

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ



سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

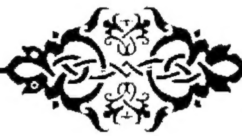
حصہ چہارم

تخریج شدہ ایڈیشن

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

اس حصے میں منصب نبوت کے بیان کے ساتھ ساتھ اسلام سے پہلے دنیا بالخصوص عرب ممالک کی تہذیب و اخلاقی حالت پر تفصیلی بحث ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اخلاقی و مذہبی اصلاح کا عظیم الشان فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اسی طرح اسلامی عقائد کا بھی تفصیلی تذکرہ موجود ہے۔



تالیف

علامہ شبلی نعمانی

علامہ سید سلیمان ندوی



مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------- علامہ شبلی نعمانی ، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973 فیکس: 042-37232369

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204, 2034256

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ چہارم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

دیباچہ طبع اوّل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

اے باز کن درِ معانی — بر ما بکلیدِ آسمانی
ہرچہ از تو گمان برم بچونی — آن من بوم و تو از آن برونی
شاہ رسل و شفیع مرسل — خورشید پسین و نورِ اوّل
سلطانِ ممالکِ رسالت — طُغرائے صحیفۂ جلالت (خسرو)

پیش نظر کتاب ''سیرۃ النبی ﷺ'' کے سلسلہ کی چوتھی جلد ہے۔ اس کا موضوع ''منصب نبوت'' ہے۔ اس تقریب سے سب سے پہلے اس میں ایک مقدمہ ہے، جس میں نبوت کی حقیقت اور اس کے لوازم و خصوصیات کی تشریح ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے، جس میں آنحضرت ﷺ کی ولادت اور ظہور اسلام کے وقت دنیا کی مذہبی و اخلاقی حالت کا مرقع دکھایا گیا ہے، بالخصوص آنحضرت ﷺ سے پہلے ملک عرب کی جو مذہبی و اخلاقی حالت تھی اور اس کی اصلاح میں جو دقتیں درپیش تھیں، شرح وبسط کے ساتھ ان کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس کے بعد آپ کی تعلیمات وارشادات کی تفصیل سے اصل کتاب کا آغاز ہوا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو پیش گاہِ باری سے جو شریعتِ کاملہ اور قانون ابدی عطا ہوا وہ درحقیقت چار عنوانوں پر منقسم ہے ① عقائد، ② عبادات، ③ اخلاق اور ④ معاملات، خیال تھا کہ عقائد وعبادات کی ایک جلد ہو اور اخلاق و معاملات دوسری جلد میں ہوں مگر جوں جوں مسافر قلم اس دشوار گزار مرحلہ میں آگے بڑھتا گیا، راستہ اس قدر وسیع اور مسافت اتنی ہی بعید نظر آنے لگی، ناچار اس جلد کو صرف عقائد کے بیان پر محدود رکھا گیا دوسری جلد میں عبادات اور ان کی حقیقت اور فرائض چہارگانہ کے حقائق وفوائد سے بحث ہوگی اور تیسری جلد کا عنوان اخلاق و معاملات ہوگا جس میں ہم ان شاء اللہ بہ تفصیل بتائیں گے کہ تمدن ومعاشرت بالخصوص قوانینِ نکاح، طلاق، وراثت، حقوق نساء، غلامی، جہاد، اصولِ حکومت اور اقتصادیات وغیرہ کے متعلق تمام دنیا کے مذاہب کے کیا اصول اور تمام سلطنتوں اور قوموں کے کیا قوانین تھے اور آج مغرب نے اس انتہائی تہذیب تک پہنچ کر کس حد تک ان امور میں ترقی کی ہے پھر موازنہ کرکے ہم دکھائیں گے کہ شریعت اسلام کے مقابلہ میں مغرب کی معراجِ ترقی شریعت اسلام کا پایۂ اولین ہے۔

حضرت الاستاذ مرحوم نے اس جلد کا کام شروع ہی کیا تھا اور مذکورۂ بالا مباحث میں سے صرف عرب

جاہلیت کے مذہبی واخلاقی حالات کے پچیس تیس صفحے لکھنے پائے تھے کہ وفات پائی، یہ صفحے بھی ان اوراق میں شامل ہیں مگر چونکہ ان میں بکثرت اضافہ اور ترمیم کی ضرورت پیش آئی ہے اس لیے ان صفحات کو ان کے اسم گرامی کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط کرتا ہوں۔ بقیہ پوری کتاب کی ذمہ داری خاکسار ہی کے خطا کار قلم پر ہے۔ ﴿ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ ﴾ (۱۲/ یوسف:۵۳) کوشش ہے کہ ان اوراق میں پیغمبر علیہ السلام کے پیغام و تعلیم کو پوری تشریح، استناد، استدلال اور دلچسپی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کیا جائے قرآن پاک کے استناد کو ہر موقع پر سب سے آگے رکھا گیا ہے اور اسی کے پرتو میں احادیث صحیحہ سے فائدہ اٹھایا گیا ہے، مناظرانہ پہلو سے بچ کر ہر پیش نظر مسئلہ میں اسلام کا دوسرے مذاہب سے اس غرض سے موازنہ کیا گیا ہے۔ تاکہ اسلام کی تکمیلِ شان نمایاں ہو جائے۔ ان اوراق کے لکھنے والے کے نزدیک نسخ شریعت کے معنی کسی حکم کو اس کے غلط یا غیر مفید ہونے کے سبب سے سرے سے مٹا کر کسی دوسرے حکم کو نافذ کرنے کے نہیں ہیں۔ بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلہ کامل تر تعلیمات بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور اسلام اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ خود اس کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے کہ ﴿ اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳) ان کی تکمیلی مباحث میں سے یہ جلد صرف عقائد پر مشتمل ہے اور کون نہیں جانتا کہ مذاہب میں اعتقادات کی حیثیت کتنی اہم اور ان کی بحث کتنی نازک ہے۔ اس لیے اس خارزار سے کسی آبلہ پا کا بسلامت گزر جانا کس قدر مشکل ہے، تاہم میں نے جدوجہد اسی کی کی ہے کہ کسی آبلہ کو ٹھیس لگے بغیر اس راستہ کو طے کرلوں، چلنے والا تو تھک کر چور ہے۔ اب یہ دیکھنے والوں کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس نے رہروی کی یہ شرط کہاں تک پوری کی۔

ارباب بصیرت جانتے ہیں کہ اسلامی فرقوں میں سے کسی فرقہ کے مطابق بھی اگر عقائد کی کتاب لکھی جاتی تو یہ منزل نہایت آسان تھی کہ ان میں سے ہر ایک کی مدوّن و مرتب کتابیں سامنے ہیں لیکن مجھے اس جلد میں کسی خاص فرقہ کے نہیں بلکہ اسلام کے وہ عقائد لکھنے تھے جن پر ایمان لانے کا قرآن نے ہم سے مطالبہ کیا ہے اور جن کی تعلیم محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کو دی تھی چنانچہ ان اوراق میں چند عقائد کی تشریح ہے اور یہ وہی ہیں جو اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى میں مذکور ہیں یعنی ''خدا، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر اور آخری دن اور قضاو قدر پر ایمان۔'' چنانچہ اس جلد میں مقدمہ و دیباچہ کے بعد ان ہی چھ باتوں کی تفصیل و تشریح ہے۔ میں نے

اپنے جانتے اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ کی تشریح میں قلم، صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے اس لیے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دعا ہے کہ خداوند میری لغزش کو دوسروں کی لغزش کا سبب نہ بنانا اور ہم سب کو سیدھی راہ دکھانا۔

﴿ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۷۸)

''جس کو خدا راہ دکھائے وہ راہ پایا ہوا ہے۔''

﴿ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ۭ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳۷)

''اور جس کو خدا راہ دکھائے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں۔''

﴿ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ ﴾ (۲/ البقرہ:۲۸۶)

''ہمارے پروردگار ہماری بھول چوک کی باز پرس ہم سے نہ فرمانا۔''

ایں نامہ کہ خامہ کرد بنیاد　　　توقیعِ قبول روزیش باد

طالب رحمت

سید سلیمان ندوی

دار المصنفین، اعظم گڑھ

(۲۵/ ربیع الاول ۱۳۵۱ھ)

دیباچہ طبع ثانی

سیرت النبی ﷺ جلد چہارم

سیرت جلد چہارم کو جو اسلام کے اصول وعقائد پر ہے جس وقت پہلی دفعہ ناظرین کرام کے ہاتھوں میں دے رہا تھا، میرا دل اضطراب کے عالم میں تھا کہ ایسے مشکل اور پیچیدہ راستہ میں معلوم نہیں، میرا قلم کہاں کہاں بہکا اور قدم نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی، لیکن الحمدللہ والمنۃ کہ سوائے دوزخ کی ابدیت وغیرابدیت کے ایک مسئلہ جس میں جمہور کی رائے ہمارے ساتھ نہ تھی، ہر مسئلہ میں اس کتاب کی تحریر کو قبولیت عام حاصل ہوئی، جن جن حوصلہ افزا طریقوں سے خواص علما اور عام مسلمانوں نے اپنی تحسین وآفرین کی عزت بخشی اس سے جی چاہتا تھا کہ یہ قیاس کروں کہ ملائے اعلیٰ کی خوشنودی ورضامندی بھی اس حقیر مؤلف کے شامل حال ہے۔

اس کتاب کی طبع ثانی چھوٹی تقطیع پر چھاپی جارہی ہے اس میں طبع اوّل کے مطبعی اغلاط کی تصحیح کردی گئی ہے۔ کہیں کہیں عبارت کی خوبی وشستگی کے لیے لفظی تبدیلیاں بھی کی گئی ہیں اور مسئلہ ابدیتِ نار میں جمہور کے خیال کی ترجمانی کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے، تاکہ ناظرین کو اس کے دونوں پہلوؤں سے واقفیت ہوجائے۔ واعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچائے، تاکہ ناچیز مؤلف کو اپنی مغفرت کا وسیلہ ہاتھ آئے۔

کتاب کی طبع اوّل چونکہ بڑی تقطیع پر چھپی تھی اس لیے ۶۸۶ صفحوں کی ایک جلد رہنے دی گئی لیکن چھوٹی تقطیع پر اس کی ضخامت ۸۸۸ صفحوں تک پہنچ گئی ہے جس کا ایک جلد میں سمانا مشکل تھا، اس لیے گو صفحوں کا شمار مسلسل رکھا گیا ہے مگر صفحہ ۴۰۵ سے کتاب دو حصوں میں علیحدہ بھی کردی گئی ہے، تاکہ اگر کسی کا جی چاہے تو اس کو دو جلدوں میں کرلے، تاکہ پڑھنے میں اور سفر میں ساتھ رکھنے میں آسانی ہو۔

جامع

سید سلیمان ندوی

۲۷ رجب ۱۳۵۳ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

منصبِ نبوّت

کتاب کا موضوع، آپ کے پیغمبرانہ کارنامے

سیرت کی عام کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے واقعاتِ زندگی کے اندر جو چیز سب سے زیادہ ممتاز ہو کر نظر آتی ہے وہ غزوات اور لڑائیاں ہیں لیکن یہ غزوات اور لڑائیاں ظاہر ہے کہ مقصود بالذات نہ تھیں بلکہ وہ سلسلۂ دعوت میں اتفاقاً پیش آ گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے عرب کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مٹانے کی پرزور کوشش کی، اس کے قبول کرنے والوں کو ستایا اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا، وہ اپنی جان بچا کر دوسرے شہر کو چلے گئے، وہاں ان کی دعوت نے فروغ پایا اور بہت بڑی تعداد نے ان کی سچائی کو قبول کیا، یہ دیکھ کر مخالفوں نے ہر طرف سے یورش کی اور چاہا کہ اس جماعت کو بزور شمشیر مٹا دیں اس نے اپنی جان کے بچاؤ کی تدبیریں کیں اور ان کی پرزور سازشوں اور کوششوں کے سیلاب کو پہاڑ بن کر روکا، اس کشمکش نے خونریز لڑائیوں کا ایک سلسلہ چھیڑ دیا جو متصل دس سال تک قائم رہا۔ رفتہ رفتہ اعجاز نبوت، حسنِ تدبیر، لطفِ اخلاق سے تمام معرکے سر ہوئے اور پھر ایک پرامن نظام قائم ہو گیا بے شبہ یہ کارنامہ بھی کچھ کم مستوجب منقبت نہیں لیکن ناظرین اس نکتہ کو پیش نظر رکھتے ہوں گے کہ ہم کس (ذات اقدس) کے سوانح لکھ رہے ہیں۔

یہ جو کچھ ہوا اور پیش آیا، وہ گو نہایت عجیب، حیرت انگیز اور کرشمہ ربانی کا پورا مظہر ہے، تاہم وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا اصلی براہ راست اور مقصود بالذات کارنامہ نہیں وہ اتفاقی حوادث ہیں جو اسلام کی دعوت و اشاعت کی راہ میں دشمنوں کی مخالفت سے پیش آ گئے آپ کے اصلی پیغمبرانہ کارنامے وہ ہیں جو اگر یہ اتفاقی واقعات رونما نہ ہوئے ہوتے تب بھی ظاہر ہی ہوتے اور وہی آپ ﷺ کی سیرۃ مبارکہ کے اصلی وقائع اور سوانح ہیں یعنی عرب میں سرتاپا روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا کر دینا، تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور اخیر شریعت کو پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانہ توحید اور سرور محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاقِ فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق و محبت، لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح کے ویران گھروں کی از سرِ نو آبادی، الغرض خاتم النبیین کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی

اصلاح، فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانون الٰہی کا اظہار و عرض اور تہذیب نفوس کی معراج اخیر تھی اور یہ سب اُسی پر آشوب زمانہ میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار بظاہر صرف حملوں کے تیر باراں کے روکنے میں صرف ہو گئے پیش نظر جلد آنحضرت ﷺ کی سیرت مبارکہ کے انہیں واقعات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔

نبی اور مصلح اور حکیم

بظاہر نظر آتا ہے کہ اس قسم کے کچھ کام ایسے لوگوں سے بھی انجام پاتے ہیں جو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوتے، وہ اپنی قوم و ملک کے سامنے اپنی اصلاح کی دعوت پیش کرتے ہیں اور سعی و محنت اور متواتر جدوجہد سے ان میں کوئی سیاسی، اجتماعی، تعلیمی، اقتصادی اور معاشرتی انقلاب پیدا کرتے ہیں اور ان کو قعرِ مذلت سے نکال کر ترقی کی سطح مرتفع تک پہنچا دیتے ہیں، ایسے لوگوں کو مصلح اور ریفارمر کہتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے منہ سے اخلاق و حکمت اور پند و موعظت کے موتی جھڑتے ہیں، جن کو حکیم کہتے ہیں۔ اس حالت میں ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کیا فرق ہوگا؟ اس التباس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے کوتاہ نظر ایک پیغمبر اور ایک مصلح اور ایک حکیم میں کوئی امتیاز نہیں کرتے اس بنا پر اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اس فرق و امتیاز کو نمایاں کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

نبوت کی حقیقت اور خصوصیات

اس فرق کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے نبوت کی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لی جائے۔ نبوت کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالی رحمہ اللہ نے معارج القدس [1] میں اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ یہ دونوں بزرگ تصوف، فلسفہ اور نقلیات تینوں کوچوں سے باخبر ہیں، اس لیے یہ جو کچھ بتائیں گے اس میں کچھ کچھ ذاتی ذوق و مشاہدہ کا حصہ بھی شامل ہوگا۔ امام صاحب فرماتے ہیں:

''نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے، وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے، سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: [2]

﴿ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٤)

''اللہ بہتر جانتا ہے کہ جہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔''

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا [2] مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ ﴾

---

[1] معارج القدس کا یہ حصہ حضرت الاستاذ مرحوم نے الکلام کے آخر میں بطور ضمیمہ شائع کر دیا ہے۔ یہ ضمیمہ عربی عبارت میں الکلام کے قدیم اڈیشن مطبوعہ نامی پریس کان پور ۱۹۰۴ء (ص: ۲۵۹ تا ۲۷۸) میں شامل تھا مگر بعد کے اڈیشنوں میں صرف اردو خلاصہ ہی شامل رہا۔ ''ض'' [2] معارج القدس بحوالہ ضمیمہ الکلام، ص: ۲۶۰، ۲۶۱۔

[2] امام صاحب نے آیت پوری نہیں لکھی ہے، میں نے اپنی طرف سے آیت پوری کر دی ہے۔

(٤٢/ الشوریٰ:٥٢)

''اور اسی طرح ہم نے تیرے پاس اپنے حکم سے ایک روح بھیجی، تو پہلے نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا؟ لیکن اس کو ہم نے ایک نور بنایا ہے جس سے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہیں راہ سوجھائیں۔''

اس موقع کے لیے صریح آیت یہ ہے:

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (٦٢/ الجمعة:٤)

''یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے جس کو چاہے دے۔''

گو یہ صحیح ہے کہ وہ عبادات وریاضات جو فکر ومراقبہ پر مشتمل اور ریا اور شہرت طلبی سے پاک ہوں نفس میں آثار وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دیتے ہیں، تاہم نبوت کا منصب خاص محض اتفاقی نہیں جو محنت اور کوشش سے کسی کو حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح نوع انسان کا انسان اور فرشتوں کا فرشتہ بن جانا ان کے افراد کی سعی ومحنت کا مرہون منت نہیں اسی طرح نوع انبیا کا نبی بن جانا، ان کے افراد کی کوشش اور محنت سے ممکن نہیں، ہر انسان کا بچہ اپنی ذاتی محنت سے نہیں بلکہ فیاض عالم کی بخشش سے انسانیت کا رتبہ حاصل کرتا ہے مگر انسانیت کے ممکن کمالات کو بالفعل حاصل ہو جانے کے لیے اس کو یقیناً کچھ نہ کچھ جدوجہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح نبوت نوع انبیا کے لیے اکتسابی چیز نہیں لیکن منشائے نبوت کے مطابق ریاضت اور عمل، قبول وحی کی استعداد اور تیاری کے لیے البتہ ضروری ہیں۔

چنانچہ اسی اصول کے مطابق اکثر پیغمبروں کے آغاز وحی کے حالات میں آپ کو یہ ملے گا کہ انہوں نے ایک زمانہ تک عبادت ومراقبہ میں بسر کیا، ایک ایک مہینہ، ایک ایک چلہ اس طرح گزارا کہ وہ مادی دنیا کی آلائشوں سے یکسر الگ ہو گئے تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ کتاب ملنے سے پہلے وہ چالیس روز تک کوہ طور پر روزہ کی حالت میں رہے۔ اسی طرح انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے کہ وہ ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک روزہ رکھ کر عبادتوں میں مصروف رہے اور وحی سے پہلے آنحضرت ﷺ کا غار حرا میں مہینوں عزلت گزین رہنا اور فکر ومراقبہ اور عبادت اور ریاضت میں مصروف رہنا سب کو معلوم ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ نبوت سے پہلے حرا میں جا کر جب عبادت میں مشغول ہوئے تو رؤیائے صادقہ دیکھنے لگے جس کی سچائی مثل سپیدۂ صبح کے صاف نمایاں ہوتی تھی وحی کے بعد آپ اس قدر عبادت میں مصروف رہتے تھے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج جاتے تھے اسی لیے قرآن نے آپ کو خطاب کر کے کہا:

﴿ طٰهٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ ﴾ (٢٠/ طٰہٰ:١، ٢)

''اے پیغمبر! ہم نے یہ قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تو تکلیف اٹھائے۔''

اس عبادت وریاضت کے ساتھ نبوت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے حامل میں حسنِ صورت، اعتدال مزاج، نشو ونما کی پاکی، حسن تربیت، طہارت نسب، کرم اخلاق، نیکی، متانت، سنجیدگی دوستان الٰہی کے ساتھ نرم خوئی اور تواضع اور دشمنان حق کے ساتھ شدت قوت پائی جائے، علاوہ بریں وہ راست گفتار، امانت دار تمام برائیوں سے پاک، فضائل ومحاسن سے آراستہ اور ذلیل باتوں سے مبرا ہوتا ہے، وہ ظلم کرنے والوں کو معاف اور اپنے ساتھ برائی کرنے والوں کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔ قرابت مندوں اور ہمسایوں کے ساتھ احسان، مظلوموں کی اعانت، فریادخواہوں کی فریادرسی، اس کی طینت اور نیکی سے محبت اور بدی سے نفرت اس کی فطرت ہوتی ہے اس کی شان جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے یہ ہوتی ہے کہ

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۲)

''تمہارا ساتھی (پیغمبر) گمراہ نہ ہوا اور نہ بہکا۔''

اس کی یہ صفت اس دنیاوی عالم میں ہے کہ وہ ہر گمراہی و بے راہروی سے پاک ہوتا ہے:

﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ ﴾ (۷۳/ النجم:۷)

''اس کی نگاہ نہ کج ہوئی اور نہ سرکش ہوئی۔''

یہ اس دنیا کے مناظر اور مشاہدات کے متعلق اس کی کیفیت ہوتی ہے۔

تمام دنیا کی قوتیں، اس کی قوت کے سامنے بالآخر طوعاً و کرہاً سرنگوں ہو جاتی ہیں، با ایں ہمہ وہ مغرور، جابر، جفا پیشہ، بدخو اور درشت مزاج نہیں ہوتا، وہ پیغمبری اور رسالت کے بارِ عظیم کو اٹھاتا ہے اور اس کا پورا حق ادا کرتا ہے اور تمام عالم میں اپنی رحمت کا فیض جاری کرتا ہے۔

نبوت ورسالت کے ثبوت کا اجمالی طریقہ

نبوت کے ثبوت کے دو طریقے ہیں: ایک اجمالی اور دوسرا تفصیلی۔ اجمالی طریقہ یہ ہے کہ جس طرح انسان کو حیوان پر نفس ناطقہ کی بنا پر فضیلت حاصل ہے کہ یہ عقلی ودماغی خصوصیت حیوان میں نہیں پائی جاتی جس کے بل پر انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اور اس کا مالک بنا ہوا ہے اور اس کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے اسی طرح انبیا علیہم السلام کو اپنے نفوس قدسیہ کی بنا پر تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے وہ اپنے ان قدسی نفوس اور پیغمبرانہ قوت سے دوسروں کو راہ راست سوجھاتے اور خود راہ راست پر قائم رہتے ہیں ان کی پیغمبرانہ عقل وفہم تمام انسانی عقلوں سے بالاتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانی نفوس کی تدبیر کا فرض انجام دیتے اور ان پر قابو پاتے اور ان کو کام میں لگاتے ہیں اور جس طرح انسانوں کے عجیب وغریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے عجیب وغریب کام انسانوں کو معجزہ نظر آتے ہیں۔ اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت میں برابر کا شریک ہوتا ہے مگر

عقلیت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی اسی مفہوم کو قرآن نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ ﴾ (۱۸/ الكهف:۱۱۰)

''میں تمہاری ہی طرح بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔''

دیکھو کہ بشریت میں گو پیغمبر کو دوسرے انسانوں کے مثل کہا ہے مگر ساتھ ہی وحی کے فرق و امتیاز کو دونوں میں حد فاصل قرار دے دیا ہے۔

نبوت کے تفصیلی ثبوت کے تین طریقے ہیں:

پہلا طریقہ: انسان میں تین قسم کے اختیاری حرکات پائے جاتے ہیں فکری، قولی، عملی ان تینوں سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں وہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ فکر یعنی رائے صحیح بھی ہوتی ہے اور غلط بھی، قول سچ بھی ہوتا ہے اور جھوٹ بھی، عمل اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح اور غلط، سچ اور جھوٹ اور اچھے اور برے میں تمیز کیونکر ہو؟ پھر کیا یہ تمیز ہر شخص کر سکتا ہے یا کوئی نہیں کر سکتا، یا بعض کر سکتے ہیں اور بعض نہیں۔ پہلے دو احتمال بداہۃً غلط ہیں، اب رہ گیا تیسرا احتمال یعنی بعضے انسان ایسے ہوتے ہیں جو ان حدود کو متعین کر سکتے ہیں کہ فلاں رائے و عقیدہ صحیح اور فلاں غلط ہے، فلاں قول سچ ہے، فلاں جھوٹ ہے اور فلاں فعل اچھا اور فلاں برا ہے۔ جس شخص کو خالق فطرت اپنے فضل و کرم سے یہ قوت عطا فرماتا ہے وہی پیغمبر اور صاحب شریعت ہوتا ہے۔

دوسرا طریقہ: نوع انسان کو اپنے اختیاری اعمال و حرکات اور مصلحتی معاملات میں باہمی اجتماع اور تعاون کی ضرورت ہے، اگر انسانوں میں باہم یہ اجتماع اور تعاون نہ ہو تو نہ انسان کا کوئی فرد زندہ رہے نہ جان و مال اور عزت آبرو کی حفاظت ہو سکے، اسی بقائے نفس اور جان و مال و آبرو کے تحفظ کے اصول و آئین کا نام شریعت ہے۔ انسان کو اس کے لیے دو قسم کے کاموں کی ضرورت ہے، ایک یہ کہ اچھے کاموں میں سب مل کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں، اس کو تعاون کہتے ہیں اور دوسرے یہ کہ برے کاموں سے ایک دوسرے کو باز رکھنے کی کوشش کریں، اس کو تمانع کہتے ہیں اسی تعاون کے ذریعہ سے انسان کھانے پینے پہننے اور رہنے کے لیے سامان و اسباب فراہم کرتا ہے تعاون کے ذریعہ نکاح و قربت اولاد و اعزہ اور احباب و دوست کے حقوق و تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور تمانع کے ذریعہ سے نوع انسانی اور افراد انسانی کی زندگی اور ان کی دولت و جائیداد اور عزت و آبرو کے بچاؤ کی صورت پیدا ہوتی ہے اس تعاون اور تمانع کے اصول ضروری ہے کہ مرتب، محدود اور معلوم ہوں اور وہ اس طرح بنائے جائیں جن میں کسی خاص شخص، خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کے فوائد کی ترجیح نہ ہو بلکہ ان میں سب کا برابر فائدہ ہو یہ ظاہر ہے کہ ایسا قانون انسانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی ربانی اور تعلیم الٰہی

سے بن سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ محض کسی انسان کی عقل سے جو بہر حال کوئی خاص شخص، یا کسی خاص خاندان، قبیلہ، قوم اور ملک کا ہوگا ایسا غیر جانبدارانہ قانون جس میں تمام مخلوقات کی حیثیت یکساں ہو اور کسی طرف پلہ جھکنے نہ پائے اور تمام عالم کے لیے یکساں واجب العمل ہو محال ہے، اس لیے ضروری ہے کہ یہ اصول اس کی طرف سے وحی ہوں، جس کے ہاتھ میں نظام عالم کی باگ ہے اور جو پورے نوع انسانی کے اندرونی و بیرونی احوال و کیفیات کے رموز سے باخبر ہے، یہ اصول خلاق عالم کی طرف سے جس شخص پر وحی ہوتے ہیں وہی پیغمبر اور رسول ہوتا ہے۔

تیسرا طریقہ: یہ وہ طریقہ ہے کہ جس نے اس کو نہیں جانا، اس نے نبوت کی حقیقت نہیں پہچانی، پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے دو کام ہیں، خلق (پیدا کرنا نیست سے ہست کرنا) اور امر (جو موجود و ہست ہے اس کو اپنی مصلحت کے مطابق حکم دینا) کائنات انہی دو چیزوں سے عبارت ہے تو جس طرح فرشتے خالق اور مخلوق کے درمیان خلق و ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی میں واسطہ ہیں، اسی طرح پیغمبر، خدا اور بندہ کے درمیان احکام کے پہنچانے میں واسطہ ہیں اور جس طرح خدا پر بحیثیت خالق اور آمر (پیدا کرنے والے اور حکم دینے والے) کے ایمان لانا واجب ہے، اسی طرح فرشتوں پر اس حیثیت سے کہ وہ خالق و مخلوق کے درمیان ایجاد و پیدائش اور پیغام رسانی کے واسطہ ہیں، ایمان لانا ضروری ہے اور اسی طرح پیغمبروں پر اس حیثیت سے ایمان لانا فرض ہے کہ وہ خدا اور بندہ کے درمیان حکم کے پہنچانے میں واسطہ ہیں۔

اس کے بعد حسب ذیل مقدمات ذہن نشین رکھنے چاہئیں:

① چونکہ ممکن کا وجود اور عدم برابر ہے اس لیے ممکن ہے کہ وجود میں آنے کے لیے ایک مرجح کا ہونا ضروری ہے جس کی وجہ سے وجود کو عدم پر ترجیح ہو اور وہ شے عدم سے وجود میں آسکے یہی امر مرجح ممکن کی علت ہوتا ہے۔

② ہر قسم کے حرکات کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہوتی ہے جو دم بہ دم حرکت کی تجدید کرتا رہے، حرکات کی بھی دو قسمیں ہیں طبعی اور ارادی۔ ارادی حرکت کے لیے ضروری ہے کہ اس کے محرک میں ارادہ اور اختیار پایا جائے اسی طرح طبعی حرکت کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اس کا محرک عقل اور تدبیر والا ہو، آفتاب و ماہتاب اور دوسری آسمانی مخلوقات کی حرکات گو طبعی ہیں، تاہم ان کو حرکت دینے کے لیے کسی عاقل و مدبر کی ضرورت ہے اسی لیے قرآن نے ان کے لیے کہا:

﴿ وَأَوْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا ﴾ (٤١/ حٰم السجدة:١٢)

"خدا نے ہر آسمان میں اس کا فرض اور کام وحی کیا۔"

③ اب جس طرح انسانی حرکات کو ارادہ اور اختیار کی حاجت ہے یعنی ارادہ اور اختیار کے بغیر وہ وقوع میں

نہیں آ سکتیں اسی طرح ان حرکات کو ایک ایسے راہنما کی ضرورت ہے جو ان اعمال وحرکات کا ٹھیک راستہ اور صحیح طریقہ بتائے اور حق کو باطل سے، سچ کو جھوٹ سے اور خیر کو شر سے ممتاز کر دے۔

④ خدا کے حکم دو قسم کے ہیں تدبیری اور تکلیفی، پہلا حکم تمام نظام عالم میں جاری ہے جس کی بنا پر تمام عالم میں تدبیر اور انتظام کا سلسلہ نظر آتا ہے، قرآن مجید میں ہے:

﴿ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ ۭ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ ﴾

(۷/ الاعراف:۵٤)

''اور سورج اور چاند اور ستارے اس کے حکم کے تابعدار ہیں اسی کا نام ہے بنانا اور حکم فرمانا۔''

تکلیفی حکم صرف انسان کے لیے ہے، چنانچہ قرآن میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱)

''اے انسانو! اپنے اس رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا۔''

مقدمات مذکورۂ بالا سے ثابت ہوا کہ انسان کے تمام حرکات ممکن ہیں اس لیے مرجح کی ضرورت ہے۔ اختیاری ہیں، اس لیے عقل کی ضرورت ہے۔ خیر وشر کے متحمل ہیں، اس لیے راہنما کی ضرورت ہے، اسی راہنما کا نام پیغمبر ہے۔

نظام عالم میں خدا کا جو تدبیری حکم نافذ ہے وہ ملائکہ کے ذریعہ سے ہے اسی قیاس سے انسانوں پر خدا کا جو تکلیفی حکم نافذ ہے وہ بھی ایسی ہی نفوس کے ذریعہ سے ہوگا اور انہیں کا نام پیغمبر ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ کے چھٹے مبحث کے دو ابتدائی بابوں میں اسی پر بحث کی ہے [1] اور حقیقت یہ ہے کہ کمال نکتہ سنجی سے کی ہے، شاہ صاحب کی تقریر کو ہم اپنے الفاظ میں لکھتے ہیں۔

نبی کی ضرورت

انسان میں دو قسم کی قوتیں ہیں، بہیمی اور ملکوتی، کھانا، پینا، شہوت، حرص وطمع، استیلا و جبر وغیرہ افعال بہیمی قوت کے آثار ہیں اور غور وفکر، علم ومعرفت، حسن اخلاق، صبر وشکر، عبادت وطاعت وغیرہ ملکوتیت کے نتائج ہیں۔ انسان کی روحانی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بہیمی قوت اس کی ملکوتی قوت کے تابع ہو اگرچہ عقل سلیم ان اصول اور طریقوں کو معلوم کر سکتی ہے جن کے ذریعہ سے بہیمیت کے تابع ملکوتیت ہونے کے فائدے اور گناہ وعصیاں کے نقصانات ظاہر ہوں عقل سلیم کے اس علم سے انسان فائدہ اٹھا کر اپنی اصلاح کر سکتا ہے مگر یہ تو امکان عقلی ہے عملی کیفیت یہ ہے کہ انسان کی آنکھوں پر، موجودہ دنیاوی لذائذ، حرص وطمع اور بے جا خواہشوں اور غفلتوں کے اتنے تو برتو پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کے اصلی اور فطری وجدان اور قوت

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، ج۱، ص:٦٥ تا ٦٨۔

احساس کا مادہ فاسد ہو جاتا ہے جیسے بیماری میں انسان کی زبان کا ذائقہ جب بدل جاتا ہے تو میٹھی سے میٹھی چیز اس کو کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی طرح اندرونی وجدان واحساس کے فاسد ہو جانے سے بھی وہ حق و باطل خیر و شر اور نیک و بد کی تمیز کو بھول جاتا ہے اس لیے نوع انسان کو ایسے صحیح راہنماؤں اور روحانی معلموں کی ضرورت ہے جن کے احساس و وجدان کا آئینہ گرد آلود نہ ہو۔

اگر افراد، جماعات اور اہل ملک کو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اپنی سیاست کے زور سے ان میں صلح و آشتی اور امن وامان پیدا کر دے تو ایک قوم کی قوم بلکہ کل دنیا کے لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت کیوں نہ ہو جو ہر گروہ کی استعداد کو پیش نظر رکھ کر اس کے مطابق اس کے حقوق وفرائض کی تعیین کرے ایسے لوگ جو ایسے اہم فریضہ کو انجام دے سکیں اسی طرح کم ہیں جس طرح دوسرے اصناف کے اہل کمال۔ انسانوں کے معمولی پیشوں نجاری اور لوہاری کو دیکھو کہ کس قدر معمولی ہیں مگر ان کو کرنا بھی ہر شخص کا کام نہیں، یہ پیشے بھی ایسے لوگوں کے بغیر وجود میں نہیں آئے جن کو ان کاموں کا خاص ذوق و وجدان تھا اور ان کو ان کاموں کی خاص فطری استعداد ملی تھی جس کے ذریعہ سے انہوں نے اس فن کو تکمیل تک پہنچایا اور اس کے اصول وقواعد وضع کیے اور بعد کے آنے والوں نے ان کی تقلید کی اور اس تقلید سے مدارج علیا تک پہنچے پھر اخلاق وروحانیات اور ملک و ملت کے مصالح وفوائد عامہ کا فن جس قدر اہم اور نازک ہے کیا اس کو سمجھنا اور وضع کرنا ہر کس و ناکس کا کام ہو سکتا ہے۔

نبی کی عصمت

پھر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جو شخص اس راہنمائی کے منصب کا مدعی ہو وہ اپنی نسبت یہ بھی ثابت کرے کہ وہ ان اصول وقواعد سے بخوبی واقف ہے اور وہ اپنے علم اور تعلیم میں غلطی اور گمراہی سے محفوظ ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے علم اور تعلیم کا ماخذ اور سرچشمہ غلطیوں سے پاک اور محفوظ نہ ہو، اس کو ان امور کا علم اسی طرح وجدانی ہو جس طرح انسان کو بھوک اور پیاس کا وجدان ہوتا ہے کیا کسی کو اس علم میں کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہوتی ہے کوئی غلطی ہو سکتی ہے؟ اس طرح اس کو حق و باطل، خیر و شر اور نیک و بد امور کے درمیان فیصلہ اسی طرح قطعی معلوم ہوتا ہے۔ جس میں نہ دلیل کی حاجت ہوتی ہے اور نہ عقل معاش کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہے ہم کبھی اس وجدانی یقین سے جس کو خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دست بردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے بعینہٖ اسی طرح ان نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح اور جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ

ناطق ہی ہوتا ہے۔

نبی کی محبوبیت

ایسا شخص جب لوگوں کے سامنے آتا ہے اور لوگوں کو بار بار کے تجربہ سے اس کی صداقت، سچائی اور راست بازی کا یقین ہو جاتا ہے اور اس کے ہاتھ سے جو تصرفات صادر ہوتے ہیں ان سے اس کا مقرب بارگاہ الٰہی ہونا بھی ظاہر ہو جاتا ہے تو ہر طرف سے لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور اس کی محبت کی راہ میں جان و مال اور اہل و عیال سب کو قربان کر دیتے ہیں۔

شاہ صاحب اس کے بعد دوسری فصل میں اسی ''بحث نبوت'' کو ایک اور انداز سے لکھتے ہیں، [1] جس کا ماحصل یہ ہے۔

مصلحین

فضل و کمال اور علم و عمل کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجے ہیں ان میں سب سے بڑا درجہ مفہمین کا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی قوت ملکیہ نہایت بلند ہے اور جن میں یہ قدرت ہوتی ہے کہ سچے اور صحیح جذبہ سے ایک خاص نظام کو دنیا میں قائم کر دیں اور ان پر بارگاہِ الٰہی سے ایسے علوم اور احوال کا ترشح ہوتا ہے جن میں ربانی آثار نظر آتے ہیں ایسے لوگ معتدل مزاج اور اپنی صورت و سیرت میں درست اور عقل و ذکاوت میں متوسط ہوتے ہیں، نہ اس قدر بلید کہ جزئیات سے کلیات تک ان کا پہنچنا مشکل ہو، نہ اس قدر تیز کہ جزئیات اور محسوسات سے قطع نظر کر کے ہمیشہ ذہنیات اور تخیلات میں مبتلا رہیں، صحیح فطرت پر وہ قائم رہتے ہیں، طور و طریق ان کے پسندیدہ ہوتے ہیں، خدا کے ساتھ ان کا تعلق عبادت و اطاعت سے اور بندوں کے ساتھ عدل و انصاف سے قائم رہتا ہے، وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور جزئی بھلائی اور منفعت کا لحاظ نہیں کرتے بلکہ منفعت عامہ اور تدبیر کلی کا لحاظ کرتے ہیں، وہ براہ راست کسی کو تکلیف نہیں دیتے الا یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور شخصی نقصان کو گوارا کر لیتے ہیں، وہ ہمیشہ اپنے کاروبار میں عالم غیب کی طرف مائل رہتے ہیں جس کا اثر ان کی بات چیت، کام کاج اور معاملات میں نمایاں ہوتا ہے، کارکنانِ عالم ان کی تائید و نصرت میں رہتے ہیں، معمولی ریاضت سے ان کے لیے قرب و سکینت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں جو دوسروں کے لیے نہیں کھلتے۔

مصلحین کی اقسام

مفہمین کے درجہ بدرجہ مختلف اصناف ہیں اور ان کی مختلف استعدادیں ہیں اور اس بنا پر ان میں سے ہر ایک کے الگ الگ اصطلاحی نام ہیں، جو زیادہ تر عبادات کے ذریعہ سے تہذیب نفس کے علوم پاتا ہے وہ کامل

[1] حجة الله البالغة، ج ۱، ص: ٦٥ تا ٦٦۔

ہے اور جو اخلاق فاضلہ اور تدبیر منزل کے اصول حاصل کرتا ہے وہ حکیم ہے۔ جو عمومی تدبیر و سیاست کے علوم کا فیض پاتا ہے اور ان کے مطابق اس کو لوگوں میں عدل کے قیام اور ظلم کے دور کرنے کی توفیق ملتی ہے وہ خلیفہ ہے اور جس پر ملائے اعلیٰ کا نزول ہو وہ اس سے تعلیم پائے اور وہ اس کو مخاطب کرے اور مختلف قسم کے تصرفات اس سے صادر ہوں وہ مؤید بروح القدس کہلاتا ہے اور وہ جس کی زبان اور دل میں وہ نور ہو کہ لوگ اس کی صحبت اور پند و موعظت سے نفع اٹھائیں اور وہ نور اس سے منتقل ہو کر اس کے رفقائے خاص میں منتقل ہو جس سے وہ بھی کمال کے درجہ تک پہنچ جائیں اس کا نام ہادی اور مزکی (پاک کرنے والا) ہے اور جس کے علم کا بڑا حصہ ملت کے اصول و قواعد اور اس کی مصلحتوں کی واقفیت ہو اور ملت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو وہ امام کہا جائے گا اور جس کے قلب میں یہ ڈالا جائے کہ وہ لوگوں کو ان کی اس مصیبت عظمیٰ سے خبردار کرے جو اس دنیا میں ان کے لیے ان کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر مقدر ہے اور ان کی بداعمالی کے سبب ان سے حق تعالیٰ کی رحمت کی جو دوری یا قبر اور حشر میں ان پر جو مصیبتیں آنے والی ہیں، اس کا نام منذر (ڈرانے والا ہوشیار کرنے والا) ہے اور جب حکمتِ الٰہی کا یہ اقتضا ہوتا ہے کہ مخلوق کی ہدایت و اصلاح کے لیے ان مفہمین میں سے کسی کو بھیجے تو اس کی آمد مخلوق کی تاریکی سے نکل کر روشنی میں آنے کا سبب ہو جاتی ہے اور وہ بندوں پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دل و جان سے اس کی اطاعت کریں اور بارگاہ الٰہی میں تاکید ہوتی ہے کہ جو اس کی اطاعت کرے اس سے خوشنودی اور جو اس کی مخالفت کرے وہ اس سے ناخوشی ظاہر کرے۔ یہی شخص نبی ہوتا ہے۔

نبی کی دو بعثتیں

نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعث ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعہ سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے نامزدگی بعثت ثانیہ ہے۔

نبی کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۲)

"وہی خدا جس نے ان پڑھوں میں، انہیں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا اور ان کو پاک بناتا اور ان کو کتاب اور دانائی سکھاتا ہے۔"

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے:

﴿ كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۱۰)

''تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے وجود میں لائی گئی نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے باز رکھتے ہو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لیے ہوئی ویسی ہی ان کی امت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنی میں قرآن پاک کی یہ آیت بھی ہے:

﴿ لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸)

''تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔''

اسی لیے احادیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ کو فرمایا ((فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ)) [1] ''تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔'' آنحضرت ﷺ سے پہلے جو انبیا آئے وہ ان مختلف مذکورہ بالا مناصب میں سے ایک یا دو منصب کے ساتھ مبعوث ہوئے لیکن آنحضرت ﷺ ان تمام منصبوں پر ایک ساتھ سرفراز ہوئے اور یہ تمام فنون آپ کی واحد ذات میں جمع کر دیے گئے اور آپ کو یہ دونوں بعثتیں بھی بکمال استحقاق عطا ہوئیں۔

بعثت کے لیے کسی قوم کا انتخاب

یہ بھی واضح ہو کہ رسول کی بعثت کے لیے حکمت الٰہی کا اقتضا اس لیے ہوتا ہے کہ عالم کی عمومی تدبیر ونظم و نسق میں جو اضافی خیر معتبر ہے وہ ان دنوں اسی رسول کی بعثت میں منحصر ہوتا ہے اور اس بعثت کے حقیقی سبب کا علم اسی دانائے غیب کو ہے مگر اتنی بات ہم قطعًا جانتے ہیں کہ کچھ اسباب ایسے ہیں جو بعثت کے ساتھ ضرور پائے جاتے ہیں اور امت پر اس رسول کی اطاعت اسی لیے فرض ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کی تمام قوموں سے جس قوم کی نسبت یہ جانتا ہے کہ اس میں خدا کی اطاعت و پرستش کی استعداد اور اس میں اللہ تعالیٰ کے فیضان اٹھانے کی صلاحیت زیادہ ہے اس میں وہ رسول مبعوث ہوتا ہے اور چونکہ اس قوم کی اصلاح اسی پیغمبر کی پیروی اور اتباع میں منحصر ہوتی ہے اس لیے بارگاہ الٰہی کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت سب پر واجب کی جائے۔

بعثت کا زمانہ

اس موقع پر چند باتیں اور قابل لحاظ ہیں کیونکہ یہ وقت وہ وقت ہوتا ہے کہ کوئی نئی حکومت اس لیے قائم کی جائے، تا کہ اس کے ذریعہ سے ان دوسری حکومتوں کو جو دنیا میں فساد اور شر کا موجب بنی ہوئی ہیں مٹا دیا جائے تو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ اس شخص کو بھیجتا ہے جو پہلے اس قائم ہونے والی سلطنت کی قوم کی اصلاح کرے اور اس کے دین کو درست کرے، تا کہ اس کے ذریعہ سے دوسری قوموں کی اصلاح ہو جس طرح

---

[1] بخاری، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول فی المسجد: ۲۲۰؛ کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا: ۶۱۲۸؛ مسند امام احمد، ج ۲، ص: ۲۳۹۔

ہمارے پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی زندگی کی بقا اور اس کو اپنا برگزیدہ بنانا چاہتا ہے تو اس میں وہ ایک ایسے شخص کو بھیجتا ہے جو اس کی کجی کو دور کر دے اور اس کو کتاب الٰہی کی تعلیم دے کر اس کو اس کا مستحق بنا دے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بنی اسرائیل میں بعثت ہوئی یا کسی قوم کے متعلق قضائے الٰہی کا فیصلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو مزید زندگی ملتی رہے اور اس کا دین وسلطنت برقرار رہے تو مجددین نبوت پیدا ہوتے ہیں، جیسے بنی اسرائیل کے مختلف زمانوں میں حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور پیغمبروں کے ایک گروہ کی بعثت ہوتی رہی۔

نبی کی یقینی کامیابی

ہر نبی کی بعثت کے دور میں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس کو اور اس کے دوستوں کو کامیابی دے، اور اس کے دشمنوں کو پے در پے ناکامی ہو (یہاں تک کہ حق استوار اور دعوت مکمل ہو جائے) قرآن میں ہے:

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِينَ ۝ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُورُونَ ۝ وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصافات: ۱۷۱_۱۷۳)

''اور (اے پیغمبر) ہماری بات بندوں کے متعلق پہلے ہی طے ہو چکی ہے کہ انھی کی مدد کی جائے گی اور ہمارا ہی لشکر غالب ہوگا۔''

ان دونوں بزرگوں (امام غزالی اور شاہ ولی اللہ صاحب) نے اپنے اپنے الفاظ میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے، انبیائے کرام علیہم السلام کے احوال مبارکہ اور سوانح مقدسہ پر جس کی نظر عمیق و وسیع ہوگی ان کو ان اصول کے تسلیم کرنے میں ذرہ بھر شک نہیں ہو سکتا اور ان پر استدلال، واقعات اور حوادث سے اسی طرح کیا جا سکتا ہے جس طرح نفسیاتِ اجتماع (سائیکالوجی آف پیپل) یا نفسیات راہنمائی (سائیکالوجی آف لیڈرشپ) پر واقعات کے تسلسل اور تواتر سے کرتے ہیں اسی طرح امام غزالی اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اوپر کے صفحات میں جو کچھ کہا ہے ہم مجازاً کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''نفسیات نبوت'' کے گویا ابواب ہیں۔

موجودہ زمانہ میں خیالات، طرز گفتار، اسلوب تحریر اور طریقۂ استدلال غرض ہر چیز میں فرق ہو گیا ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اہل زمانہ سے ان کی اصطلاح میں گفتگو کی جائے اور جو اصول قائم کیا جائے اس پر قرآن مجید سے بھی ساتھ ساتھ استدلال کیا جائے کہ عقل و نقل دونوں درباروں میں کہنے والے کی بات کا اعتبار ہو۔ غور کرنے سے یہ معلوم ہوگا کہ دنیا کا ذرہ ذرہ جس غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے وہ اپنے ذاتی ارادہ اور قصد کے بغیر خود بخود اس کو پورا کر رہا ہے اور اس کے خالق نے اس کے روز پیدائش سے اس کو جو حکم دے دیا ہے اس کی تعمیل سے وہ سرمو انحراف نہیں کرتا۔ آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آفتاب دنیا کو گرمی اور روشنی دینے پر مامور ہے اور وہ ہر آن اور ہر لمحہ اس میں مصروف ہے۔

زمین کو سرسبزی اور شادابی کا کام سپرد ہے اور وہ اس کو انجام دے رہی ہے۔ ابر کو سیرابی اور گوہر باری کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ درخت پھل دینے پر مقرر ہیں اور وہ اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ حیوانات جن کاموں پر مامور ہیں وہ بخوشی ان کو کر رہے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا انسان بھی اس دنیا میں کسی کام پر اسی طرح مقرر ہو کر آیا ہے یا نہیں؟ اگر آیا ہے تو کیا اس کو انجام دے رہا ہے؟ آؤ انسان کو غور سے دیکھیں بظاہر وہ بھی کھاتا پیتا، چلتا پھرتا، اٹھتا بیٹھتا زندگی گزارتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ کیا اس کی زندگی کا بس اسی قدر مقصد ہے؟ اگر یہی ہے تو پھر انسان اور حیوان میں کیا پہچان؟ اور ذی ارادہ اور غیر ذی ارادہ میں کیا امتیاز؟ اور صاحب عقل اور بے عقل میں کیا فرق؟ چنانچہ قرآن پاک اسی لیے انسانوں سے سوال کرتا ہے اور بجا سوال کرتا ہے؟

﴿ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۱۵)

''کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا۔''

﴿ أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۳۶)

''کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی کسی غرض و مقصد کے لیے پیدا ہوا ہے لیکن وہ غرض و مقصد کیا ہے؟

انسان کی پوری ہستی اگر کائنات کے صفحہ سے مٹ جائے تو بھی آفتاب اسی طرح چمکتا رہے گا، سمندر اسی طرح ابلتے رہیں گے، ہوائیں اسی طرح چلتی رہیں گی، پانی اسی طرح برستا رہے گا، سبزے اسی طرح اگتے رہیں گے اور درخت اسی طرح پھلتے رہیں گے لیکن اگر درخت نہ پھلیں تو انسان کی ہستی معرض خطر میں پڑ جائے، سبزیاں نہ اگیں تو انسان بھوکا مر جائے، پانی نہ برسے تو انسان پیاسا تڑپ جائے، اگر ہوا نہ چلے تو انسان گھٹ کر مر جائے، اگر زمین نہ ہو تو انسان کو کھڑے ہونے کی جگہ نہ ملے، اگر آفتاب نہ چمکے تو انسان کی ہستی کا چراغ فوراً بجھ جائے، سمندر نہ ہو تو نہ پانی برسے، نہ سبزیاں اگیں، نہ انسانی غذا میسر آئے، نہ پانی برس کر پھر زمین کو خشک ہونا نصیب ہو، الغرض دنیا کی کوئی اہم ہستی اپنے وجود کے لیے انسان کی محتاج نہیں لیکن انسان اپنے وجود کے لیے کارخانہ ہستی کے ایک ایک پرزہ کا حاجت مند ہے تو پھر کیا یہ نتیجہ صحیح نہیں کہ اس کارخانہ کے ہر پرزہ کی غرض و غایت انسان کا وجود اور اس کی بقا ہے لیکن خود انسان کے وجود کی غرض کوئی دوسری ہے جو دیگر موجودات کے وجود کی غرض سے زیادہ اہم ہے۔

قرآن پاک دوسرے موجودات و مخلوقات کی نسبت یہ کہتا ہے:

﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۹)

''اسی نے تمہارے لیے (اے انسانو!) وہ سب پیدا کیا جو زمین میں ہے۔''

پھر یہ بھی بتایا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ ﴾ (٢٢/ الحج:٦٥)

''(اے انسان)! کیا تو غور نہیں کرتا کہ زمین میں جو کچھ ہے ان سب کو تمہارے کام میں اس نے لگا رکھا ہے۔''

زمین کے بعد آسمان کی نسبت بھی اس نے اعلان کیا:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ ﴾

(١٦/ النحل:١٢)

''اور (اے انسانو!) اس نے رات اور دن کو سورج اور چاند کو تمہارے کام میں لگایا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔''

ہستیاں دو ہی ہیں، خالق کی اور اس کی مخلوقات کی مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے نظر آتا ہے کہ ان میں ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ چیز کے کام آ رہی ہے جمادات، نباتات کے، نباتات جمادات کے اور جمادات، نباتات اور حیوانات تینوں انسان کے کام آ رہے ہیں، آخر انسان کو بھی اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے کام آنا چاہیے، مخلوقات میں تو اب اس طرح کی کوئی اعلیٰ ہستی نہیں تو لامحالہ اس کی تخلیق خود خالق کے لیے ہوئی ہے۔ الغرض دنیا کی ساری چیزوں کی غرض و غایت بواسطہ یا بلاواسطہ انسانوں کی بقا، زندگی اور آسائش ہے لیکن خود انسان کی زندگی اس کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ ﴾ (٥١/ الذاریات ٥٦)

''اور میں نے جن اور انسانوں کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری اطاعت کریں۔''

عقل و فہم اور ارادہ و اختیار کے لحاظ سے مخلوقات کی تین قسمیں ہیں:

① ایک وہ جو ان صفات سے یکسر محروم ہیں، جیسے آفتاب، ماہتاب، زمین، مٹی، پتھر، پھل، پھول، درخت۔

② دوسری وہ جو صرف ابتدائی احساس اور علم و فہم رکھتی ہیں لیکن قیاس واستقرا و تمثیل اور حاضر پر غائب کو قیاس کرکے کسی نئے علم کا استخراج کرنا ان کی قدرت سے باہر ہے، ان کا ارادہ و اختیار بھی صرف ظاہری محسوس اشیاء تک محدود ہے، جیسے حیوانات۔

③ تیسری وہ مخلوق ہے جو عقل و ادراک رکھتی ہے، قیاس آرائی کرتی ہے، استقرا اور تمثیل کے ذریعہ سے استنباط کرتی ہے، جزئیات سے کلیات بناتی اور کلیات سے جزئیات پر حکم لگاتی ہے، بدیہات سے نظریات تک پہنچتی اور غائب کو حاضر پر قیاس کرتی ہے۔

پہلی قسم کی مخلوقات سے جو حرکات اور آثار پیدا ہوتے ہیں وہ اضطراری اور غیر ارادی ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تخلف نہیں ہوتا اسی لیے ان کو فطری آثار اور طبعی خصائص کہتے ہیں، جن کا صدور ان مخلوقات

سے ہمیشہ یکساں اور بلا ارادہ ہوتا رہتا ہے۔ دوسری قسم کی مخلوقات سے جو آثار اور حرکات پیدا ہوتے رہتے ہیں وہ گو ارادہ اور احساس اور ابتدائی فہم کے ماتحت صادر ہوتے ہیں لیکن ان کے ہر فرد سے صرف ایک ہی قسم کے افعال، حرکات اور آثار یکساں طور سے ظاہر ہوتے ہیں ان کے خلاف نہیں ہوسکتا اور نہ ایک دوسرے سے کم وبیش ہوسکتا ہے۔ ان کے افعال، حرکات اور آثار کو جبلت فطرت اور طبیعت کہتے ہیں ان کے صدور میں بھی وہ مخلوقات اپنی فطرت اور طبیعت کے تقاضے سے مجبور ہیں، جیسے حیوانات کے افعال اور ان کے مختلف انواع کے الگ الگ نوعی کام کہ وہ ازل سے قیامت تک یکساں ایک ہی طرح اور وہ بھی کسی غایت اور انجام و مآل کے پہلے سے سوچے بغیر ان سے صادر ہوتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے بعض افعال گو طبیعت و جبلت کے مطابق ہوتے ہیں جو دیگر مخلوقات کی طرح ویسے ہی بے ارادہ اور اضطرار سرزد ہوتے ہیں مگر اس کے اور دوسرے افعال و حرکات تمام تر اس کے ارادہ، اختیار اور فہم سے صادر ہوتے ہیں صرف یہی آخری قسم کے افعال وہ ہیں جن پر خیر وشر اور نیک و بد کا حکم جاری ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے تمام عاقلانہ کام عاقبت بینی، انجام اور مآل کار کو خیال کر کے اس کے ارادہ سے صادر ہوتے ہیں اور یہیں سے اس کی ذمہ داری کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

جن وانس کے علاوہ تمام دوسری مخلوقات، خیر وشر کی ذمہ داری سے بری ہیں۔ جمادات ونباتات تو اس لیے کہ ان کے افعال وحرکات تمام تر مجبورانہ، بے ارادہ اور فکر انجام کے بغیر صادر ہوتے ہیں یا یوں کہو کہ ان احکام کے بموجب ہمیشہ ہوتے ہیں جو خدا نے ان کو اول ہی دن دے دیے ہیں، حیوانات بھی اس لیے اس ذمہ داری سے بری ہیں کہ ان کے افعال وحرکات بھی تمام تر جبلی وطبعی ہیں اور وہ جبلت وطبیعت پر مجبورانہ بے ارادہ اور انجام کے خیال کے بغیر عامل ہیں یا یوں کہو کہ وہ اپنے خالق کے احکام پر ہمیشہ اضطرارا عمل پیرا ہیں اسی طرح فرشتے بھی اس تکلیف سے سبک دوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی خلقت اور جبلت سے اطاعت پر مجبور ہیں اور اسی لیے ان سے عصیاں نہیں سرزد ہوتا صرف ایک انسان ایسی مخلوق ہے جو بہت سی باتوں میں ارادہ، اختیار اور علم رکھتا ہے، نیکی، بدی اور خیر وشر ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کے اختیار پر قطعی مجبور نہیں ہے بلکہ وہ عقل وفہم سے سوچ سمجھ کر مآل کار اور انجام پر غور کر کے یا اپنے جذبات کے ماتحت کوئی کام کرتا ہے اس لیے وہی خیر وشر کے امتیاز اور حق و باطل کے فرق کے لیے پیغام الٰہی کا محتاج قرار پایا ہے۔ جمادات ونباتات اور دیگر مخلوقات سے احکام الٰہی کی مجبورانہ اطاعت یعنی جبلت یا فطرت یا خاصیت کو قرآن پاک یوں ادا کرتا ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٤٩، ٥٠)

”اور خدا ہی کے آگے سر جھکاتے ہیں جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، جانداروں

میں سے اور فرشتے، وہ سرکشی نہیں کرتے، اپنے پروردگار کا اوپر سے ڈر رکھتے ہیں اور کرتے ہیں جو حکم پاتے ہیں۔''

اسی فطری اطاعت الٰہی کا دوسرا نام فطری وحی بھی رکھ لو، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ۙ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۭ ﴾ (١٦/ النحل:٦٨، ٦٩)

''اور تیرے پروردگار نے شہد کی مکھیوں پر وحی بھیجی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور جہاں چھت ڈالتے ہیں، اپنے لیے گھر بنالے، پھر ہر پھل میں سے کھا، پھر اپنے پروردگار کی راہوں پر (مقررہ احکام پر) چل، مطیع ہو کر۔''

دیکھو اس آیت پاک میں طبعی الہام کی مجبورانہ پیروی کو اطاعت الٰہی کہا گیا ہے اور دوسری جگہ ان کی اپنے خالق اور پیدا کرنے والے کے حکم کی اسی طبعی اطاعت اور فطری تعمیل کو ان کی زبان حال کی نماز اور تسبیح فرمایا گیا ہے:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ۭ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴾ (٢٤/ النور:٤١)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اڑتے جانور پر کھولے، اس کی یاد کرتے ہیں، ہر ایک نے جان رکھی ہے اپنی طرح کی نماز اور اس کی پاکی کی یاد اور خدا کو معلوم ہے جو وہ کرتے ہیں۔''

لیکن انسان کو دوسرے موجودات ومخلوقات کی طرح مجبور محض پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے وہ احساس اور ارادہ جو جمادات میں معدوم، نباتات میں محل بحث اور حیوانات میں متحرک ہے وہ انسان میں پوری طرح بیدار اور کارفرما ہے اسی طرح وہ ارادی قوت واختیار جو جمادات میں معدوم، نباتات میں مفقود اور حیوانات میں محدود ہے وہ انسان میں ایک حد تک وسیع ہے علاوہ ازیں ہر کام میں عاقبت بینی اور مآل اندیشی صرف انسان کا خاصہ ہے اسی لیے تمام مخلوقات میں وہی ارادی ''تکلیف'' کا مستحق قرار پایا اور غیر ذی ارادہ مخلوقات کی طرح بالاضطرار اور مجبورانہ اطاعت الٰہی کے لیے نہیں بلکہ بارادہ اطاعت کے لیے اس کی تخلیق ہوئی، فرمایا:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٧٢)

''ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے انکار کیا اور

اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔''

یہ امانت، اس کی نیکی و بدی کی تمیز اور خیر و شر کا فرق ہے جس کے نتیجہ کے طور پر شریعت الٰہی کا نزول ہوا ہے انسان کو اپنی اس امانت سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بالارادہ اور بااختیار افعال میں بھی بے ارادہ اور بے اختیارانہ افعال کی طرح احکام الٰہی کی اطاعت کرنا ضروری ہے یعنی جس طرح بے اختیارانہ افعال میں فطرت و جبلت کی مجبورانہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل کی جاتی ہے اسی طرح بالارادہ اور اختیاری افعال میں بھی شریعت کی بالا رادہ اطاعت کر کے حکم الٰہی کی تعمیل ضروری ہے۔ اس مطلب کو دوسرے لفظوں میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ غیر ارادی افعال و حرکات میں جس طرح ہم اپنے فطری الہام و وحی کی مجبورانہ پیروی کرتے ہیں اسی طرح ارادی افعال میں بھی شرعی الہام و وحی کی بالا رادہ پیروی کریں۔ لیکن کسی کی اطاعت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے احکام و امر سے ہم کو واقفیت نہ ہو انبیا اور رسول وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اپنے ان احکام اور اوامر کی شریعت کو وحی کرتا ہے اور وہ ان ذی ارادہ بندوں کو اس سے آگاہ و باخبر کرتے اور اس کی اطاعت کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ نکتہ کہ انسان کے علاوہ تمام دیگر بے ارادہ مخلوقات خدا کی اطاعت پر طبعاً مجبور اور مجبول ہیں اور کسی قدر بااختیار انسان کے افراد اپنے اسی تھوڑے سے اختیار اور ارادہ کے بل پر اپنے خالق سے سرکشی کرنے پر آمادہ ہیں خود قرآن پاک کے الفاظ میں موجود ہے، فرمایا:

﴿ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ ﴾

(۲۲/ الحج:۱۸)

''کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی کے آگے سر جھکاتا ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان اور بہت سے (انسان) ہیں جن پر عذاب ٹھہر چکا ہے۔''

دیکھو کہ انسان کے علاوہ تمام دوسری بے ارادہ اور بے عقل مخلوقات کی کلی اطاعت اور سرافگندگی کا اعلان ہے لیکن خاص بالارادہ اور باعقل اور انجام میں انسانوں کی دو قسمیں کر دی گئیں ہیں مطیع اور سرکش!

کائنات کے صحیفہ کا تدریجی مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان میں، سے جس صنف مخلوقات میں احساس ارادہ اور اختیار کی جتنی کمی ہے اسی قدر فطرت اس کی دایہ گیری کی خدمات انجام دیتی ہے اور جس حد تک احساس اور اختیار کا دائرہ اصناف ہستی میں بڑھتا جاتا ہے اسی قدر معلم فطرت اپنے فرائض سے کنارہ کش ہوتا جاتا ہے اور وہ صنف کائنات اپنی ذمہ داری آپ قبول کرتی جاتی ہے۔ جمادات اپنی نشو و نما کے لیے بیرونی غذا کے محتاج نہیں، نباتات جن میں ان اوصاف کی ہستی صرف اپنی

آنکھیں کھولتی ہے ان کی غذا خود ان کے پاؤں کے نیچے ہوتی ہے اور وہ خود اڑ کر اور چل کر ان تک پہنچ جاتی ہے۔ حیوانات جن میں یہ اوصاف جاگ کر کروٹیں بدلتے ہیں ان کی غذا بے جوتے، بے بوئے، بے چنے نکھارے، بن پکے پکائے ہر قدم پر ہر وقت تیار ملتی ہے لیکن انسان جس میں یہ تینوں اوصاف بیٹھ کر حکمران اور کارفرما ہوتے ہیں اس کے منہ تک غذا کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کی جدوجہد، محنت اور جانفشانی کے پسینہ کا گرم قطرہ پیشانی سے چل کر اس کے پاؤں تک نہیں پہنچتا۔ جہاں احساس، ارادہ اور اختیار جیسے جیسے کم ہے اسی قدر طبیعت، فطرت اور جبلت کی اضطراری حکومت زیادہ قائم ہے لیکن جیسے جیسے ان تینوں اوصاف کی ترقی و تکمیل ہوتی جاتی ہے طبیعت، فطرت اور جبلت کی حکومت کا دائرہ تنگ ہو کر احساس، ارادہ اور اختیار کی شہنشاہی قائم ہوتی جاتی ہے اور حرکات و اعمال کی باگ فطرت و جبلت کے مضبوط اور ناممکن التغیر ہاتھوں سے نکل کر اختیار و ارادہ کے کمزور اور ہر آن بدل جانے والے ہاتھوں میں آ جاتی ہے، جمادات ہمیشہ وہی کریں گے جو ان کو کرنا چاہیے، نباتات عموماً وہی بنیں گے جو ان کو بننا چاہیے۔ حیوانات وہی کام انجام دیں گے جو ان کے سپرد کر دیا گیا ہے لیکن انسان کسی قدر اختیار اور ارادہ پا کر اکثر اپنی راہ سے ہٹ جاتا ہے اور حدود اعتدال سے قدم باہر نکال دیتا ہے اور اپنے اس اختیار و ارادہ کی ذمہ داری کی امانت کو بھول جاتا ہے، انبیا اور رسول وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ذی ارادہ اور بااختیار مخلوق کو اس کی ذمہ داری کے فرائض سمجھانے کے لیے آتے ہیں۔

اس اختیار اور ارادہ کے مرکز کا نام مذاہب کی زبان میں "دل" ہے جو انسان کے سر سے لے کر پاؤں تک کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ کی ایک ایک ارادی جنبش و حرکت پر حکمران ہے اور اسی کے حکم سے اس جسم کے اندرونی عالم میں سب کچھ ہوتا اور سرانجام پاتا ہے انبیا علیہم السلام اسی دل کے نظام کو درست کرنے کے لیے آتے ہیں۔

انسان کو اپنے وجود، بقا، ترقی اور تکمیل کی ہر منزل میں قدم قدم پر ہزاروں چیزوں کی احتیاج ہوتی ہے ان چیزوں کے مہیا اور تیار کرنے کے لیے ہر انسان میں استعداد و قوت الگ الگ ہوتی ہے اور یہ استعداد و قوت فیاض قدرت کی طرف سے پیدائش بلکہ پیدائش سے پہلے ہی آب و گل کے عالم میں اس میں ودیعت رکھی جاتی ہے یہی سبب ہے کہ ہر انسان میں جس قسم کا میلان ہوتا ہے اسی کی استعداد اس میں پائی جاتی ہے اور پھر بعد کو خاص خاص فنی الہامات کے ذریعہ سے جن کو تم ایجادات اور اختراعات کہتے ہو ہر پیشہ ور اپنے متعلقہ کام کو بڑھاتا ہے اور ترقی دیتا ہے اور تمہاری ضرورت کے مطابق تمہارے لیے سامان فراہم کرتا ہے۔

ان مادی ضروریات کے بنانے والوں کے حسب استعداد اور حسب حیثیت مختلف درجے اور مرتبے ہیں، بعض ان میں سے محض مقلد ہوتے ہیں جو وہی بنا سکتے ہیں جو بنانا سیکھا ہے، بعض چابکدست اور ذہین ہوتے ہیں جو اچھے کاری گروں کے صرف نمونوں کو دیکھ کر اچھی چیزیں تیار کر سکتے ہیں، بعض ایسے ذہین اور

فطین ہوتے ہیں کہ وہ نئی نئی چیزیں بناتے، دریافت کرتے اور ایجاد کرتے ہیں اور بعد کے آنے والے مدت تک انہیں کی تقلید کرتے رہتے ہیں، کاشتکاری کے اصول، ازالہ مرض کی تدبیریں، کھانے پکانے کے طریقے، سواری کی ضروریات، رہنے سہنے کے سامان، پہننے کے کپڑے، لڑنے کے آلات، ان میں سے ہر شے کی ضرورت ہے اور ان میں ہر ضرورت کے لیے خالق فطرت نے ایک ایک گروہ پیدا کر دیا ہے وہ اپنے اپنے کام کو انجام دیتے رہتے ہیں، ان ضرورتوں کے فراہم ہو جانے سے انسان کی مادی زندگی کی تکمیل ہو جاتی ہے، اب اس کے بعد اس کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی ضروریات کا جن کو تم اصول تمدن، طریقہ معاشرت، آئین عدل وانصاف، اخلاق حسنہ اور دین وتقویٰ کے نام سے موسوم کرتے ہو، دور شروع ہوتا ہے اگر یہ اصول اور تعلیمات انسانوں کے سامنے نہ ہوں تو آدم کے بیٹوں کی یہ جنت دوزخ ہو جائے اور اشرف المخلوقات کی یہ جماعت جانوروں کا گلہ اور درندوں کا جھنڈ بن جائے۔

جو تمہارے لیے غلہ پیدا کرتا ہے وہ کاشتکار ہے اور جو اوزار بناتا ہے وہ لوہار ہے، جو زیور گھڑتا ہے وہ سونار ہے، جو تمہارے کپڑے بناتا ہے وہ جولاہا ہے، جو تمہارے مکان بناتا ہے وہ معمار ہے، جو تمہاری حفاظت کرتا ہے وہ سپاہی ہے، جو تمہاری نگہبانی کرتا ہے وہ حاکم ہے، جو تمہارے آپس کے جھگڑے چکاتا ہے وہ قاضی ہے، جو تمہارے ملک کے اندر امن وامان کا ضامن ہے وہ بادشاہ ہے، جو تمہاری جسمانی بیماریوں کا معالج ہے وہ طبیب ہے، جو اپنی صناعیوں سے تمہاری ضرورتوں کے لیے کاریگری کی چیزیں بناتا ہے وہ صناع ہے اور جو تمہارے لیے مادی کائنات کے چہرہ سے اسرار کا پردہ ہٹا کر تم کو ہر چیز سے باخبر کرتا ہے وہ حکیم ہے۔

اسی طرح جو برگزیدہ افراد تمہارے روحانی واخلاقی واجتماعی حالات کے معلم ونگران ہیں ان کی بھی ایک جماعت ہے لیکن جس طرح تمہاری مادی ضروریات کے بنانے والوں کے لیے حسب استعداد اور حسب حیثیت درجے ہیں اسی طرح ان روحانی ضروریات کے فراہم کرنے والوں میں بھی مرتبے اور درجے ہیں بعض وہ ہیں جو صرف اگلے روحانی معلمین کی نقل وتقلید کرتے ہیں یہ عام علما ہیں، بعض وہ ہیں جو اچھے روحانی نمونوں کو دیکھ کر خود بھی ان کی عمدہ نقل اتارتے ہیں اور دوسروں کو بھی بتاتے ہیں یہ مجددین ہیں، بعض ایسے ہیں جو الہام ربانی سے فیض پا کر روحانیت کے نئے نئے اصول وضع کرتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ انبیا ہیں، ان کے مقدس ہاتھ تمہارے لیے غلہ پیدا کرنے، مکان بنانے، کپڑا بنانے، اوزار بنانے اور صناعی کرنے کے لیے نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند تر اور بہتر کام کے لیے ہیں ان کی مبارک انگلیاں تمہارے ان تاروں پر پڑتی ہیں جن سے صدہا قسم کے نغمے نکل رہے ہیں یعنی تمہارے دل کی رگوں پر۔ غور کرو کہ یہ اصل مرکز جس پر تمہارے اعمال وافعال اور ہر قسم کی حرکات وسکنات اور ہر طرح کی جدوجہد کا مدار ہے یعنی ''دل''۔ کیا انبیا علیہم السلام اور اس کے متبعین کے سوا نوع انسانی کا کوئی طبقہ اس کی نشوونما، حفاظت، ترقی تکمیل اور اصلاح

کے لیے بھی کام کر رہا ہے اور کیا خالق فطرت کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مادی ترقی واصلاح کی طرح تمہاری روحانی ترقی واصلاح کی بھی فکر کرتا ہے اور ایسا سمجھنا کہ اس نے اس کی ترقی وتکمیل واصلاح کی خدمت نوع انسانی کے کسی کارکن طبقہ سے متعلق نہیں کی ہے کیا اس کی شان ربوبیت کے ساتھ سوئے ظن نہیں ہے۔

یہی وہ طبقہ ہے جو تمام متفرق اور مختلف انسانی طبقوں کو باہم جوڑ کر ایک عام انسانی تمدنی سطح پر لایا ہے وہ ان سب کو جو تمہارے لیے روٹی تیار کرتے ہیں، کپڑے بنتے ہیں، جھونپڑے بناتے ہیں اور سامان اور اوزار درست کرتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ مشارکت اور معاونت اور نیکی پر آمادہ کر کے ان میں روحانی برادری پیدا کرتے ہیں اور مٹی سے پیدا ہونے والے ایک آدم کے بیٹوں کو جن کو دولت وغربت، سوسائٹی اور مجلس اور حکومت اور اقلیم اور جغرافی وقومی تقسیم نے پارہ پارہ کر رکھا ہے باہم جوڑ دیتے ہیں اور ان تمام مصنوعی امتیازات کو مٹا کر پوری زمین کو ایک ملک، تمام اقوام عالم کو اولاد آدم، اور کل بلند وپست طبقوں کو ایک انسانی طبقہ قرار دیتے ہیں اور ان کے اخلاقی وروحانی عالم میں اصلاح وترقی اور امن وامان پیدا کر دیتے ہیں ان کے دلوں سے بغض وکینہ کو نکال کر اخوت ومحبت کا نور بھرتے ہیں، ان کے احساس، ارادہ اور اختیار کی باگ پر ان کے دل کو قابو حاصل کرنے کی تدبیر بتاتے ہیں اور ان کو اعتدال کی حد بتا کر صحیح وغلط کی تمیز عطا کرتے ہیں۔

یہی وہ طبقہ ہے جس کو ہم نبی رسول اور پیغمبر کہتے ہیں ان کو گو براہ راست جسم وجسمانیات سے تعلق نہیں ہوتا بلکہ صرف دل اور قلب وروح کے عالم سے سروکار ہوتا ہے تاہم اس دل اور قلب وروح کی اصلاح کے لیے جسم وجسمانیات کی کسی قدر اصلاح بھی اس حد تک ان کے فرائض میں داخل ہے جہاں تک ان کو دل اور قلب وروح کے کاموں کی اصلاح کے لیے اس کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اس مقام پر ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ افراد انسانی کے درمیان، امن وامان اور اطمینان پیدا کرنے کا کام تو بادشاہ بھی کرتے ہیں، اخلاق کا ایک معلم بھی ہے، ایک فلسفی اور اجتماعیات کا ایک حکیم بھی کرتا ہے مگر ان کے کاموں کے درمیان جو عظیم الشان فرق ہے اس کو سمجھ لینا ہی اس شبہ کا ازالہ ہے۔ علمی اصطلاح میں یوں سمجھو کہ مختلف فنون کے ماہر ایک ہی چیز پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں اور اسی اختلاف نظر سے ان کا فن بھی علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے کسی جسم کے اجزائے ترکیبی سے اگر بحث کی جائے تو کیمسٹری ہے، اگر اس کی زندگی اور اسباب زندگی پر غور کیا جائے تو بیالوجی (علم الحیات) ہے، اگر اس کے دماغی قوی اور ان کے آثار کی تحقیق کی جائے تو سائیکالوجی (علم النفس) ہے اور اگر اس کے جذبات اور جذبات کے مطابق اس کے شخصی افعال و اعمال کے حدود اور ان کے اسباب وعلل اور غرض وغایت پر نظر ڈالی جائے تو یہ اتھکس (فلسفۂ اخلاق) ہے، اگر اس کے جماعتی خصائص اور لوازم کی تفتیش کی جائے تو یہ سوشیالوجی (علم اجتماع ومعاشرت) ہے، اگر جسم کی

صحت ومرض کے اسباب کی جستجو کی جائے تو یہ طب ہے۔ دیکھو کہ ایک ہی جسم یا متعلق جسم پر کتنی حیثیتوں سے بحثیں کی گئی ہیں اوران سے کتنے مختلف علوم پیدا ہو گئے ہیں تاہم وہ سب کے سب جسم اور جسمانیات ہی سے متعلق اور وابستہ ہیں اور باایں ہمہ ان میں سے ہر ایک علم وفن علیحدہ اور ہر ایک علم وفن کے جاننے والے علیحدہ ہیں۔ اسی طرح ایک نبی اور ایک رسول کا کام بھی بادشاہوں، فلاسفروں اور حکیموں کی طرح انسانوں ہی کی اصلاح ہے مگران میں سے کسی ایک کا کام بھی دوسرے سے ملتا جلتا نہیں ہے، بادشاہ صرف اس کا ذمہ دار ہے کہ وہ اپنے زور وقوت سے بازاروں، گلیوں، آبادیوں اور میدانوں میں امن وامان اور انصاف کو قائم رکھے، فلاسفر انسانوں کے تمام اعمال وخیالات کے اسباب وعلل کی تفتیش اور ان میں نظم وتسلسل اور علت ومعلول کا ربط پیدا کرنے کا کفیل ہے، فلسفۂ اخلاق کے معلم تمہارے اخلاق وعادات کے اسباب وعلل تم کو بتاتے اور ناقابل فہم جذبات کی تشریح کرتے ہیں، اس سے آگے ان کا کوئی کام نہیں، حکیم اور واعظ تمہارے اعمال واخلاق کی اصلاح کے لیے نہایت شیریں خوشگوار اور ڈھلے ہوئے فقرے سناتے ہیں مگران میں سے کوئی نہیں جو تمہارے دلوں کا راہنما ہو جو تمہارے احساس، ارادہ اور اختیار کے قدم کو غلط روی سے روک سکے وہ نہ صرف تمہارے اخلاق وعادات اور جذبات کے اسباب وعلل بتائے بلکہ تمہارے اخلاق وعادات اور جذبات میں خیر وشر کی تمیز کرے اور خیر کے حصول اور شر سے حفاظت کی تدبیر بتائے بلکہ اس کے ہاتھ اور زبان میں یہ قوت ہو کہ اپنی تعلیم وتلقین وفیض صحبت سے تمہارے اخلاق وعادات وجذبات بلکہ احساس، ارادہ اور اختیار کی غرض وغایت بلکہ پورے دل کی قوتوں میں انقلاب پیدا کردے اور شر کے تخم کو دلوں کی سرزمین سے نکال کر خیر کا برگ وبار پیدا کردے البتہ نبی یہ تمام کام سرانجام دیتا ہے وہ انسانوں کو اس کے احساس، ارادہ اور اختیار کی بھولی ہوئی ذمہ داری یاد دلاتا ہے اور ان قوی کے مرکز یعنی دل کو خدا کے حکم سے درست کردیتا ہے۔

وہ بادشاہوں کی طرح صرف بازاروں، مجمعوں اور آبادیوں کا امن واطمینان نہیں چاہتا بلکہ وہ لوگوں کے دلوں کے اندر کا امن واطمینان چاہتا ہے، وہ معلمین اخلاق کی طرح اسباب وعلل کی تلاش وجستجو کی تشریح کی پروا نہیں کرتا بلکہ اخلاق سیئہ خواہ کسی سبب سے ہوں، وہ ان کی بیخ کنی کرتا ہے اور اخلاق حسنہ خواہ کسی علت کے معلول ہوں، وہ ان کو انسانوں کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ انسانی اوہام کے طلسم کو توڑ دیتا ہے اور غلط رسوم ورواج کی بندشوں کو کھولتا ہے اور انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے آزاد کرکے صرف خدا کی غلامی میں دیتا ہے:

﴿ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۷)

”وہ ان کو بھلائی کا حکم دیتا ہے اور برائی سے روکتا ہے اور اچھائیوں کو ان کے لیے حلال اور

خبیث چیزوں کوحرام ٹھہراتا ہے اور ان کے اس بندھن اور زنجیروں کو جو ان پر ہوتی ہیں ان سے اتارتا ہے۔''

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٥)

''ایسے رسول بھیجے جو نیکوں کو خوشخبری دیتے اور بدکاروں کو ہوشیار کرتے ہیں، تاکہ رسولوں کو اس وعظ وتذکیر کے بعد پھر انسانوں کو خدا پر الزام دینے کا موقع نہ ملے۔'' (کہ ہم بھولے تھے تو خدا نے ہم کو کیوں نہ یاد دلایا)

﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ ﴾

(٥٧/ الحدید:٢٥)

''ہم نے رسولوں کو کھلی ہدایتیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اتاری اور (عدل کی) ترازو، تاکہ لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں اور دنیا میں امن واطمینان کی زندگی بسر کریں۔''

نوع انسانی کے دوسرے تمام خدام اور کارکن اپنے فرائض کو جن اغراض سے انجام دیتے ہیں ان کا دائرہ موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی سے آگے نہیں بڑھتا مگر انبیا اور رسول نوع انسانی کی خدمت کے یہ کام بھی اس کی موجودہ زندگی کی بھلائی اور برائی کو اس لحاظ سے سامنے رکھ کر کرتے ہیں کہ ان کا اثر اس کی دوسری دائمی و پائیدار زندگی پر کیا پڑے گا، وہ جسم کی خدمت، جسم کے لیے نہیں بلکہ روح کے لیے کرتے ہیں اور مخلوق کی خدمت خالق کے منشا کے مطابق بجالاتے ہیں وہ صرف ایک مخلوق کو دوسری مخلوق ہی سے نہیں بلکہ مخلوق کو خالق سے اور خالق ہی کے لیے ایک مخلوق کو دوسری مخلوق سے جوڑتے ہیں۔ وہ صرف اچھی اچھی اور میٹھی میٹھی باتیں لوگوں کو نہیں سناتے بلکہ خود بہتر سے بہتر عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا عامل بناتے ہیں وہ خیال آراء شاعروں اور جھوٹے حکیموں کی طرح نہیں ہوتے جو کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ دماغ ہوتے ہیں مگر دل نہیں ہوتے، زبانیں ہوتی ہیں مگر ہاتھ نہیں ہوتے:

﴿ وَالشُّعَرَاۗءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢٢٤-٢٢٦)

''اور شاعروں کے پیروکار گم کردہ راہ ہوتے ہیں تم دیکھتے نہیں کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں۔''

وہ اس دعویٰ کے ساتھ انسانوں میں آتے ہیں کہ ان کے خالق نے جس نے ان کے ذرہ ذرہ کا سامان راحت فراہم کیا ہے وہی ان کے قلب وروح کا سامان راحت بھی بہم پہنچاتا ہے ان کو اس لیے بھیجا ہے کہ

انسانوں کے قلب وروح کو اس سامان کا برتنا سکھائیں اور ان کے رب کا پیغام ان کو سنائیں اور بتائیں کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندے اپنے احساس، اپنے ارادہ اور اپنے اختیار کو کس طرح اس عالم میں صرف کریں کہ وہ پریشانی وبے اطمینانی کی تاریکی سے نکل کر سکون واطمینان اور امن وسعادت کی روشنی میں داخل ہوں:

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (۵۷/ الحدید:۹)

''وہی خدا جو اپنے (رسول) بندے پر کھلی آیتیں اتارتا ہے کہ تم کو (اے انسانو!) وہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائے (اور اللہ نے ایسا اس لیے کیا) کہ وہ تم پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔''

انبیا بھی ایک بادشاہ کی طرح جماعتوں کا انتظام کرتے ہیں مگر ملک کے خراج اور زمین کی آبادی کے لیے نہیں بلکہ خدا کے لیے، وہ بھی جان ومال کی حفاظت کے لیے مقنن کی طرح قانون بناتے ہیں اور قاضی کی طرح سزا وجزا کا حکم سناتے ہیں مگر انعام شاہی اور تنخواہ ماہانہ پا کر کسی دنیاوی بادشاہ کے فرمان کی تعمیل کے لیے نہیں، بلکہ جسم وجان کے شہنشاہ اور کائنات کے مالک کے فرمان کی تعمیل میں۔ وہ بھی فلاسفر کی طرح رموز واسرار کا پردہ فاش کرتے ہیں مگر تجربہ استقرا اور قیاس سے نہیں بلکہ عالم الاسرار کے مبدئے علم سے فیض پا کر۔ وہ بھی حکیم وواعظ کی طرح پرتاثیر کلام کرتے ہیں مگر ان کے مانند اپنے دل سے جوڑ کر نہیں بلکہ خدا سے سن کر اور وہ صرف کہتے نہیں بلکہ جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں اور جو کرتے ہیں وہ دوسروں سے کراتے ہیں وہ خدا سے ہیں خدا سے پاتے ہیں اور اسی سے سنتے ہیں اور وہی اوروں کو سناتے ہیں غرض اوپر آسمان سے ان کو جو کچھ ملتا ہے وہی نیچے زمین پر سب کو بانٹتے ہیں:

﴿ وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۝ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝﴾ (۵۳/ النجم:۱۔۷۔۱۰۔۱۲۔۱۷۔۱۸)

''قسم ہے اس ستارہ کی جب وہ نیچے گرے، کہ تمہارا ساتھی (پیغمبر) نہ بھولا نہ بھٹکا اور نہ وہ نفس کی خواہش ہی سے بات کرتا ہے وہ تو وہ ہے جو اس کو وحی کے ذریعہ کہا جاتا ہے اس کو بڑی بڑی قوتوں والے ہی نے سکھایا، طاقت والا، تو وہ سیدھا ہوا درآنحالیکہ وہ آسمان کے سب سے اونچے کناروں میں تھا۔ تو اس نے اپنے بندہ پر وحی کی، جو وحی کی نہ اس کے دل نے جو اس نے دیکھا، اس کو جھوٹ کہا، کیا وہ جو دیکھتا ہے تم اس پر اس سے جھگڑتے ہو، نہ بینائی نے کجی کی اور

نہ سرکشی کی، اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں میں سے دیکھا۔''

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۰۳)

''کہہ دے (اے پیغمبر) کہ میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، یہ (اے انسانو)! تمہارے رب کی طرف سے بصیرتیں ہیں اور ان کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور رحمت ہیں۔''

﴿ وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰي قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعراء:۱۹۲، ۱۹۵)

''یہ تو عالم کی پرورش کرنے والے کی طرف سے اتارا گیا ہے، اس کو امانت والی روح نے تیرے دل پر اتارا، تاکہ فصیح عربی زبان میں تو ہشیار کرنے والوں میں سے ایک ہو۔''

نکتہ: یہ بالکل ممکن، بلکہ واقعہ ہے کہ ایک ہی قسم کا کام مختلف لوگ مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں کسی قوم کی اصلاح ہی کا کام ہے کہ اس کو مختلف لوگ مختلف غرض ونیت سے کرتے ہیں، خودغرضی کے غیر مخلصانہ اغراض سے قطع نظر کرکے صرف مخلصانہ اغراض کو لو، کوئی یہ سمجھتا ہے کہ قوم کی مالی حالت کی درستی سے قوم بن سکتی ہے، کوئی اصلاح کی جڑ تعلیم کو قرار دیتا ہے، کوئی رسم ورواج اور معاشرت پر زور دیتا ہے، کوئی ظاہری تمدن پر مدار رکھتا ہے، کوئی جسمانی قوت پر بھروسہ رکھتا ہے، کوئی سیاسی کامیابی کو قومی اصلاح کا مرکز ٹھہراتا ہے، لیکن انبیا کے نزدیک یہ سب ثانوی درجہ کی باتیں ہیں، وہ اپنی بنیاد صرف قلب کی اصلاح پر رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی اصلی چیز ہے اور تمام دوسری ترقیوں اور اصلاحوں کو وہ یکسر اسی ایک اصل کی فروع اور اسی ایک جڑ کی شاخیں جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی دعوت کی کامیابی سے قوموں کو سلطنت بھی ملتی ہے، دولت بھی ہاتھ آتی ہے، علم بھی حاصل ہوتا ہے، زور اور قوت بھی پیدا ہوتی ہے اور دنیاوی عظمت وجلال کا ہر منظر خادمانہ اس کے استقبال کے لیے آگے بڑھتا ہے، مگر یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی مصلحین کی طرح قوت وطاقت ان کا مطمح نظر نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ان کے سامنے ہوتا ہے وہ صرف خدا کی اطاعت، خدا کی محبت اور خدا کی خوشنودی ہوتی ہے باقی تمام چیزیں ان کی نگاہ میں فرعی، ثانوی اور ضمنی ہوتی ہیں۔

نبی اور غیر نبی کے امتیازات

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ انبیا ﷺ اور ان کے مشابہ اشخاص میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔ یہ فرق چار حیثیتوں سے نمایاں ہے مبدأ اور منبع کا فرق، غرض وغایت کا فرق، طریق دعوت کا فرق اور علم وعمل کا فرق۔ نبی کے علم کا مبدأ منبع، ماخذ اور سرچشمہ جو کچھ کہو وہ تعلیم ربانی، شرح صدر اور وحی والہام ہوتا ہے اور حکیم کے علم کا

ماخذ ومنبع تعلیم انسانی، گزشتہ تجربہ استقرا اور قیاس سے ہوتا ہے یعنی حکیم عقل سے جانتا ہے اور نبی خالق عقل سے، اسی طرح ایک حکیم کے تمام اقوال اور جدوجہد کا منشا اپنی شہرت طلبی، علم کا اظہار، قوم یا ملک کی محبت کی خاطر اس کی اصلاح ہوتا ہے مگر ایک نبی کا مقصد خدا کے حکم کا اعلان اور خالق کی رضامندی کے لیے مخلوق کی بھلائی ہوتا ہے، طریق دعوت کا فرق یہ ہوتا ہے کہ حکیم اپنی دعوت کی عمارت تمام تر حکمتوں، مصلحتوں اور علل و اسباب کے ستونوں پر کھڑی کرتا ہے لیکن نبی اپنی دعوت کو زیادہ تر خالق کی اطاعت، محبت اور رضا جوئی پر قائم کرتا ہے، حکیم کہتا ہے لیکن اس کا کرنا اس کے لیے ضروری نہیں۔ نبی جو کہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس کا کر کے دکھانا اس کے لیے ضروری ہے۔ وہ صرف جلوت کے منبر پر آراستہ نہیں ہوتا بلکہ وہ جلوت وخلوت اور ظاہر و باطن میں یکساں حسنات سے آراستہ اور برائیوں سے پاک ہوتا ہے۔ دنیا میں سقراط، افلاطون، ارسطو، دیو جانیس وغیرہ ایک طرف اور ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور محمد ﷺ دوسری طرف ہیں اور دونوں کے سوانح اور سیرتیں اور کارنامے بالکل نمایاں اور ایک دوسرے سے اس طرح ممتاز ہیں کہ ان میں ذرا التباس نہیں۔

بادشاہ اپنی تلوار کے زور اور اپنی فوج ولشکر کی قوت سے رعایا کو اپنے قانون کا پابند بناتے ہیں، تاکہ فتنہ و فساد رک جائے۔ فلاسفر اپنے دعوؤں کو صرف استدلال کی قوت اور عقل کے خطاب سے ثابت کرنا چاہتے ہیں، تاکہ لوگ ان کی بات تسلیم کریں، لیکن پیغمبر اپنے پیروؤں کے قلب کو اس طرح بدل دینا چاہتے ہیں کہ وہ از خود برائی کو چھوڑ کر نیکی اختیار کر لیں وہ اگر کبھی قانون وحدو سزا کو اختیار کرتے ہیں یا ساتھ ساتھ عقل کو بھی مخاطب کرتے ہیں تو ان کا یہ ضمنی یا ثانوی کام ہوتا ہے اولین نہیں۔ ان کی اولین غرض یہ ہوتی ہے کہ ان کے پیروؤں کو خدا کی قدرت اور اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اتنا محکم اور پختہ یقین ہو جائے کہ وہ اس کے حکموں اور نصیحتوں کو جو ان کے ذریعہ آتی ہیں بے چون وچرا تسلیم کر لیں۔ دنیا کے بادشاہ اور فاتح اور کشور کشا اپنے زور بازو اور تلوار کی قوت سے دنیا کے تختے الٹ دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی کبھی چار دانگ عالم پر حکمرانی کی، قوموں کی جان و مال پر اپنا قبضہ اقتدار جمایا ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں اور مجمعوں کے مجرموں کو روپوش کر دیا اور بازاروں اور راستوں میں امن وامان پیدا کر دیا لیکن کیا انہوں نے دلوں کے طبقے بھی الٹے؟ اپنی سلطنت کے دائرہ سے باہر کسی کمزور سے کمزور انسان سے اپنے حکم کو منوا سکے؟ لوگوں کے دلوں کو بھی اپنے قبضۂ اقتدار میں لا سکے؟ وہ آبادیوں اور مجمعوں کے روپوش مجرموں کو بھی فنا کر سکے؟ وہ دلوں کی بستیوں میں بھی امن وامان پیدا کر سکے؟ وہ روحوں کی مملکتوں کا بھی نظم ونسق قائم کر سکے؟

حکما اور فلاسفر جو اپنی عقل رسا کے ذریعہ سے عجائبات عالم کی طلسم کشائی اور کائنات کے مخفی اسرار کے فاش کرنے کے مدعی ہیں کیا وہ قلب وروح کے عجائبات کو دریافت کر سکے؟ وہ ماورائے مادہ اسرار و رموز کو بھی حل کر سکے؟ وہ انسانوں کی اصلاح وہدایت کا بھی کوئی سامان اپنی تحقیق وتفتیش سے فراہم کر سکے؟ ان کی دقیق

نکتہ سنجیوں اور خیال آرائیوں کے پیچھے ان کے ذاتی حسن عمل کا بھی کوئی نمونہ ہے؟ ارسطو نے فلسفہ اخلاق کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے حکما نے اخلاق کے اسباب وعلل کے حدود، ظہور، اثر اور نتیجہ کے ایک ایک حرف کی تحقیق کی مگر کیا اس سے کسی انسان کے دل سے برائی کا تخم دور ہوا، اچھائی کے بیج نے نشو ونما پائی، ان کے اخلاق وتعلیمات کے فلسفیانہ رموز واسرار کا دائرہ ان کی درسگاہوں کی چہار دیواریوں سے کبھی آگے بڑھ سکا؟ کیونکہ وہ اپنے درس کے کمروں سے نکل کر جب انسانی صحبتوں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی اخلاقی زندگی اور قلبی صفائی عام انسانی افراد سے ایک انچ بھی بلند نہیں ہوتی، حکمائے یونان میں سقراط سے بڑھ کر کوئی نہیں، مگر کیا یہ وہی نہیں ہے جو بازار کی فاحشہ عورتوں سے ارتباط رکھتا تھا اور ان میں ایک پیشہ کے فروغ اور کامیابی کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ یہی یونان کے دوسرے حکماء کا حال تھا اور توحید وخدا پرستی تو اس سے بدرجہا بلند ہے، جس کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

ان سطروں سے اندازہ ہوا ہوگا کہ ہر شیریں نوا واعظ، ہر مؤثر البیان خطیب، ہر دقیقہ رس مقنن، ہر کشور کشا فاتح اور ہر نکتہ دان حکیم اس لائق نہیں کہ نبوت ورسالت کا اہم اور بلند اور مقدس منصب اس سے منسوب کیا جائے، اس منصب کے ساتھ کچھ ایسے شروط، لوازم اور خصوصیات بھی وابستہ ہیں، جو اس کے ضروری اجزاء اور عناصر ہیں۔

① سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس کا تعلق پراسرار عالم غیب سے ہو، وہ عالم غیب کی آوازیں سنتا ہو، غیب کی چیزیں دیکھتا ہو، غیب سے علم پاتا ہو، علم ملکوت کی تائید اس کے ساتھ ہو، روح القدس اس کا ہمسفر وہمنوا ہو۔

② اللہ تعالیٰ نے اس کو تمام بندوں میں سے اس کے لیے چنا ہو کہ وہ اس بلند منصب پر سرفراز ہو۔

③ اس سے خدا کے حکم سے عجیب وغریب اور حیرت انگیز تصرفات صادر ہوں جن سے اس کا مقبولِ بارگاہ ہونا ثابت ہو۔

④ فضائل واخلاق کے پھولوں سے اس کا دامن بھرا ہوا اور ہر قسم کے گناہ کے خس وخاشاک سے پاک وصاف ہو کہ گندے ہاتھوں سے میلے کپڑے پاک وصاف نہیں ہو سکتے۔

⑤ وہ لوگوں کو خدا اور عالم غیب پر یقین کی دعوت اور فضائل واخلاق کی تعلیم دے اور روز "اَلَسْتُ" کا بھولا ہوا عہد ان کو یاد دلائے۔

⑥ نہ صرف تعلیم بلکہ اس میں قوت ہو کہ وہ شریروں کو نیک اور گمراہوں کو راست رو بنا دے اور جو خدا سے بھاگتے ہوں ان کو پھیر کر پھر اس کے آستانہ پر لے آئے۔

⑦ اپنے سے پہلے خدا کی طرف سے آئے ہوئے صحیح اصول کو انسانی تصرفات سے پاک وصاف کر کے پیش کرے۔

⑧ اس کی دعوت وجد وجہد اور تعلیم وتلقین سے مقصود کوئی دنیاوی معاوضہ، شہرت، جاہ طلبی، دولت مندی، قیام سلطنت وغیرہ نہ ہو بلکہ صرف خدا کے حکم کی بجا آوری اور خلقِ خدا کی ہدایت ہو۔

یہ نبوت ورسالت کے وہ اوصاف اور لوازم ہیں جو دنیا کے تمام پیغمبروں میں یکساں پائے جاتے ہیں۔ مذاہب عالم کے صحیفوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف اور آشکارا ہو جاتی ہے، خصوصاً قرآن پاک نے، جو دنیا کی نبوت کا سب سے آخری اور سب سے مکمل صحیفہ ہے اور جس نے نبوت ورسالت کی حقیقت اور شرائط ولوازم کی سب سے بہتر تشریح کی ہے۔ سورۂ انعام میں اکثر پیغمبروں کا ذکر کر کے یہ حقائق ان الفاظ میں بیان کیے ہیں:

﴿ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰي وَهٰرُوْنَ ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰي وَاِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٨٣۔٩٠)

''اور یہ تھی ہماری دلیل جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی، ہم جس کو چاہتے ہیں کئی درجے بلند کرتے ہیں، بے شبہ تیرا پروردگار تدبیر والا خبردار ہے اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق اور یعقوب علیہما السلام بخشے اور ہر ایک کو ہدایت دی اور نوح علیہ السلام کو اس سے پہلے ہدایت دی تھی اور اس کی اولاد میں داؤد اور سلیمان اور ایوب اور یوسف اور موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کو اور اسی طرح ہم نیکو کاروں کو بدلہ دیتے ہیں اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس علیہم السلام کو ہر ایک نیکو کاروں میں سے اور اسمٰعیل اور الیسع اور یونس اور لوط علیہم السلام کو ہر ایک کو بزرگی بخشی دنیا والوں پر اور ان کے باپ دادوں اور بھائیوں میں سے اور ہم نے ان کو چن کر پسند کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر وہ چلاتا ہے جس کو چاہتا ہے، اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا برباد ہو جاتا یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب اور حق و باطل میں فیصلہ کرنا (حکم) اور نبوت دی تو اگر کوئی ان باتوں سے انکار کرے تو ہم نے ان

باتوں پر ایسے دوسروں کو مقرر کیا ہے جو ان کا انکار نہیں کرتے، یہی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی اے محمد ﷺ! تو بھی انہیں کی راہنمائی کی پیروی کر اور کہہ میں اپنے کام کی تم سے مزدوری نہیں چاہتا، یہ قرآن تو دنیا والوں کو یاد دلانا ہے۔"

ان آیتوں میں اکثر پیغمبروں کے نام لے کر، ان کے پیغمبرانہ اوصاف گنائے ہیں اگر ہم ان کو یکجا کر دیں تو نبوت و رسالت کے عام اوصاف خصوصیات اور لوازم واضح ہو جائیں:

① فرمایا: "ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دلیل دی اور ہم نے ان کو ہدایت بخشی" جس سے معلوم ہوا کہ ان کے علم اور ہدایت کا سرچشمہ عالم ملکوت سے ہوتا ہے۔

② ارشاد ہوا کہ "ہم نے ان کو سیدھی راہ چلایا اور یہ سب نیکوکار تھے" اس سے ثابت ہوا کہ وہ معصوم اور گناہوں سے بے داغ ہوتے ہیں۔

③ یہ بھی کہا کہ "ہم نے ان کو چن کر پسند کیا" اور "جس کو چاہیں اپنے بندوں میں سے یہ ہدایت عطا کریں" جس سے یہ مقصود ہے کہ یہ منصب سعی و محنت سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی اور انتخاب سے ملتا ہے۔

④ فرمایا کہ "ہم نے ان کو کتاب حق و باطل کے فیصلہ کی طاقت (حکم) اور احکام غیب کی تعلیم (نبوت) دی" اس سے معلوم ہوا کہ اس منصب والوں کو کیا کیا چیزیں عطا ہوتی ہیں۔

⑤ حکم ہوا کہ "ان کی راہنمائی کی پیروی کر" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی اور دعوت پر مامور ہوتے ہیں اور لوگ ان کی پیروی سے نیکوکار اور صالح بنتے ہیں۔

⑥ فرمایا کہ "اے پیغمبر! یہ کہہ دے کہ میں اپنے کام کا کوئی معاوضہ یا بدلہ تم سے نہیں چاہتا یہ تو اہل دنیا کے لیے نصیحت اور یاد دلانا ہے" اس سے ثابت ہوا کہ خالق کی خوشنودی اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی خیر خواہی اس کے علاوہ ان کا کوئی دوسرا مقصود اور مطمع نظر نہیں ہوتا۔

دوسرے انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ خاص محمد رسول اللہ ﷺ کے تعلق و نسبت سے ان حقیقتوں کو قرآن پاک نے کئی دفعہ بتصریح بیان کیا ہے جن میں سے چار باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں:

① اشیائے غیب، امور خیر اور فلاح و سعادت کے اسباب پر اس کا علم خدا کی تعلیم سے کامل ہو۔

② وہ اپنے علم کے مطابق اپنے عمل میں کامل اور راست باز ہو۔

③ وہ دوسروں کو ان امور کی تعلیم دیتا ہو۔

④ اور ان کو بھی اپنی تعلیم اور صحبت کے فیض سے حسب استعداد کامل بناتا ہو۔

قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر آپ ﷺ کی نسبت یہ فرمایا گیا:

﴿ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۹_۶۲/ الجمعۃ :۲)

''وہ رسول ان پڑھوں کو خدا کی باتیں سناتا اور ان کو پاک وصاف بناتا اور ان کو کتاب وحکمت سکھاتا ہے۔''

اس مختصر سی آیت میں ان چاروں مذکورہ بالا امور کا یکجا ذکر کیا ہے جاہلوں کو آیات الٰہی پڑھانے اور کتاب وحکمت سکھانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ خود اس کو آیات الٰہی پڑھائی اور کتاب وحکمت سکھائی گئی ہوں اور دوسروں کو پاک وصاف بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود پاک وصاف ہو کہ ایک جاہل اپنے ہی جیسے دوسرے جاہل کو عالم اور ایک ناپاک اپنے ہی جیسے دوسرے ناپاک کو پاک نہیں بنا سکتا۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

﴿ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۙ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۭ وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ښ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۭ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۙ وَيَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى ۙ ﴾

(۸۷/ الاعلیٰ ۶_۱۱)

''ہم تجھے پڑھائیں گے تو تو نہیں بھولے گا، مگر جو اللہ چاہے، وہ جانتا ہے، پکار اور چھپا اور ہم تجھے آہستہ آہستہ آسانی تک پہنچائیں گے اور تو سمجھا اگر تیرا سمجھانا فائدہ دے جس کو خدا کا لحاظ ہوگا وہ سمجھے گا اور جو بدبخت ہوگا وہ اس سے پرہیز کرے گا۔''

ایسا پڑھانا جس میں بھول نہ ہو ''پیغمبر کی روحانی تعلیم ہے'' اور آسانی کی منزل کی طرف اس کو آہستہ آہستہ لے چلنا اور اس کے لیے اس کٹھن منزل کو آسان کر دینا اس کے ذاتی عمل کو کمال درجہ تک اس طرح پہنچا دینا ہے کہ تمام امور خیر اس سے بسہولت از خود صادر ہونے لگیں پھر اس کو دنیا کے ''سمجھانے'' پر مامور کرنا اس رمز کو آشکارا کرنا ہے کہ دوسروں کی تعلیم وتذکیر کا منصب اس کو ملا ہے۔ اس کے بعد یہ فرمانا کہ ''متقی اس نصیحت سے فیض پائیں گے اور بدبخت محروم رہیں گے'' اس کی تشریح یہ ہے کہ ناقصوں کی تکمیل اور ذی استعداد لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق فیض پہنچانا بھی اس کا فرض ہے۔ [1]

نبوت کے لوازم اور خصوصیات

نبوت کی شرح حقیقت اور اس کے ضروری لوازم اور خصوصیات کے اجمالی بیان کے بعد ضرورت ہے کہ نبوت کے چند اہم خصوصیات پر تفصیل سے گفتگو کی جائے، تاکہ وقت کی بہت سی غلط فہمیوں کا سدباب ہو لیکن ان خصوصیات کے ذکر سے پہلے خود ہم کو ''خصوصیت'' کو سمجھنا ہے کہ اس سے مقصود کیا ہے؟

دنیا میں ہر نوع اور ہر نوع کے ماتحت ہر صنف میں کچھ نہ کچھ مخصوص صفات ہوتی ہیں یہ مخصوص صفات

---

[1] یہ تشریح اور طریقہ استدلال امام رازی نے اپنی تفسیر "تفسیر کبیر، سورۃ الاعلیٰ، ج ۶، ص: ۵۲۸" اور بعض کتب کلامیہ میں اختیار کیا ہے۔

اس نوع اور صنف کے ہر فرد میں یکساں پائی جاتی ہیں انہیں کو ہم لوازم اور خصوصیات کہتے ہیں پھل، پھول، چوپائے، پرندے اور انسان تمام انواع میں کچھ نہ کچھ ایسی خصوصیات ہیں جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں خصوصیات کی بنا پر ہر نوع دوسرے سے ممتاز اور ہر صنف دوسرے سے علیحدہ ہے گلاب میں خاص قسم کا رنگ، خاص قسم کی خوشبو، خاص قسم کے پتے ہوتے ہیں یہ ناممکن ہے کہ کوئی گلاب ہو اور اس میں یہ چیزیں نہ پائی جائیں لیکن گلاب کی بھی مختلف صنفیں ہیں ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسی لازمی صفات ہوتی ہیں جن سے گلاب کی ہر صنف (قسم) دوسری صنف (قسم) سے علانیہ الگ نظر آتی ہے۔

اسی طرح انسانیت کے کچھ خاص لوازم ہیں دو ہاتھ، دو پاؤں، سیدھا قد، بولنے کی طاقت، سمجھ بوجھ اور غور و فکر کی اہلیت، ایجاد و اختراع کی قوت، انجام بینی اور مآل اندیشی کی صلاحیت وغیرہ اس کے خواص ہیں اور جس طرح شہد میں مٹھاس، حنظل میں کڑوا پن، آگ میں گرمی اور برف میں ٹھنڈک، نوعی خواص کی حیثیت سے خود بخود پیدا ہو گئی ہیں اسی طرح انسان میں انسانیت کی مذکورہ بالا خاصیتیں فطرتاً ودیعت ہیں لیکن اس وصفِ انسانیت میں اشتراک کے ساتھ گلاب کے اصناف کی طرح نوع انسانی کے بھی مختلف اصناف ہیں، جیسے ہندی، چینی، حبشی، رومی، ایشیائی اور یورپین وغیرہ۔ دیکھو کہ ان میں سے ہر ایک صنف میں انسانیت کے اشتراک کے باوجود قد و قامت، چہرہ مہرہ، رنگ و روغن، صورت و شکل اور اخلاق و عادات، وغیرہ بیسیوں چیزوں کا نمایاں امتیاز ہوتا ہے اور یہ تمام اصناف انسانی جو مختلف آب و ہوا، مختلف مرز و بوم، مختلف نسل اور مختلف ماحول سے تعلق رکھتے ہیں انسان ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے صریحًا ممتاز ہیں۔

اسی طرح ہر صنفِ انسانی کے اندر مختلف افراد ہیں، خلاق فطرت نے ان میں سے ہر ایک کو مختلف قابلیتیں عطا کی ہیں، شاعری، زبان دانی، فلسفہ، ریاضی، صناعی، باغبانی، معماری، پہلوانی، سینکڑوں مختلف قسم کی انسانی استعداد کی خصوصیتیں دوسروں سے الگ ہیں ایک تخیل پسند شاعر اور ایک حقیقت شناس ریاضی دان میں عظیم الشان فرق ہوتا ہے۔ ادب و انشا کے خیالی بلند پرواز، عموماً ریاضیات جیسے ٹھوس اور واقعی علوم سے کورے ہوتے ہیں اور واقعیات سے لبریز ریاضیات کے جاننے والے، ادب و شاعری سے بیگانہ، پہلوانی کے جوہر باغبانی سے الگ ہیں اور ایک صناع کی طبیعت ایک فلسفی سے متضاد ہوتی ہے۔

اسی کے ساتھ صنف شعرا میں خاص دماغی قابلیت کا اتحاد ہوتا ہے، نظم کی قوت، تخیل کی بلندی، محاکات کی قدرت، الفاظ کا زور، معانی کا جوش، یہ تمام شعرا کی مخصوص صفات ہیں اسی طرح تمام فلسفیوں کی ایک خاص دماغی کیفیت ہوتی ہے، خاموشی، غور و فکر، دقتِ نظر، خارجی عالم سے بے پروائی، تصور میں انہماک، خلوت گزینی، اخلاق کی خشکی، الغرض مرز و بوم اور آب و ہوا کے اختلاف کی بنا پر جو اصنافِ انسانی پیدا ہوتے ہیں ان میں بھی یہ اختلاف و امتیاز نظر آتا ہے ہنیبال و نپولین، تیمور و چنگیز، دم کے دم میں آبادی کو ویرانہ اور

ویرانہ کو آبادی، پہاڑ کو میدان اور میدان کو پہاڑ بنا سکتے تھے مگر وہ بیٹھ کر فلسفۂ اخلاق پر چند صفحے نہیں لکھ سکتے تھے۔ افلاطون تنہائی میں بیٹھ کر جمہوریت کا فلسفیانہ خاکہ تیار کر سکتا تھا مگر ایتھنز کے تخت پر بیٹھ کر ایک لمحہ حکمرانی کا فرض انجام نہیں دے سکتا تھا۔ سلطان محمود کے درباری شاعر فردوسی نے اپنی طبیعت کے زور سے سینکڑوں خیالی سومنات کے معرکے فتح کیے لیکن پتھر کی ایک چٹان پر بھی کلہاڑی نہ مار سکا اس کے برخلاف سلطان محمود فوجوں کے دل کے ساتھ پہاڑوں کو چیرتا، دریاؤں کو پھاڑتا اور ریگستانوں میں پانی بہاتا ہوا، غزنی سے چل کر گجرات کے کناروں تک پہنچ گیا اور سومنات کے سنگی قلعہ اور مجسمہ کو چکنا چور کر ڈالا مگر فردوسی کی طرح تنہا بیٹھ کر وہ خیالی شاہنامہ کا ایک معرکہ بھی فتح نہیں کر سکتا تھا۔

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوا کہ نوع انسانی میں اشتراک کے باوجود اصناف انسانی کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ان میں سے ہر قسم وصنف کے الگ الگ خصوصیات، صفات اور لوازم ہیں انہیں مختلف اصناف انسانی میں انبیاء علیہم السلام کی بھی ایک صنف ہے اور نوع انسانی کی اس مقدس صنف کے بھی، چند خاص اوصافِ خصوصیات اور لوازم ہیں جو ان کو دوسرے اصناف انسانی سے علانیہ ممتاز بناتے ہیں۔

اس تمہید کے بعد اب ہم کو اس مسئلہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے کہ نبوت و رسالت کے اہم لوازم اور خصوصیات کیا ہیں:

وہبی استعداد

ان میں سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے، اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں اور انہیں کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ ایک خاص مقررہ مدت میں جا کر وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہو سکتا بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے پھر آم کے درخت کے آثار و خواص، پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بوغرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے، کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن اس سے آخر میں ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوۃ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہو سکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار و خواص اور کیفیات اس میں بالقوہ اور استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کا کہ

''میں اس وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب وگل میں تھے۔'' [1] اسی قسم کا مطلب ہوگا۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں وہ حسب و نسب اور سیرت وصورت میں ممتاز ہوتے ہیں، شرک وکفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں، اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں، ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے اور یہ تمہیدیں اس لیے ہوتی ہیں، تاکہ منصب ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی سے موجود رہے، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات قبل نبوت پڑھو تو ہمارے اس دعویٰ کی سچائی تم کو نظر آئے گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نبوت پانے سے پہلے ہی آسمان وزمین کے خالق کی تلاش، سورج، چاند اور ستاروں پر متفکرانہ نظر اور بت پرستی کے خلاف نفرت کا شدید جذبہ کس بات کی شہادت ہے؟ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا بے آب وگیاہ میدان میں پرورش پانا، چاہ زمزم کا ظہور، آنے جانے والے قافلوں کا اس کی آبادی کی طرف میلان، چلنے پھرنے کے قابل ہوئے تو مقدس باپ کے ساتھ مقدس سفر کی تیاری اور اس کمسنی میں باپ کے خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری آمادگی اور صبر وشکر اور تسلیم ورضا کا اظہار کس مستقبل کی خبر دیتا ہے؟ حضرت اسحاق علیہ السلام کا فرشتوں کی بشارت سے پیدا ہونا اور پیدائش سے پہلے ہی ﴿بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ﴾ (۱۵/ الحجر: ۵۳) کا خطاب پانا پھر مقدس باپ کی جانشینی اور یروشلیم کی مسجد کی پاسبانی کے لیے انتخاب کس مقصود کا دیباچہ ہے؟

حضرت یوسف علیہ السلام کا بچپن میں رؤیائے صادقہ اور صبر وشکر اور پاک دامنی کس بات کی گواہی دیتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عین خطرہ میں پیدائش، حفاظت، پرورش اور نبوت سے پہلے فرعونیوں سے تن تنہا مجاہدانہ آویزش، کس مبتدا کی خبر ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کا آغاز عمر میں علم وفہم، فصل مقدمات کی قوت کس نتیجہ کے آثار ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی دعائیہ پیدائش بچپن ہی میں ان کی نیکی، سعادت مندی، نرم خوئی اور پاکی، کس مقصد کی تمہید ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش اور بچپن ہی میں نیکی، سلامت روی، توراۃ کی حقیقت رسی کس روز روشن کی صبح ہے؟ اور خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے دعائے خلیل، نوید مسیحا، رؤیائے آمنہ اور احوال ولادت وتربیت، مراسمِ شرک سے اجتناب، اخلاق حسنہ، دیانت، امانت، آثار خیر وبرکت نبوت سے پہلے ہی تنہائی پسندی، خلوت گزینی، حقیقت کی تلاش اور غور وفکر کس خورشید جہان تاب کا مطلع انوار ہے۔

---

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۹ میں (آدم بین الروح والجسد) کے الفاظ ہیں ومستدرك حاكم، ج ۲، ص: ۶۰۰ ومسند أحمد، ج ٤، ص: ۱۲۷۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا یہ حال ہے:

﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۭ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ۝ ﴾

(۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۱، ۱۰۲)

''تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک بردبار لڑکے کی خوشخبری دی، تو جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے کی عمر کو پہنچا، تو اس نے کہا کہ اے میرے بیٹے! میں خواب میں دیکھتا ہوں، کہ تجھ کو میں ذبح کر رہا ہوں، اس نے جواب دیا اے میرے باپ کر ڈال جو تجھ سے کہا گیا، تو مجھے خدا نے چاہا تو صبر کرنے والوں میں پائے گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خطاب ہے:

﴿ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ۝ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۳۷، ۳۸)

''اور ہم نے تجھ پر دوسری دفعہ احسان کیا جب (تیری حفاظت اور پرورش کے متعلق) تیری ماں کے دل میں وہ بات ڈال دی جو ڈالی گئی۔''

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نسبت یہ ارشاد ہے:

﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ۝ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ ﴾ (۱۹/ مریم:۱۲۔۱۵)

''اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ اور ہم نے اس کو فیصلہ کرنے کی قوت بچپن ہی میں دے دی اور اپنے پاس سے رحم و مہر اور ستھرائی۔ اور تھا پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا فرمان بردار اور نہ تھا زبردستی کرنے والا نافرمان، سلامتی ہو اس پر جس دن پیدا ہوا۔''

نیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿ كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝ قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ړ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۝ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ ﴾ (۱۹/ مریم:۲۹۔۳۱)

''ہم کیسے اس سے بات کریں، جو ہنوز گہوارہ میں بچہ ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے کہا، میں خدا کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب الٰہی دی اور مجھے نبی ٹھہرایا اور مبارک بنایا میں جہاں ہوں۔''

اور مکہ کا ''الامین'' نبوت کے پہلے کی اپنی پوری زندگی موقع شہادت میں بے خطر پیش کر دیتا ہے:

﴿ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۱۶)

''تو اس (پیغمبری کے دعویٰ) سے پہلے میں تم میں ایک عمر گزار چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے۔''

انبیا علیہم السلام کے احوال مبارکہ کے یہ جزئیات باہم مل کر، اپنی نسبت خود کلیہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔

غیبی علم

نبوت کا دوسرا سب سے اہم خاصہ اس کا غیبی علم ہے یعنی وہ علم جو عام انسانوں کی طرح وجدان، احساس یا عقل و قیاس سے نہیں، بلکہ براہ راست صدائے غیب یا رؤیائے صادقہ یا فرشتوں کے ذریعہ سے خدائے پاک سے حاصل ہوتا ہے اسی کے آغاز سے نبوت کی استعداد بالقوۃ کا عملی ظہور شروع ہو جاتا ہے، اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

علم انسانی کے ماخذ

علم انسانی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو بلا واسطہ ہوتا ہے اور دوسرے وہ جو کسی واسطہ سے حاصل ہوتا ہے بے واسطہ علم کی بھی تین قسمیں ہیں:

① وجدان: انسان کو اپنے جسمانی وجود اور اس جسمانی وجود کے اندرونی کیفیات کا علم سب سے زیادہ یقینی طور سے ہوتا ہے، ہر شخص کو اپنے وجود کا یقین ہے اور اس کے اندر بھوک، پیاس، بیماری، صحت، غم، خوشی، خوف وغیرہ اندرونی تغیرات کا علم اس کو بلا واسطہ از خود ہو جاتا ہے۔

② فطرت: اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ہر نوع مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسی نوعی خصوصیتیں عطا ہوتی ہیں جو دوسری نوعوں میں نہیں پائی جاتیں اور انہیں سے باہم نوعوں کا اختلاف اور امتیاز ظاہر ہوتا ہے ان نوعی خصوصیتوں کا علم ہر نوع کے افراد کو بلا کسی ذریعہ اور واسطہ کے از خود ہوتا ہے اور اسی کو بعض علما کی اصطلاح میں فطری یا نوعی الہام اور اہل فلسفہ کی اصطلاح میں ''جبلت'' کہتے ہیں حیوانات کو اپنے متعلق بہت سی باتوں کا علم از خود فطرتاً ہوتا ہے، پرندوں کے بچوں کو دانہ چگنا اور اڑنا کون سکھاتا ہے؟ آبی جانوروں کو تیرنے کی تعلیم کون دیتا ہے، شیر کے بچہ کو درندگی کا سبق کس معلم نے پڑھایا؟ انسان کے بچہ کو پیدا ہوتے ہی رونا، سونا، دودھ پینا کون سکھا دیتا ہے؟

③ بداہت اولیہ: انسان کو کچھ ہوش و تمیز آنے کے بعد بلا دلیل بعض ایسی باتیں از خود یا ادنیٰ تامل اس طرح معلوم ہو جاتی ہیں کہ ان میں پھر کسی قسم کا شک و شبہ راہ نہیں پاتا، دو اور دو چار ہوتے ہیں، برابر کا برابر، برابر ہوتا ہے، ایک وقت ہی میں ایک ہی چیز سیاہ و سپید دونوں نہیں ہو سکتی، ہر بنی ہوئی چیز کا کوئی بنانے والا ہوتا ہے وغیرہ، بہت سے ایسے ضروری مقدمات اور کلیات جن پر انسان کے استدلال کا تمام تر مدار ہے اس کو بداہتاً معلوم ہو جاتی ہیں۔

یہ تو بلا واسطہ علم کی تین قسمیں تھیں اس کے بعد علم انسانی کی وہ قسمیں ہیں جن کا علم اس کو کسی واسطہ سے ہوتا ہے انسان کے پاس اس قسم کے دو واسطے ہیں، ایک احساس اور دوسرا عقل۔ پہلے سے وہ گرد و پیش کی مادی

چیزوں کا اور دوسرے سے ان مادی چیزوں کا جو سامنے موجود نہیں یا سرے سے خارج ہیں موجود نہیں بلکہ عالمِ غیب میں ہیں یا صرف ذہن میں ہیں، علم حاصل کرتا ہے۔

④ انسان کے جسم کے اندر پانچ قسم کی جسمانی قوتیں ہیں: باصرہ، سامعہ، شامہ، ذائقہ، لامسہ، باصرہ دیکھتی سامعہ سنتی، شامہ سونگھتی، ذائقہ چکھتی، اور لامسہ چھوتی ہے، انہیں کا نام حواس خمسہ ہے، انسان کے پاس یہی پانچ آلات ہیں جن کے ذریعہ سے وہ ان مادی چیزوں کے متعلق علم حاصل کرتا ہے جو اس کے ان آلات سے آ کر ٹکراتی ہیں اسی کا نام احساس ہے ہم چکھ کر مزہ پاتے، سن کر آواز پہچانتے، دیکھ کر صورت جانتے، چھو کر سختی ونرمی دریافت کرتے اور سونگھ کر بو معلوم کرتے ہیں ان حواس کے ذریعہ سے بھی جو علم ہم کو ہوتا ہے وہ اکثر یقینی اور شاذ و نادر غلط بھی ہوتا ہے کیونکہ وہ کبھی کبھی کسی سبب سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں اور دریافت کرنے میں غلطی بھی کرتے ہیں اور دلائل سے ان کا یہ دھوکا اور ان کی غلطی ثابت ہوتی ہے بیماری میں قوت ذائقہ بدل جاتی ہے اور اس نے میٹھے کو کڑوا بتایا ہے، تیز حرکت میں قوت باصرہ نے ہم کو دھوکا دیا ہے، ریل میں ہم کو ساکن اور ٹھہری ہوئی چیز چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، چلتے ہوئے جہاز میں جہاز ہم کو ٹھہرا ہوا معلوم ہوتا ہے، متحرک چنگاری کا نقطہ تیز سیدھی حرکت میں ہم کو آتشیں خط اور گول حرکت میں آتشیں دائرہ معلوم ہوتا ہے، آسمان کے چمکتے ہوئے بڑے بڑے ستارے کتنے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں لیکن کیا درحقیقت وہ ایسے ہی چھوٹے ہیں۔

⑤ علم بالواسطہ کی دوسری قسم وہ ہے جس کو ہم اپنی عقل و قیاس، غور وفکر اور استدلال کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں ان کی بنیاد درحقیقت انہیں معلومات پر ہوتی ہے جن کا علم ہم کو اپنے وجدان الہام فطری (یا جبلت) بداہت اولیہ اور احساس سے پہلے ہو چکا ہے اور انہیں معلوم شدہ امور پر غیر معلوم امور کو تمثیل یا استقرا کے ذریعہ سے قیاس کر کے ان معلوم شدہ امور کے خصوصیات اور آثار کا حکم ان غیر معلوم لیکن مشابہ و مماثل امور پر لگا کر نیا نتیجہ حاصل کرتے ہیں وہ غیر معلوم امر جس پر معلوم امر کے ذریعہ ہم کوئی حکم لگاتے ہیں اگر مادی ہوتا ہے تو نتیجہ چنداں غیر مشکوک نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ جزئیات کا استقرا پورا نہ کیا گیا ہو یا تمثیل تام نہ ہو یا تجربہ ومشاہدہ نے دھوکا دیا ہو، یا کوئی اور اصولی غلطی ہوگئی ہو، طبیعات اور سائنس کے مسائل اکثر اسی طرح معلوم کیے گئے ہیں لیکن اگر وہ امر مجہول غیر مادی ہے تو مادی امور پر اس غیر مادی کو قیاس کر کے اس کی نسبت جو کچھ کہا جائے گا اس کا مرتبہ ظن وتخمین سے آگے نہیں بڑھتا، مگر یہ کہ وہ تمام تر فطریات و بدیہیات ومحسوسات پر علانیہ منتہی ہو مابعد الطبیعہ اور فلسفہ الٰہیات کے مسائل اسی طریقہ استدلال سے حاصل ہوتے ہیں اور اسی لیے ان میں اختلاف کی بڑی گنجائش نکلتی ہے کہ ان کے آخری نتیجہ اور ابتدائی بنیادی وجدانی یا بدیہی یا حسی مقدمات کے درمیان قیاسات کی کئی منزلیں ہیں اور ان میں سے ہر منزل خطروں سے لبریز ہے مشابہت ومماثلت میں دھوکا ہوسکتا ہے، عقلی اور وجدانی اور حسی اشیاء کے خواص کے درمیان اختلاف اور فرق

ہوسکتا ہے، غور وفکر، بحث ونظر، تحقیق وجستجو اور ترتیب مقدمات جو اس قیاس کے عقلی کارکن اور فاعل ہیں وہ اپنے کام میں دھوکا کھاسکتے ہیں اسی لیے یہ علوم شکوک وشبہات سے لبریز ہیں۔

ذرائع علم کے حصول کے زمانے اور ان کے مراتب

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ یقینی علوم ہمارے وجدانیات اور فطریات ہیں جو ہم کو قدرت کی طرف سے سب سے پہلے عنایت ہوتے ہیں کہ ہمارے وجود کی بقا اس علم پر موقوف ہے، جیسے بھوک اور پیاس کا احساس اور اس علم کا یقینی ہونا بھی ضروری ہے ورنہ ہم اپنا وجود قائم نہ رکھ سکیں گے، ہم کو جو بھوک یا پیاس لگتی ہے کیا اس کے یقینی اور قطعی علم میں ہم سے غلطی ہوسکتی ہے اور کیا کسی کے شک دلانے سے یہ ممکن ہے کہ تم کو بھوک نہ ہو یا ممکن ہے کہ تم کو پیاس نہ ہو، کبھی بھوکے یا پیاسے کو اپنی بھوک اور پیاس کے متعلق شک ہوسکتا ہے اور یہ احساس اور علم وجود کے ساتھ ساتھ انسان کو ملتا ہے یہاں تک کہ آج کا پیدا شدہ بچہ بھی اس کا احساس کرتا اور علم رکھتا ہے ورنہ وہ اپنے وجود کو قائم نہ رکھ سکے۔

وجدانیات وفطریات کے بعد محسوسات کا علم انسان کو ملتا ہے۔ دیکھنا، سننا، چکھنا، سونگھنا، چھونا یہ ہمارے پانچ حواس ہیں جو ہمارے مادی علم کے آلات ہیں اور جن کے بغیر کوئی باہر کا علم ہمارے اندر نہیں آسکتا یہ احساسات بھی ایک ہی دفعہ نہیں کمال پا جاتے بلکہ ضرورت کے مطابق حسب استعداد ملتے اور ترقی پاتے ہیں اور پیدائش کے چند ماہ بعد یہ تکمیل کو پہنچتے ہیں کیونکہ وجود کی بقا اور ضروریات کی تکمیل ابھی سے ان پر رفتہ رفتہ موقوف ہوتی جاتی ہے۔ محسوسات کے بعد بدیہیات اوّلیہ کا درجہ آتا ہے، انسان کو اپنے اس علم میں بھی وہی اذعان وقطعیت ہوتی ہے، دو اور دو چار ہوتے ہیں، دس پانچ کا دونا ہے، ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہوسکتی، ایک چیز ایک ہی وقت میں سیاہ وسپید نہیں ہوسکتی، ان بدیہی علوم کو ہر شخص مانتا ہے اور تسلیم کرتا ہے مگر اس کا علم انسان کو بچپن میں نہیں ہوتا بلکہ تمیز ورشد کے بعد ہوتا ہے کیونکہ اسی وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر یہ علوم اس سن میں اس کو عطا نہ ہوں تو وہ دنیا کے ضروری کاروبار چلانے کے لائق نہ ہو اور نہ دوسرے علوم کی دریافت کی اس میں استعداد پیدا ہو، فطری احمق اور بے وقوف انہیں کو کہتے ہیں جن میں ان بدیہیات کا علم کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

سب سے اخیر میں اس علم کا درجہ آتا ہے جو وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات پر قیاس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اور جن کو معقولات کہتے ہیں۔ اسی علم اور اسی کی قوت کی کمی بیشی کا نتیجہ ہے کہ انسانی عقلیں درجہ اور مرتبہ میں متفاوت ہوتی ہیں ایک طرف تو (کمی کی سمت میں) وہ حماقت تک پہنچ جاتی ہے اور دوسری طرف (سمت کمال میں) عاقل، عاقل تر اور عاقل ترین طبقہ تک اونچی ہوجاتی ہیں یہاں تک کہ وہ درجہ بھی آتا ہے کہ کسی کی عقل اس مرتبہ تک جا پہنچتی ہے جہاں کوئی اس کا دوسرا حریف اور ہمسر نہیں ہوتا، ایک

جاہل حبشی سے لے کر ارسطو اور بوعلی سینا تک سب انہیں عقلی مدارج کے مختلف انسانی نظائر ہیں، بایں ہمہ یہ ظاہر ہے کہ اس علم کا طریقہ نہایت پر خطر اور منزل مقصود ہمیشہ مشکوک رہتی ہے۔ عام طور سے انسانی علم کے یہ پانچ ذریعے اور طریقے سمجھے جاتے ہیں لیکن درحقیقت ایک اور ذریعہ بھی ہے جس کا تعلق تمام تر ماورائے مادہ سے ہے، غور کیجئے کہ آپ کا سب سے پہلا علم یعنی وجدانیات، آپ کے اندرونی حواس کا نتیجہ ہے، دوسرا، یعنی فطریات کا علم، خالق فطرت خود آپ کے اندر ودیعت رکھتا ہے، تیسرا علم یعنی محسوسات کا علم آپ کے ان ظاہری حواس کا نتیجہ ہے جو گو باہر ہیں مگر آپ کے جسم کے اندر ہیں آپ کا چوتھا ذریعہ علم یعنی بدیہیات اولیہ آپ کے حواس اور ذہن کا ایک مشترکہ فیصلہ ہیں پانچواں ذریعہ علم جو آپ کی عقل و ذہن کی قیاس آرائی ہے وہ آپ ہی کے اندر کے دماغی قویٰ کا عمل ہے تھوڑے سے تامل سے معلوم ہوگا کہ آپ کا علم وجدان سے لے کر ذہن تک بتدریج مادیت سے ترقی کر کے ماورائے مادہ کے قریب تک پہنچتا ہے، وجدان تمام تر ہماری اندرونی جسمانی مادیت ہے جس میں کوئی شک نہیں، محسوسات بھی ہمارے ہی جسم کے مادی آلات علم کے نتائج ہیں بدیہیات ہمارے حواس سے جو مادی ہیں اور ہمارے ذہن سے جو غیر مادی ہے مشترک تعلق رکھتے ہیں یعنی بدیہیات مادی اور غیر مادی ذرائع علم کے بین بین ہیں اور معقولات تمام تر ذہنی اور غیر مادی ہیں تاہم اس غیر مادی قوت کا مرکز ہمارا مادی جسم ہی ہے اور اس حد تک اس غیر مادی قوت کا مادہ سے تعلق بہرحال ہوتا ہے۔

غیر مادی علم

اب اس کے بعد اس علم کا درجہ آتا ہے جس کی سرحد اس کے بعد آتی ہے اور جس کا تعلق مادہ سے اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا معقولات اور ذہنیات کا ہے وہ تمام تر مادہ اور مادیات سے پاک ہوتا ہے اس کو مادہ سے اسی قدر لگاؤ ہوتا ہے کہ وہ علم مادی، دل و دماغ کے آئینہ پر اوپر سے آ کر اپنا عکس ڈالتا ہے۔

اس غیر مادی علم کے بھی بہ ترتیب مختلف درجے ہیں جن کو فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی کہتے ہیں اور جس طرح انسانی علم کے مذکورہ بالا پانچوں ذریعے انسان کے جسمانی قویٰ سے متعلق تھے اسی طرح یہ غیر مادی ذرائع انسان کے روحانی قویٰ سے وابستگی رکھتے ہیں اور جس طرح آپ نے دیکھا ہے کہ وجدانیات سے لے کر عقلیات تک بہ ترتیب ہمارا ذریعہ علم خالص مادی، کامل مادی، کم مادی اور برائے نام مادی تک ترقی کرتا چلا گیا ہے اسی طرح فراست، حدس، کشف، الہام اور وحی بھی برائے نام مادی اور روحانی سے لے کر پھر روحانی، کامل روحانی اور خالص روحانی کے ذریعہ تک ترقی کرتے چلے گئے ہیں۔ فراست کے لفظی معنی ''تاڑ جانے'' کے ہیں تاڑ لینے کی قوت ہر شخص میں نمایاں نہیں ہوتی مگر جس میں نمایاں ہوتی ہے اس کی یہ کیفیت ایک ملکہ کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے جو تجربہ کی کثرت اور عمل کی مہارت اور کمال کے بعد انسان کو حاصل ہو جاتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے، سننے، چکھنے، سونگھنے یا چھونے کے ساتھ ہی صرف

بعض علامتوں کے جان لینے سے دوسری متعدد ضروری علامتوں پر تفصیلی نظر ڈالے بغیر اتنی جلدی سے انسان صحیح نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ غیب کی بات بیان کر رہا ہے حالانکہ اس کا علم تمام تر ظاہری علامتوں اور نشانوں پر مبنی ہوتا ہے جن کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر دیکھتا نہ تھا، ایسے ماہر فن اور ذی فراست اشخاص برابر ہر شخص کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں جس کو جس چیز یا فن میں یہ ملکہ پیدا ہو جاتا ہے اس کی فراست اس کو حاصل ہو جاتی ہے، جرائم کے پتہ لگانے والے ماہرین اور جاسوس اپنے فن کی فراست میں یہ کمال رکھتے ہیں کہ صورت دیکھی اور تاڑ گئے۔ اسی طرح ہر علم وفن کے ماہروں کو اپنے اپنے فن کے اندر یہ ملکہ حاصل ہو جاتا ہے، اخیار اور نیکوکاروں کو اپنی جماعت کے افراد کے پہچان لینے اور جان لینے کی طاقت بھی اسی طرح حاصل ہوتی ہے اور اسی کو ایک حدیث میں ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

((اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله)) [1]

''مومن کے تاڑ لینے سے ڈرو کہ وہ خدا کی روشنی سے دیکھتا ہے۔''

② فراست کے بعد حدس کا درجہ ہے فراست کے ابتدائی مقدمات حواس پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن حدس کے ابتدائی مقدمات ذہنی اور عقلی ہوتے ہیں اور ان ذہنی اور عقلی مقدمات کے غور وفکر، تلاش اور ترتیب سے نتیجہ حاصل ہوتا ہے مگر فطری کمال یا فن کی حاصل کردہ مہارت کے سبب سے غور ونظر، فکر وتلاش اور ترتیب مقدمات کے منطقیانہ مرحلوں کو ذہن رسا اس تیزی اور سرعت کے ساتھ طے کر کے آخری نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ خود اس کو بھی اس کا احساس نہیں ہوتا، کہ اس نتیجہ کے حاصل کرنے میں اس نے کوئی دماغی عمل بھی کیا ہے یہ چیز بھی ایک کامل العقل اور صائب الرائے انسانوں کو فطرۃً عطا ہوتی ہے اور دنیا کے مشہور عقلا اور دانایانِ روزگار کے واقعات میں اس کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔

③ کشف کے لفظی معنی کھولنے اور پردہ اٹھانے کے ہیں مگر اس سے مقصود یہ ہے کہ مادیت کے ظلمانی پردہ کو چاک کر کے مادی چیز روحانی عالم میں مشاہدہ کے سامنے آجاتی ہے وہ کبھی اصلی صورت میں اور کبھی اپنی مثالی صورت میں نظر آتی ہے، عام لوگوں کو سمجھنے کے لیے اس کی بہترین مثال خواب کی ہے فرق اتنا ہے کہ خواب، عالم خواب کی بات ہے اور کشف عالم بیداری کی، جس طرح عام لوگوں کو خواب میں جب ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں ایسی چیزیں معلوم ہوتی ہیں، جو کبھی کبھی عین واقعہ ثابت ہوتی ہیں اسی طرح خاص لوگوں پر بیداری ہی میں ظاہری حواس کے تعطل سے ایسا سماں پیش آتا ہے۔ ہر شخص کے تجربہ میں ایسے متعدد حیرت انگیز واقعات گزرتے رہتے ہیں۔

④ الہام کے لفظی معنی ''دل میں ڈالنے'' کے ہیں اور اس سے مراد وہ علم ہے جو محنت، تلاش، تحقیق، غور اور

[1] جامع ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورة الحجر: ٣١٢٧۔

ترتیب مقدمات کے بغیر دل میں آ جاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس کی صحت بعد کو حسی تجربوں اور عقلی دلیلوں سے بھی ثابت ہو جائے مگر خود وہ علم پہلے پہل ذہن میں کسی حسی تجربہ یا عقلی دلیل کے نتیجہ کے طور پر نہیں آتا بلکہ خود بخود دل میں آ جاتا ہے، کیوں آتا ہے اور کہاں سے آتا ہے؟ اس کے جوابات مختلف ہو سکتے ہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ آتا ہے اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس کی ابتدائی اور معمولی مثالیں وہ خیالات ہیں جو محققین علما، شعرا اور موجدین کے ذہن میں پردۂ عدم سے پہلے پہل آتے ہیں اور وہ ان کو دنیا کے سامنے اپنی ایجادات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

⑤ وحی کے لغوی معنی کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفا اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہے اور اصطلاحاً اس کے معنی خدا کا اپنے دلی منشا سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں یہ علم واطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین جسمانی قسمیں یعنی وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے ذریعہ یقینی ہیں اسی طرح روحانی ذرائع علم کے یہ تین ذریعے کشف، الہام اور وحی انبیا علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں اور جس طرح علم کے مادی ذریعوں میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات۔ اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی، پھر الہام، پھر کشف۔

ہم نے علم کے روحانی ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور پھر کشف یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں اس کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمۂ الٰہی (خدا سے بات کرنا) اور اس کی حسب ذیل تین قسمیں بیان کی ہیں:

① وحی (اشارہ) سے بات کرنا، یعنی دل میں کسی معنی کا بغیر آواز اور الفاظ کے آ جانا اگر یہ حالت بیداری میں ہے تو کشف ہے اگر خواب میں ہے تو رؤیا ہے۔

② خدا کا پردہ کے پیچھے سے بات کرنا یعنی متکلم نظر نہیں آتا مگر غیب سے آواز آتی ہے اور الفاظ سنائی دیتے ہیں اس کو الہام کہہ لو۔

③ فرشتوں کے ذریعہ سے بات کرنا، یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے نظر آتا ہے اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں جن کو نبی سن کر محفوظ کر لیتا ہے اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے دو طریقے وحی کی قسمیں نہیں، وحی کی ان اقسام کا ذکر سورۂ شوریٰ میں ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ

بِإِذْنِهِۦ مَا يَشَآءُ ۚ إِنَّهُۥ عَلِىٌّ حَكِيمٌ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورى: ٥١)

''اور کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی (اشارہ) سے یا، پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے تو وہ خدا کے حکم سے، خدا جو چاہے اس کو وحی کر دیتا ہے، بے شک اللہ بلند حکمت والا ہے۔''

مکالمۂ الٰہی کے یہ تینوں طریقے یعنی وحی (اشارہ) سے بات کرنا، پردہ کے پیچھے سے بات کرنا اور فرشتہ کے ذریعہ سے بات کرنا، وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا اجمالاً مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ منقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے اسی آیت میں دیکھو کہ فرشتہ کے ذریعہ سے کلام کو بھی وحی فرمایا گیا اور تینوں مذکورہ بالا طریقوں میں جس طریقہ سے بھی آنحضرت ﷺ کو غیبی تعلیم واطلاع دی گئی ہے اس کو بھی وحی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ عام مکالمۂ الٰہی کے مترادف بھی مستعمل ہوا ہے:

﴿ وَمَا يَنطِقُ عَنِ ٱلْهَوَىٰٓ ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْىٌ يُوحَىٰ ۝ ﴾ (٥٣/ النجم: ٣، ٤)

''نبی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔''

الغرض اسی امتیاز کے لیے علمی اصطلاح میں ان تینوں طریقوں کے لیے کشف، الہام اور وحی کے تین علیحدہ علیحدہ الفاظ وضع کر دیے گئے ہیں، تا کہ بول چال میں ہر روحانی طریقہ گفتگو دوسرے سے ممتاز ہو جائے بیداری میں اشارہ سے بات کرنا کشف ہے اور خواب کے عالم میں رؤیا ہے، پردہ کے پیچھے سے آواز کا آنا الہام ہے اور فرشتہ کی درمیانگی سے بات کرنا وحی ہے۔ [1]

نکتہ: اوپر کی آیت میں جہاں اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کسی بندہ کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے بات کرے لیکن ان تینوں طریقوں سے، اس کے آخر میں فرمایا ہے کہ وہ سب سے بلند اور حکیم ہے یعنی اس کی بلندی و برتری کا اقتضا تو یہ ہے کہ وہ کسی کو اپنے مکالمہ کے شرف کا مستحق نہ سمجھے مگر اس کی حکمت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اپنے بندگانِ خاص کو عام بندوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے ان تین غیر معمولی طریقوں میں سے کسی طریقہ سے گفتگو فرما لے۔

بہر حال غیبی ذریعہ اطلاع کی یہ سب سے بلند قسم جس کو اصطلاح میں ''وحی'' کہتے ہیں اس کا تجربہ عام لوگوں کو نہیں، لیکن اس سے نیچے درجہ کے غیبی ذرائع اطلاع کا تجربہ ہر شخص کو تھوڑا بہت ہے اور ہر انسان کی زندگی میں جو بعض پر اسرار اور نا قابل فہم واقعات پیش آتے ہیں ان پر غور کرنے سے غیب کے اس اعلیٰ ترین

[1] ان اصطلاحات کی بحث کے لیے اصول فقہ کی اہم کتابوں کی طرف توجہ کرنی چاہیے، کم از کم اس موقع پر تحریر ابن همام المتوفی ۸٦۱ھ کی شرح التقرير والتحبير لابن امير الحاج المتوفى: ٨٧٩ ج ٣، ص: ٤٩٥ مطبوعه اميريه بولاق مصر ۱۳۱۷ھ دیکھنی چاہیے۔

ذریعہ علم کا دھندلا سا خاکہ ذہن میں آ سکتا ہے جس سے غیر جسمانی اور غیر حسی مادی ذرائع علم کے سمجھنے اور باور کرنے میں جو استبعاد معلوم ہوتا ہے وہ دور ہو سکتا ہے خصوصاً اس عہد میں جب سائیکالوجی کی تحقیقات سے نفس کی بہت سی نامعلوم طاقتوں کا پتہ چل رہا ہے اور اسپریچوئلزم کے ذریعہ ارواح سے خطاب وکلام کی سلسلہ جنبانی ہو رہی ہے اور جدید روحانیات کا فن ایک مستقل سائنس کی صورت اختیار کر رہا ہے۔

انبیا علیہم السلام کو اپنے کشف، الہام اور وحی پر اتنا ہی یقین ہوتا ہے جس قدر عام انسانوں کو اپنے وجدانیات، محسوسات، فطریات اور بدیہیات پر، انبیا کا یہ روحانی علم ایسا ہی اندرونی ہوتا ہے جیسا عام انسانوں میں وجدانیات، فطریات اور بدیہیات ومحسوسات کا علم ہوتا ہے جس طرح کسی شخص کو اس علم میں دھوکا نہیں ہو سکتا کہ اس کو بھوک یا پیاس معلوم ہو رہی ہے یا اس کو غم یا خوشی ہے اسی طرح نبی کو بھی اپنے روحانی وجدانیات میں دھوکا نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے فطریات میں یہ مغالطہ نہیں ہوتا کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے اسی طرح اس کو بھی پیغمبرانہ فطریات میں مغالطہ واقع نہیں ہوتا اور جس طرح تم کو اپنے محسوسات میں اگر کسی کو سامنے دیکھ رہے ہو یا کسی کی آواز سن رہے ہو، شبہ نہیں ہوا کرتا، اس کو بھی اپنے روحانی محسوسات میں شبہ نہیں ہوا کرتا غرض وہ اپنے ان جملہ غیبی اور روحانی ذرائع علم میں ہر لغزش، فریب، خطا اور غلطی سے اسی طرح پاک ہوتا ہے جس طرح تم اپنے وجدانیات، فطریات، محسوسات اور بدیہیات میں غلطی اور خطا سے پاک ہوتے ہو۔

علم غیب

اسلام کے عقیدہ میں غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرآن میں بار بار آنحضرت ﷺ کو اس اعلان کی ہدایت ہوئی ہے:

﴿ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۰)

''تو کہہ دے اے پیغمبر کہ غیب خدا کے لیے ہے۔''

﴿ قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (۲۷/ النمل:۶۵)

''کہہ دے کہ آسمانوں میں اور زمین میں خدا کے سوا کوئی نہیں جس کو غیب کا علم ہو۔''

رسول کہتے ہیں:

﴿ وَلَاۤ اَعْلَمُ الْغَیْبَ ﴾ (۶/ الانعام:۵۰) ''اور میں غیب نہیں جانتا۔''

لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر یہ بھی کہا گیا ہے کہ با ایں ہمہ خدا اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے۔

سورۂ جن میں ہے:

﴿ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا ۙ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ ﴾ (۷۲/ الجن:۲۶، ۲۷)

''تو اللہ اپنے غیب کی بات کسی پر ظاہر نہیں کرتا لیکن اس پیغمبر پر جس کو پسند کرے۔''

دوسری جگہ سورۂ آل عمران میں ہے:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ﴾

''اور نہ تھا اللہ کہ غیب کی باتوں پر تم کو مطلع کرتا، لیکن یہ کہ اللہ اپنے پیغمبروں میں سے جس کو چاہے چن لیتا ہے۔'' (۳/ آل عمران:۱۷۹)

ان دو آیتوں میں سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی اطلاع دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں غیب دانی کی کلیتًا اور قطعًا نفی کی گئی ہے اس سے مراد ذاتی اور حقیقی علم ہے یعنی خدا کے سوا بالذات کسی کو غیب کا علم نہیں، البتہ خدا کے واسطہ اور ذریعہ سے اور اس کی تعلیم واطلاع سے پیغمبروں کو اس کا علم حاصل ہوتا ہے ساتھ ہی آیت الکرسی میں فرمادیا گیا:

﴿ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۵)

''اور وہ خدا کے ایک ذرہ علم کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے لیکن اتنے کا جتنے کا وہ چاہے۔''

یعنی اپنے علوم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے وہ ان کو بذریعہ وحی ان سے واقف کرتا رہتا ہے، بایں ہمہ بعض باتوں کی نسبت جیسا کہ سورۂ ہود اور لقمان میں ہے، اللہ تعالیٰ نے قطعی طور سے یہ فیصلہ کر دیا کہ ان کا علم کسی کو نہیں مثلاً: قیامت، بارش، موت، شکم مادر میں لڑکا ہے یا لڑکی کل کیا ہوگا ان باتوں کو خدا تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح بعض آیتوں میں آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اس کا تم کو علم نہ تھا جیسا کہ غزوۂ تبوک میں عدم شرکت کے، بعض عذر خواہ اصحاب کے متعلق سورۂ توبہ میں ہے کہ انہوں نے جھوٹی قسمیں کھا کر اجازت حاصل کر لی خدا نے فرمایا:

﴿ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴾

(۹/ التوبۃ:۴۳)

''خدا نے تجھ سے درگزر کیا کیوں تو نے ان کو اجازت دی، تا آنکہ تجھے معلوم ہو جائے جو سچ بولے اور جھوٹوں کو جان لیتا۔''

﴿ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۴۸)

''انہوں نے پہلے فتنہ پیدا کرنا چاہا اور تیرے سامنے واقعات الٹ دیئے، یہاں تک کہ حق بات آ گئی اور خدا کی بات کھل گئی اور وہ ایسا نہیں چاہتے تھے۔''

آگے چل کر ہے:

﴿ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ ۖ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۱)

''یہ نفاق پر اڑے ہیں، تو ان کو نہیں جانتا ہم جانتے ہیں۔''

ان آیتوں سے یہ واضح ہے کہ پیغمبروں کو غیب کا کلی علم نہیں ملتا بلکہ ان کو غیب کی اطلاع دیے جانے کے موقع کی دونوں آیتوں میں ''رسول'' ہی کا لفظ استعمال کرنا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جن امور غیب کی اطلاع پیغمبروں کو دی جاتی ہے ان کا تعلق فریضۂ رسالت اور اس کی مصلحتوں اور شریعتوں سے ہے۔

غیب کی حقیقت

علم غیب کے اس نادیدہ راستہ میں اتنی منزل طے کر لینے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ قرآن مجید کی اصطلاح میں غیب کس کو کہتے ہیں قرآن مجید کے اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے اس کے اجمالی اور تفصیلی دونوں معنی واضح ہوتے ہیں اجمالاً اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے علم کے عام اور طبعی وفطری ذریعوں سے حاصل نہیں کر سکتا گزر چکا ہے کہ انسانی علم کے طبعی ذریعے وجدان، حواس، اور عقل واستدلال وغیرہ ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا اس کو علم غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیاء کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے غائب ہیں اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس کے معنی حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کو بار بار عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے (۶/ انعام:۷۳، ۱۳/ الرعد:۹، ۵۹/ الحشر:۲۲، ۶۴/ التغابن:۱۸) یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل وہی ہے الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملا ہے۔

تفصیلی حیثیت سے قرآن پاک میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر ہوا ہے:

① ''زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعد کو نہ تو حواس کے ذریعہ ہو سکتا ہے، کہ حواس سے صرف شاہد (سامنے موجود) کا علم ہوتا ہے اور نہ عقل وفکر کے ذریعہ ہو سکتا ہے، اگر ہو سکتا ہے تو تحریر و روایت کے ذریعہ لیکن جس کے لیے تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور سے مسدود ہو اس کے لیے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے تو غیبی ہی ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔''

حضرت نوح علیہ السلام کے مختصر قصہ کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ ۚ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا ۛ ﴾

(۱۱/ ھود:۴۹)

''یہ غیب کی بعض خبروں میں سے ہے ہم ان کو وحی کرتے ہیں تیری طرف، تو، تو ان کو پہلے سے

جانتا ہی نہ تھا اور نہ تیری قوم جانتی تھی۔“

حضرت مریم علیہا السلام کے قصہ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:٤٤)

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے اس کو ہم تیری طرف وحی کرتے ہیں اور نہ تو ان کے پاس موجود تھا جب وہ اپنے قلم (قرعہ کے طور پر) ڈال رہے تھے کہ کون مریم کو پالے اور نہ تو ان کے پاس اس وقت تھا جب وہ جھگڑ رہے تھے۔“

دیکھو کہ محسوس واقعات کے علم کا طبعی طریقہ اس وقت موجود رہ کر دیکھنا اور سننا تھا اس کی آنحضرت ﷺ سے نفی کی گئی کہ آپ وہاں یقیناً اس وقت موجود نہ تھے اب رہ گیا کسی دوسرے انسانی ذریعہ سے سننا اس کی بھی نفی پہلے ہی سے ہے کہ تیری قوم میں سے بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ دوسروں سے معلوم کیا اب اس کا علم جس غیر طبعی طریقہ سے رسول کو دیا گیا وہ وحی کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے پورے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (۱۲/ یوسف:۱۰۲)

”یہ غیب کی خبروں میں سے ہے ہم اس کو تیری طرف وحی کرتے ہیں اور تو اس وقت ان کے پاس نہ تھا جب وہ اپنا کام طے کرنے لگے اور چال چل رہے تھے۔“

اس میں بھی علم شاہد کی نفی کر کے علم غائب کو ثابت کیا گیا بہر حال ان تینوں آیتوں سے واضح ہے کہ ماضی کے واقعات کے غیر طبعی طریقہ علم کو بھی علم غیب کہا گیا ہے۔

② اسی طرح آئندہ مستقبل میں جو واقعات ہونے والے ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی علم غیب کہیں گے۔ قرآن پاک میں ایک موقع پر ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں کے طالب تھے یہ کہا گیا:

﴿ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۰)

”تو کہہ دے کہ غیب کا علم خدا ہی کے لیے ہے، انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔“

مستقبل کے منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا گیا ہے اسی طرح قیامت کو بار بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے علم کی نفی کی گئی ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ عِندَهُۥ عِلْمُ السَّاعَةِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۳٤)

''خدا ہی کے پاس قیامت کا علم ہے۔''

﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ السَّاعَةِ أَيَّانَ مُرْسَاهَا ۖ قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي ۖ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۸۷)

''وہ قیامت کو پوچھتے ہیں کہہ دے کہ اس کا علم میرے پروردگار کے پاس ہے۔''

اسی طرح مستقبل کے دوسرے واقعات کے علم کی بھی انسانوں سے نفی کی گئی ہے:

﴿ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ۖ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ ۚ ﴾

(۳۱/ لقمان:۳٤)

''کوئی نہیں جانتا کہ کل وہ کیا کرے گا اور نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ وہ کس سرزمین میں مرے گا۔''

③ ان چیزوں پر بھی غیب کا اطلاق کیا گیا ہے جو گو ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں، تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہوسکتا ہم کو دیکھنے اور سننے کی طاقت دی گئی ہے مگر اس کے لیے کسی نہ کسی مسافت، عدم حجاب اور دیگر چند شرائط کی قید لگا دی گئی ہے جن کے بغیر ہماری یہ طاقت بالکل بے کار ہے، ہم دلی میں بیٹھ کر بمبئی کے پیش نظر مناظر کو نہیں دیکھ سکتے اور نہ بغیر آلات کے ہم یہاں سے وہاں کی آواز آج بھی سن سکتے ہیں، اس لیے زمانہ حال کے علم کے لیے بھی جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ان کے بغیر جو علم حاصل ہوگا وہ غیب ہوگا۔ حاملہ عورت سامنے موجود ہے مگر اس کے بطن کے پے درپے حجابات کے اندر جن کو آنکھیں چاک نہیں کرسکتیں کیا ہے؟ کس کو معلوم ہے:

﴿ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ ۖ ﴾ (۳۱/ لقمان:۳٤)

''اور اللہ جانتا ہے رحموں کے اندر جو ہے۔''

آسمان و زمین میں اس وقت جو کچھ ہے وہ سب زمانہ حال میں سب کے سامنے موجود ہے، تاہم اس کا علم ہمارے حواس اور عقل کی محدود دسترس سے اس وقت تک باہر ہے جب تک ہمارے دیکھنے اور سننے اور جاننے کے لیے خدا نے جو طبعی شرائط بتا دیے ہیں وہ پورے نہ ہوں:

﴿ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (۱۱/ ہود:۱۲۳)

''اور خدا ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ ﴾ (٤۹/ الحجرات:۱۸)

''بے شک خدا جانتا ہے آسمانوں اور زمین کا غیب۔''

④ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور عقل کے تنگ دائرہ

علم سے قطعاً باہر ہیں ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے، خدا کی رؤیت کی صلاحیت نہیں رکھتے، جنت اور دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں آ سکتی، یہ تمام امور بھی غیب ہیں:

﴿ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۴۹)

''جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں۔''

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳)

''وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں غیب میں۔''

﴿ الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ﴾ (۱۹/ مریم۔۶۱)

''وہ جنت جس کا وعدہ اس مہربان خدا نے اپنے بندوں سے کیا ہے غیب میں۔''

''غیب میں'' کے معنی ہیں، بے جانے، بن دیکھے، حواس سے علم حاصل کیے بغیر اور باوجود اس کے کہ وہ چیزیں اس عالم میں دیکھی نہیں جا سکتی ہیں۔

پیغمبر کو اللہ تعالیٰ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں بعض گزشتہ قوموں اور پیغمبروں کے عبرت انگیز اور نصیحت آموز حالات سے بھی روایت اور تحریر کے ذریعہ کے بغیر وحی کے واسطہ سے ان کو مطلع کرتا ہے جیسا کہ قرآن مجید کے حوالوں سے اوپر گزر چکا، آیندہ مستقبل میں دنیا کے فتنوں، امت محمدیہ کے انقلاب، قیامت کے مناظر اور اس کے بعد پیش آنے والے واقعات کا علم آپ کو دیا گیا، جیسا کہ ان دنیاوی پیشین گوئیوں اور قیامت و محشر کے ان مناظر سے ظاہر ہے جو قرآن پاک اور احادیث صحیحہ میں بتصریح مذکور ہیں، اسی طرح حال کے ان مناظر و احوال کا علم بھی ثابت ہے جو باوجود سامنے موجود ہونے کے احساس و تعقل کے طبعی شرائط نہ پائے جانے کے سبب سے عام انسانوں کو نظر نہیں آتے۔ قبروں کا انکشاف، پس پردہ رؤیت، دوسروں کے سامنے موجود احوال سے واقفیت وغیرہ اس علم غیب میں سے بھی پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اور سب سے آخر میں وہ مغیبات ہیں جن کا احساس و تصور ہمارے مادی ذرائع علم سے قطعاً خارج ہے، تاہم وہ بھی اس کو دکھائے اور بتائے جاتے ہیں خود خدا کا دیدار اور فرشتوں کی رؤیت، جنت و دوزخ کا مشاہدہ وغیرہ ان تمام امور غیب میں سے اللہ تعالیٰ جس رسول کے لیے جس قدر مناسب اور سزاوار سمجھتا ہے اس کا علم وحی کے مختلف اقسام کے ذریعہ سے اس کو عطا فرماتا ہے۔

وحی اور ملکۂ نبوت

حکمائے اسلام نے وحی کی حقیقت ''ملکۂ نبوت'' کے لفظ سے ظاہر کی ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ ترتیب کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات میں علم اور تعقل نے پستی سے بلندی کی طرف رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ جمادات بے حس ہیں ان کے اوپر نباتات ہیں جن میں صرف محدود احساس ہوتا ہے اور وہ دماغی قویٰ

حافظہ، تذکر اور غور وفکر کی قوت سے وہ محروم ہیں۔ ان سے اونچے حیوانات ہیں جن میں یہ تمام قویٰ ناقص طریقے سے نمودار ہوتے ہیں اور آخر میں ان سے بالاتر ہستی یعنی انسان میں جا کر یہ قویٰ پورے کمال میں ظاہر ہوتے ہیں ان قویٰ کی ترقی یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ جس طرح نباتات میں قوت احساس ہے جس سے جمادات محروم ہیں اور حیوانات میں حافظہ، تصور، تعقل وغیرہ کی وہ قوتیں ہیں جو نباتات میں نہیں، انسان میں وہ دماغی و ذہنی قویٰ ہیں، جو حیوانات میں نہیں اسی طرح انبیا میں علم و تعقل کی ایک ایسی قوت موجود ہوتی ہے جو عام انسانوں میں نہیں ہوتی اور اسی کا نام ملکۂ نبوت ہے۔

حواس صرف مادیات کو دریافت کرتے ہیں۔ دماغی قویٰ مادیات سے بلند ذہنیات اور عقلیات کو اور ملکۂ نبوت اس سے بھی اونچا جاتا ہے، وہ ذہنیات وعقلیات سے بلندتر حقائق یعنی غیبیات کو دریافت کرتا ہے۔ اس ذریعہ علم میں غور و بحث اور منطقیانہ فکر ونظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جس طرح وجدانیات، فطریات اور بدیہیات اور محسوسات سامنے آتے ہیں اور انہیں کی طرح وہ یقینی بھی ہوتے ہیں اور چونکہ اس ذریعہ میں علم انسانی کے عام ذریعے اور طریقے یعنی وجدان، فطرتِ نوعی، بداہت اوّلیہ، احساس اور غور وفکر سے معلومات حاصل نہیں کیے جاتے بلکہ خود علام الغیوب وہ علم ان انسانی وسائط کے بغیر ان کو عطا کرتا ہے شرع کی زبان میں اسی کو وحی والہام کہتے ہیں علم کلام کی اصطلاح میں ملکۂ نبوت اور عام محاورہ میں اس کو غیبی علم کہہ لیجئے۔

لیکن اہل نقل کی اصطلاح میں وحی کی یہ صورت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو وقتاً فوقتاً احکام اور ارادوں سے براہ راست فرشتوں کے ذریعہ سے مطلع کرتا رہتا ہے یہی وحی ہے۔

امعان نظر سے معلوم ہوگا کہ اہل عقل ونقل کے اختلاف کا منشا یہ ہے کہ آیا یہ وحی خود پیغمبر کے مافوق اور غیر معمولی وہبی علم وفہم کا نتیجہ ہوتی ہے یا خود براہ راست وقتاً فوقتاً تعلیم ربانی کا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ جس طرح عام انسانوں میں علم وفہم کی قوت آغاز پیدائش ہی میں فطرتاً ودیعت کردی جاتی ہے اسی طرح انبیا میں منشائے الٰہی جاننے کی قوت بھی شروع ہی میں ودیعت کردی جاتی ہے یا یہ کہ فطرتاً ویسے ہی عام انسانی طریقہ کا طبعی علم وفہم رکھتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ نبوت کے بعد اپنے منشائے الٰہی سے ان کو کسی غیبی ذریعہ سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتا رہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت، عقل کی نقل سے اور نقل کی عقل سے علیحدگی میں نہیں بلکہ اتحاد میں ہے، وہ لوگ جو عقل ونقل دونوں کے جامع ہیں وہ ان دونوں کو مجتمع کرتے ہیں۔

ع یار ما ایں دارد وآں نیز ھم

انبیا علیہم السلام میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بدءِ فطرت اور آغاز پیدائش سے ان امور کے متعلق جن کا

ان کی رسالت و نبوت سے تعلق ہے اور جس کو دین کہتے ہیں وہ کلی استعداد اور عمومی فہم ہوتی ہے جس سے غیر انبیا محروم ہیں اور اس پوشیدہ قوت کا عملی ظہور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب وہ نبوت کے منصب پر عملاً سرفراز ہوتے ہیں اسی کا نام ''ملکۂ نبوت'' ہے اور اہم امور دین کے متعلق ان کو وقتاً فوقتاً جو غیبی اطلاع ملتی رہتی ہے اس کا نام ''وحی'' ہے۔

آج کل قرآن فہمی اور عقل کے مدعیوں اور نقل کے لفظی پابندوں میں جو اختلاف ہے وہ دراصل انہیں دو قوتوں کے درمیان تمیز نہ کرنے کا نتیجہ ہے، نقل کے لفظی پابند یہ سمجھتے ہیں کہ ہر لفظ جو نبی کے منہ سے نکلتا ہے وہ اس معنی میں وحی ہے جس معنی میں قرآن ہے کہ وہ براہ راست خدا کی غیب کی اطلاع ہے اور عقل کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن بے شک خدا کی براہ راست وحی ہے مگر اس کے ماسوا رسول جو کچھ کہتا ہے وہ اس کے پیغمبرانہ نہیں بلکہ انسانی و بشری علم وفہم کا نتیجہ ہے لیکن حقیقت ان دونوں کے ماورا ہے جیسے قرآنی وحی براہ راست ہے اسی طرح نبی کے دوسرے احکام اس کے عام انسانی و بشری علم وفہم کا نہیں بلکہ اس کی پیغمبرانہ وہبی قوت علم وفہم کا نتیجہ ہے جو وحی کی ایک دوسری قسم اس لیے کہی جاسکتی ہے کہ اس کا منشا ''ملکۂ نبوت'' کے ذریعہ وحی ربانی کی ترجمانی ہے اس لیے پیغمبر کی وحی اور ملکۂ نبوت دونوں کے احکام واجب الاتباع ہیں۔

کتاب اور سنت

اس تقریر کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر کو جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک وحی حقیقی یعنی وہ علم جس کو اللہ تعالیٰ وقتاً فوقتاً اپنے خاص الفاظ میں پیغمبر پر نازل کرتا رہتا ہے اور جس کے مجموعہ کو کتاب الٰہی، صحیفۂ ربانی، تورات، انجیل، زبور اور قرآن کا نام دیا گیا ہے، دوسرا وہ علم جو پیغمبر کے ملکۂ نبوت یا نور نبوت یا فہم نبوت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا علم اصلی اور دوسرا ضمنی ہے یا یوں کہو کہ پہلا اصولی اور دوسری فروعی ہے یعنی علم اول پیغمبر پر شریعت کے غیر متبدل اور ازلی احکام کلیہ اور مبہمات کو واضح کرتا ہے اور دوسرا علم پہلے علم کے غیر متبدل کلی اصول کے ماتحت اس کے مقصود کی صحیح تشریح اور اس کے جزئیات کی ضروری تفصیل کرتا ہے اور غیر اہم اور متبدل امور کے متعلق ہنگامی اوقات میں مصلحتی احکام بتاتا ہے اور اسی دوسری قسم کا علم ہے جو روایات اور احادیث کی صورت میں ہے اور جس کو اہل اصول اصطلاحاً سنت کہتے ہیں۔ کتاب اصولی احکام ہیں اور سنت ان اصولی احکام کی عملی تشریح اور بیان ہے۔ کتاب براہ راست وحی الٰہی کا نتیجہ ہے اور سنت ملکۂ نبوت اور فہم نبوی کا، کتاب بلفظہٖ وحی ہے اور سنت بالمعنی۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو

بعض علمائے اصول نے کتاب اور سنت دونوں کو وحی مانا ہے اور ان دونوں کے درمیان تفریق یہ کی ہے کہ کتاب اس وحی کا نام ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے اور سنت اس وحی کو کہتے ہیں جس کی تلاوت نہیں کی

جاتی اس تشریح کا مقصود حقیقتاً تلاوت وعدم تلاوت کا فرق نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ کتاب میں معنی کے ساتھ الفاظ بھی وحی کیے گئے ہیں اور وہ الفاظ بھی محفوظ ہیں ان کا حرف حرف اور نقطہ نقطہ ﴿ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾ کی پیشین گوئی میں داخل ہے اور اس لیے اس میں الفاظ کی کمی بیشی اور حذف واضافہ محال ہے اور سنت میں الفاظ کی نہیں صرف معانی کی حفاظت ہے اسی لیے کتاب کی وحی مدون، مکتوب اور محفوظ کی گئی اور نماز میں اس کی قراءت کا حکم ہے اور یوں بھی عام طور سے اس کی تلاوت مسنون ہے اور سنت کی وحی بالفاظہا مقصود نہیں اس لیے اس کی لفظی حفاظت کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی اور نہ نماز میں اس کے الفاظ قراءت کیے جاسکتے ہیں اور نہ ان کی تلاوت کی جاتی ہے اور نہ اس کو کتاب الٰہی کہا جاسکتا ہے مگر معناً اصولی حیثیت سے ان کی حفاظت خود قرآن نے اپنے اندر کر لی ہے اور جزئیات کی حیثیت سے گو الفاظ میں نہیں مگر عمل میں خود رسول اور اس کے پیروؤں اور پھر ان کے پیروؤں کے مسلسل تعامل سے، یہاں تک کہ آج بھی تمام مسلمانوں کے عمل درآمد سے عملی تواتر کی صورت میں محفوظ ہے اور بعد کے اماموں نے اچھی طرح تحقیق کر کے الفاظ اور کتب حدیث کے اوراق میں بھی ان کو محفوظ کر دیا ہے۔

سنت کو وحی کہنا اس لحاظ سے ہے کہ اس کے جزئیات اصولاً وحی حقیقی یعنی کتاب کے اندر داخل ہیں اور اس کی کلیت میں سنت کے تمام احکام مندرج ہیں بنابریں چونکہ سنت، وحی کے کلی منشا کے اندر داخل ہے، وہ بھی ضمنی حیثیت سے وحی کہی جاسکتی ہے لیکن چونکہ اس میں الفاظ کی تعیین خدا کی طرف سے نہیں اس لیے وہ غیر متلو ہے۔ اس فرق کا راز یہ ہے کہ کتاب کی اصلی حیثیت کلی قانون کی ہے قانون کے اصل منشا کی حفاظت اور وضاحت کے لیے نہ صرف اس کے ایک ایک لفظ کے محفوظ رہنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ، شوشہ، وقف، وصل، فصل، عطف، قطع، تقدم، تاخر یعنی آج کل کی اصطلاح میں ایک ایک ڈیش اور کامے کی بعینہٖ حفاظت کی ضرورت ہے، ورنہ ذرا سے تغیر میں قانون کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جاسکتا ہے اور سنت کی یہ کلی قانونی حیثیت نہیں ہے بلکہ وہ اس کلی قانون کی تشریحات، تفصیلات اور جزئیات ہیں جو درحقیقت اس کلی قانون کے اندر مندرج تھے مگر چونکہ عام لوگوں کے فہم میں نہیں آتے تھے یا عام لوگ ان کو نہیں سمجھتے تھے اس لیے صحابہ کے دریافت پر، یا خود حضور ﷺ نے اس کی ضرورت محسوس فرما کر اس کو کھول کر بیان فرما دیا کہ پھر اشتباہ نہ رہ جائے۔

اسی مقام پر ایک نکتہ اور بھی ہے کہ کتاب الٰہی میں جو حکم جن الفاظ میں ادا ہوا ہے وہ اگر بعض کم فہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کی تشریح چاہی یا انہیں نہیں معلوم ہوا کہ اس خاص جزئی واقعہ کا کیا حکم ہے اور قرآن پاک کی کس اصل سے ماخوذ ومستنبط ہوگا اور اس لیے انہوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا، تو اس کے جواب میں اگر آنحضرت ﷺ قرآن پاک کے بعینہٖ انہیں الفاظ کو بے کم وبیش

دہرا دیتے تو یہ بیکار ہوتا کہ انہیں الفاظ کے نہ سمجھ سکنے کے سبب تو سوال کی نوبت آئی اس لیے ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ الفاظ کو بدل کر اور طریقہ تعبیر کو تغیر دے کر ان الفاظ کی تشریح فرمائیں اور یہی احادیث ہیں۔
درحقیقت احادیث میں قانون الٰہی اور کتاب ربانی ہی کے مفہوم ومنشا کو رسول اللہ ﷺ نے سمجھنے کی سہولت، گمراہوں کی تکمیل ہدایت اور اصل منشائے الٰہی کی پوری توضیح اور کہیں پوری تاکید کی خاطر مختلف لفظوں، مختلف عبارتوں اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا ہے اس لیے اصل مفہوم ومنشا کے لحاظ سے احادیث کے معانی ضمناً وحی ہیں لیکن الفاظ، عبارت اور تعبیر کی حیثیت سے یعنی لفظاً وحی نہیں ہیں بلکہ فہم نبوی، اجتہاد نبوی اور ملکۂ نبوت کے غیر خطا پذیر نتائج ہیں اسی لیے ان کو اصطلاح میں ''وحی غیر متلو'' کہتے ہیں۔ ہم اس فرق کی ایک مثال دے کر اپنے مطلب کو زیادہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ قرآن پاک میں والدین کی خدمت اور اطاعت کا حکم ہے اور ساتھ ہی یہ بھی اشارہ ہے کہ والدین کی رضامندی گناہوں کی مغفرت کا سبب ہے [1] یہ وحی الٰہی کا حقیقی منشا ہے آنحضرت ﷺ نے اس منشائے الٰہی کو ان الفاظ اور مختلف تعبیروں سے ادا فرمایا: ''ماں کے پاؤں کے نیچے جنت ہے۔'' [2] کبھی ارشاد ہوا: ''رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔'' [3] ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ فرمایا: ''تیری ماں، تیری ماں، تیری ماں۔'' [4] ایک دفعہ آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے صحابہ رضی اللہ عنہم حضوری کے شرف سے ممتاز تھے کہ زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے: ''وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا، وہ ذلیل ہوا'' حاضرین نے عرض کی، یارسول اللہ! کون؟ ارشاد ہوا: ''وہ جس نے اپنی ماں یا باپ کی ضعیفی پائی اور پھر ان کی خدمت گزاری کر کے جنت نہ حاصل کر لی۔'' [5] ایک اور مجلس میں صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! نیکی کے کاموں میں خدا کو سب سے زیادہ کون سا کام پسند ہے؟ فرمایا: ''وقت پر نماز ادا کرنا۔'' دریافت کیا اس کے بعد، فرمایا: ''ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنا۔'' [6] ان تمام احادیث پر معمولی سی غور وفکر کی نظر بھی یہ راز ظاہر کر دے گی کہ یہ کل حدیثیں ذیل کی آیتوں کی تشریح وبیان ہیں:

﴿ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۳۔ ٤/ النسآء:۳٦)

''ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔''

﴿ فَلَا تَقُلْ لَهُمَا أُفٍّ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآء یل:۲۳)

''وہ بوڑھے ہو جائیں تو اُن کو اُف نہ کہو۔''

---

[1] ٤٦/ الاحقاف:۱٦۔ [2] سنن نسائی، کتاب الجهاد، باب الرخصة فی التخلف لمن له والدة:۳۱۰٦۔
[3] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدین:۱۸۹۹۔
[4] مسلم، کتاب البر والصلة، باب بر الوالدین:٦۵۰۰۔ [5] مسلم، کتاب البر والصلة، باب رغم انف من ادرك ابویه ...الخ: ٦۵۱۰، ٦۵۱۱۔ [6] بخاری، کتاب الادب، باب البر والصلة:۵۹۷۰۔

﴿ وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ ﴾ (٤٦/ الاحقاف:١٦)

''یہ (ماں باپ کے خدمت گزار) وہ ہیں جن کی بدیوں سے ہم درگزر کرتے ہیں۔''

یہی حال دوسرے قرآنی احکام کے بیانات وتشریحات کا ہے۔ [1]

احادیث قرآن کا بیان ہیں

قرآن پاک اور احادیث دونوں پر جن کی عمیق اور وسیع نظر ہے ان کو یہ برملا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث صحیحہ کے تمام فرعی اور ثانوی احکام قرآن پاک کے عمومی اور کلی احکام کے تحت میں مندرج ہیں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں صرف ان کی تشریح فرمائی ہے اس قسم کی حدیثوں کی عموماً تین شکلیں ہیں ایک وہ جن میں آنحضرت ﷺ نے اپنے الفاظ میں حکم بیان فرمانے کے بعد خود قرآن پاک کی کوئی آیت اس کے ساتھ پڑھ دی اس قسم کی حدیثوں کے بیان ہونے میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ دوسری شکل یہ ہے کہ آپ نے آیت نہیں پڑھی مگر خود اس حکم میں ایک دو لفظ ایسے فرما دیے ہیں جو کسی آیت کا جزو ہیں جس سے یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ حکم فلاں آیت کی تشریح ہے اس صورت میں بھی اصل وفرع کی تمیز اہل علم کے لیے آسان ہے۔ تیسری شکل یہ ہے کہ آپ نے کسی آیت یا اشارہ کے بغیر صرف حکم بیان فرما دیا ہے اس قسم کی حدیثوں کے ماخذ کی تلاش دقت نظر کا کام ہے ان کا پتہ زبان نبوت اور فہم رسالت کے طرز واسلوب کے سمجھنے والے راسخین فی العلم ہی پاسکتے ہیں۔

الہام واجتہاد وحکمت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الرسالہ میں احادیث وسنن کی تین قسمیں بیان کی ہیں، ایک وہ جو بعینہٖ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دوسری وہ جو قرآن پاک کے مجمل حکم کی تشریح ہیں۔ تیسری وہ جن کا ذکر (بظاہر) قرآن پاک میں نہ تفصیلاً ہے نہ اجمالاً، یہی تیسری قسم قابل بحث ہے۔ امام صاحب نے اس کے متعلق ائمہ سلف کے چار نظریے نقل کیے ہیں: [2]

① اللہ تعالیٰ نے رسول کی کلی اطاعت فرض کی ہے اور اس کے علم میں پہلے ہی سے یہ ہے کہ رسول جو کچھ کہے اور کرے گا اس میں رضائے الٰہی کی توفیق اس کے ساتھ شامل ہوگی (حاصل یہ ہے کہ پہلے ہی رسول کو یہ توفیق ربانی عنایت کی گئی ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو دریافت کرلے)

---

[1] مجھے پہلے یہی شبہ تھا کہ میں اس رائے میں منفرد ہوں مگر بحمد اللہ کہ تلاش وتفحص سے ثابت ہوا ہے کہ دیگر متعدد علمائے اصول کا یہی مسلک ہے چنانچہ یہ خیال اجمالاً سب سے پہلے امام شافعی کی کتاب الرسالۃ ، ص: ٢٨۔ ٢٩۔ ٦٢ میں اور یہ نظریہ سب سے زیادہ مفصل امام شاطبی اندلسی المتوفی ٧٩٠ھ کی اہم تصنیف الموافقات فی اصول الاحکام، ج١، ص: ١٧٥ ، ٢٢١ مطبعۃ سلفیۃ مصر ١٣٤١ھ میں موجود ہے اور شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغۃ میں بھی اس کا ایک باب ہے۔

[2] کتاب الرسالۃ امام شافعی، ص: ٣٨۔

② رسول نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا ہے جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو۔ (مقصود یہ ہوا کہ اس قسم کے احکام بھی دراصل کتاب اللہ ہی سے ماخوذ ہیں گو بظاہر کم بینوں کو ایسا نظر نہ آئے)

③ تمام احادیث نبوی القائی الروع ہیں (یعنی رسول ﷺ کے دل میں خدا نے ڈال دیے ہیں) اور یہ اس حکمت کا نتیجہ ہیں جو آپ کے دل میں ڈالی گئی۔

④ اس قسم کے تمام امور جو احادیث میں ہیں کتاب الٰہی سے جداگانہ، مستقل پیغام ربانی کے ذریعہ رسول کو معلوم ہوئے ہیں۔

چوتھے نظریہ کو چھوڑ کر بقیہ تین آراء میرے خیال میں تقریباً ایک ہی ہیں۔ پہلے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ صریح وحی کے علاوہ جو وقتاً فوقتاً نبی پر آتی رہتی ہے اس کو ابتدا ہی سے ایک توفیق ازلی عنایت ہوتی ہے جس سے وہ پیش آمدہ امور میں رضائے الٰہی کو دریافت کر کے فیصلہ کرتا ہے، تیسرے نظریہ میں اسی توفیق علم کو الہام، القائی الروع اور دل میں ڈال دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور دوسرے نظریہ کا منشا یہ ہے کہ رسول کے جو احکام بظاہر کتاب اللہ میں نہ ہوں ان کی اصل بھی درحقیقت کتاب اللہ میں ہے اور رسول اسی اصل سے اپنے احکام کو مستنبط کرتا ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ استنباط عام انسانی و بشری فہم سے نہیں ہوتا ورنہ اس کا غلطی سے پاک ہونا مشتبہ رہے گا بلکہ وہ پیغمبرانہ قوتِ فہم کا نتیجہ ہوگا اور جب ایسا ہے تو اس پیغمبرانہ قوتِ فہم کی تعبیر خواہ الہام سے کرو، القا سے کرو یا اس کو حکمت نبوی کا نتیجہ کہو یا توفیق الٰہی کہو بات ایک ہی ہوئی۔

میرے نزدیک صحیح مسلک یہ ہے کہ رسول کے تمام صحیح ربانی احکام بھی عموماً اس کے صحیفۂ ربانی سے ماخوذ و مستنبط ہیں اور ان کے جزئیات کتاب الٰہی کے کلیات کے تحت میں مندرج ہیں اور رسول کا یہ اخذ، استنباط اور فہم اس کی پیغمبرانہ قوت علم کا نتیجہ ہیں جس کو حکما، ملکۂ نبوت اور اہل شرع، حکمت، الہام اور شرح صدر وغیرہ الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور جو خطا اور غلطی سے یکسر پاک ہے۔

اجتہادِ نبوت

اس موقع پر علمائے اصول کی ایک اور اصطلاح اجتہاد نبوی کی تشریح ضروری ہے، علمائے اصول لکھتے ہیں کہ جب کوئی نیا واقعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش آتا اور وحی نازل نہ ہوتی تو آنحضرت ﷺ اجتہاد فرماتے یعنی گزشتہ وحی شدہ احکام کے تطابق سے آپ حکم دے دیتے تھے (یہ فقہا کا طریقہ تعبیر ہے ورنہ یوں کہنا چاہیے کہ رسول اپنی اس حکمت ربانی کے فیض سے مدد لے کر جو خدا نے ان کے سینہ میں ودیعت رکھی تھی گزشتہ وحی کے کلیات کی روشنی میں اس کا فیصلہ فرماتے تھے) بہر حال خواہ فقہا کے طریقہ پر اجتہاد نبوی کو نصوص قرآنی سے مستنبط سمجھیے یا شاہ ولی اللہ صاحب کے نظریہ کے مطابق رسول کے علمِ سینہ اور وحی شدہ اصول کلی کے جزئیات تسلیم کیجیے، ہر حال میں وہ نتیجہ امت کے لیے واجب العمل اور خطا سے پاک ہے کیونکہ یہ

مقدمہ اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ انبیا گناہوں سے معصوم، ضلالت و گمراہی سے پاک اور ہوائے نفسانی سے مبرا ہوتے ہیں اس لیے امور رسالت اور امور دین میں ان کی کوئی رائے غلط نہیں ہو سکتی کہ ان کی غلطی سے پوری امت کا غلطی پر قائم ہو جانا مسلم ہے، حالانکہ ان کی بعثت کی غرض ہدایت ہے، ضلالت نہیں، ان وجوہ سے ان کا اجتہاد اگر کبھی کسی ایسے نتیجہ پر پہنچ جائے جو مصلحت الٰہی کے مطابق نہیں ہوتا تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ اس پر تنبیہ فرما کر ان کو اپنی مرضی سے مطلع فرما دیتا ہے (اس کی مثالیں آیندہ آئیں گی) الغرض بعض امور میں خیر کے کسی خاص پہلو کو پیش نظر رکھ کر اس سے بہتر پہلو سے تغافل ہونے، یا غیب اور مستقبل سے عدم واقفیت کے سبب سے نبی کا اجتہادی خطا کرنا ممکن ہے مگر اس خطا پر نبی کا قائم رکھا جانا ناممکن ہے ایسی صورت میں نبی کا ہر ایسا اجتہادی حکم جس پر وحی الٰہی نے فوراً کوئی تنبیہ نہیں کی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ حکم علم الٰہی کے منشا کے مطابق اور خطا و غلطی سے مبرا ہے اور اس کے دوسرے معنی وحی خفی یا باطنی وحی کے ہیں۔ [1]

میری رائے میں یہ اصطلاح بھی معناً گزشتہ اصطلاحوں کے قریب قریب ہے اس لیے اس اجتہاد نبوی کے معنی الہام، حکمت، ملکۂ نبوت، فہم نبوی وغیرہ گزشتہ اصطلاحات سے عملاً الگ نہیں کہ اس کی حیثیت بھی وحی ثانوی کی قرار پا جاتی ہے۔

اس مبحث پر شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں جو خیال ظاہر فرمایا ہے اس کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

---

[1] سطور بالا میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے حوالہ کے لیے دیکھو شرح تحریر ابن همام المتوفی ۸۶۱ھ مسمی به التقریر والتحبیر للعلامه ابن امیر الحاج المتوفی ۸۷۹ھ ج ۳، ص: ۲۹۴، ۲۹۹ مطبعه امیریه مصر ۱۳۱۷ھ اور التلویح فی کشف حقائق التنقیح و التوضیح فی حل غوامض التنقیح، ج ۲، ص: ۴۵۲ مطبع مکتبه صنائع قسطنطنیه ۱۳۱۰ھ بحث الرکن الثانی فی السنة۔

ساتواں مبحث: احادیثِ نبوی سے شریعت کے اخذ کرنے میں

علوم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقسام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو روایتیں حدیث کی کتابوں میں جمع کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں:

① ایک تو وہ جن کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اور یہ آیت:

﴿ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ﴾ (۵۹/ الحشر:۷)

''پیغمبر تم کو جو کچھ دے اس کو لے لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آؤ۔''

اسی قسم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

علوم معاد یعنی قیامت اور آخرت کے احوال یہ جزا و سزا اور عجائب الملکوت (یعنی دوسرے عالم کے احوال و کیفیات) اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان سب کا دارومدار صرف وحی پر ہے اور ان اصول کے مطابق جن کا ذکر اوپر گزر چکا قوانین شریعت اور عبادات و معاملات کی جزئیات کا ضبط بھی اسی قسم میں داخل ہے، لیکن ان میں سے بعض چیزوں کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد بھی وحی کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو غلط رائے قائم کرنے سے محفوظ رکھا ہے اور یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کا ہر اجتہاد کسی خاص نص و آیت سے استنباط کا نتیجہ ہو، جیسا کہ خیال کیا جاتا ہے بلکہ آپ کے اجتہاد کی زیادہ تر صورت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شریعت اور وضع قانون کے مقاصد، انسانوں کی آسانی اور بھلائی اور اصولی مقاصد کا قانون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم کر دیا تھا وہ مقاصد، جن کا ماخذ وحی تھا آپ اس کلی و اصولی قانون کے ذریعہ سے جو آپ کو سکھایا گیا تھا ان کی تشریح فرمایا کرتے تھے۔ حکمت کی متفرق باتیں اور عام مصلحتیں جن کے لئے آپ نے نہ کوئی وقت مقرر کیا نہ ان کے حدود بتائے مثلاً: اخلاق صالحہ اور اخلاق غیر صالحہ کا بیان بھی تبلیغ رسالت سے تعلق رکھتا ہے لیکن ان میں اکثر کا دارومدار اجتہاد پر ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے آپ کو باہمی معاملات و اجتماع کا کلی قانون تعلیم کر دیا تھا اور آپ نے حکمت کی باتیں اسی کلی قانون سے جو آپ کو تعلیم کر دیا گیا تھا مستنبط کیں اور ان کے متعلق ایک کلیہ بنایا، فضائلِ اعمال اور ان پر عمل کرنے والوں کے مناقب بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے خیال میں ان میں بعض کا دارومدار وحی پر اور بعض کا اجتہاد پر ہے، ان قوانین کا بیان اوپر گزر چکا ہے اور ہم اسی قسم کی شرح کرنا اور ان کے معانی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

② دوسری وہ روایتیں ہیں جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''میں صرف ایک آدمی ہوں جب میں تمہارے دین کے متعلق تم کو کوئی حکم دوں تو اس پر عمل کرو اور جب میں تم کو اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو یہ سمجھو کہ میں صرف ایک آدمی ہوں۔'' اور چھوہاروں کے جوڑ لگانے کے واقعہ میں

آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ ''میں نے ایک خیال قائم کیا تھا، میرے خیال پر تم لوگ عمل نہ کرو البتہ جب خدا کی کوئی بات بیان کروں تو اس پر عمل کرو کیونکہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا۔'' اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔ طب کے متعلق حدیثیں اور آپ کا یہ ارشاد کہ ''تم سیاہ رنگ اور ایسے گھوڑے پر سوار ہو جس کی پیشانی میں تھوڑی سی سفیدی ہو۔'' اسی قسم میں داخل ہے اور اس کا دارومدار تجربہ پر ہے۔

آپ نے جو کچھ عادتاً کیا، عبادت نہیں، اتفاقاً کیا قصداً نہیں وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔ آپ نے جو واقعات ایسے بیان کئے جن کا تمام قوم میں چرچا تھا مثلاً: ام زرع اور خرافہ کے قصے وہ بھی اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی بات کو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جب ان سے چند لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں بیان کرنے کی درخواست کی اس طرح بیان کیا کہ ''میں آپ کا پڑوسی تھا اور جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی تو آپ مجھ کو بلا بھیجتے تھے اور میں آپ کے حکم سے اس کو لکھا کرتا تھا لیکن جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر فرماتے تھے اور جب ہم آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے تو کیا میں ان تمام چیزوں کو بطور حدیث بیان کروں؟''

اسی میں وہ چیزیں بھی داخل ہیں جن کو آپ ﷺ نے اپنے زمانہ کے جزئی و عارضی مصلحت کے طور پر کیا ہے اور وہ تمام امت کے لئے ضروری نہیں مثلاً: فوجوں کی آراستگی اور جنگی علامت کی تعیین کے وہ احکام جن کو خلیفہ دیتا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے کہ ''اب ہم کو حج میں اکڑ کر چلنے کی کیا ضرورت؟ ہم ایک قوم (کفار قریش) کے سامنے اس کی نمائش کرتے تھے لیکن اب خدا نے ان کو ہلاک کر دیا'' بھی یہی معنی ہیں کہ وہ اس کو ایک خاص جزئی و عارضی مصلحت سمجھتے تھے لیکن چونکہ اپنے اس اجتہاد پر پورا اطمینان نہ تھا اس لئے ان کو یہ خوف ہوا کہ شاید اس کا سبب کوئی اور ہو اس لئے اس میں دست اندازی نہیں کی اسی طرح دوسرے احکام بھی اسی پر محمول کئے گئے ہیں مثلاً: آپ کا یہ ارشاد کہ ''جو شخص جس کو قتل کرے اس کا ہتھیار اسی کا حق ہے۔'' نیز آپ کے مخصوص فیصلے بھی اسی قسم میں داخل ہیں کہ آپ مقدمات کے ان فیصلوں میں گواہوں اور قسموں کے مطابق فیصلے کرتے تھے آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو یہ فرمایا تھا کہ ''واقعہ میں حاضر جو کچھ دیکھتا ہے اس کو غائب نہیں دیکھتا۔'' اس کے معنی بھی یہی ہیں۔ [1]

شاہ صاحب کے نظریہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ارشادات کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن کا تعلق پیغمبرانہ فرائض، تبلیغ رسالت اور مہمات امور دین سے ہے یہ تمام باتیں براہ راست وحی و تعلیم الٰہی سے ماخوذ ہیں۔ دوسری وہ جو عام انسانی باتیں ہیں، اس کی متعدد صورتیں ہیں:

[1] حجة الله البالغة، ج ١، ص: ١٠٢۔

① کسی جزئی عارضی مصلحت کی بنا پر کوئی حکم جیسے حج میں آپ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ قریش کے سامنے اکڑ کر سعی کریں، تاکہ قریش یہ نہ سمجھیں کہ مدینہ کی آب وہوا نے ان کو کمزور کر دیا ہے۔

② وہ امور جن کو دین ورسالت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں بلکہ زمانہ کے حالات کے ساتھ وہ بدلتے رہتے ہیں مثلاً: جنگ کا طریق، ہتھیار کے اقسام، حکومت کے صیغوں کی ترتیب وغیرہ۔

③ وہ امور جن کو آپ اپنی شخصی، قومی یا ملکی عادت کے مطابق کرتے تھے جن کو دین ورسالت سے کوئی واسطہ نہیں مثلاً: وضع ولباس، فرش پر نشست، کمبل اوڑھنا، دسترخوان، چمچوں کا عدم استعمال، عمامہ باندھنا، تہبند پہننا، اونٹ پر سوار ہونا وغیرہ۔

④ وہ امور جو عرب میں بطور قصہ کے مشہور تھے اور آپ نے بھی ان کو اسی طرح تفنن طبع کے لئے یا کسی اخلاقی نتیجہ کی خاطر بیان فرمایا مثلاً: ام زرع اور اس کی نو سہیلیوں کی کہانی، خرافہ کی داستان، بنی اسرائیل کی بعض حکایتیں۔

⑤ عربوں کے بعض تجربی مسلمات اور علاج ومعالجہ کی بعض باتیں۔

⑥ زراعت وغیرہ کے متعلق بعض ذاتی رائیں، مثلاً: مدینہ میں قاعدہ تھا کہ فصل کے موقع پر نر چھوہاروں کے پھول مادہ چھوہاروں کے درختوں میں ڈالے جاتے تھے آپ نے یہ طریقہ دیکھا تو اس کو محض رسمی بات سمجھ کر فرمایا کہ ''اگر ایسا نہ کرو تو کیا ہو۔'' مدینہ والوں نے آپ کے اس ہلکے سے اشارہ کو حکم کے طور پر مانا اور اس سال یہ ترکیب چھوڑ دی نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال پیداوار کم ہوگئی لوگوں نے آ کر عرض کی، فرمایا: ''میں نے ایسا خیال کیا تھا، ((انتم اعلم بامور دنیاکم)) [1] کہ تم اپنے دنیاوی کاروبار اور معاملات سے زیادہ واقف ہو۔'' یہ امور تغیر اور ردوبدل کے قابل ہو سکتے ہیں۔

الغرض یہ وہ امور ہیں جن میں رسول کے ارشادات کی حیثیت انسانی باتوں کی ہے لیکن ان کے دوسرے امور جن کا تعلق دین ورسالت ونبوت سے ہے مثلاً: عقائد، عبادات، اخلاق اور اخبار معاد اور معاملات کے بعض ضروری حصے یہ سب کے سب وحی اور تعلیم ربانی سے ہیں جو دائمی اور ناقابل تغیر ہیں۔

ان ناقابل تغیر امور کی تعلیم واطلاع کی دو صورتیں ہیں ایک براہ راست وحی الٰہی جو وقتاً فوقتاً پیغمبر کی تعلیم واطلاع کے لئے خدا کی طرف سے آیا کرتی تھی اور دوسری اجتہاد نبوی۔ یہاں بحث اسی دوسری چیز سے ہے شاہ صاحب اس کے متعلق دو باتیں فرماتے ہیں:

① یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت وحقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص

[1] مسلم، كتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ماقاله شرعا: ٦١٢٦ تا٦١٢٨؛ ابن ماجه، ابواب الرهون، باب تلقيح النخل: ٢٤٧٠، ٢٤٧١؛ مسند احمد بن حنبل، ج٣، ص: ١٥٢۔

نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبروں کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور سے شریعت کے کلی اصول وقواعد کا علم، منصب نبوت کے ساتھ عطا فرما دیا ہے اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح، احکام منصوصہ کی تفصیل، کسی کل' کے جزئیات مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں فرما دیا کرتے تھے۔

② پیغمبروں کا یہ اجتہاد، دوسرے عام انسانی مجتہدین کے اجتہادات کے برخلاف خطا وغلطی سے یکسر پاک ومنزہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے خطا وغلطی پر باقی رکھے جانے سے محفوظ بنائی گئی ہے، اس لئے ''ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی بمنزلہ وحی کے ہے۔''

''پیغمبرانہ اجتہاد'' کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش نظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ دوسرے لوگ ملکۂ نبوت، الہام، القا، حکمتِ ربانی، فہم نبوی سے جو کچھ مراد لیتے ہیں اس میں اور ''اجتہاد نبوی'' میں عملاً کوئی فرق نہیں ہے کہ اس اجتہاد سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ خاص پیغمبر کے سینہ میں ودیعت رکھتا ہے اسی لئے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظ کی مشارکت ہے معنی کی نہیں مزید بحث آگے آئے گی۔

ایک نکتہ کی طرف یہاں اور اشارہ کر دینا ہے، آنحضرت ﷺ کے سوا اور جتنے صاحبِ کتاب انبیا آئے ان کی وحی کتاب اور نتائج حکمت نبوی میں فرق وامتیاز باقی نہیں رہا چنانچہ توراۃ وانجیل وزبور میں یہ سب باتیں ملی جلی ہیں، جیسا کہ ان کے پڑھنے سے ہر شخص کو نظر آ سکتا ہے مگر محمد رسول اللہ ﷺ چونکہ آخری اور غیر منسوخ کتاب لے کر آئے تھے اس لئے آپ کی کتاب کی ہر طرح حفاظت کی گئی اور ہر تخلیط اور آمیزش سے محفوظ رکھی گئی بلکہ اسی لئے آغاز اسلام میں آپ نے نتائج حکمت نبوی ﷺ کی تحریر سے لوگوں کو باز رکھا، تاکہ کتاب کے ساتھ ان کی آمیزش نہ ہو بعد کو جب یہ خطرہ باقی نہ رہا تو اکثروں کے نزدیک یہ ہے کہ آپ نے ان کی تحریر کی اجازت دے دی اور بعض متشدد صحابہ اور علما کے نزدیک یہ اجازت مخصوص لوگوں کے لئے تھی، عام نہیں، لیکن یہ اختلاف تحریر وکتابت میں ہے ان کی صحیح طور سے حفاظت وروایت وتبلیغ میں نہیں، اس لئے اس خدمت کو تمام صحابہ نے، تابعین، تبع تابعین اور تمام علمائے صالحین نے ہمیشہ ادا کیا۔

عصمت اور بے گناہی

نبی ﷺ کی تیسری اہم خصوصیت اس کی معصومی اور بے گناہی ہے یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں، اس لئے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں۔ عیسائیوں میں صرف ایک مسیح علیہ السلام کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے اس کے نزدیک تمام انبیا اور رسول گناہوں سے پاک اور معصوم تھے ان سے بتقاضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی وحی سے ان کی ان

غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے، نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہوسکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جاسکتا، اسی لئے اسلام نے اس عقیدہ کا بھی بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام پیغمبروں کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کے سوانح میں شامل کر دیا ہے۔

عرب کے مشرکوں کا یہ عقیدہ تھا کہ کاہن جو غیب کا حال بتاتے ہیں اور شاعر جو پر جوش اور پرتاثیر کلام نظم کرتے ہیں یہ شیطانوں سے سیکھ کر بتاتے اور کرتے ہیں اور یہی بات وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی نسبت بھی (نعوذ باللہ) کہتے تھے، قرآن نے ان کے جواب میں کہا درخت اپنے پھل سے اور شے اپنے آثار سے پہچانی جاتی ہے:

﴿ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَٰنٌ عَلَى ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝ إِنَّمَا سُلْطَٰنُهُۥ عَلَى ٱلَّذِينَ يَتَوَلَّوْنَهُۥ وَٱلَّذِينَ هُم بِهِۦ مُشْرِكُونَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:٩٩، ١٠٠)

”شیطان کا زور ایمان والوں پر نہیں چلتا اور نہ ان پر، جو اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، اس کا زور انہیں پر چلتا ہے جو اس سے دوستی کرتے ہیں، اور اپنے رب کا شریک ٹھہراتے ہیں۔“

اس کے بعد آخر تک اس خیال کی تردید کی ہے اور پھر خاتمہ اس پر ہے:

﴿ وَٱصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِٱللَّهِ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِى ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ۝ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلَّذِينَ ٱتَّقَوا۟ وَّٱلَّذِينَ هُم مُّحْسِنُونَ ۝ ﴾ (١٦/ النحل:١٢٧، ١٢٨)

”اور صبر کر اور تیرا صبر کرنا بھی خدا ہی کی مدد سے ہے اور نہ تو ان پر غمگین ہو اور نہ ان کے فریب سے تنگدل ہو، بے شک خدا ان کے ساتھ ہے، جو پرہیزگار ہیں اور جو نیکوکار رہیں۔“

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ انبیائے کرام شیطانوں کے فریب سے آزاد، متقی، پرہیزگار اور نیکوکار ہوتے ہیں۔ سورۂ شعراء میں اسی شبہ کا جواب تمام پیغمبروں کے حالات کو سنا کر آخر میں یہ کہہ کر دیا ہے:

﴿ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ ٱلشَّيَٰطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ ٱلسَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَٰذِبُونَ ۝ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢٢١۔٢٢٣)

”کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتے ہیں، ان پر اترتے ہیں، جو جھوٹ گھڑتے ہیں، گناہگار ہوتے ہیں (لوگوں کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ وہ غیب کی باتیں سن رہے ہیں) کان میں ڈال لیتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔“

سورۂ جاثیہ میں مخالفین کے جواب میں کہا گیا:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يَسْمَعُ آيَاتِ اللَّهِ تُتْلَىٰ عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا ۖ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ ﴾ (٤٥/ الجاثية:٧، ٨)

''پھٹکار ہواس پر جو جھوٹ گھڑنے والا گناہگار ہے، خدا کی آیتوں کو جو اس کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں، وہ سنتا ہے اور پھر اپنے غرور پر اڑا ہی رہتا ہے گویا کہ اس نے سنا نہیں، تو اس کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔''

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام جھوٹ گھڑنے والے اور گناہگار نہیں ہوتے کہ اگر ایسے ہوں تو فرشتوں کے بجائے وہ شیطانوں کے قرین و رفیق ثابت ہوں اور ان کی سچائی اور صداقت مشتبہ ہو جائے اور نیز یہ کہ نبوت کی حقیقت کذب و گناہگاری کے صریح منافی ہے۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ ﴾ (٣/ آل عمران:٧٩)

''اس آدمی کے جس کو اللہ کتاب اور فیصلہ اور نبوت دے، یہ شایان نہیں کہ وہ لوگوں سے کہے کہ خدا کو چھوڑ کر میرے بندے ہو جاؤ۔''

یعنی پیغمبروں کی دعوت کا منشا خدا کی بندگی کا اعلان ہے نہ کہ لوگوں کو اپنا بندہ اور پرستار بنانا اور یہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہوتا۔

اور ایک آیت میں فرمایا:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَغُلَّ ۚ وَمَن يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ۝ أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَن بَاءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۝ هُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٦١۔١٦٤)

''کسی پیغمبر کا یہ کام نہیں، کہ وہ جو کچھ چوری سے چھپا لے اور جو کوئی چھپا لے گا قیامت کے دن لے کر اس کو حاضر ہوگا، پھر اس وقت ہر شخص کو اس کے کام کا پورا بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہ ہوگا، کیا جو خدا کی خوشنودی کی پیروی کرے، وہ اس کے جیسا ہو سکتا ہے، جو خدا کا غضب کمائے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ برا ٹھکانا ہے، انسانوں کے خدا کے نزدیک کئی درجے ہیں اور خدا ان کے کام سے خبردار ہے بے شبہ اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں ایک ایسے

رسول کو بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک و صاف بناتا اور کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ بے شک اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

ان آیتوں میں گو ہر نبی سے غلول (مال چھپانے) کی نفی کی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کے مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں، مگر خصوصیت کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے، کیونکہ اللہ کی رضا مندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور جو دوسروں کو احکام الٰہی سنائے خود اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک و صاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گناہگار و ناپاک نہیں ہو سکتا۔

انبیا علیہم السلام کے لئے بار بار قرآن نے ''چن کر پسند کرنا'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو سرتاسر ان کی عصمت اور گناہوں سے محفوظ و پاک رہنے پر دلالت کرتا ہے، عام پیغمبروں کے متعلق یہ آیت ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۵)

''خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر کو چن کر پسند کرتا ہے اور آدمیوں سے۔''

☆ چند مخصوص پیغمبروں کی شان میں ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾

(۳/ آل عمران:۳۳)

''اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام اہل دنیا پر چن کر پسند کیا۔''

☆ خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ﴾ (۲/ البقرہ:۱۳۰)

''ہم نے اس کو دنیا میں چن کر پسند کیا۔''

☆ حضرت موسیٰ کی نسبت فرمایا:

﴿ اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۴۴)

''میں نے تجھ کو اپنے کلام اور پیغاموں کے لئے لوگوں پر چن کر پسند کیا۔''

ایک آیت میں پیغمبروں کے لئے اصطفاء کے ساتھ خیر (بہتر اور نیکوکار) کی صفت ظاہر کی گئی ہے:

﴿ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ ۝ اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۝ ﴾

(۳۸/ ص:۴۵۔۴۷)

''ہمارے خاص بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو یاد کرو جو ہاتھوں (قوت عمل) اور آنکھوں (قوت علم) والے تھے ہم نے ان کو آخرت کی خالص نصیحت کے لئے خالص کیا اور وہ ہماری بارگاہ میں چنے ہوئے نیکوکاروں میں تھے۔''

سورۂ انبیاء میں اکثر پیغمبروں کے تذکرہ کے بعد فرمایا:

﴿ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۝ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۲، ۷۳)

''ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو وہ پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کو راہ دکھاتے تھے اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے کی اور نماز کھڑی کرنے اور زکوٰۃ دینے کی وحی کی اور وہ ہمارے پرستار تھے۔''

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ امام و پیشوا اور صالح اور خدا کے پرستار بنائے گئے۔

سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر سب کو صالح فرمایا گیا:

﴿ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۸۵) ''یہ سب صالحوں میں تھے۔''

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۸۶)

''ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔''

پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا:

﴿ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (۶/ الانعام:۸۷)

''اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔''

صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

شقی و سعید اور گناہگار و نیکوکار دونوں کی سیرتوں اور زندگیوں کا فرق اتنا نمایاں ہے کہ ان میں التباس و اشتباہ ممکن نہیں، تاریخ و سیر کی خاموش اور خلق کی گویا زبانیں چیخ چیخ کر اس فرق و امتیاز کی منادی کرتی رہتی ہیں، اس اصول کو قرآن پاک نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ ﴾ (۴۵/ الجاثیۃ:۲۱)

''کیا وہ جو گناہوں کے مرتکب ہیں، یہ گمان کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان کی طرح جو ایمان لائے

اور اچھے کام کیسے بنائیں گے، ان دونوں کی زندگی اور موت یکساں ہو، یہ ان کا فیصلہ کتنا برا ہے۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ان دونوں کی زندگی اور موت دونوں ممتاز ہوتی ہیں۔

انبیا علیہم السلام کے وصف میں فرمایا:

﴿ اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَ یَخْشَوْنَهٗ وَ لَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۹)

''جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔''

آنحضرت ﷺ کے اہل بیت اور بیویوں کو جو عزت اور شرف حاصل ہے، وہ نبوت و رسالت ہی کی نسبت سے ہے۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی شان میں ہے:

﴿ یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَیْتُنَّ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۲)

''اے پیغمبر کی بیویو! تم عام عورتوں میں سے کوئی ایک نہیں ہو، اگر تم متقی ہو۔''

پھر اہل بیت نبوی کو خطاب کر کے فرمایا کہ ارادۂ ربانی یہ ہے کہ وہ تم کو برائی سے پاک اور صاف ستھرا بنائے:

﴿ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۳)

''اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی کو دور کر دے، اے نبی کے گھر والو! اور تم کو بالکل صاف ستھرا بنا دے۔''

ظاہر ہے کہ اگر انبیا علیہم السلام کے ازواج و اولاد کی شرافت کے لیے گناہ اور بدی کی نجاست مخل ہے تو خود انبیا علیہم السلام کا کیا ذکر ہے۔ ایک دوسری آیت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت سے بری کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَ الْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثٰتِ ۚ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَ الطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبٰتِ ۚ اُولٰٓىِٕكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا یَقُوْلُوْنَ ﴾ (۲۴/ النور:۲۶)

''گندیاں، گندوں کے واسطے اور گندے، گندیوں کے لئے اور ستھریاں، ستھروں کے واسطے، اور ستھرے، ستھریوں کے واسطے، یہ ان کی تہمت سے پاک ہیں۔''

یہاں طیب، پاک اور ستھرے سے ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ کی طرف اشارہ ہے اور اسی ستھرے

پن، پاکی اور طہارت سے ازواج مطہرات کے اخلاقی ستھرے پن، پاکی اور طہارت پر استدلال کیا گیا ہے۔

انبیاء درحقیقت مقتدیٰ اور پیشوا اور نمونہ بن کر اس دنیا میں بھیجے جاتے ہیں، اسی لئے فرمایا:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۲۱)

''تمہارے لئے خدا کے رسول میں اچھی پیروی ہے۔''

نیز ان کی اطاعت واجب ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (٤/ النسآء:٦٤)

''ہم نے کوئی نبی نہیں بھیجا لیکن اس لئے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔''

اور خاص آنحضرت ﷺ کی نسبت تصریح ہے کہ آپ کی پیروی، خدا کا محبوب بننے کا مستحق ٹھہراتی ہے:

﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳/ آل عمران:۳۱)

''اگر تم خدا کو چاہتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو چاہے گا۔''

کیا کسی گناہگار اور عصیاں کار کی زندگی، پیروی، اتباع اور نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہے، تاریکی سے کبھی روشنی نکلی اور گندگی سے پاکی کبھی پیدا ہوئی اور گناہگاروں کی دعوت سے کبھی نیکوکاری پھیلی ہے؟ برائی اور گناہگاریوں کا اصلی سرچشمہ اور منبع شیطان یا انسان کی خود قوت شر ہے لیکن خدا کے خاص بندے اس کے دام فریب سے آزاد ہیں:

﴿ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ۭ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۶۵)

''یقیناً میرے بندوں پر تیرا (اے شیطان) کوئی زور نہیں، تیرا پروردگار اپنے بندوں کی طرف سے سب کچھ کر دینے کو بس ہے۔''

کیا انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کوئی بندۂ رب ہو سکتا ہے؟

انسانوں کی گمراہی اور عصیان کاری، وسوسہ شیطانی کا نتیجہ ہوتی ہے، خواہ یہ شیطان خود اپنے دل کے اندر (خناس) چھپا ہو، یا انسان اور جن کی صورت میں ہو، ہر ایک کے فتنہ سے ان کی ذات پاک اور بلند ہے۔

آنحضرت ﷺ کو بعض خود غرض لوگوں نے بعض مشوروں میں پھسلانا چاہا مگر خدا نے پھسلنے نہ دیا اور فرمایا کہ میری رحمت اور مہربانی تجھ پر مبذول ہے، وہ ہر وقت تیری دستگیر ہے اور گمراہی سے تیری نگہبان ہے اور کتاب الٰہی اور حکمت و دانائی جو تجھے عطا ہوئی وہ تیری پاسبان ہے:

﴿ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ۭ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ۭ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١١٣)

''اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل اور مہربانی نہ ہوتی، تو ایک گروہ نے تیرے گمراہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے آپ کو اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور اس نے وہ سکھایا ہے جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل ہے۔''

اور یقیناً موقع ومحل کی شہادت سے اس سب سے بڑے فضل سے یہاں مراد عصمت ہے۔

خود نفس انسانی بھی اپنی جھوٹی تمناؤں اور خود غرضانہ آرزوؤں اور خوش نما خیالوں سے لوگوں کو دھوکا دیتا ہے لیکن انبیا علیہم السلام اس فریب تمنا سے بھی پاک ہیں، بشریت کے اقتضا سے یہ تو ممکن نہیں کہ خود اپنے مشن اور جس دعوت حق کو لے کر وہ آئے ہیں اس کی جلد از جلد کامیابی اور لوگوں کے بسرعت قبول ایمان کے متعلق ان کے دل میں تمنائیں اور آرزوئیں نہ پیدا ہوتی ہوں لیکن وہ مصلحت الٰہی کے مطابق نہیں ہوتیں اس لئے اللہ تعالیٰ ان خیالات اور تمناؤں کو ان کے دلوں سے نکال دیتا ہے اور اپنے فیصلہ کو برجا رکھتا ہے، فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴾

(۲۲/ الحج:۵۲)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا، لیکن یہ کہ جب وہ خیال باندھتا ہے، تو شیطان اس کے خیال میں کچھ ملا دیتا ہے، تو خدا شیطانوں کی ملاوٹ کو مٹا دیتا ہے اور اپنے حکموں کو مضبوط کر دیتا ہے اور خدا دانا اور حکمت والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام علیہم السلام غلط خیال آرائی کے گناہ سے بھی محفوظ رکھے جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے:

﴿ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ ﴾ (۵۳/ النجم:۲)

''(اے مسلمانو!) تمہارا، صاحب نہ گمراہ ہوا نہ بھٹکا۔''

اس عدم گمراہی اور عدم ضلالت کا تعلق کسی خاص عہد اور وقت سے نہیں ہے بلکہ اس آیت میں آنحضرت ﷺ کے ہر عہد سابق اور زمانہ ماضی سے ضلالت اور غوایت کی پوری نفی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ آپ کا دامن سدا ان کانٹوں سے پاک رہا۔

بعض شبہات کا ازالہ

قرآن پاک میں بعض ایسے الفاظ ہیں جن سے ایک ظاہر بین کو یہ دھوکا ہو سکتا ہے کہ بعض پیغمبروں کے دامن پر عدم معصومیت کے بھی داغ ہیں مگر علمائے محققین نے ان میں سے ہر ایک شبہ کا تشفی بخش جواب دے

دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ علامہ ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ نے الفصل فی الملل والنحل (جلد چہارم) میں اور قاضی عیاض مالکی رحمۃ اللہ نے شفاء (قسم ثالث، باب اول) میں، خفاجی رحمۃ اللہ نے شرح شفاء (جلد چہارم) میں اور متاخرین میں مُلّا دوست محمد کابلی رحمۃ اللہ نے تحفۃ الاخلاء فی عصمۃ الانبیاء میں ایک ایک شبہ کو پوری طرح رد کیا ہے جس سے ظاہر بینی کا پردہ آنکھوں کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور اصل حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے ان میں سے ہر شبہ کا ذکر کرنا اور اس کا رد کرنا ایک طویل عمل ہے مختصرً ااصولی طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس مسئلہ میں جو غلط فہمیاں کسی کو پیش آتی ہیں ان کے دو اسباب ہیں اور ان اسباب کی تشریح کر دینا ہی ان غلط فہمیوں کو دور کر دینا ہے۔

① سب سے پہلی بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ انبیا علیہم السلام کا پایہ بندوں میں بلکہ تمام مخلوقات میں خواہ کس قدر بلند ہو اور ان کا دامن گناہ وعصیاں کے گرد وغبار سے کتنا ہی پاک ہو، تاہم اس ذوالجلال والاکرام کے سامنے ان کی حیثیت ایک عبد، ایک بندہ اور ایک عاجز مخلوق کی ہی ہے ایک عبد وغلام خواہ کس قدر اطاعت کیش، کتنا ہی وفا شعار اور مطیع وفرمانبردار ہو، تاہم اپنے آقا کے سامنے اس کو اپنے قصور کا معترف، اپنی تقصیر کا مقر، اپنی کوتاہیوں پر خجل اور اپنی فروگزاشتوں پر نادم ہی ہونا چاہیے۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی نیکی اور پاکی کی شہادت سے قرآن بھرا ہوا ہے، وہ خدا کی عظمت وجلال اور اس کی رحمت وشفقت کے ذکر میں فرماتے ہیں:

﴿ وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓـَٔتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۸۲)

''اور وہ خدا جس سے جزا کے دن اپنی بھول چوک کی معافی کی پوری امید رکھتا ہوں۔''

نبی کا یہ اعتراف واقرار اور خجالت وندامت اس کا نقص نہیں بلکہ اس کی بندگی اور عبودیت کا کمال ہے اور آقا کو حق پہنچتا ہے کہ اس کے غلام، اطاعت وفرمانبرداری کے جس حیرت انگیز رتبہ تک بھی پہنچتے ہیں وہ ان سے اطاعت کیشی اور وفا شعاری کے اس سے بھی بلند رتبہ کا مطالبہ کرے کہ اس کے دربار میں ان کے عروج و ترقی کی کرسی اور بھی اونچی ہوتی جائے بعض آیتوں میں اگر کسی پیغمبر کو خدا سے مغفرت مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس کا سبب گناہ کا وجود نہیں بلکہ ہر قدم پر گزشتہ رتبہ اطاعت پر قناعت کر لینے پر تنبیہ اور مزید اطاعت کا مطالبہ ہے، تاکہ وہ اس کے مزید تقریب کا ذریعہ بن سکے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب ہوتا ہے:

﴿ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝ ﴾ (۱۱۰/ النصر:۱ تا ۳)

''جب اللہ کی مدد آ چکی اور (مکہ) فتح ہو چکا اور لوگوں کو اللہ کے دین میں گروہ در گروہ جاتے دیکھ چکا تو اپنے پروردگار کی پاکی بیان کر اور اس سے معافی چاہ کہ وہ بندے کے حال پر رجوع کرنے والا ہے۔''

غور کرو کہ خدائی مدد آنا، مکہ فتح ہونا، بت پرستی کی بیخ کنی اور لوگوں کا مسلمان ہو جانا کوئی جرم ہے جس سے کوئی معافی چاہے، اسی طرح سورۂ فتح میں فرمایا:

﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۙ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۙ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝ ﴾

(۴۸/ الفتح: ۱۔۳)

''ہم نے تجھ کو کھلی فتح دی، تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی خطا کو معاف کرے اور اپنا احسان تجھ پر پورا کرے اور تجھ کو سیدھی راہ چلائے اور تجھ کو مضبوط مدد دے۔''

دوبارہ غور کرو کہ مکہ کی فتح کامل نصیب ہونے کو حضور کی معافی سے بجز اس کے کیا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کے حسن خدمت کو قبول فرما کر اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتا ہے۔

اس استغفار سے مقصود نعوذ باللہ پیغمبر کی گناہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ اس کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کے خدا کے بیٹے ہونے کے عیسائی اور فرشتے جن کے خدا کی بیٹیاں ہونے کے اہل عرب قائل تھے اور ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے، ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ ﴾ (۴/ النسآء: ۱۷۲)

''مسیح علیہ السلام کو ہرگز اس سے عار نہ آئے گا، کہ وہ خدا کا بندہ ہو اور نہ مقرب فرشتوں کو اور جو اس کی بندگی سے عار کرے گا اور بڑائی چاہے گا تو خدا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔''

اس سے مقصود نعوذ باللہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین نہیں بلکہ ان کی عبدیت اور بندگی کا اعلان ہے۔

الغرض انبیا علیہم السلام کا خدا کے حضور میں اپنی کوتاہی کا اعتراف، ان کی گناہگاری کا ثبوت نہیں بلکہ ان کی عبدیت کاملہ کا اظہار ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا کسی پیغمبر کی نسبت یہ فرمانا کہ میں نے تجھے معاف کیا، اس کی گناہگاری کا اعلان نہیں، بلکہ اپنی پسندیدگی، رضا اور قبولِ تام کی بشارت ہے۔ سورۂ فتح کی جو آیتیں اوپر گزریں ان کو پڑھو تو ظاہر ہوگا کہ چونکہ بت پرستی کی آلائش سے مکہ کی تطہیر اور کل جزیرۂ عرب میں حق و باطل کی تمیز مکہ کی فیصلہ کن فتح پر موقوف تھی اس لئے جب وہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کی مسلسل کوششوں اور جاں فروشیوں سے حاصل ہوئی تو خدا نے اعلان فرمایا کہ آج اس فتح سے نبوت کے فرض کی اور تجھ پر میرے سلسلۂ احسانات کی تکمیل ہوئی، پھر خدا آپ سے صراط مستقیم کی طرف ہدایت کا اور اپنی زبردست مدد کا وعدہ کرتا ہے حالانکہ ان میں سے ہر چیز آپ کو پہلے ہی عنایت ہو چکی تھی، کیا فتح مکہ سے پہلے آپ صراط مستقیم یعنی اسلام پر نہ تھے یا آپ کو زبردست مدد نہیں مل چکی تھی، یہ سب مرتبے حاصل تھے، مگر ان باتوں کے یہاں ذکر سے اللہ

تعالیٰ کا مقصود یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح اپنی مزید رضا مندی کا اظہار فرمائے اور رسول کی اگلی پچھلی تمام فروگزاشتوں پر (اگر ہوں) خطِ عفو پھیرنے کا اعلان کر کے ان کو نیا خلعتِ فاخرہ عطا اور نئے مراتب جلیلہ عنایت کرے۔ عبدیت کاملہ کا یہی راز و نیاز ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ میں نمایاں ہے، ایک سردار ان کو ''اے نیک استاذ!'' کہہ کر خطاب کرتا ہے اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں:

''تو کیوں مجھ کو نیک کہتا ہے کوئی نیک نہیں؟ مگر ایک یعنی خدا۔'' (لوقا ۱۸، ۱۹)

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس فقرہ سے کسی کا یہ قیاس کرنا کہ وہ نیک نہ تھے کس قدر غلط ہوگا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اپنی مشہور دعا میں یہ کہنا کہ

''اور جس طرح ہم اپنے قرض داروں کو بخشتے ہیں تو اپنا دین ہم کو بخش دے۔'' (متی ۔ ۶، ۱۲)

ان کی گناہگاری کی دلیل نہیں بلکہ عبدیتِ کاملہ کے اظہار کا ثبوت ہے۔

نکتہ: عربی زبان میں گناہ کے لئے مختلف الفاظ ہیں، مثلاً: ذنب، اثم، حنث، جرم وغیرہ، ان میں سے ذنب کے سوا دوسرے الفاظ کا اطلاق اس حقیقی گناہ پر کیا جاتا ہے جو بالقصد اور جان بوجھ کر کیا جائے لیکن ذنب کا اطلاق ہر غلط فعل پر ہوتا ہے خواہ وہ جان بوجھ کر کیا جائے، یا بن جانے غلط فہمی سے ہو یا سوچ سمجھ کر بھول چوک سے ہو، یا قصداً اور ان کاموں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو درحقیقت عام امت کے لئے گناہ نہیں لیکن انبیا کے حق میں اتنی غفلت بھی مواخذہ کے قابل ہے، اسی معنی میں کہا گیا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین (نیکوں کی نیکیاں، مقربین کی برائیاں ہیں)۔

ع جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل بھی ہے

انبیا علیہم السلام کے استغفار کے موقع پر ہمیشہ ''ذنب'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جرم، اثم یا حنث کا نہیں، ذنب کا لفظ بھول چوک اور غفلت سے لے کر عصیاں تک کو شامل ہے [1] اس لئے کسی نبی کو اگر خدا کی طرف سے استغفار ذنب کی ہدایت کی گئی تو اس کے معنی صریح عصیان و گناہ کے نہیں، بلکہ یہی انسانی بھول چوک اور فروگزاشت ہے جس کی اصلاح و تنبیہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم و لطف عنایت سے فرماتا رہتا ہے اور اسی کے لئے استغفار کا حکم ان کو ہوتا رہتا ہے۔

اسی سے ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بھول چوک اور بلا ارادہ غفلت گو امت کے حق میں

[1] اس فرق کو عام لغت نویسوں نے ملحوظ نہیں رکھا ہے، مگر جن علمائے لغت نے الفاظ کے فرق پر کتابیں لکھی ہیں، انہوں نے اس کی تصریح کی ہے، ہم یہاں پر بیروت کے مشہور عیسائی لغت نویس وادیب الاب ہنریکوس لامنس کی کتاب فرائد اللغة فی الفروق کی عبارت نقل کرتے ہیں، الاثم الذنب الذی یستحق العقوبة علیه ولا یصح ان یوصف به المجرم، وبین الاثم والذنب فرق من حیث ان الذنب مطلق الجرم عمدًا کان او سهوًا بخلاف الاثم فانه مایستحق فاعله العقاب، فیختص بما یکون عمدًا، والحنث ابلغ من الذنب، لان الذنب یطلق علی الصغیرة، والحنث علی الکبیرة والجرم لایطلق الاعلی الذنب الغلیظ، (ص: ۹۶، ۹۷) مطبوعه کاثو لیکیه، ۱۸۸۹ء۔

قابل مواخذہ نہیں، مگر انبیا علیہم السلام کے بلند مرتبہ کے لحاظ سے یہ چیزیں بھی گرفت میں آتی ہیں کیونکہ ان کا قول و فعل شریعت بن جاتا ہے اس لئے شریعت کی حفاظت کے لئے ان کے ہر قول وفعل کی حفاظت بھی ضروری ہے اس بنا پر اگر ان سے احیانًا کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے تو فوراً اس پر تنبیہ کی جاتی ہے اور ان کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ان کی یہ چیز معاف کر کے ان کو بشارت سنا دی جاتی ہے اور اس طرح ہر چھوٹے بڑے دانستہ اور نادانستہ تمام گناہوں سے ان کا دامن پاک وصاف رکھا جاتا ہے:

﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۷)

''تو آدم نے اپنے رب سے چند باتیں سیکھ لیں تو وہ اس کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۲)

''پھر خدا نے آدم کو برگزیدہ کیا پھر اس کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿ لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۱۷)

''یقیناً اللہ نبی کی طرف رجوع ہوا۔''

﴿ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۸۸)

''پھر ہم نے یونس کی دعا قبول کی اور اس کو غم سے رہائی دی۔''

﴿ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ ﴾ (۴۸/ الفتح:۲)

''تا کہ اللہ تیری اگلی پچھلی سب فروگزاشت معاف کرے۔''

کامل اور عام عفو ومغفرت کا یہ مرتبہ بلند خود بندہ کی زندگی میں انبیا علیہم السلام کے سوا کسی دوسرے کو نصیب نہیں۔

② انبیا کی معصومیت کے مسئلہ میں غلط فہمی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ انبیا کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعل کا جو فرق ہے اس کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا، علم اور جہل، ضلالت اور ہدایت اضافی الفاظ میں سے ہیں، علم کی ہر حد کو، علم کے مافوق درجہ کے لحاظ سے جہل اور ہدایت کے بلند سے بلند رتبہ کو اس سے بھی اوپر کے مرتبہ کے لحاظ سے ضلالت کہہ سکتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت زندگیوں میں قوت اور فعلیت کا فرق ہے جس طرح تخم میں تمام برگ وبار پوشیدہ ہوتا ہے لیکن وہ اس وقت درخت نہیں ہوتا اور نہ اس میں تنا، شاخیں، پتے، پھول اور پھل ہوتے ہیں اور نہ اس کا عالم پناہ سایہ ہوتا ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب وہی تخم بڑھ کر ایک نیا درخت بن جاتا ہے، اس کے پتے آنکھوں میں ہریالی پیدا کرتے ہیں، اس کے پھول مشام جان کو معطر کرتے ہیں، اس کے پھل کام ودہن میں شہد ٹپکاتے ہیں، اس کے سایہ میں تھکے ماندے مسافر آرام پاتے ہیں، اسی طرح

نبوت کی سابقہ اور لاحقہ زندگیوں میں عظیم الشان فرق ہے اور اسی فرق کی بنا پر اس کی قبل از نبوت زندگی ظہور نبوت کے بغیر تاریکی اور ضلالت اور بعد کی زندگی نور اور ہدایت معلوم ہوتی ہے، جس طرح عام افراد کی زندگی اسلام وایمان کے بغیر ضلالت اور اسلام وایمان کے بعد ہدایت بن جاتی ہے، اسی طرح انبیا علیہم السلام کی زندگی ان کی نظر میں نبوت کے بغیر ضلالت اور نبوت کے بعد ہدایت ہوتی ہے، غرض یہ ہے کہ ظہور نبوت سے پہلے کا زمانہ ان کی ضلالت کا اور بعد کا زمانہ ان کی ہدایت کا عہد کہلاتا ہے لیکن ضلالت اور ہدایت کا یہ مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جو غیر انبیا کے حق میں مستعمل ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں آنحضرت ﷺ پر اپنے احسانات گناتا ہے فرماتا ہے:

﴿ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآىِٕلًا فَاَغْنٰى ۝ ﴾

(۹۳/ الضحیٰ:۶۔۸)

''کیا اللہ نے تجھ کو یتیم نہ پایا، پھر پناہ دی اور اس نے تجھ کو بھولا پایا، تو راہنمائی کی اور تجھ کو محتاج پایا، تو بے نیاز کیا۔''

سطور بالا سے ظاہر ہے کہ یہاں ہدایت سے نبوت اور ضلالت سے قبل نبوت کی زندگی مراد ہے جو نبوت کے بعد کی زندگی کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہی ہے۔

''ضلالت'' کے معنی عربی میں صرف صریح گمراہی ہی کے نہیں بلکہ نادانستہ بھولنے، بھٹکنے اور غفلت کرنے کے بھی ہیں۔ عورتوں کی شہادت کے موقع پر ہے:

﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۲)

''کہ بھول جائے ایک عورت تو یاد دلادے اس کو دوسری۔''

ایک اور آیت میں علم الٰہی کی تعریف میں ہے:

﴿ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۵۲)

''نہ چوکتا ہے میرا رب نہ بھولتا ہے۔''

ان آیتوں میں لفظ ضلالت کا استعمال بتاتا ہے کہ "ضـــــال" کے معنی عربی میں اور محاورۂ قرآن میں صرف گمراہ کے نہیں، بلکہ بھول چوک کے بھی ہیں، اسی طرح اس حالت کے بھی ہیں جس میں گمراہی گو گمراہی معلوم ہوتی ہے لیکن ہنوز ہدایتِ الٰہی کا نور اس کے سامنے نہیں چمکا، غلطی کا احساس ہوتا ہے، مگر اس غلطی کی جگہ ہنوز صحت نظر نہیں آتی، جہل کی برائی تو معلوم ہوگئی ہے مگر ہنوز علم کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور یہی قبل نبوت کی کیفیت ہوتی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی نبوت سے پہلے ایک ستم شعار قبطی کو گھونسہ مارا تھا، جس کے صدمہ سے وہ اتفاقاً مر گیا تھا، نبوت پا کر جب لوٹے تو فرعون نے ان کو طعنہ دیا کہ تم تو میرے فراری مجرم ہو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا:

﴿ فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۰)

''میں نے اس حالت میں کیا تھا، کہ میں چوکنے والوں میں سے تھا۔''

اس چوک اور ضلالت سے مقصد صرف یہی ہے کہ اس وقت میں نبوت کی عزت سے سرفراز نہ تھا ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت سے پہلے کوئی گمراہی کی بات نہیں کی تھی نہ بت کو پوجا تھا نہ فرعون کو سجدہ کیا تھا، نہ کوئی اور شرک کیا تھا، کسی کے طمانچہ مارنے سے اتفاقیہ کسی کمزور کا مرجانا مارنے والے کا بالقصد گناہ نہیں جس کو ضلالت کہیں، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اپنے کو اس وقت ضال کہنے سے مراد نبوت سے سابقہ زندگی ہے اس قبل نبوت کی زندگی کو بعد نبوت کی زندگی کے لحاظ سے جسے یہاں ''ضلالت'' کہا گیا ہے دوسری جگہ اس کو ''غفلت'' (بے خبری) سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں آپ کو خطاب ہے:

﴿ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ (۱۲/ یوسف:۳)

''ہم تجھے بہترین قصہ سناتے ہیں، کیونکہ ہم نے تیری طرف یہ قرآن اتارا، اگرچہ اس قرآن کی وحی سے پہلے تو بے خبروں میں تھا۔''

اس بے خبری کے عالم کی تفسیر دوسری آیت میں ہے، جس میں پیغمبر کی قبل از نبوت اور بعد از نبوت کی زندگی کا فرق ظاہر فرما دیا ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾

(۴۳/ الشوریٰ:۵۲)

''اور اسی طرح ہم نے اپنے (خلوت خانہ) راز سے ایک روح تیری طرف وحی کی، تو نہیں جانتا تھا کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان، لیکن ہم نے اس کو نور بنا دیا جس سے جس کی چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے راہنمائی کرتے ہیں اور بے شک تو سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

''کتاب و ایمان'' کے نور ہدایت ملنے سے پہلے کی یہی وہ کیفیت و حالت ہے جس کو کہیں ضلالت اور کہیں غفلت کہا گیا ہے، اس سے مقصود حقیقی گناہگار، عصیان کاری اور باطنی گمراہی نہیں ہے بلکہ طلب حق تلاش معرفت اور انتظار حقیقت ہے کہ وہی ان کے حق میں ضلالت اور غفلت کا حکم رکھتا ہے آخر وہ وقت آتا ہے جب روشنی چمکتی ہے، روحانی سکون کا چشمہ بہتا ہے اور منزل رسی کے بعد دوسروں کی راہنمائی کا منصب عطا ہوتا ہے

یہ ہدایت کا دور ہے چنانچہ ایک موقع پر انبیا علیہم السلام کے نبوت ملنے کو ہدایت کے لفظ سے ادا فرمایا گیا ہے:

﴿ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۚ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوحًا هَدَيْنَا مِن قَبْلُ ﴾ (٦/ الانعام:٨٤)

''اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب علیہما السلام بخشے اور ان میں ہر ایک کو ہدایت دی اور ان سے پہلے نوح کو ہدایت دی۔''

اس ہدایت دینے سے اگر نبوت عطا کرنا مراد ہے تو ظاہر ہے کہ عدم نبوت کا عہد ''ضلالت'' ہی کہلائے گا مگر اس سے مقصد صرف وہ حالت ہوگی جس میں ان کو ہنوز نبوت نہیں ملی تھی اور اس مرتبہ بلند کا انتظار تھا۔

اس تشریح سے یہ واضح ہو گیا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے حق میں ضلالت سے مقصود گناہگاری، عصیان کاری اور گمراہی نہیں بلکہ عدمِ نبوت کا دور اور رسالت کی زندگی سے پہلے کا عہد ہے جو نبوت اور رسالت کی ہدایت کے مقابلہ میں نسبتاً ضلالت ہے۔

نبی کی بشریت

نبی کی معصومیت اور اس کے دوسرے مقدس خصوصیات کے باوجود اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ نبی خدا کا مخلوق، خدا کا بندہ اور آدمی ہی ہوتا ہے، وہ خدا، خدا کا اوتار، دیوتا یا فرشتہ نہیں ہوتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت محمد رسول اللہ ﷺ سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی اور آپ کے فیض علم سے وہ روشن ہوئی، اسلام سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے اہل مذہب بھی تھے جو پیغمبروں کو ایک پیشین گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے، وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے اور وہ بداخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے، وہ کفر بھی کرتے تھے، تاہم وہ پیغمبر سمجھے جاتے تھے، دوسری طرف عیسائی بھی تھے جو اپنے ''نجات دہندہ'' کو انسانیت سے پاک، خود خدا، یا خدا کا جزو یا ناسوت ولاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنے راہنماؤں کو دیوتا اور اوتار یعنی مجسم خدا یا انسان کے بھیس میں خدا سمجھتے تھے اور جن کو ہر قسم کی خدائی طاقتیں حاصل تھیں۔

اسلام نے اپنی تعلیم ان دونوں کے وسط میں پیش کی، وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق محض، صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ تسلیم کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو خدا کا برگزیدہ، معصوم، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پا کر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں خیالات کی جو غلط فہمی پر مبنی ہیں، علانیہ تردید کرتا ہے اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں اور عیسائیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی راہنمائی کے لئے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے، قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے اور کہا ہے کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے، تو فرشتہ کو ان کے پاس

رسول بنا کر بھیجا جاتا، اور انسانوں میں فرشتہ بھی آتا تو انسانیت ہی کے پیکر میں آتا تو ایسی حالت میں تم اس فرشتہ کو فرشتہ کب مانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبروں کے دُورخ ہوتے ہیں ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں دوسری طرف وہ اپنی روحانیت، بے گناہی، پاک دامنی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ یہودیوں کی طرح جن کی نظر ان کے انسانی رخ پر پڑتی ہے وہ ان کو ہر طرح معمولی انسان سمجھتے ہیں اور عیسائیوں کی طرح جن کی نظر ان کے مافوق انسانی خصائص پر پڑتی ہے وہ ان میں الوہیت کے اوصاف ثابت کرنے لگتے ہیں حالانکہ حق ان دونوں کے بیچ میں ہے وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی بنا پر مافوق البشر ہوتے ہیں یہی مغالطہ اپنے اپنے پیغمبروں کے متعلق کفار کو ہوتا تھا۔ پیغمبران کے سامنے جب اپنی نبوت اور خدا کی طرف سے آنے کا دعویٰ پیش کرتے تھے تو وہ ان کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، تم خدا کے قاصد اور پیامبر کیسے ہو سکتے ہو؟ چنانچہ کفار نے بار بار پیغمبروں سے کہا:

﴿ أَبَعَثَ اللَّهُ بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۹۴)

''کیا خدا نے بشر کو قاصد (رسول) بنا کر بھیجا۔''

وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿ هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۹۳)

''میں تو نہیں ہوں مگر انسان رسول۔''

ان کو شبہ تھا کہ کیا گمراہ انسانوں کی انسان ہی رہنمائی کر سکتا ہے:

﴿ أَبَشَرٌ يَهْدُونَنَا ﴾ (٦٤/ التغابن: ٦) ''کیا انسان ہماری راہنمائی کریں گے۔''

یہ وہی شبہ تھا، جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت سے منکر ہوئے کہ موروثی گناہ گار انسان کو انسان کا بیٹا کیونکر نجات دلا سکتا ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ انسان موروثی گناہگار نہیں بلکہ وہ گناہگار بھی ہو سکتا ہے اور بے گناہ بھی، بے گناہی اور معصومیت کے لئے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں، یہی بات اور کفار کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی، اور انبیا علیہم السلام کو ظاہری اور جسمانی طور سے اپنی ہی طرح انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور کہتے تھے:

﴿ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (١٤/ ابراهيم: ١٠)

''تم تو نہیں ہو، لیکن ہماری ہی طرح ایک بشر۔''

دوسروں کو نبی کے انکار کرنے پر اس طرح آمادہ کرتے تھے کہ

﴿ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳) ''نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔''

﴿ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۲٤)

''نہیں ہے یہ لیکن تمہاری ہی طرح بشر۔''

انبیا کے سامنے وہ یہی دلیل پیش کرتے تھے:

﴿ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (۲٦/ الشعرآء:١٥٤) ''تم تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔''

﴿ مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ﴾ (۳٦/ یٰسٓ:١٥) ''تم لوگ تو ہماری ہی طرح بشر ہو۔''

اور وہ اپنے اس دعویٰ کی صداقت کو بداہت اور مشاہدہ سے ثابت کرتے تھے:

﴿ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا ﴾ (۱۱/ ھود:۲۷) ''ہم تو تم کو اپنی ہی طرح بشر دیکھتے ہیں۔''

انبیا علیہم السلام نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ ہاں تمہاری ہی طرح ہم بشر ہیں لیکن خدا کے فضل و کرم سے سرفراز ہیں اور یہی تم میں اور ہم میں فرق ہے۔ فرمایا:

﴿ قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ﴾

(١٤/ ابراهيم:١١)

''ان کے رسولوں نے جواب دیا کہ ہم تمہاری ہی طرح بشر ہیں، لیکن خدا اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے احسان کرتا ہے۔''

ان کفار کی نظر صرف ان کے ایک رخ یعنی عام انسانی پہلو پر پڑتی تھی، انبیا علیہم السلام نے جواب میں اس پہلو کے ساتھ اپنے دوسرے رخ کو بھی ان کے سامنے پیش کر دیا اور کہا کہ ہاں ہم انسان ہیں لیکن ایسے انسان جن پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بارش ہے یعنی نبوت سے سرفراز اور اس کی خصوصیتوں سے ممتاز ہیں۔

دوسرے نبیوں کی طرح ختم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ بار بار ارشاد فرمایا بلکہ وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان کر دیا کہ ''کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی اور بشر ہوں۔'' اس اعلان نے جو درحقیقت اس غلط عقیدہ کے مٹانے کے لئے تھا جو انبیا علیہم السلام کی شان الوہیت کے متعلق عیسائیوں کے اثر سے لوگوں میں پھیل گیا تھا اور افسوس ہے کہ اس قسم کا غلط خیال اس نبی کی اُمت کے ایک گروہ میں بھی پایا جاتا ہے جو دنیا میں خدا کی توحید کامل کا مبلغ بن کر آیا تھا، دوسری طرف اس اعلان سے ایک تفریط پسند گروہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ پیغمبر اور عام انسانوں میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں اور نہ پیغمبروں کو عام انسانوں پر کوئی بلندی و برتری حاصل ہے الا یہ کہ پیغمبروں پر وحی آتی رہتی ہے اور عام انسان اس سے محروم ہیں گویا اس کا منشا یہ ہے کہ پیغمبر صرف اس لحہ اور آن میں منصب نبوت کا امتیاز پاتا جاتا ہے جب اس پر کسی قسم کی وحی نازل ہوتی ہے اور اس کے پہلے اور اس کے بعد وہ عام انسان ہوتا ہے اس سے آگے بڑھ کر اسی لئے ایک اور مختصر سے فرقہ نے یہ

دعویٰ کیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ حکم صرف وہی ہے جو وحی قرآنی کی صورت میں آیا اس کے علاوہ آپ کے تمام احکام جو قرآن سے باہر ہیں وہ صرف حاکمانہ اور انتظامی امور ہیں جن کی پیروی کرنا نہ اسلامی شریعت ہے اور نہ اسلام کا جزو ہے، یہ خیالات حقیقت میں دوسرے فرقہ کے مفرطانہ خیالات کے مقابلہ میں تفریطانہ ہیں اور یہ دونوں اعتدال کی حد سے باہر ہیں اور حقیقت ان کے بیچ میں ہے۔

قرآن پاک میں تین جگہ وہ آیتیں ہیں جن میں خاص آنحضرت ﷺ کی بشریت کا اعلان ہے مگر ہر جگہ توحید کامل کے بیان اور خدا کے مقابلہ میں رسولوں کی عبدیت کی تشریح اور اس عقیدۂ باطل کی تردید میں ہیں کہ رسولوں کے ہاتھوں میں یہ قوت ہونی چاہیے کہ وہ خدا سے زبردستی کسی بات کو منوالیں اور سعی و سفارش کرکے قصور معاف کرادیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ان کو جو کچھ حاصل ہے وہ خدائے تعالیٰ کی اجازت، اذن اور عطا سے ہے۔

سورۂ کہف میں ان مشرکوں کا ذکر ہے جو خدا کے بندوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں:

﴿ أَفَحَسِبَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن يَتَّخِذُوا عِبَادِي مِن دُونِي أَوْلِيَاءَ ۚ إِنَّا أَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكَافِرِينَ نُزُلًا ﴾ (۱۸/ الكهف:۱۰۲)

''کیا وہ جنہوں نے کفر کیا، یہ سمجھے ہیں کہ وہ میرے بندوں (رسول اور فرشتوں) کو میرے سوا اپنا حمایتی بنائیں گے ہم نے ان کافروں کے لئے جہنم تیار کی ہے۔''

قرآن اس خیال کو کفر قرار دیتا ہے، یہ رکوع کا شروع ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے غیر محدود اوصاف وکمالات کا ذکر ہے، پھر ارشاد ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾ (۱۸/ الكهف:۱۱۰)

''کہہ دے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔''

دوسری جگہ یہی تعلیم بعینہٖ سورۂ حم السجدہ (فصلت) میں ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَاسْتَقِيمُوا إِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ﴾ (۴۱/ حمٓ السجدة:۶)

''کہہ دے کہ میں تو تمہاری طرح بشر ہوں، مجھ پر وحی کی جاتی ہے، کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے، اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو، خرابی ہے شرک کرنے والوں کے لئے۔''

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں رسول اسی طرح ایک بندہ ہے جس طرح خدا

کے دوسرے بندے، دعائیں خدا ہی سے مانگنی چاہئیں اور اسی سے اپنے گناہوں کی معافی کی درخواست کرنی چاہیے یہ اختیارات خاص خدا کے بندوں کے نہیں، اس تعلیم سے مقصود حقیقت میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ اوران کے اس عقیدہ کی تردید ہے کہ گناہوں کا معاف کرنا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اختیار میں ہوگا اور مسلمانوں کو اپنے رسول کی نسبت اس قسم کی باطل عقیدت مندیوں سے بچانا ہے۔ چنانچہ تیسری جگہ قرآن پاک میں جہاں آنحضرت ﷺ سے کفار کا یہ مطالبہ مذکور ہے کہ تم خدا کے پیغمبر ہو تو ہمارے لئے سونے کی چھت بنا دو، اپنے ساتھ جلو میں فرشتوں کے پرے لے کر چلو، ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے ہاتھ میں کتاب لے کر سامنے اترو:

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۹۰-۹۳)

''اور انہوں نے کہا کہ ہم تم پر ایمان اس وقت تک نہیں لائیں گے، جب تک تم ہمارے لئے زمین سے ایک چشمہ نہ بہا دو یا تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ نہ ہو جائے یا جیسا تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گراؤ یا خدا کو اور فرشتوں کو ضامن بنا کر نہ لے آؤ یا تمہارے لیے سونے کا ایک گھر نہ ہو جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہاں تمہارے آسمان پر چڑھنے کا ہم کو اس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک تم وہاں سے ایک نوشتہ نہ ہم پر اتار لاؤ جس کو ہم پڑھ لیں۔''

یہ امور مشکل ومحال نہ تھے لیکن نبوت کے اوصاف کو ان بازی گرانہ تماشوں سے تعلق نہ تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ اس غلط عقیدہ کا ابطال کرنا تھا کہ پیغمبر میں براہِ راست کچھ خدائی اختیارات ہوتے ہیں اس لئے آپ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ آپ فرمائیں:

﴿ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۹۳-۹۵)

''کہہ دے اے پیغمبر! سبحان اللہ! میں تو ایک بشر ہوں رسول اور لوگوں کو جب ان کے پاس ہدایت آئی، ایمان لانے سے باز نہیں رکھا مگر اس خیال نے کہ کیا خدا نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ اگر زمین میں فرشتے ہوتے تو ہم ان پر آسمان سے فرشتہ کو رسول بنا کر ان

پر اتارتے۔"

آنحضرت ﷺ سے بحکم خدا معجزات بھی صادر ہوئے اور ان کی حیرت انگیزی کو انہوں نے تسلیم بھی کیا، پھر بھی یہ خیال کہ ایک بشر رسول کیونکر ہوسکتا ہے، قائم رہا۔

کفار نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی یہی کہا:

﴿ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳)

"یہ تو تمہاری ہی طرح بشر ہے، کیا تم دیکھ بھال کر بھی جادو کے پاس آتے ہو۔"

معجزات کی حیرت انگیزی کو جادو کہہ کر تسلیم کیا مگر پھر بھی ان کو بشریت رسالت کے منافی ہی معلوم ہوئی، انہیں کہا گیا کہ نبوت و رسالت کے اوصاف و خصائص تم سے زیادہ ان کو معلوم ہیں، جن کو تم سے پہلے آسمانی کتابیں عطا ہوئیں، یعنی یہود ان سے پوچھ لو کہ رسول اور نبی بشر ہی ہوتے ہیں:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(۲۱/ الانبیآء:۷)

"اور ہم نے نہیں بھیجا رسول بنا کر تم سے پہلے لیکن انسانوں ہی کو، جن کو ہم وحی کرتے تھے جاننے والوں سے پوچھو، اگر تم نہیں جانتے۔"

یہی جواب سورۂ یوسف میں دیا گیا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۭ ﴾

(۱۲/ یوسف:۱۰۹)

"اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے وہ بشر ہی تھے، آبادیوں کے رہنے والے ہم ان پر وحی کرتے تھے۔"

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ نحل میں ہے:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ۙ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾

(۱٦/ النحل:۴۳، ۴۴)

"اور ہم نے نہیں بھیجا تم سے پہلے لیکن انسانوں کو جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے، تو پوچھ لو کتاب والوں سے اگر تم نہیں جانتے، کھلی نشانیاں اور کتابیں دے کر اور ہم نے تم پر کتاب (ذکر) اتاری، تاکہ تم کھول کر لوگوں سے بیان کرو جو ان کی طرف اتاری گئی اور، تاکہ وہ سوچیں۔"

ہر شخص جو مثلیت اور بشریت کی ان آیتوں پر ایک نگاہ ڈالے گا وہ یہی سمجھے گا کہ ان آیتوں میں جس قسم کی مثلیت اور بشریت کا ذکر ہے اس کا تعلق ظاہری جسمانیت اور جسمانی قویٰ اور مخلوقیت سے ہے ورنہ اخلاقی، روحانی، دماغی، قلبی، علمی اور عملی حیثیت سے وہ انسان رہ کر بھی، غیر نبی انسانوں سے بلند تر اور علانیہ ممتاز ہوتا ہے، نبی اور غیر نبی میں صرف وحی کے امرِ فارق ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی القائے ربانی سے متصف ہونے کے علاوہ بقیہ تمام اوصاف وکمالات یا عیوب ونقائص میں عام انسانوں کے برابر ہوتا ہے یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے اگر کوئی یہ کہے کہ عالم وجاہل میں صرف علم کا فرق ہے ورنہ دونوں برابر کے انسان ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ علم وجہل کے علاوہ علم وجہل کے علانیہ ممتاز ومتضاد اوصاف میں بھی وہ دونوں برابر ہیں اور ان میں عقل، اخلاق، تہذیب، سلیقہ، رائے اور حکمت ودانائی کا کوئی فرق نہیں، حالانکہ ان میں علم وجہل کا فرق کہہ کر درحقیقت ان دونوں کے درمیان علم اور جہل کے سینکڑوں اوصاف، لوازم اور خصائص کا فرق وامتیاز تسلیم کرنا ہے۔

اسی طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم، خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا وحی ورسالت کو چھوڑ دو، دوسرے انسانی کمالات کو مثالاً لو تو بھی یہی ماننا پڑے گا کہ انسان کے لئے جتنے اوصاف وکمالات ممکن ہیں ان سب کی اعلیٰ سے اعلیٰ جانب کمال تک پہنچنا ممکن ہے اور جو وہاں تک پہنچ جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اوصاف وخصائص کے لحاظ سے انسان ہونے کے باوجود اپنے دوسرے قویٰ میں عام انسانوں سے یقیناً بلند اور ممتاز ہوتے ہیں، کوئی کہہ سکتا ہے کہ جسمانی قوت کا ایرانی ہیرو رستم انسان نہ تھا، علم وعقل کا یونانی مجسمہ ارسطو انسانیت سے پاک تھا اور موجودہ دنیا کی بہت سی حیرت انگیز ایجادوں کا مخترع اڈیسن بشر نہیں لیکن اس انسانیت اور بشریت کے اشتراک کے باوجود اپنے اپنے دائرہ میں وہ عام انسانوں سے بلند تر اور ممتاز تر ہیں اور با ایں ہمہ وہ اپنے جسمانی خصائص، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، دیکھنے بھالنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں، ہر ایک چیز میں ویسے ہی انسان ہیں اور مخلوق انسان ہیں بلکہ مجبور انسان ہیں جیسے دوسرے کمزور، جاہل اور بلید الذہن انسان۔ یہی مثال ایک معنی میں انبیائے کرام علیہم السلام کی بھی ہے وہ غیر نبی انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص اور لوازم میں ان سے صریحًا الگ، بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہوتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو صومِ وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع کرتے ہیں اور اپنی نسبت فرماتے ہیں: ((اَيُّكُمْ مِثْلِيْ؟ اَبِيْتُ يُطْعِمُنِيْ رَبِّيْ وَيَسْقِيْنِيْ)) [1] ''تم میں کون میری مثل ہے میں رات گزارتا ہوں تو میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔'' کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور

[1] صحيح بخاري، كتاب الصوم، باب التنكيل لمن اكثر الوصال:١٩٦٥۔

روحانی سیرابی میسر آتی ہے اور وحی کے علاوہ بعض دوسری حیثیتوں سے بھی مثلیت کی اس میں نفی نہیں ہے؟

اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔'' ((وَكَذٰلِكَ الْأَنْبِيَاءُ تَنَامُ أَعْيُنُهُمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُمْ)) [1] ''اور اسی طرح انبیا کی آنکھیں سوتی ہیں مگر ان کے دل نہیں سوتے۔'' کیا یہی کیفیت عام انسانوں کی نیند کی بھی ہے؟ آنحضرت ﷺ لوگوں کو نماز میں صفوں کو درست رکھنے کی تاکید کرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ ''میں اپنی پیٹھ کے پیچھے سے بھی ویسے ہی دیکھتا ہوں جیسے سامنے سے۔'' [2] کیا عام انسانوں کی قوت بصارت کا یہی عالم ہوتا ہے قرآن پاک میں ہے: ﴿ أَفَتُمٰرُونَهُ عَلٰى مَا يَرٰى ﴾ (۵۳/ النجم: ۱۲) ''کیا پیغمبر جو دیکھتا ہے تم اس میں اس سے جھگڑتے ہو۔'' ﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴾ (۸۱/ التکویر: ۲۳) ''اور اس نے فرشتہ کو آسمانوں کے کناروں میں دیکھا۔'' کیا عام انسان بھی یہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے انتساب سے امہات المومنین کو جو شرف حاصل ہوا اس کا اقتضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے امہات المومنین کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿ يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۳۲) ''اے پیغمبر کی بیویو! تم ایسی نہیں ہو جیسی ہر عورت اگر خدا کا ڈر رکھو۔'' تو اگر پیغمبر کی بیویاں تقویٰ کے بعد عام عورتوں کی مثل نہیں ہیں تو خود پیغمبر تو بدرجہا اس کا سزاوار ہے کہ وہ كَاَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ نہ ہو اور اپنے خصائص میں عام انسانوں سے بدرجہا بلند تر اور ممتاز ہو۔

الغرض نبی اور غیر نبی میں صرف وحی و نبوت کا جو فرق ہے اس کے یہی معنی ہیں کہ ان دونوں میں وحی و رسالت کے تمام لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق اور امتیاز ہے اس لئے کسی انسان کو صاحب وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ضرور ہی ماننا پڑے گا۔

اجتہادِ نبوی میں خطا

شبہ کا ایک اور سبب یہ ہے کہ قرآن مجید میں بعض جگہ آنحضرت ﷺ کو آپ کی چند فروگزاشتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ خاص وحی الٰہی کے علاوہ آپ اپنی عقل و مصلحت سے جو حکم دیتے تھے وہ غلطیوں سے پاک نہیں ہوتا تھا اس سلسلہ میں یہ بات تمام مسلمانوں کو تسلیم ہے کہ جن بعض امور میں آپ پر وحی قرآن نازل نہیں ہوتی تھی ان میں آپ اپنے پیغمبرانہ علم و حکم اور فہم نبوی سے فیصلہ فرماتے تھے لیکن غور کے قابل یہ بات ہے کہ اگر آپ کو آپ کے اس فیصلہ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے کبھی کوئی تنبیہ نہ ہوئی تھی تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ آپ کے تمام فیصلے صحیح اور منشائے الٰہی کے مطابق ہوتے تھے مگر یہ بھی کہنے والا کہہ سکتا

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی قولہ: وکلّم اللہ موسیٰ تکلیما: ۷۵۱۷۔
[2] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب عظۃ الامام الناس فی اتمام الصلوٰۃ: ۴۱۸۔

تھا کہ اجتہادِ نبوی کے فیصلوں کی صحت وخطا کی ذمہ داری خدا نے نہیں لی تھی اس لئے تنبیہ نہ فرمائی گئی مگر واقعہ ان دونوں کے خلاف ہے۔ صورت یہ ہے کہ بعض فیصلوں پر تنبیہ کی گئی ہے اور بعض پر نہیں، اس سے بداہتاً ثابت ہوتا ہے کہ اجتہادِ نبوی ﷺ میں غلطی ہو جانا ممکن ہے مگر اس غلطی پر چند لمحوں کا قرار بھی ممکن نہیں اِدھر لغزش ہوئی اور اُدھر علام الغیوب کی بے خطا وحی نے اس کی تنبیہ اور اصلاح کی۔ اس واقعہ سے دوسرا نتیجہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ تمام امور واحکام جن کو آپ نے اپنے پیغمبرانہ اجتہاد وعلم وحکمت سے ارشاد فرمایا ان پر عمل کیا اور وحی الٰہی نے ان پر خاموشی برتی تو منشائے الٰہی نے گویا ان کی صحت وصداقت پر اپنی خاموشی سے مہر کردی اور ان کی حیثیت بمنزلۂ وحی کے ہوگئی۔

آنحضرت ﷺ کی نبوت کی عمر ۲۳ سال ہے ان پورے ۲۳ سالوں میں ہزاروں واقعات اور امور پیش آئے جن پر آپ نے اپنے اجتہاد اور شرح صدر سے فیصلے صادر کئے مگر ان میں سے کل پانچ باتیں ایسی ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی اور عجیب تر یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس کا تعلق حکمِ دینی، شریعتِ ابدی، اعتقاد، عبادات یا شرعی معاملات میں سے ہو بلکہ وہ کل کے کل ایسے امور ہیں جن کی حیثیت تمام تر شخصی یا جنگی ہے اس سے بھی یہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ دین وشریعت میں آپ کے یہ پیغمبرانہ اجتہادی فیصلے خطا اور غلطی سے تمام تر پاک تھے۔

اس خطا کے معنی

عام انسانوں کے اجتہادات میں جن اسباب سے غلطیاں واقع ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ جن مقدمات پر ان کا اجتہاد مبنی ہوتا ہے وہ غلط ہوتے ہیں یا ان کا علم ان کو قطعی طور سے نہیں ہوتا، یا استقرائے تام نہیں ہوتا، تمثیل پوری نہیں ہوتی، علتِ مشترکہ صحیح نہیں معلوم ہوتی مگر یہ تمام صورتیں اجتہادِ نبوی میں نہیں ہیں کیونکہ اجتہادِ نبوی نہ ان طریقوں پر مبنی ہوتا، نہ وہ غور وفکر، نظر واستدلال اور استقرا وتمثیل کے منطقی واصولی ذرائع پر قائم ہوتا ہے بلکہ وہ نورِ رسالت، فہمِ نبوت، حکمِ ربانی اور شرحِ صدر پر مبنی وقائم ہوتا ہے جن میں یہ بیچ کی منزلیں سرے سے نہیں ہوتی ہیں اسی لئے لفظ اجتہاد جو عام طور پر پہلے معنی میں مستعمل اور مشہور ہے اس سے اس مقام پر التباس سے بچنے کی خاطر احتراز کرنا بہتر ہے۔

ایک اور نکتہ بھی پیش نظر رہے، آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ اجتہاد میں اگر غلطی ہوئی ہے تو اس غلطی کا یہ مفہوم نہیں ہے آپ نے جو پہلو اختیار فرمایا وہ کوئی گناہ یا بدی یا بداخلاقی کا پہلو تھا بلکہ یہ ہے کہ دو بہتر راستوں میں سے آپ نے بہترین راستے کو چھوڑ کر بہتر راستے کو اختیار کیا اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی اور بہتر کی جگہ بہترین کی تلقین کی۔

اس قسم کے جو چند واقعات پیش آئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ

بہترین کو چھوڑ کر جس بہتر کو آپ نے اختیار فرمایا اس کا منشا ہمیشہ امت پر رحم و کرم اور شفقت کی نگاہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری یا عارضی رحم و کرم و شفقت کی جگہ ان احکام کی تلقین فرمائی جن میں گو بظاہر سختی معلوم ہوتی ہے مگر علام الغیوب کی دائمی مصلحت کا تقاضا یہ تھا کہ وہی سخت پہلو اختیار کیا جائے۔

ذیل میں ہم ان اجتہادی امور کی تشریح کرتے ہیں جن پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے:

پانچ اجتہادی امور پر تنبیہ الٰہی

جن اجتہادی امور پر وحی الٰہی نے تنبیہ کی ہے ان میں:

① پہلا واقعہ یہ ہے کہ ہجرت کے قبل مکہ معظمہ میں جب آنحضرت ﷺ اپنی دعوت کی تبلیغ فرما رہے تھے تو ایک دن قریش کے بڑے بڑے رؤسا آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھے آپ ان کو سمجھا بجھا رہے تھے بت پرستی کی برائیاں اور توحید کی خوبیاں ان پر ظاہر فرما رہے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ اس دعوت کو قبول کر لیں کہ اتنے میں ایک مخلص لیکن غریب اور نابینا مسلمان عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ بھی آ کر بیٹھ گئے اور کچھ دریافت کرنا چاہا، قریش کے یہ رؤسا بے حد مغرور اور خود پسند تھے وہ آپ کے جلسوں میں صرف اس لئے آنا پسند نہیں کرتے تھے کہ آپ کی مجلس میں بدحال، بے حیثیت اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لئے اس موقع پر جب آنحضرت ﷺ کو ان رئیسوں کی اثر پذیری کے کچھ امکانات نظر آ رہے تھے، عبداللہ بن ام مکتوم کا آ جانا اور پوچھنا ناگوار ہوا کہ ان کے آنے سے ان رئیسوں کی خود پسندی اور بڑائی کے جذبہ کو اشتعال ہوا اور راستہ سے بدک گئے۔

عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی آمد اور دریافت پر یہ ناگواری جو بالکل نیک نیتی سے تھی یعنی اس لئے تھی کہ آپ جانتے تھے کہ عبداللہ بن ام مکتوم تو مسلمان ہی ہیں اس وقت ان کی بات کا جواب نہ دینے میں چنداں حرج نہیں لیکن ان رئیسوں کی ناگواری پورے باشندگانِ مکہ پر اثر انداز ہوگی اگر یہ مسلمان ہو گئے تو مکہ میں اسلام کی اشاعت کی راہ میں پھر کوئی روک باقی نہیں رہے گی یہ سمجھ کر آنحضرت ﷺ عبداللہ بن ام مکتوم کی طرف سے بے التفات ہو کر ان رئیسوں کی تبلیغ و موعظت کی طرف سر تا پا متوجہ رہے، اس پر وحی الٰہی نے حسب ذیل الفاظ میں تنبیہ کی:

﴿ عَبَسَ وَتَوَلّٰىٓ ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۝ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۝ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۝ وَهُوَ يَخْشٰى ۝ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۝ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ ﴾ (۸۰/ عبس: ۱۔۱۱)

”تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا کہ وہ اندھا آیا اور تجھے کیا خبر شاید وہ سنورتا یا سوچتا تو (تمہارا) سمجھانا کام آتا، وہ جو پروا نہیں کرتا سو تو اس کی فکر میں ہے اور اس کے نہ سنورنے کا تجھ پر کوئی

الزام نہیں، وہ جو تیرے پاس دوڑا آیا اور (وہ خدا سے) ڈرتا ہے تو اس سے تغافل کرتا ہے،
یوں نہیں، یہ تو نصیحت ہے جو چاہے اس کو یاد کرے۔"

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے اس اجتہاد پر کہ ایک پرانے لیکن غریب مسلمان کی مزید ہدایت سے قریش کے رئیسوں کا سمجھانا زیادہ بہتر ہے، تنبیہ کی گئی اور اس نکتہ کو ذہن نشین کیا گیا کہ اسلام کی اصولی بنیادوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے نزدیک امیر وغریب، آقا اور غلام، اونچے اور نیچے کی کوئی تمیز نہیں اس کی نگاہ میں بینا اور نابینا دونوں برابر ہیں، یہ نکتہ تو اس وقت کے فیصلہ میں آپ کے پیش نظر رہا کہ ایک مسلمان اندھے کی دلجوئی سے، ان رئیسوں کی جائز دلجوئی کر کے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنا زیادہ بہتر ہے مگر یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ اس طرزِ عمل سے خود اسلام کی بنیادی تعلیم پر کیا اثر پڑے گا اس لئے وحی الٰہی نے تنبیہ کی کہ اسلام کا یہ پیغام دنیا کے لئے صدائے عام ہے، جو چاہے قبول کرے، اس میں کوئی تمیز و تخصیص نہیں علاوہ ازیں اس کا بھی اشارہ کیا کہ یہ رؤسائے قریش جن کے مسلمان ہونے کی آپ اس قدر کوشش فرما رہے ہیں وہ ایمان سے محروم ہی رہیں گے، اس لئے ان کی طرف مزید توجہ بے سود ہے اور ظاہر ہے کہ آپ ان کے حق میں دانائے غیب کے اس فیصلہ سے پہلے آگاہ نہ تھے، اس لئے آپ اپنے موجودہ علم کے مطابق اپنے فعل کو صحیح سمجھ رہے تھے۔

دوسرا واقعہ: سب سے پہلی لڑائی میں مسلمانوں کے مال غنیمت کو حاصل کرنے اور بدر کے قیدیوں سے زرِ فدیہ قبول کرنے کا ہے، اس وقت تک ظاہر ہے کہ مالِ غنیمت اور فدیہ کا قانون نازل نہیں ہوا تھا کہ ابھی اس کا موقع ہی نہیں آیا تھا، مسلمانوں کو مدینہ منورہ آ کر سب سے پہلے سریہ نخلہ میں مالِ غنیمت ہاتھ آیا، اس کے بعد ہی بدر کے معرکہ میں پھر مالِ غنیمت ملا اور ساتھ ہی قریش کے ستر قیدی بھی ہاتھ آئے جن میں اکثر مکہ کے دولت مند اور شرفا تھے، ان قیدیوں کی نسبت مسلمانوں کی مختلف رائیں تھیں، بعض ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہتے تھے، کچھ لوگ فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینا چاہتے تھے، جس سے ان کو چالیس ہزار درہم ملنے والے تھے نفسیات کے ماہر جانتے ہیں کہ جو قوم مدت سے ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف اٹھاتی رہتی ہے، وہ بے کسی، مظلومیت، مغلوبیت اور غربت کے دور سے نکل کر جب پہلے پہل غالب اور دولت مند ہوتی ہے اور اس کو ملکی و مالی قوت پر دسترس حاصل ہوتی ہے تو وہ لمحہ اس کی زندگی میں اخلاقی حیثیت سے بڑا ہی نازک ہوتا ہے۔ غلبہ، قوت اور دولت پا کر بھی اس کے نشہ میں وہ سرشار نہ ہو اور اپنے دل و دماغ پر قابو رکھے یہ بڑا ہی مشکل کام ہے جو مظلوم تھا وہ غالب ہو جائے اور جو ظالم تھا وہ مغلوب ہو جائے اور اس وقت ردِ عمل اپنا کام کر کے مظلوم غالب میں اپنے ظالم مغلوب سے شدید انتقام لینے کا جذبہ نہ پیدا کرے یہ کوئی آسان کام نہیں۔ سیاسی و مذہبی تاریخوں سے تین صدیوں تک برابر سخت سے سخت تکلیفیں اٹھائیں لیکن قسطنطین کے زمانہ میں جب دفعتاً جو مظلوم تھے وہ غالب اور جو ظالم تھے وہ مغلوب ہو گئے تو عیسوی قوم کا پچھلا جو ہر ایک ایک کر کے رخصت ہو گیا

اوران لوگوں نے جو پہلے مظلوم تھے اس نشہ میں چور ہو کر یہودیوں اور رومی بت پرستوں کے ساتھ وہ کچھ کیا جس سے اخلاقِ انسانی کی تاریخ آج بھی شرماتی ہے۔

غزوۂ بدر کی غیر متوقع فتح نے مظلوم و بے کس مسلمانوں کے لئے تاریخی دور کا وہی نازک موقع پیدا کر دیا، غریب و تنگدست مسلمانوں کو جو سالہا سال سے کسب معاش سے محروم اور غیر معمولی ضروریات کے بوجھ سے دبے ہوئے تھے، ان کو غنیمت اور فدیہ کی دولت ہاتھ آئی اور وہی قریش جن کے ظلم و ستم سے ان کے بدن زخمی اوران کے سینے داغ دار تھے وہ دفعۃً مغلوب ہو گئے، ان کے بڑے بڑے سرداران کے ہاتھوں سے لڑائی میں مارے گئے، اوران کے ہاتھوں میں قید ہو کر ستر سردار صرف ان کے رحم و کرم پر زندہ تھے۔

اب تک مسلمان نہایت یک دلی، یک جہتی اور خلوص سے اپنی راہ طے کر رہے تھے اور یہ اخلاقی جوہر مظلوموں کی برادری میں اکثر پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن دولت آ کر ان کے بجائے ان میں اختلاف، تفریق اور حرص و طمع اور ذاتی اغراض کے جذبات پیدا کر دیتی ہے، اس اتفاقی دولت اور غیر متوقع فتح و غلبہ نے صحابہ کرام کے لئے امتحان کا وہی نازک موقع پیش کر دیا اور دنیا کے سب سے بڑے راہنما کی قوتِ راہنمائی کے اظہار کا بھی یہی موقع تھا، چنانچہ اس وقت مالِ غنیمت، زرِ فدیہ اور قیدیوں کے ساتھ برتاؤ کے متعلق غالب و فاتح مسلمانوں میں اختلافِ رائے رونما ہو گیا آنحضرت ﷺ کے سامنے اس وقت اہم ترین کام تھا، آپ نے امر اول کی طرف توجہ فرمائی کہ مظلوم فاتح قوت پا کر اپنا جوہر نہ کھو بیٹھیں، چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان قیدیوں کے قتل کی جو تجویز پیش کی تھی آپ نے رد فرما دی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تجویز کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے قبول فرمائی اوران سے فرمایا کہ ''اے ابوبکر! تمہاری مثال ابراہیم اور عیسیٰ علیہما السلام کی ہے اور اے عمر! تمہاری مثال نوح اور موسیٰ علیہما السلام کی ہے [1] آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نیک دلی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رحم دلی کی مثال کی پیروی کی اور بدر کے ان قیدیوں کی جان بخشی فرمائی اور قتل کے بجائے زرِ فدیہ ادا کر دینے پر رہائی کا حکم دے دیا اور جوان میں نادار تھے ان کو چند مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دینے پر آزادی کا فرمان جاری کر دیا اور صحابہ کو تاکید کی کہ ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کریں، چنانچہ بعضوں کا یہ حال تھا کہ وہ خود کھجور پر قناعت کرتے تھے اور اپنے قیدیوں کو روٹی کھلاتے تھے لیکن وحی الٰہی کی نگاہ میں اس سے زیادہ اہم پہلو ان غریبوں کا دفعۃً مال و دولت کی حرص و طمع میں مبتلا ہو جانا تھا، چنانچہ یہی صورت پیش آئی مالِ غنیمت کے فراہم کرنے والوں نے دعویٰ کیا کہ اس پر ہم نے لڑائی میں قبضہ کیا ہے اس لئے ہمارا ہے، لڑنے والے نوجوانوں نے دعویٰ کیا کہ ہماری تلواروں سے فتح حاصل ہوئی ہے اس لئے اس کے اصلی حق دار ہم ہیں، جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ سب سے نازک اور خطرناک فرض ہمارا تھا، اس لئے ہم کو ملنا چاہیے [2] یہی اختلاف زرِ فدیہ کی ملکیت کی نسبت بھی ہوا ہو گا جیسا کہ سورۂ انفال

[1] مستدرك حاكم، كتاب المغازي، ج٣، ص: ٢١۔

[2] سیرت ابن هشام، ذكر الفيء ببدر والاسارىٰ، ج ١، ص: ٣٩١ مطبوعه محمد على مصر۔

کی ابتدائی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ ۪ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۱)

''(اے پیغمبر)! تجھ سے (تیرے ساتھی) غنیمت کا حکم پوچھتے ہیں، تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا ہے تو اللہ سے ڈرو اور آپس میں صلح کرو اور اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی اطاعت کرو۔''

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ سورۂ انفال کے نزول کی کیا وجہ ہے، تو کہا:

فينا اصحاب بدر نزلت حين اختلفنا فى النفل وساء ت فيه اخلاقنا فنزعه اللّٰه من ايدينا فجعله الى رسول اللّٰه ﷺ فقسمه رسول اللّٰه ﷺ بين المسلمين عن سواء ۔ [1]

''یہ سورۂ ہم بدر والوں کے متعلق نازل ہوئی جب مال غنیمت میں ہم نے باہم اختلاف کیا اور اس میں ہمارے اخلاق برے ہو گئے تو خدا نے اس کو ہمارے ہاتھوں سے چھین لیا اور رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں دے دیا، تو آپ نے تمام مسلمانوں کے مابین برابر تقسیم فرما دیا۔''

یہی وہ تنبیہ ہے جو وحی الٰہی نے آنحضرت ﷺ کے اس فیصلہ [2] پر کی اور آیت اتری:

﴿ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗۤ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِى الْاَرْضِ ؕ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ۖ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۝ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَاۤ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ۝ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ ﴾

(۸/ الانفال:۶۷، ۶۹)

''کسی پیغمبر کو زیبا نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں، تاکہ زمین میں فساد کریں، تم لوگ دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب اور دانا ہے اگر خدا کی طرف سے یوں ہونا مقدر نہ ہو چکا ہوتا تو تمہارے اس لینے پر تم کو بڑی سزا ملتی، تو اب جو تم نے لوٹ میں پایا، حلال و پاک کر کے کھاؤ اور اللہ کا ادب کرو، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

اسی قدر نہیں بلکہ ان قیدیوں کو جن سے زرفدیہ وصول ہو، یا وصول کیا جا رہا تھا، اس کے بعد ہی یہ تسلی دی گئی:

﴿ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْۤ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّاۤ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ ﴾ (۸/ الانفال:۷۰)

---

[1] سيرت ابن هشام ذكر الفئ ببدر والاسارى، ج۱، ص: ۳۹۱، ۳۹۲۔

[2] سيرت ابن هشام، ج ۱، ص: ۳۹۱، ۳۹۲۔

''اے پیغمبر! تمہارے ہاتھوں میں جو قیدی ہیں، ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں نیکی پائے گا، تو تم کو اس سے بہتر چیز دے گا، جو تم سے لی گئی اور تم کو معاف کرے گا اور اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

بعضوں کو یہ شبہ ہوا کہ یہ تنبیہ قیدیوں کے لئے زرفدیہ لے کر رہا کرنے اور قتل نہ کیے جانے پر ہوئی [1] حالانکہ ظاہر ہے کہ جن قیدیوں سے زرِفدیہ لئے جانے پر اللہ تعالیٰ نے ان سے ہمدردی فرمائی اور اگر وہ حسن نیت سے ظاہر کریں، تو ان کی مغفرت کا وعدہ اور اس دنیاوی خزف ریزہ سے جو ان سے بطور فدیہ لیا گیا، ان کو بہتر دولت دیے جانے کی امید دلائی، کیا ان کا قتل زرفدیہ لینے سے کم سزا ہوتی؟ اور جن سے فدیہ لیا گیا ان کے قتل کئے جانے پر ان کے قاتلوں پر اس سے زیادہ سرزنش اور مقتولوں سے اس سے زیادہ ہمدردی نہ کی جاتی۔

بہر حال وہی مال غنیمت اور زرفدیہ جس کو اس وقت آنحضرت ﷺ نے صاف وصریح وحی آنے سے پیشتر قبول فرمالیا تھا اور جس پر تنبیہ ہوئی وہ آخر کار اجتہادِ نبوی کے مطابق مناسب، موقع پر جائز وحلال وطیب ہی ٹھہرالیا گیا اور غلطی باقی نہیں رہی، مالِ غنیمت لینے کے متعلق ﴿كُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ﴾ کا حکم اسی وقت آ گیا، اور فدیہ لینے کی اجازت ﴿فَاِمَّا مَنًّا ۢ بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً﴾ الفاظ میں بعد کو مناسب زمانہ میں آ گئی اور اس مال و دولت کی حرص وطمع سے اس وقت جو بداخلاقی پیدا ہونے والی تھی اس کا ازالہ ہمیشہ کے لئے اس طرح کر دیا کہ اس کی تقسیم کا ابدی قانون بنا دیا گیا اور اس میں تمام ضروری مستحقین کے حصے لگا دیے گئے۔

تیسرا واقعہ: تیسرا واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ غزوۂ تبوک کے لئے جا رہے تھے جس میں بکثرت مسلمانوں کی شرکت کی ضرورت تھی کہ مقابلہ رومیوں کے دل بادل فوج سے تھا اور کسی منظّم سلطنت سے ٹکر کھانے کا یہ پہلا موقع مسلمانوں کو پیش آیا تھا اور موسم بھی نہایت گرم اور سخت تھا۔ تیس ہزار مسلمانوں کی جمعیت روانہ ہوگئی مگر کچھ مخلص مسلمان مجبوراً چھوٹ گئے اور اکثر منافقین نے جان بوجھ کر اس کی شرکت سے جی چرایا، آپ واپس آئے تو عدم شرکت کے قصوروار منافقین آ آ کر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے عذرات بیان کرنے لگے، آپ نے ان کا اعتبار کر کے رحم فرما کر ان کے قصور سے درگزر کیا، اس پر تنبیہ ہوئی:

﴿وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (۹/ التوبۃ:۴۲، ۴۳)

''وہ خدا کی قسمیں کھائیں گے اگر ہم مقدور رکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ نکلتے، وہ اپنی جانوں کو برباد کرتے اور اللہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں، اللہ تجھ کو بخشے تو نے ان کو رخصت کیوں دی،

---

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھو اسی سیرت النبی ﷺ جلد اول میں غزوۂ بدر کا بیان۔

جب تک تجھ پر وہ کھل نہ جاتے جوان میں سچ بولتے اور تو جان لیتا جھوٹ بولنے والوں کو۔“

ظاہر ہے کہ آپ علم غیب سے آگاہ نہ تھے اوران کے واقعی حالات سے بے خبر تھے اس لئے بظاہران کے قول پر اعتبار ہی کرنا تھا اور وہی آپ نے کیا مگر علام الغیوب نے حقیقت حال سے باخبر فرما کر ان کے جھوٹ کا پردہ چاک کیا بہرحال یہاں بھی منشائے خطا، اگر خطا سمجھی جائے، تو وہی ترحم کی شان تھی۔

چوتھا واقعہ: منافقین کی نسبت آپ ﷺ کو اطلاع دی گئی تھی کہ ان کے حق میں آپ کی دعائے مغفرت قبول نہ ہوگی اور فرما دیا گیا تھا کہ:

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ ﴾ (۹/ التوبة:۸۰)

”تو ان کی مغفرت کی دعا مانگے، یا نہ مانگے اگر ستر دفعہ بھی ان کی مغفرت کی دعا مانگے تو ہرگز ان کو خدا نہ بخشے گا، یہ اس لئے کہ انہوں نے خدا کا اور اس کے رسول کا انکار کیا۔“

اس حکم کے آنے کے بعد عبداللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا، یہ منافقوں کا سردار تھا، اس کا لڑکا مخلص مسلمان تھا۔ اس نے آکر آپ سے نماز جنازہ پڑھانے کی درخواست کی، جس کو آپ فرط کرم سے رد نہ فرما سکے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض بھی کی، یارسول اللہ ﷺ! اس کے عدم مغفرت کے متعلق تو حکم ہو چکا ہے فرمایا: ”میں ستر دفعہ سے بھی زیادہ اس کی مغفرت کی دعا مانگوں گا۔“ [1] بہرحال آیت بالا میں گو آپ کے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے دونوں کو بےکار و بےسود بتایا گیا تھا مگر ان کے حق میں سرے سے دعائے مغفرت نہ مانگنے کی کوئی ممانعت نہ تھی اس لئے آنحضرت ﷺ نے غایت شفقت سے اس بیکار فرض کو انجام دیا، تاکہ اس کے مخلص مسلمان فرزند کی دل شکنی نہ ہو اور اس لیے تغافل فرمایا کہ گو ایک مسلمان کی دلجوئی تو ہوگی مگر بیسیوں منافقین کو اپنے چھپانے میں کامیابی ہو جائے گی اور وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر فتنوں کا باعث بنیں گے اس لئے حکم ہوا:

﴿ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓي اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰي قَبْرِهٖ ۭ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (۹/ التوبة:۸٤)

”اور نہ کبھی ان میں سے کسی کے جنازہ کی نماز پڑھ اور نہ ان کی قبر پر کھڑا ہو، بےشک انہوں نے خدا اور اس کے رسول کا انکار کیا اور اسی گناہ گاری کی حالت میں مرے۔“

پانچواں واقعہ: اس کی تفصیل یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی بعض بیویوں کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے کسی مباح، چیز کو جو آپ ﷺ کو بہت مرغوب تھی اپنے اوپر حرام کرلیا تھا، یعنی اس کے کبھی نہ استعمال

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ براءۃ: ٤٦٧٢۔

کرنے کا عہد فرمالیا تھا، ظاہر ہے کہ ہر شخص پر مباح چیز کا کھانا فرض نہیں، اس کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی خوشی سے یا کسی دوسرے کی رضامندی کے لئے اس کے نہ کھانے کا عہد کرلے، اس لئے آنحضرت ﷺ نے بعض بیویوں کی خاطر جن کو وہ شے پسند نہ تھی اس کو اپنے اوپر حرام کرلیا تو ظاہر ہے کہ آپ کا اپنی بعض بیویوں کی خاطر داری کے لئے ایسا کرنا الزام کے قابل نہیں کہ آپ نے بحیثیت شوہر کے ان کی اتنی دلجوئی کو بھی عورتوں کے ساتھ عدل وانصاف کے مناسب سمجھا، مگر اس مسئلہ کی ایک دوسری حیثیت بھی تھی اور وہ یہ کہ بحیثیت ایک پیغمبر کے ایک حلال و جائز چیز کو اپنے اوپر حرام کرلیا اور اس کے نہ کھانے کا عہد کرنے سے آپ کی اقتدا میں امت کے عام افراد بھی اس کو ناجائز نہیں تو ناپسند ضرور ہی کرتے اور یہ ایک طرح سے شریعتِ الٰہی میں تبدیل وتحریف کا، مترادف ہوجاتا اس لئے حکم آیا کہ ان امور میں پیغمبروں کو کسی کی دل جوئی اور خاطر داری کی پروا نہ چاہیے۔ فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(٦٦/ التحريم:١)

''اے پیغمبر! جس کو اللہ نے تیرے لئے حلال کیا ہے، اس کو حرام کیوں کرتا ہے، اپنی بیویوں کی مرضی چاہتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔''

اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا آپ کو نبی کہہ کر خطاب کرنا یہ واضح کرتا ہے کہ بحیثیت ایک انسان اور شوہر ہونے کے آپ ایسا کرسکتے تھے مگر پیغمبر کی حیثیت سے آپ کو یہ اختیار نہیں۔

الغرض یہی وہ پانچ واقعے ہیں جن میں آپ کی اجتہادی خطا ثابت کی گئی ہے مگر تفصیلات سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ ان کو خطا کہنا درحقیقت مجاز ہے کہ پیغمبر کی بلندی اور معصومی کو پیش نظر رکھ کر اس مجازی خطا کی بھی اجازت نہیں اور اسی لئے وحی الٰہی نے ان میں سے ہر موقع پر تنبیہ کی اور اپنے صحیح فیصلہ سے راہنمائی فرمائی۔

اب کیا کسی کا شبہ یہ بھی ہے کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو یہ معمولی مسامحات پیش آئے جن کی تنبیہ و اصلاح ہر وقت وحی الٰہی نے کی، ایسے ہی ممکن ہے کہ آپ کو اور بھی ایسے مسامحات پیش آئے ہوں جن کی تنبیہ وتصحیح کی حکمت الٰہی نے پروانہ کی اور خاموشی برتی، اگر کسی کو یہ شبہ ہے تو درحقیقت رسالت ونبوت کی مرتبہ شناسی اور دینِ الٰہی وشریعتِ ربانی کی حقانیت اور اللہ تعالیٰ کے طرق رشد وہدایت کی معرفت سے کوسوں دور ہے، رسولوں کی بعثت اس لئے ہے کہ وہ غلط کار انسانوں کو ان کی غلطی سے نکال کر حق وصواب کی تعلیم دیں، نہ اس لئے کہ ان کے ذریعہ اُلٹے ہدایت کے بجائے مزید ضلالت کا اضافہ ہو استغفر اللہ ثم استغفر اللہ اس لئے ناممکن ہے کہ رسولوں کے ہاتھوں اور زبانوں سے کوئی ایسا کام یا حکم صادر ہو جو حکمت الٰہی کے مطابق نہ ہو اور پھر وہ اس کی تصحیح اور راہنمائی سے تغافل برتے اور انسانوں کو خود اپنے رسولوں کے ذریعہ گمراہ ہونے دے۔

پیغمبرانہ اجتہاد ورائے علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں دماغ سے نہیں بلکہ دل کے سرچشمہ سے بہتی ہیں جو انسانی رائے وتجربہ سے نہیں بلکہ الہام الٰہی، القائے ربانی، حکمتِ یزدانی، فہمِ رسالت، ملکۂ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرمِ اسرارِ شریعت، عمر فاروق برسرمنبر یہ فرماتے ہیں:

یا ایها الناس! ان الرأی انما کان من رسول اللہ ﷺ مصیبا لان اللہ کان یریه وانما هومنا الظن والتکلف۔ [1]

''اے لوگو! آنحضرت ﷺ کی رائے غلطی سے پاک تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو راہ دکھاتا تھا اور ہماری رائے، ہمارا گمان اور از خود کہنا ہے۔''

وہ رائے نبوی ﷺ جو خدا کے بتانے اور دکھانے سے قائم ہوئی ہو، ظاہر ہے کہ بمنزلۂ وحی کے ہے اور اس کا نام بشری اجتہاد اور انسانی رائے نہیں، بلکہ نبوی اجتہاد اور پیغمبرانہ رائے ہے جو عملاً وحی الٰہی کی ہم مرتبہ اور کلامِ ربانی کی ہم پایہ ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس خطبہ میں جو کچھ کہا ہے درحقیقت وہ خود کلام پاک سے مستنبط ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآىِٕنِیْنَ خَصِیْمًاۙ ﴾ (٤/ النسآء:١٠٥)

''ہم نے تجھ پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، تاکہ لوگوں کے درمیان جو اللہ تجھ کو سوجھائے فیصلہ کرے اور تو نہ ہو دغابازوں کی طرف سے جھگڑنے والا۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو جو دکھایا، سوجھایا اور رائے پیدا کرائی جاتی تھی وہ خدا کی طرف سے ہوتی تھی، یہی پیغمبرانہ رائے ہے جس کی نسبت خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((انّما اقضی بینکم برای فیما لم ینزل علیّ فیه)) [2]

''میں تم لوگوں کے درمیان اس مسئلہ میں جس کی نسبت مجھ پر وحی نہیں ہوئی، اپنی رائے سے فیصلہ کرتا ہوں۔''

یہ فیصلہ اگر، غلط ہوتا تو فوراً وحی الٰہی دست گیری کرتی اور صحیح راستے پر لے آتی، جیسا کہ گزشتہ پانچوں واقعات سے ظاہر ہے۔

ایک غلط استدلال

اس آیت پاک سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں آپ کو ''ارائتِ الٰہی'' ہوتی تھی

[1] ابوداود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ٣٥٨٦۔
[2] ابوداود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ٣٥٨٥۔

یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سوجھائی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ ارائتِ الٰہی (خدا کی طرف سے بجھایا جانا) تا کہ آپ کتابِ الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں غلط نہیں ہوسکتی، لیکن ابوداؤد وغیرہ میں ایک حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اہلِ مقدمہ سے فرمایا:

''میں ایک بشر ہوں تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں، جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں، تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں، تو میں اگر کسی کو وہ حق دلا دوں جو اس کا نہیں، بلکہ اس کے بھائی کا ہے، تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔'' [1]

اس سے ایک غلط فہم یہ استدلال بھی کر سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے فیصلے ہمیشہ غلطی سے پاک نہیں ہوتے تھے، اس لئے اُمت آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں، لیکن ایسا خیال کرنا سراسر مغالطہ ہے اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں ایک واقعہ کی اصلی روداد جس کو ہر مدعی اور مدعا علیہ اپنے دعویٰ کے مطابق بنا کر اپنے اپنے رنگ میں بیان کرتا ہے، اس کے بعد دوسری چیز اس بیان کردہ روداد کے مطابق صحیح اور عادلانہ حکم اور فیصلہ ہے جو تمام تر مقدمہ کی اس روداد پر مبنی ہوتا ہے جو حاکم وقاضی کے سامنے بیانات اور شہادتوں کے ساتھ پیش ہوتی ہے، یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور ان میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے، علم غیب سے تعلق رکھتی ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں اور اگر ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ نہیں قرار پا سکتا، اس کے لئے فریقین کے بیانات، شہادتیں اور دلائل ہی بکار آمد ہیں، آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امرِ اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا، لیکن دوسری چیز یعنی جس روداد کو آنحضرت ﷺ نے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ کبھی کبھی صحیح وصواب اور عادلانہ نہیں ہوتا تھا یہ کہنا رسول و نبی کی شان کی توہین وتحقیر ہے اور اس ''ارائتِ الٰہی'' کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلہ میں آپ کو بخشا جاتا تھا اس لئے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہوسکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی دلیل وشہادت کو سن کر اس کے صحیح یا غلط، مطابقِ واقعہ یا مخالفِ واقعہ سمجھنے میں لیکن جس کو آپ نے صحیح باور فرمالیا اس کے مطابق مناسب وصحیح حکم وفیصلہ کرنے میں آپ سے کبھی غلطی نہ ہوئی اور نہ ہوسکتی تھی اور امت آپ کی پیروی، آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکور کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں (فَشَتَّانَ بَيْنَهُمَا)۔

آنحضرت ﷺ کے اس اعلان میں نکتہ یہ ہے کہ شاید فریقین میں سے کوئی غلط بیان یا جھوٹا، برسرِ باطل جو اپنے مقدمہ کی روداد زیادہ خوبی سے بنا کر آپ کی عدالت سے موافق فیصلہ حاصل کر لے یہ سمجھے کہ گو

[1] ابوداود، کتاب القضاء، باب في قضاء القاضي اذا أخطأ: ۳۵۸۳۔

حقیقت میں میرا حق نہ تھا، لیکن اب جب عدالت نبوی ﷺ نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا تو میری ملکیت ثابت ہوگئی اور غصبِ حق کے گناہ سے بریت ہوگئی تو اس کا ایسا سمجھنا صحیح نہ ہوگا قانوناً حکم نافذ ہو جائے گا مگر عنداللہ جو بر سر حق تھا وہ حق ہی رہے گا اور جو بر سر باطل تھا وہ باطل ہی رہے گا اور جو اصل مالک تھا وہی مالک رہے گا اور جو غاصب ہے وہ غاصب ہی ٹھہرے گا، اسی اعلان کا اثر تھا کہ جب آنحضرت ﷺ نے ایک مقدمہ میں فریقین کو اس حقیقت سے مطلع فرمایا تو دونوں رو پڑے اور دونوں ایک دوسرے کے حق میں دست بردار ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ [1]

آنحضرت ﷺ رودادِ مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر حق، منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف کفر و نفاق تھا اسی لئے ارشاد ہوا کہ

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٦٥)

''سو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھ کو حکم نہ مانیں، پھر اپنے دلوں میں تیرے فیصلہ سے تنگی نہ پائیں اور مان کر قبول کریں۔''

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ۝ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٣٦)

''اور کسی ایماندار، مرد یا عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے، تو بھی اس کو اپنے کام کا اختیار رہے، اور جو خدا اور اس کے بے حکم چلا، وہ صریح گمراہ ہوا۔''

کیا امت کو رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلوں کے بے چون و چرا قبول کر لینے کا خدا کی طرف سے تاکیدی حکم بر سرِ باطل پہلو پر ہو سکتا ہے چنانچہ دوسری آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ آپ کا کوئی فیصلہ کبھی ظالمانہ اور غلط نہیں ہو سکتا:

﴿ وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ يَّكُنْ لَّهُمُ الْحَقُّ يَاْتُوْٓا اِلَيْهِ مُذْعِنِيْنَ ۝ اَفِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ يَخَافُوْنَ اَنْ يَّحِيْفَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُوْلُهٗ ۭ بَلْ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ ﴾ (٢٤/ النور:٤٨-٥٠)

''اور جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں، تاکہ رسول، ان کے درمیان فیصلہ کر دے، تو ان میں ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کو کوئی حق پہنچتا ہو، تو قبول کر کے

[1] ابو داود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ٣٥٨٤۔

چلے آئیں، کیا ان کے دلوں میں روگ ہے یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ ناانصافی کرے گا، بلکہ وہی بے انصاف ہیں۔"

عقل بشری

اس میں بھی شک نہیں کہ وحی اور ملکۂ نبوت کے علاوہ نبی میں نبوت و رسالت کے فرائض سے باہر کی چیزوں میں اس کی عقل وہی ہوتی ہے جو عام انسانوں کی ہوتی ہے اور جس میں اجتہادی غلطی کا ہر وقت امکان ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے نزدیک اجتہاد کی یہی وہ دوسری قسم ہے جس میں نبی سے بھی غلطی ہو سکتی ہے کہ اس کا مدار وحی و الہام اور ملکۂ نبوت پر نہیں بلکہ انسانی علم و تجربہ پر ہوتا ہے اور یہی وہ قسم ہے جس کا اتباع پیرووں پر واجب نہیں اور اس کی بہترین مثال کھجور کی کاشت کا واقعہ ہے۔ [1]

صحیح مسلم میں ہے کہ آنحضرت ﷺ مدینہ منورہ کے بعض باغوں میں گزرے دیکھا کہ کچھ لوگ کھجوروں کے درختوں پر چڑھ کر کچھ کر رہے ہیں، آپ نے دریافت فرمایا: "یہ کیا کر رہے ہیں؟" ایک ہمراہی نے کہا کہ یہ مادہ کھجوروں میں نر کھجوروں کے پھول ڈالتے ہیں کہ پھل زیادہ آئیں، فرمایا: "میں تو نہیں سمجھتا کہ اس سے کچھ فائدہ ہوگا۔" ایک روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اگر ایسا نہ کرتے تو بہتر ہوتا۔" اس نے جا کر باغ والوں سے آپ کا یہ فقرہ بیان کر دیا، صحابہ نے جو سراپا اطاعت تھے اس پر عمل کیا اور ایسا کرنا چھوڑ دیا پھل اس سال کم آئے، یا کم ٹھہرے آپ کا پھر گزر ہوا، تو ان لوگوں نے صورتِ حال عرض کی، آپ ﷺ نے فرمایا: "میں نے تو یونہی ایک بات سمجھ سے کہہ دی تھی، اگر ان کو اس عمل سے فائدہ ہوتا تھا تو وہ کریں۔" پھر فرمایا:

((اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ اِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ دِیْنِكُمْ فَخُذُوْا بِهٖ وَاِذَا اَمَرْتُكُمْ بِشَیْءٍ مِّنْ رَّاْیِیْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ)) [2]

"میں تو ایک آدمی ہی ہوں، جب تمہیں دین کا کوئی حکم دوں تو اس کو قبول کرو اور جب اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں ایک آدمی ہوں۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں:

((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاكُمْ)) [3] "تم اپنے دنیا کے کام کو زیادہ جانتے ہو۔"

تیسری روایت کے الفاظ ہیں:

((فانی انما ظَنَنْتُ ظنا فلا تؤاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللّٰہ شیئا

---

[1] حجۃ اللّٰہ البالغۃ، باب بیان اقسام علوم النبی ﷺ، ج ۱، ص: ۱۰۲ پر اس کی تشریح موجود ہے۔

[2] مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا.....: ۶۱۲۷۔

[3] ایضا: ۶۱۲۸۔

فخذو به فاني لن اكذب على الله عزوجل)) [1]

''میں نے ایک گمان سا کیا تھا، گمان پر مجھ کو نہ پکڑو، ہاں جب خدا کی طرف سے کوئی بات کہوں تو اس کو لو، کہ میں خدا پر جھوٹ نہ کہوں گا۔''

ان تینوں روایتوں میں آپ نے اپنے اس ارشاد کو ظن (گمان) رائے اور امرِ دنیا سے تعبیر فرمایا ہے اس سے یہ کلیہ سمجھ آتا ہے کہ امورِ دین وشریعت میں آپ کا ہر حکم واجب اور من جانب اللہ ہے، لیکن کھیتی باڑی، علاج معالجہ وغیرہ خالص دنیاوی امور میں اگر آپ نے کچھ کہا تو اس کی حیثیت فقط مشورہ اور رائے کی ہے یہی سبب ہے کہ صحابہ کرام جن باتوں میں اپنا مشورہ آپ کو دینا چاہتے تھے پوچھ لیتے تھے کہ یارسول اللہ! یہ وحی سے ہے یا رائے ہے، آپ جب فرما دیتے تھے کہ رائے سے ہے تو وہ اپنا مشورہ پیش کرتے اور آپ پسند فرماتے تو قبول فرماتے۔ غزوۂ بدر میں آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہا، ایک صحابی نے آ کر عرض کی، یا رسول اللہ ﷺ! اس مقام کا انتخاب وحی سے ہے یا رائے سے ہے، فرمایا: ''محض رائے ہے۔'' تو عرض کی کہ جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام بہتر نہیں فلاں مقام بہتر ہے، آپ نے ان کی رائے پسند کی اور اس پر عمل فرمایا، اسی طرح صلح و جنگ اور حکومت کے دوسرے معاملات میں بھی صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ لیا اور عمل فرمایا ہے اور اسی میں خود حضور ﷺ کو ﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹) یعنی ''امورِ حکومت یا عام امور میں صحابہ سے مشورہ لے لو۔'' کا حکم خدا کی طرف سے ہے چنانچہ غزوۂ احزاب میں خندق کھودنے میں سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل کیا، [2] لیکن امورِ جنگ وسیاست میں بھی جس بات کا حکم عقلِ بشری سے نہیں، بلکہ وحیِ الٰہی یا فہمِ نبوی ﷺ سے ہوا تھا اس میں آپ نے نہ کسی سے مشورہ لیا اور نہ کسی کے مشورے کو قبول فرمایا، صلح حدیبیہ کی شرائط اور دفعات جو سراسر مصلحتِ الٰہی اور حکمتِ ربانی پر مبنی تھے ان کے بدلنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ نے کیا کیا زور نہیں لگایا، مگر آنحضرت ﷺ نے کچھ التفات نہ فرمایا اور آخر مستقبل نے بتا دیا کہ فہمِ نبوت سراسر صحیح تھی، اسی طرح غزوۂ احد جیسے نازک موقع پر عبداللہ بن ابی کا تین سو آدمیوں کے ساتھ پھر جانا گوارا کیا، مگر مدینہ سے باہر جا کر صف آرا ہونے سے باز نہ آئے اور پھر مستقبل نے مصلحتِ الٰہی کے راز کو فاش کیا۔

ایک ادنیٰ سا تامل عقلی حیثیت سے بھی یہ راز بتا دے گا کہ دنیا میں ہر صاحبِ فن کی ایک نہیں دو عقلیں ہوتی ہیں ایک اس فن کے متعلق جس کی استعداد اس کے اندر رکھی جاتی ہے اور پھر تعلیم وتربیت مشق اور کثرتِ عمل سے وہ اتنی بلند اور پختہ ہو جاتی ہے کہ وہ اس فن کے بڑے بڑے عمیق اور مشکل دقائق کو ایک نظر میں معلوم کر لیتی ہے اور اس کے لاینحل عقدوں کو اشاروں میں حل کر دیتی ہے لیکن اس دائرہ کے باہر اس کی دوسری عقل عام انسانوں ہی کی طرح معمولی ہوتی ہے ایک شخص جو فنِ تعمیر کی مہارت اور ہندسہ اور انجینئرنگ کی

[1] ایضا.٢١٢٦۔ [2] سیرت ابن هشام، ج٢، ص:١٦٢؛ البداية والنهاية، ج٤، ص:٩٥؛ كامل ابن اثير، ج٢، ص ٦٧۔

صناعی میں غیر معمولی عقل وذہانت رکھتا ہے بالکل ممکن ہے کہ کھجور کی کاشت میں اس کی عقل معمولی انسانوں سے بھی کم درجہ ہو، ایک فلسفی جو اپنے زورِ فکر سے افلاطون وارسطو کی غلطیاں نکالتا ہے وہ تعمیر کے فن میں ایک معمولی مزدور سے بھی زیادہ کم عقل ہو، یہ روزمرہ کی پیش آنے والی مثالیں ہیں اسی طرح وہ برگزیدہ انسان جو روحانیت کے اسرار، معرفتِ ربانی کے حقائق، تزکیہ نفس کے رموز، اخلاق ومعاشرت کے آداب اور حقوق و شریعت کے مسائل میں دقیقہ رس فہم اور نکتہ دان عقل رکھتا ہو اس کو تعمیر وکاشتکاری کے مسائل میں محض معمولی درک ہو بلکہ بالکل نہ ہو۔

اسی طرح انبیا علیہم السلام امور دین وشریعت میں وحی اور ملکۂ نبوت سے جو کچھ فرماتے ہیں وہ عین مصلحت، عین حکمت، خطا اور غلطی سے سرتاپا مبرا اور پاک ہوتا ہے لیکن دوسرے امور مثلاً: پہننے، اوڑھنے، کھانے پینے، رہنے سہنے، سلطنت وسیاست، نظم ونسق، صلح وجنگ، سامان واسلحہ، جنگ وسواری، صنعت وحرفت، طب وعلاج، وغیرہ دنیاوی امور کی نسبت کا مصلحتیں بتا کر جزئیات کی تفصیل سے انہوں نے احتراز فرمایا اور کسی قطعی فیصلہ کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا، پہننے اوڑھنے کے متعلق صرف تین باتیں فرمائیں پہلی یہ کہ وہ لباس اور طرز لباس نہ اختیار کیا جائے جس سے ستر عورت نہ ہو، دوسری یہ کہ مرد وہ لباس اختیار نہ کریں جو عورتوں کے لئے زیبا ہے، نہ عورتیں وہ لباس اختیار کریں جو مردوں کے لئے مناسب ہے، تیسری بات یہ ہے کہ وہ لباس پسندیدہ نہیں، جس سے غرور ونخوت نمایاں ہو، کھانے پینے میں چند حرام چیزوں کے سوا کسی کی ممانعت نہیں، نظم ونسق اور نظام حکومت و سلطنت میں چند کلی اصول تعلیم فرمائے، شہنشاہانہ اور جابرانہ حکومت نہ ہو لوگوں میں مساوات ہو اور اہم امور میں اہل حل وعقد کا باہمی مشورہ ہو وعلیٰ ہذا القیاس۔ الغرض یہی وہ امور ہیں جن میں زمانہ اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تغیر و انقلاب ہوتا ہے اس لئے ان کو ہمیشہ کے لئے محدود کر دینا مصلحتِ الٰہی کے خلاف تھا۔

ملکۂ نبوت یا عقلِ نبوت کا شرعی ثبوت

گزشتہ مباحث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ نبی ﷺ میں علم وفہم کے تین ذریعے ہیں وحی، ملکۂ نبوت اور عام عقل بشری ان میں سے اول وآخر کے ثبوت کے لئے اب کسی استدلال کی ضرورت نہیں کہ اول تو یہ مسلمات سے ہیں، اور دوسرے اوپر کی تشریحات میں مستقل طور سے ان پر بحثیں ہو چکی ہیں، لیکن اب تک ہم نے دوسری چیز یعنی ملکۂ نبوت کے لئے کوئی شرعی دلیل پیش نہیں کی اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ کہنی ہے کہ جن علمانے اس کی حقیقت ظاہر کی ہے، انہوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کے لئے الگ الگ اصطلاحیں قائم کی ہیں مگر مفہوم ومعنی کے لحاظ سے وہ دراصل ایک ہیں سلف وصالحین میں سے بعض نے اس کو القائی الروع (دل میں ڈالنا) نبی کی حکمتِ قلبیہ، توفیقِ ازلی اور قوتِ تبیین سے تعبیر کیا ہے۔ [1] امام غزالی و

[1] یہ تمام الفاظ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الرسالہ میں مذکور ہیں۔

امام رازی رحمہ اللہ اور دوسرے متکلمین نے اس کو ملکۂ نبوت سے ادا کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور علمائے اصول نے اس کو پیغمبرانہ قوتِ اجتہاد کہا ہے اور صوفیہ کی عام پسند اصطلاح میں اس کو علم لدنی کہا جاتا ہے، مگر ان سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی نبی کے اندر وہ پیغمبرانہ عقلی قوت، جو بشری عقل سے فوق ہے اور جس کے ذریعہ سے وہ وحی کی تشریح، اسرارِ شریعت کا بیان اور دقائقِ حکمت کی اپنی زبان سے توضیح کرتا ہے۔

انبیائے کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھئے جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست انعامات میں جو چیز نظر آئے گی وہ ''علمِ نبوت'' ہے جس کو کہیں ذکر (یادداشت) کہیں حکم (حق و باطل میں تمیز کا ملکہ) کہیں حکمت (دانائی) کہیں شرحِ صدر (سینہ کا کھول دینا) کہیں تفہیم (سمجھ بوجھ دینا) کہیں تعلیم (سکھا دینا) کہیں ارائت (دکھا دینا، سوجھا دینا) کہا گیا ہے، ان سب مختلف الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقلِ بشری سے اوپر عقلِ نبوی کے سوا اور کیا ہے؟ ان سے مراد وحی تو اس لئے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لئے نہیں کہ عقلِ بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ ملی ہے اس بنا پر اس سے مراد عقلِ نبوی ﷺ اور حکمت نبوی ﷺ کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔

حکمت

انبیا علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمتیں عطا ہوتی ہیں ان میں ایک خاص نعمت کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آتا ہے اور وہ حکمت ہے۔ آل ابراہیم علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے جو احسانات کئے ان کا ذکر وہ ان الفاظ میں فرماتا ہے:

(۱) ﴿فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا﴾

(٤/ النسآء:٥٤)

''تو بے شبہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کو کتاب اور حکمت دی اور ان کو بڑی سلطنت بخشی۔''

حضرت لقمان علیہ السلام کی نسبت ہے:

(۲) ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۲)

''اور یقیناً ہم نے لقمان کو حکمت دی۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کی شان میں ہے:

(۳) ﴿وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۰)

''اور ہم نے داؤد علیہ السلام کی سلطنت مضبوط کی اور اس کو حکمت اور قولِ فیصل عطا کیا۔''

(٤) ﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵۱)

''اور داؤد نے جالوت کو مارا اور خدا نے داؤد کو سلطنت اور حکمت بخشی اور جو چاہتا ہے، اس میں سے کچھ سکھایا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

(۵) ﴿ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ ۚ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۶۳)

''میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تا کہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔''

خود اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اپنا احسان جتاتا ہے، تو فرماتا ہے:

(۶) ﴿ وَإِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيلَ ۖ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۰)

''اور یاد کر جب میں نے تجھ کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل کی تعلیم دی۔''

عام انبیا کے متعلق ہے:

(۷) ﴿ وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ﴾

(۳/ آل عمران:۸۱)

''اور جب اللہ نے نبیوں سے وعدہ لیا کہ جو میں تم کو کوئی کتاب اور حکمت دوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آنحضرت ﷺ کے ظہور کی یہ دعا مانگی تھی:

(۸) ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۹)

''ہمارے پروردگار! اور ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیج، جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو سنوارے بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے انکی یہ دعا قبول فرمائی:

(۹) ﴿ كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۱)

''جس طرح ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا وہ تم کو ہماری آیتیں سناتا اور تم کو سنوارتا ہے اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔''

اس دعائے ابراہیمی کے مطابق آنحضرت ﷺ کے ظہور کا احسان اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ہم پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۰) ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾

(۳/ آل عمران:۱٦٤)

''یقیناً اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہی احسان انہیں الفاظ میں سورۂ جمعہ میں دہرایا ہے:

(۱۱) ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (٦٢/ الجمعة:۲)

''وہی اللہ جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا ہے اور ان کو پاک وصاف کرتا ہے اور کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

خود آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے اپنا یہ احسان ان پر ظاہر فرمایا ہے:

(۱۲) ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (٤/ النسآء:۱۱۳)

''اور اگر خدا کا فضل وکرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک جماعت ارادہ کر چکی تھی کہ وہ تجھے گمراہ کر دے اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے کچھ نقصان نہ پہنچا سکتے خدا نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری اور تجھ کو وہ سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر خدا کا بڑا فضل تھا۔''

آنحضرت ﷺ سے خطاب ہے:

(۱۳) ﴿ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰۤى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ﴾ (۱۷/ بنی اسرآءیل:۳۹)

''یہ وہ ہے جو خدا نے حکمت کی باتوں میں سے تم پر وحی کی ہے۔''

عام مسلمانوں سے ارشاد ہے:

(۱٤) ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ﴾

(۲/ البقرة:۲۳۱)

''اور اللہ کا جو احسان تم پر ہے اور اس نے تم پر جو کتاب اور حکمت اتاری ہے ان کو یاد کرو خدا تم

کو اس سے سمجھاتا ہے۔"

خاص طور سے ازواج مطہرات کو خطاب ہے:

(۱۵) ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳٤)

"اور تمہارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔"

یہ نعمت حسب استعداد عام مسلمانوں کو بھی ملا کرتی ہے:

(۱٦) ﴿يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾

(۲/ البقرۃ:۲٦۹)

"اور خدا جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جس کو حکمت بخش دی گئی اس کو بڑی دولت (بھلائی) دی گئی۔"

اسی کے ذریعہ تبلیغ ودعوت کا حکم بھی ہوتا ہے:

(۱۷) ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾

(۱٦/ النحل:۱۲۵)

"اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف، تو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے عمدہ طریقہ سے مناظرہ کر۔"

ایک جگہ قیامت اور عبرت کے واقعات پر حکمت کا اطلاق ہوا ہے:

(۱۸) ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ حِكْمَةٌ ۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۙ﴾

(٥٤/ القمر:٤۔٥)

"اور ان کو اتنے احوال جتنے میں ڈانٹ ہوسکتی ہے، پہنچ چکے ہیں، مؤثر حکمت، تو ان کو ڈر سنانے والے فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔"

اوپر کی سطروں میں وہ تمام آیتیں لکھ دی گئیں ہیں جن میں "حکمت" کا لفظ آتا ہے ان آیتوں میں حکمت کا لفظ کہیں تنہا آیا ہے اور کہیں "کتاب" کے بعد آیا ہے کتاب کے دو معنی قرآن میں ہیں ایک صحیفۂ ربانی کے معنی میں اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نوشتہ الٰہی اور علم الٰہی جیسے ﴿لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ﴾ "اگر خدا کا نوشتہ یا علم پہلے نہ ہوتا۔" ان سابقہ آیتوں میں کتاب سے تو بے شبہ آسمانی کتاب اور صحیفہ ربانی، یا یوں کہو کہ وحی سے کتاب مراد ہے جیسے تورات وقرآن وغیرہ مراد ہے لیکن "حکمت" کا مفہوم ان آیتوں میں کیا ہے؟ حکمت کے لغوی معنی تو دانائی کی بات اور کام کے ہیں، مگر یہاں اس سے مقصود کیا ہے؟ اس تحقیق کے

لئے ضرورت ہے کہ مستند اہلِ لغت اور ماہرین قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے اور سب سے قدیم لغت نویس ابن درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب ''جمهرة اللغة'' میں حکمت کے حسب ذیل معنی لکھتا ہے:

فكل كلمة وعظتك اوزجرتك اودعتك الى مكرمة اونهتك من قبيح فهى حكمة وحكم. ❶

''ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بری چیز سے روکے وہ حکمت اور حکم ہے۔''

لغت کا امام جوہری اپنی صحاح اللغة میں لکھتا ہے:

الحكمة من العلم والحكيم العالم و صاحب الحكمة والحكيم المتقن للامور. ❷

''حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم اور حکمت والا اور حکیم کاموں کو خوبی سے کرنے والا''

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

والحكمة عبارة عن معرفة افضل الاشياء بافضل العلوم. ❸

''اور حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ سے جاننے کو کہتے ہیں۔''

لغت قرآن کے مشہور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں کہتے ہیں:

والحكمة اصابة الحق بالعلم والعقل فالحكمة من الله تعالى معرفة الاشياء ايجادها على غاية الاحكام ومن الانسان معرفة الموجودات و فعل الخيرات. ❹

''اور حکمت، علم اور عقل سے سچی اور صحیح بات کو جاننا ہے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت چیزوں کا جاننا اور ان کو بکمال خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات کو جاننا اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔''

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا چاہیے جو زبان دانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاوروں سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے۔ ابن حبان اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے: ❺

(۱) قال مالك وابورزين: الحكمة الفقه فى الدين والفهم الذى هو سجية ونور من الله تعالى.

❶ جمهرة اللغة، ج ۲، ص: ۱۸۶، حیدرآباد۔ ❷ صحاح اللغة، ج ۲، ص: ٦٢٧، مصر۔
❸ لسان العرب، ج ۱۵، ص: ۳۰، مصر۔ ❹ مفردات القرآن، ص: ۱۲٦، مصر۔
❺ زیر آیت ﴿وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ﴾ الاية: ج ۱، ص: ۳۵۳ مطبوعه سعادت مصر۔

''امام مالک اور ابورزین کا قول ہے: حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔''

(۲) وقال مجاهد: الحكمة فهم القرآن.

''مجاہد کا قول ہے: حکمت یعنی قرآن کا فہم۔''

(۳) وقال مقاتل: العلم والعمل به لايكون الرجل حكيمًا حتى يجمعها.

''مقاتل کا قول ہے: حکمت، علم اور علم کے مطابق عمل کو کہتے ہیں کسی شخص کو حکیم اس وقت تک نہیں کہا جاتا جب تک وہ علم و عمل دونوں کا جامع نہیں۔''

(٤) وقيل: الحكمة القضاء.

''بعضوں کا قول ہے: حکمت فیصلہ کرنا ہے۔''

(٥) وقيل: مالايعلم الامن جهة الرسول.

''کسی کا قول ہے: حکمت وہ ہے جو رسولوں کے سوا کسی اور ذریعہ سے معلوم نہ ہو سکے۔''

(٦) وقال ابوجعفر محمد بن يعقوب: كل صواب من القول ورث فعلاً صحيحًا فهو حكمة.

''ابوجعفر کا قول ہے: ہر وہ صحیح بات جو صحیح عمل پیدا کرے حکمت ہے۔''

(٧) وقيل: وضع الاشياء مواضعها.

''کسی کا قول ہے: چیزوں کو اپنی اپنی جگہ رکھنا حکمت ہے۔''

(٨) وقيل: كل قول وجب فعله.

''ایک اور شخص کا قول ہے: ہر وہ بات جس کا کرنا ضروری ہو حکمت ہے۔''

امام ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں حسب ذیل اقوال لکھے ہیں:

(١) قال (مالك): المعرفة بالدين والفقه في الدين والاتباع لهٗ.

''مالک کا قول ہے: دین کی معرفت اور دین میں سمجھ اور اس کی پیروی حکمت ہے۔''

(٢) قال ابن زيد: الحكمة الدين الذى لا يعرفونه الابه ﷺ يعلمهم اياها قال والحكمة العقل فى الدين وقرا: ﴿ومن يؤت الحكمة فقد اوتى خيرًا كثيرًا﴾ وقال يعينى ويعلمه الكتب والحكمة والتوراة والانجيل وقرأ ابن زيد: ﴿واتل عليهم نبأ الذى اتينه ايٰتنا فانسلخ منها﴾ قال لم ينتفع بالآيات حين لم تكن معها حكمة قال والحكمة شيء يجعله الله فى القلب نورله به۔

''ابن زید کا قول ہے: حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول ﷺ سے معلوم ہوتا ہے وہی اس کو سکھاتا ہے نیز انہیں کا قول ہے کہ حکمت دینی عقل کا نام ہے اور اس پر یہ آیت پڑھی کہ ''جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی دولت دی گئی اور خدا نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کہا کہ خدا ان کو کتاب اور حکمت اور توراۃ اور انجیل سکھاتا ہے۔'' ابن زید نے یہ آیت بھی پڑھی کہ ''ان کو اس کا حال سناؤ جس کو میں نے اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے الگ ہو گیا۔'' یعنی ان آیتوں سے نفع نہیں اٹھایا کہ ان کے پاس حکمت نہ تھی حکمت وہ چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ بندہ کے قلب میں رکھتا ہے اور اس سے اس کو روشن کرتا ہے۔''

(۳) عن قتادہ: والحکمۃ ای السنۃ.

''قتادہ سے مروی ہے: حکمت یعنی، سنت نبوی۔''

آخر میں امام طبری اپنا فیصلہ سناتے ہیں:

(٤) قال ابن جریر الطبری: والصواب من القول عندنا فی الحکمۃ انھا العلم باحکام اللّٰہ التی لا یدرک علمھا الابیان الرسول ﷺ والمعرفۃ بھا وما دل علیہ ذلک من نظائرہ وھو عندی مأخوذ من الحکم الذی بمعنی الفصل بین الحق والباطل. [1]

''ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکام الٰہی کے علم کا نام ہے، جو صرف رسول کے بیان (تشریح) سے معلوم ہوتے ہیں اور جو ان کی مثالیں اور نظیریں ہیں ان کی معرفت کو کہتے ہیں اور حکمت کا لفظ میرے نزدیک حکم سے ماخوذ ہے جس کے معنی حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔''

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے، لکھتے ہیں:

(٥) وسمعت من ارضی من اھل العلم بالقران یقول: الحکمۃ سنۃ رسول اللّٰہ ﷺ. [2]

''میں نے قرآن کے ان اہلِ علم سے جن کو پسند کرتا ہوں یہ سنا کہ حکمت آنحضرت ﷺ کی سنت کا نام ہے۔''

امام شافعی اسی کتاب میں آگے چل کر بعضوں کا قول نقل کرتے ہیں:

وسنتہ الحکمۃ التی فی روعہ عن اللّٰہ عزوجل. [3]

[1] تفسیر طبری، الجزء الاوّل، ص:٤١٥، مصر [2] الرسالۃ، ص:٢٤۔ [3] ایضاً، ص:٢٨۔

"اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔"

ائمہ لغت اور علمائے قرآن کے ان تمام اقوال پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ یہ کل کے کل ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حکمت عقل وفہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے، جس سے صحیح وغلط، صواب وخطا، حق و باطل اور خیر وشر کے درمیان تمیز وفیصلہ، بذریعہ غور وفکر، دلیل و برہان اور تجربہ واستقرا کے نہیں، بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا عمل بھی ہوتا ہے۔

ہر فن کے واقف کار دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وہ جو کسی فن کو باقاعدہ حاصل کرتے، اس کی مشق کرتے اور اس میں مہارت اور کمال بہم پہنچاتے ہیں۔ دوسرے وہ جو اس فن کی فطری استعداد اور قابلیت رکھتے ہیں اور تجربہ و دلیل کے بغیر خود اپنی فطری صلاحیت، صحیح وجدان اور سلیم ذوق سے اس فن کی کسی شے کو دیکھنے کے ساتھ اس کے متعلق جچی تلی رائے دیتے ہیں اور حرف حرف صحیح دیتے ہیں اسی کا نام آپ صحتِ وجدان اور سلامت ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری، انشاپردازی اور دوسرے فنون لطیفہ میں اس کی مثالیں بکثرت دیکھی اور سنی جاتی ہیں اسی طرح بعض لوگوں میں اشیاء کے حق و باطل اور افعال کے خیر وشر کی تمیز کا صحیح وجدان اور صحیح ذوق ہوتا ہے وہ ان امور کے اس کے دقیق سے دقیق مسئلہ کے متعلق اپنے ربانی ذوق و وجدان سے صحیح رائے دیتے ہیں جو دوسرے لوگ وسیع مطالعہ اور غور وفکر کے بعد بھی نہیں دے سکتے یہی وہ معرفت اور نور الٰہی ہے جو جدوجہد اور سعی ومحنت سے نہیں بلکہ عطا و بخشش سے حاصل ہوتی ہے اور اسی کا نام "حکمت" ہے۔

دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ بھی سب کو یکساں نہیں ملتا بلکہ حسب استعداد معمولی حکمت سے لے کر اعلیٰ ترین اور کامل ترین حکمت تک عطا ہوتی ہے اس کے مختلف درجے اور مراتب عام انسانوں کو مل سکتے ہیں اور ملتے ہیں لیکن اس کا اعلیٰ ترین اور کامل ترین درجہ اور مرتبہ صرف انبیا علیہم السلام کو ملتا ہے۔

مگر یہ نکتہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، آسمانی فہم، دینی عقل اور نورانی قوت پر "حکمت" کا اطلاق ہوتا ہے اسی طرح اس قوتِ حکمت کے آثار ونتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، چنانچہ دوسری آیت، جس میں حضرت لقمان علیہ السلام کو حکمت دیے جانے کا بیان ہے اس کے بعد اس حکمت لقمانی کی حسب ذیل تعلیمات کا ذکر ہے، اللہ کا شکر ادا کرنا، شرک کی ممانعت، والدین کی خدمت، اچھوں کی پیروی، خدا کا ہمہ گیر علم، نماز کا حکم، صبر، فخر وغرور کی ممانعت، میانہ روی اور آہستہ بولنا۔ اسی طرح تیرہویں آیت میں حکمتِ محمدی کی حسب ذیل تعلیمات کی تفصیل بھی کی گئی ہے شرک کی ممانعت، والدین کے ساتھ احسان، قرابت داروں اور بے کسوں سے نیک سلوک، اسراف کی برائی، نرمی کی بات کرنا، میانہ روی، اولاد کے قتل کی مذمت، کسی کی جان نہ لینا، مقتول کا بدلہ لینا، یتیم کے ساتھ اچھا برتاؤ، عہد پورا کرنا، ناپ تول

ٹھیک رکھنا، بے جانی چیز کی پیروی نہ کرنا، فخر وغرور کی مذمت وغیرہ۔ ان تمام باتوں کو بیان فرما کر اللہ کہتا ہے:

﴿ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ ﴾ (١٧/ بنی اسرآئیل: ٣٩)

''یہ ہیں حکمت کی وہ بعض باتیں جو خدا نے تجھ پر وحی کی ہیں۔''

حکمت کی ان بعض باتوں کی تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکمت کے مظاہر اور نتائج کس قسم کی باتیں ہیں یہ عموماً وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالم گیر صداقت اور سچائی کو خود فطرتِ انسانی اور حسِ اخلاقی تسلیم کرتی ہے اور یہی سبب ہے کہ تیسری اور چوتھی آیت میں حکمت کا اطلاق زبور پر اور پانچویں اور چھٹی آیت میں انجیل پر ہوا ہے کہ ان میں اسی قسم کی دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کی تعلیم ہے اور خود قرآن پاک نے بھی اپنی صفت ''حکمت والا قرآن'' ظاہر کی ہے ﴿ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ۙ﴾ (٣١/ لقمان:٢؛ ١٠/ یونس:١) ﴿ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ﴾ (٣٦/ یٰس:٢) ﴿ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴾ (٣/ آل عمران:٥٨) ان آیتوں سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ''حکمت'' کی بعض اہم تعلیموں اور باتوں کو وحی الٰہی خود اپنے اندر بھی شامل کر کے ان کو آب مقطر بنا دیتی ہے یہ چیز انبیا کو کتاب کی وحی الٰہی کے ساتھ عام طور پر ملتی ہے۔ فرمایا:

﴿ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ﴾ (٣/ آل عمران:٨١)

''اور یاد کرو جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ البتہ جو میں تم کو کتاب اور حکمت دوں۔''

بہر حال یہ حکمت کی قوت انبیا علیہم السلام کو بدرجہ اتم حاصل تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر بات، دانائی اور ان کا ہر کام، دانش مندی پر مبنی تھا اور چونکہ یہ قوت ان کو حاصل تھی تو اس قوت کے آثار اور نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوئے اور جن کا یہ صرف اقرار واعتراف بلکہ ان پر عمل بھی نبوت کی تصدیق کے اندر داخل ہوا۔ پندرہویں آیت میں ہے:

﴿ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى [1] فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٣٤)

''(اور اے محمد رسول اللہ کی بیویو!) تمہارے گھروں میں خدا کی جو آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات کو آیات الٰہی کے علاوہ کس حکمت کے یاد رکھنے کا حکم دیا گیا، ظاہر ہے کہ وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کی حکمت ودانائی کی وہ باتیں تھیں، اب اگر وہ باتیں امور دین سے متعلق نہ ہوتیں تو ان کے لئے ان کا یاد رکھنا کیوں ضروری قرار دیا جاتا، اسی طرح آٹھویں، نویں، دسویں اور گیارہویں آیت میں آنحضرت ﷺ کی صفت میں ہے:

﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ ﴾ (٦٢/ الجمعة:٢)

[1] لفظ "یتلی" سے کسی کو شبہ نہ ہو کہ وہ کتاب کے لیے خاص ہو کہ آنحضرت ﷺ کتاب کا کوئی صفحہ پڑھ کر نہیں سناتے تھے بلکہ الفاظ الٰہی کو زبانی ادا فرماتے تھے۔

''وہ مسلمانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کتاب کے بعد کس حکمت کی تعلیم دیتے تھے؟ ظاہر ہے کہ خود اپنی حکمت کی، تو جس حکمت کی وہ تعلیم دیتے تھے وہ خود ان کے اندر بھی تھی، کہ جو چیز ان کے پاس نہیں وہ دوسروں کو کیا بخش سکتے تھے، تو جب یہ قوت آپ کے پاس تھی تو اس کے آثار ونتائج بھی اقوال وافعال کی صورت میں نمایاں ہوں گے، جن کی وہ تعلیم فرماتے ہیں اور اپنے ان امورِ حکمت کی تعلیم سے آپ کا مقصد بھی یہی ہوسکتا ہے کہ مسلمان ان پر عمل کریں۔

پانچویں آیت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

﴿قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِأُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي تَخْتَلِفُونَ فِيهِ﴾

(۴۳/ الزخرف:۶۳)

''میں تمہارے پاس حکمت لے کر آیا ہوں، تاکہ جن باتوں میں تم باہم اختلاف رکھتے ہو کچھ باتیں ان میں سے کھول دوں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ حکمت کا ایک فریضہ تبیین بھی ہے یعنی کسی مجمل، ذو معنیین اور مختلف فیہ مسئلہ کی تشریح و تفصیل جس سے وہ اجمال اور اختلاف جاتا رہے، اور اصل مقصود کی تشریح ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تورات کے بعض احکام کی جن میں یہود مختلف الرائے تھے تفصیل فرمائی اور ان کی غلطی دور کی، بارہویں آیت میں ہے:

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهُ لَهَمَّتْ طَائِفَةٌ مِنْهُمْ أَنْ يُضِلُّوكَ وَمَا يُضِلُّونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّونَكَ مِنْ شَيْءٍ وَأَنْزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا﴾ (۴/ النسآء:۱۱۳)

''اور اگر خدا کا فضل و کرم تجھ پر نہ ہوتا تو ان میں سے ایک گروہ نے چاہا تھا کہ تجھ کو گمراہ کر لے، اور وہ گمراہ نہیں کرتے لیکن اپنے آپ کو اور تجھے ذرا سا بھی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اللہ نے تجھ پر کتاب اور حکمت اُتاری اور تجھ کو سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور اللہ کا فضل تجھ پر بڑا ہے۔''

ان آیتوں میں بیان ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور وہ تجھ کو بہکا نہ سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا تجھ پر فضل و کرم ہے اور وہ فضل و کرم یہ ہے کہ اس نے تجھ پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تجھے وہ علم بخشا جو پہلے نہ تھا اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت، خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کتاب اور حکمت دونوں کے ملنے کے سبب حاصل ہوئی ہے۔ الغرض اس حفاظت و عصمت کے حصول میں کتابِ الٰہی کے ساتھ حکمتِ ربانی کے

[1] قرآن پاک میں حرفِ علت سے قبل ''واؤ'' آیا کرتا ہے جیسے ﴿وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ﴾ (۶/ الانعام:۷۵) یہ حرفِ عطف نہیں۔

انعام کو بھی دخل کامل ہے۔

یہ تو وہ نبوی حکمت تھی جس کا سرچشمہ صرف سینہ نبوت تھا، لیکن یہ فیض حسب استعداد پیغمبر کے اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے، جس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ سچی اور صحیح بات کو بہت آسانی سے سمجھ لیتے، قبول کر لیتے اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

تبلیغ اسلام کے تین ذریعوں، حکمت، موعظت اور خوش خلقی کے مناظرہ کرنے میں سب سے اول اسی کو جگہ دی گئی ہے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾

(۱۶/ النحل:۱۲۵)

''تو اپنے رب کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دے اور ان سے مناظرہ بطریق احسن کر۔''

سچی، صحیح اور صاف بات دل تک پہنچ جاتی ہے اور بہت جلد اپنا اثر دکھاتی ہے۔ فرمایا:

﴿ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ ﴾ (۵۴/ القمر:۵) ''دل تک پہنچ جانے والی حکمت۔''

یہ حکمت ہر نیکی کی جڑ اور بھلائی کی اصل ہے پھر اس سے بڑھ کر دنیا میں اور کیا دولت ہوسکتی ہے، اس لئے ارشاد ہوا:

﴿ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶۹)

''جس کو حکمت دی گئی اس کو بڑی نیکی (دولت) دی گئی۔''

اس سلسلہ میں دو مشہور اور مستند حدیثوں کا حوالہ بھی مناسب ہے جس سے حکمت کی حقیقت واضح ہوگی اور کم از کم قرن اول میں اس لفظ کا مفہوم ظاہر ہوگا، آنحضرت ﷺ نے وفد کے ایک خطیب کا بیان سن کر فرمایا:

((اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً، اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا)) [1]

''بعض شعر حکمت ہیں، اور بعض تقریریں جادو ہوتی ہیں۔''

اس حدیث میں بعض اشعار کو حکمت اور بعض تقریر و بیان کو جادو کہا گیا ہے۔ اس تقابل سے ظاہر ہے کہ اس عربی حکمت کا مفہوم اردو حکمت کے مفہوم سے بلند تر ہے، یعنی سحر و جادو کے مافوق انسانی تصور کی طرح حکمت کے عربی مفہوم میں کوئی مافوق بشری تخیل ضرور ہے اسی سے سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی میں حکمت کے معنی عقل وفہم وغیرہ معمولی الفاظ سے کوئی بلند اور غیر معمولی حقیقت ہے اردو میں اس حقیقت کو ''حکمت'' کے ساتھ لفظ الہامی بڑھا کر ادا کیا جا سکتا ہے یعنی ''الہامی حکمت''

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب مایجوز من الشعر والرجز...... الخ:۶۱۴۵ میں پہلا فقرہ اور کتاب الطب، باب ان من البیان سحرا:۵۷۶۷ میں دوسرا فقرہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''رشک وحسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر ایک اس پر جس کو مال کی دولت ملی تو وہ اس کو صحیح مصرف میں لٹاتا ہے اور دوسرے ((رَجُلٌ اٰتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا)) [1] ''اس شخص پر جس کو حکمت ملی ہے تو وہ اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں معلم ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے۔'' جب یہ عام انسانوں کا درجہ ہے تو انبیا علیہم السلام کو یہ دولت کس بہتات سے ملی ہوگی اور وہ یقیناً آنحضرت ﷺ کے حصہ میں بھی آئی اب اس حصولِ دولت یعنی عطائے حکمت کا نتیجہ بھی آپ سے ظاہر ہونا چاہیے اور وہ فیصلہ اور تعلیم ہے، آپ کے یہ ملہمانہ فیصلے اور حکیمانہ تعلیمات جو تمام تر وحی ربانی کی عملی اور زبانی شرح اور بیان ہیں۔

کتاب وحکمت کی تعلیم

اوپر کی چار آیتوں ۸۔۹۔۱۰۔۱۱ میں خفیف سے تغیر کے ساتھ حسب ذیل آیت ہے:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۲)

''(وہ رسول) ان (ان پڑھوں) کو خدا کی آیتیں سناتا اور ان کو سنوارتا اور ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔''

ان آیتوں میں آنحضرت ﷺ کے تین کاموں کا ذکر ہے:

1. خدا کی آیتوں کو پڑھنا اور دوسروں کو سنانا۔
2. ان کو شرک اور بداخلاقی کی نجاستوں سے پاک وصاف کرنا اور سنوارنا۔
3. ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا۔

سوال یہ ہے کہ پہلی اور تیسری آیتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں یا دو، اگر ایک معنی رکھتی ہیں، تو اس بے سود تکرار کا کیا فائدہ؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتلوا یعنی تلاوت ہی کا لفظ رکھ دیا گیا اور اگر دو الگ الگ معنی رکھتی ہیں، جیسا کہ ہر صاحب نظر سمجھ سکتا ہے، تو ان دونوں معنوں میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہوگا، اگر رسول کا فرض محض وحی کی زبان سے سنی ہوئی آیتوں کو پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر اس کی تبلیغ کا فریضہ ختم ہو جاتا ہے تو اس کا تیسرا فرض الفاظ کی تلاوت سے آگے بڑھ کر کتاب اور حکمت کے سبق کی تعلیم کیونکر قرار دیا جا سکتا، بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ، ہے خصوصاً جبکہ لفظ تعلیم تلاوت کے بعد آتا ہے وحی کے الفاظ کو سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہو جاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ہنوز باقی رہ جاتا ہے کتاب کی تعلیم کے معنی تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ کا سنا دینا اور پڑھا دینا اور دوسروں کو یاد کرا دینا نہیں بلکہ الفاظِ قرآنی کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ:۷۳۔

تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معانی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام ''کتاب و حکمت کی تعلیم'' ہے اور یہ آپ کا دوسرا یا تیسرا فریضہ تھا اور یہی وہ تعلیم تھی جس کا ان آیتوں میں بار بار ذکر ہے اب جب ان مطالب و معانی کی شرح و تفسیر بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل تھی تو اس پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی حیثیت بھی دینی ہوگی اور اس کی تعمیل بھی امت کے لئے ضروری ہوگی آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایت و عمل سے محفوظ رکھا اور وہ ''احادیث و سنن'' کے نام سے موسوم ہے۔

اس تفصیل کے بعد ''حکمت'' کے ان معنوں پر ایک نظر دوبارہ ڈال لیجئے جو ائمہ لغت اور علمائے قرآن نے بیان کئے ہیں تو آپ کو یقین آ جائے گا کہ وہ کل ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی معنی کی متعدد تفسیریں ہیں آنحضرت ﷺ کے اقوال و افعال، جن کے اصطلاحی نام احادیث و سنن ہیں، کتاب الٰہی کی عملی و زبانی تشریحات ہیں۔ کتابِ الٰہی وحی ربانی کا نتیجہ ہے اور احادیث و سنن، سینۂ نبوی کی ملہمانہ حکمت کا۔ اس مقام پر امام شافعی کی تحقیق پیش نظر رہے:

وسنة الحكمة التي القى فى روعه عن الله عزوجل۔ [1]

''اور آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے قلب میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔''

اور اسی مفہوم کو مجاہد اس طرح ادا کرتے ہیں کہ الحكمة فهم القرآن . حکمت فہم قرآن کا نام ہے، دوسری عبارت میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور اس تشریح کا نام جو رسول کے قول و عمل سے ادا ہوئی، سنت ہے اور اس معنی کو امام مالک اور ابورزین اور ابن زید وغیرہ دوسری صدی کے علمائے قرآن ان عبارتوں میں ادا کرتے ہیں کہ ''حکمت معرفتِ دین، فقہ دین اور اس دینی علم کو کہتے ہیں جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کر کے اس کو منور کر دیتا ہے۔''

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اصل حکمتِ نبوی وہ نور نبوت اور الہامی معرفت ہے جو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب و سینہ میں ودیعت رکھا تھا اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمتِ نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں اس لئے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے، اس تفصیل کے بعد ظاہر ہوگا کہ بعض اماموں اور عالموں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنی کی طرف توجہ کی ہے اور بعض نے ثانوی معنی کو بیان کیا ہے اور دونوں حق پر ہیں۔

علم

علم کے لغوی معنی جاننے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت

---

[1] الرسالۃ، ص:۲۸، مصر۔

مختلف ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام کے تعلق سے اس کا جب استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید، ذات وصفات، دین وشریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید پر استدلال کر کے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

﴿ يَٰٓأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ ٱلْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ ﴾ (۱۹/ مریم:۴۳)

''اے میرے باپ! میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔''

حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿ وَعَلَّمْنَٰهُ مِن لَّدُنَّا عِلْمًا ۝ ﴾ (۱۸/ الکھف:۶۵)

''اور ہم نے اپنے پاس سے اس کو علم سکھایا۔''

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے، پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شے جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش، جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے وہ منجانب اللہ کہی جاتی ہے اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنی اس علم کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائعِ علم واستدلال اور تلاش وتحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو، وہی علم خداداد ہے اور اسی لئے صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو علم لدنی (پاس والا علم) کہتے ہیں:

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی نسبت ہے:

﴿ وَلَقَدْ ءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ وَسُلَيْمَٰنَ عِلْمًا ۖ ﴾ (۲۷/ النمل:۱۵)

''اور بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم دیا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے:

﴿ وَكَذَٰلِكَ يَجْتَبِيكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِن تَأْوِيلِ ٱلْأَحَادِيثِ وَيُتِمُّ نِعْمَتَهُۥ عَلَيْكَ ﴾

(۱۲/ یوسف:۶)

''اور اسی طرح تیرا پروردگار تجھ کو نواز دے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت، کی (تاویل) سکھائے گا اور تجھ پر اپنا انعام پورا کرے گا۔''

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں، جس کا منشا وحی موقت ہے، کیونکہ ان میں سیاق کلام سے علم کے یکبارگی دیے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں، خصوصاً آخری آیت میں تاویلِ احادیث کا علم بیک دفعہ دیے جانے کا تذکرہ ہے، اسی لئے حضرت یوسف علیہ السلام ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

﴿ ذَٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّيٓ ۚ ﴾ (۱۲/ یوسف:۳۷)

''یہ وہ ہے جو میرے پروردگار نے مجھے سکھایا ہے۔''

یہ کہیں بیان نہیں کیا گیا ہے، کہ خواب کی تعبیر کے وقت ان پر وحی آ کر حقیقت سے ان کو مطلع کرتی تھی

بلکہ خود ان کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لئے ودیعت کردی گئی تھی، اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیا علیہم السلام کو بچپن ہی میں علیم (جاننے والے) کا خطاب ملا:

﴿ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۲۸)

''اور فرشتوں نے اس کو ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوشخبری دی۔''

﴿ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۵۳)

''ہم تجھے ایک بڑے صاحب علم فرزند کی خوش خبری دیتے ہیں۔''

یہاں لفظ علیم اختیار کیا گیا ہے عالم نہیں اور یہ لفظ عالم سے زیادہ علم پر دلالت کرتا ہے ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اس کے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ بھی نبی کی شان ہے۔

علم وحکم

بہت سے انبیا کے متعلق علم کے ساتھ حکم کا عطا ہونا بھی بیان ہوا ہے، حکم کے معنی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ اور بوجھ کا نتیجہ (یعنی فیصلہ کے) کر سکتے ہیں، امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

والحكم بالشيء ان تقضي بالشيء بانه كذا أوليس كذا سواء الزمت ذلك غيره اولم تلزمه۔ [1]

''کسی شے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ایسی شے ہے یا ایسی نہیں ہے، عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔''

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

الحكم العلم والفقه والقضاء بالعدل۔ [2]

''حکم کے معنی علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنا ہے۔''

ان انبیا علیہم السلام کو جن پر کسی کتاب کا ملنا ثابت نہیں، اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ کسی اور عطیہ علم و حکم کی طرف اشارہ ہے، چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی شان میں ہے:

﴿ وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ ﴾ (۱۲/ یوسف:۲۲)

''اور جب یوسف علیہ السلام جوانی کی قوت کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔''

حضرت لوط علیہ السلام کے متعلق ہے:

﴿ وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۴)

[1] مفردات القرآن، ص:۱۲۶، مصر۔ [2] لسان العرب، ج۱۵، ص:۳۰، مصر۔

''اور لوط کو ہم نے حکم اور علم دیا۔''

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے ذکر میں ہے:

﴿ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۹)

''تو ہم نے سلیمان کو وہ فیصلہ سمجھا دیا اور ہر ایک کو ہم نے حکم اور علم دیا تھا۔''

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی نسبت ہے:

﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۱۲)

''اے یحییٰ کتاب (توراۃ) کو مضبوطی سے پکڑ و اور ہم نے اس کو حکم بچپن میں عطا کر دیا۔''

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل پر اپنی نعمتیں ان الفاظ میں شمار کرتا ہے:

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ﴾ (۴۵/ الجاثیۃ:۱۶)

''اور بلاشک ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکم اور نبوت دی۔''

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اور حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ان آیتوں میں حکم سے مراد دنیاوی حکومت اور سلطنت ہے کہ اس کے معنی میں یہ لفظ خالص قدیم عربی میں نہیں آیا، یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنی میں استعمال کیا ہے، جیسے:

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا بِالْحَقِّ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۲)

''ہمارے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔''

﴿ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ﴾ (۳۸/ صٓ:۲۶)

''تم لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

﴿ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲)

''اور اگر تو ان کے درمیان فیصلہ کرے تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر۔''

حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام ایک مقدمہ کا فیصلہ کرتے ہیں:

﴿ وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۸)

''اور داؤد اور سلیمان کو جب وہ دونوں کھیت کا فیصلہ کر رہے تھے۔''

﴿ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۱۰)

''اور جس کسی چیز میں تم نے اختلاف کیا، تو اس کا فیصلہ اللہ کی طرف ہے۔''

سب سے بڑھ کر یہ کہ، یہی تین باتیں سورۂ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر الگ الگ دہرائی گئی ہیں:

﴿ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ آتَيْنَٰهُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:٩٠)

''یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب اور حکم اور نبوت بخشی۔''

جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے، یہ ہیں: ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنی حکومت وسلطنت (اگر ہو) تو اس کے مستحق صرف دو ہیں، سلیمان اور داؤد علیہما السلام اور چاہے کسی طرح کسی تاویل سے یوسف اور موسیٰ علیہما السلام کو بھی شامل کرلیا جائے باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا اس لئے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صحیح اور صریح معنی میں مستعمل ہے اور اس لفظ سے خدا کا جو مقصود ہے، وہ کتاب کے ساتھ ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ غلط فہمی کا پورا پردہ چاک کرنے کے لیے ایک اور آیت کریمہ پر نظر ڈالیے:

﴿ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَن يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّي مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِن كُونُوا رَبَّٰنِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَٰبَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ ﴾

(٣/ آل عمران:٧٩)

''کسی بشر کے لئے یہ زیبا نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکم اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بنو، بلکہ جو تم کتاب (توراۃ) سکھاتے تھے اور جو تم پڑھتے تھے اس کے ذریعہ سے تم خدا والے بنو۔''

ان آیتوں میں مخاطب اہل کتاب ہیں اور جس مقدس بشر کا ان میں ذکر ہے، بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، وہ نہ ہوں تو خود محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور یہ اس وقت کی بات ہے جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ میں کمزور و ناتواں تھا۔ ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے، وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہوسکتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو حکومت وسلطنت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی عطا نہیں ہوا تھا اور آنحضرت ﷺ کو اس وقت تک جب تک بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے، یہ رتبہ نہیں ملا تھا آیت ﴿ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ﴾ میں بھی حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے، حکومت وسلطنت نہیں، تسکین کے لئے اس آیت کے آگے پیچھے کے الفاظ پر نظر ڈالو:

﴿ قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهِ ۚ مَا عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الْفَٰصِلِينَ ﴾ (٦/ الانعام:٥٧)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ میں اپنے پروردگار کی کھلی دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو،

میرے پاس وہ نہیں جس کی تم جلدی کرتے ہو، فیصلہ کسی کا نہیں لیکن اللہ کا، وہ حق بیان کرتا ہے اور سب فیصلہ کرنے والوں سے وہ بہتر ہے۔"

ان وجوہ سے اس میں کوئی شک نہیں رہتا کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے جس کے صاف وصریح معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم وفہم فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز ہے اور اس لئے رسول کی اس قوت وطاقت کے نتائج بھی ہمارے لئے واجب العمل ہیں۔

شرح صدر

ربانی علم ومعرفت کا ایک اور مقام شرح صدر ہے شرح صدر کے معنی سینہ کھولنے کے ہیں عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل و نادانی کی علامت اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے اسی لئے شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنی علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور سے اس علم ومعرفت اور اطلاع وآگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعتہً اور یک بیک قلب میں وارد ہو جاتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی وتسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک وشبہات دور ہو کر اس کو یقین کی راحت ومسرت حاصل ہو جاتی ہے جمہرہ ابن درید میں ہے:

والشرح من قولهم شرحت لك الأمر...... أى أوضحته وكشفته وشرح الله صدره فانشرح اذا اتسع بقبول الخير۔ [1]

"شرح اہل عرب کے اس محاورہ سے ہے کہ "میں نے تیرے لئے بات کی شرح کر دی" یعنی اس کو واضح کر دیا اور کھول دیا اور اللہ نے اس کے سینہ کو کھول دیا تو وہ کھل گیا یعنی جب نیکی کے قبول کرنے کے لئے وسیع ہو گیا۔"

صحاح جوہری میں ہے:

الشرح الكشف تقول شرحت الغامض اذا فسرته۔ [2]

"شرح یعنی کشف (کھولنا) تم کہتے ہو میں نے اس پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی اس کی تفسیر کر دی۔"

لسان العرب میں ہے:

الشرح الكشف يقال شرح فلان امرى اوضحه وشرح مسئلةً مشكلةً بينها وشرح الشيء يشرحه شرحًا وشرحه فتحه بينه وكشفه وكل ما فتح من

---

[1] جمهرة اللغة، ج ٢، ص: ١٣٤۔

[2] صحاح اللغة، ج ٢، ص: ٢٦٠۔

الجواهر فقد شرح ایضا تقول شرحت الغامض اذا فسرته وشرح الله صدره لقبول الخير يشرحه شرحا فانشرح وسعه لقبول الحق فاتسع۔

''شرح یعنی کشف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں نے اس کی بات کی شرح کر دی، یعنی اس کو واضح کر دیا اور مشکل مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی اس کو بیان کر دیا اور کسی چیز کی شرح کر دی یعنی تفصیل کر دی اور کھول دیا اور جواہر میں سے جو کھولا جائے تو اس کی شرح کی گئی، تم بولتے ہو پوشیدہ مسئلہ کی شرح کر دی، یعنی تفسیر کر دی اور خدا نے اس کے سینہ کو کھول دیا کسی نیک بات کے قبول کرنے کے لئے تو وہ کھل گیا یعنی اس کو قبول حق کے لئے وسیع کر دیا گیا یا وہ وسیع ہو گیا۔''

قال ابن الاعرابی : الشرح الحفظ والشرح الفتح والشرح البيان والشرح الفهم ۔[1]

''ابن اعرابی نے کہا: شرح کے معنی، یاد رکھنا، کھولنا، بیان کرنا، سمجھنا۔''

قرآن مجید میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا مانگی:

﴿ قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي ۝ وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي ۝ يَفْقَهُوا قَوْلِي ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۲۵۔۲۸)

''اے میرے رب! میرے سینہ کو میرے لئے کھول دے اور میرے کام کو میرے لئے آسان کر دے اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات کو پوری طرح سمجھیں۔''

دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحت بیان کی یعنی اول میں صحیح معانی کے القا اور آخر میں ان کے لئے صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے، تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت محمد رسول اللہ ﷺ کو بن مانگے ملی۔ خدا نے فرمایا:

﴿ أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ۝ وَوَضَعْنَا عَنكَ وِزْرَكَ ۝ ﴾ (۹۴/ الانشراح:۱، ۲)

''کیا ہم نے (اے محمد ﷺ)! تیرے لیے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا اور تیرے بوجھ کو تجھ سے اتار لیا۔''

شرح صدر اور ''سینہ کھولنے'' کی جو تشریح احادیث صحیحہ میں مذکور ہے اس کے لئے عام اصطلاح شق صدر ہے یعنی عالم رؤیا یا بیداری میں فرشتوں نے آ کر سینہ مبارک کو واشگاف کیا، اس کو آبِ زمزم سے دھویا اور

[1] لسان العرب، ج۲، ص:۲۹۲، بیروت۔

سونے کے طشت میں ایمان اور حکمت بھر کر لائے اور ان سے سینہ مبارک کو معمور کر کے شگاف کو برابر کر دیا۔ [1]
اگر یہ واقعہ اپنی ظاہر حقیقت پر محمول کیا جائے تو بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ سینہ مبارک کو واقعاً چاک کر کے اور زمزم کے پانی سے پاک وصاف کر کے ایمان اور حکمت اس میں بھری گئی اور اگر تمثیل کے رنگ میں لیا جائے تو یہ حقیقت ماننی پڑے گی کہ سینہ صافی ایمان وحکمت سے معمور کیا گیا بہر حال شرحِ صدر کی حقیقت ایمان اور حکمت کی ربانی بخشش ہے۔

شرحِ صدر کے اس مذکورہ بالا معنی کو جو شرحِ صدر کے واقعہ کی تفصیل سے واضح ہے، اگر کوئی تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہو تو بحمد اللہ کہ اس کی تسکین کا سرمایہ بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ سورۂ زمر میں ہے:

﴿ اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ ﴾ (۳۹/ الزمر:۲۲)

”بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لئے کھول دیا، تو وہ اپنے پروردگار کی طرف سے ایک روشنی میں ہے۔“

اسلام کے لئے سینہ کے کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا یقین آ گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین حاصل ہوگئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اپنی منزلِ مقصود کے ہر قدم پر اللہ کی روشنی حاصل ہوئی یہی شرحِ صدر کی حقیقت اور ہے اس روشنی کی کمی بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوگی۔

اس سلسلہ میں حدیث کے دو ایسے موقعوں کا ذکر کرنا ہے جن سے لفظ ”شرحِ صدر“ کے معنی کی پوری تشریح ہو جاتی ہے یہاں یہ نکتہ پیش نظر رہے کہ ان حدیثوں سے معنوی، احتجاج یہاں مقصود نہیں بلکہ صدرِ اول کے کلامِ عرب سے شرحِ صدر کے محاورہ کی تشریح مقصود ہے۔

① پہلا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبیلے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کرتے ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان پر فوج کشی کا ارادہ کرتے ہیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ آ کر عرض کرتے ہیں کہ یا خلیفہ رسول اللہ! ان سے جہاد کیونکر ممکن ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے لا الٰہ الا اللّٰہ کہا اس نے جان و مال مجھ سے بچالیا، حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا خدا کی قسم! میں اس سے لڑوں گا جو زکوٰۃ اور نماز میں فرق کرتا ہے۔ نماز خدا کا حق ہے اور زکوٰۃ بندوں کا حق ہے اگر وہ بکری کا ایک بچہ بھی جس کو وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں دیتے تھے، اب نہ دیں گے تو میں ان سے لڑوں گا۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ:۳۴۹؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللہ ﷺ الی السموات...... ۴۱۳، ۴۱۵؛ نسائی، کتاب الصلوٰۃ، باب فرض الصلوٰۃ:۴۴۹؛ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ انشراح:۳۳۴۶؛ مسند احمد، ج ۳، ص:۱۲۱، عن انس بن مالک۔

فو اللّٰہ! ما ھو الا ان قد شرح اللّٰہ صدر ابی بکر فعرفت انہ الحق۔ [1]

''تو خدا کی قسم، نہ تھا یہ، لیکن یہ کہ کھول دیا تھا اللہ نے ابوبکر کے سینہ کو، تو میں نے جان لیا کہ وہی حق ہے۔''

② دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جنگِ یمامہ میں قرآن کے بہت سے حافظ شہید ہوئے اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مشورہ دیا کہ قرآن پاک کو ایک ترتیب سے کاغذ پر یکجا لکھ لیا جائے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ میں وہ کام کیونکر کروں جس کو خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے مشورہ کے بہتر ہونے پر اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں بات آ گئی، اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

فلم یزل عمر یراجعنی حتی شرح اللّٰہ صدری لذلک ورأیت فی ذلک الذی رای عمر۔ [2]

''تو عمر رضی اللہ عنہ بار بار مجھ سے کہتے رہے، یہاں تک کہ خدا نے اس کے لئے میرے سینہ کو کھول دیا، اور میں نے بھی وہی دیکھا جو عمر رضی اللہ عنہ دیکھتے تھے۔''

ان دونوں موقعوں پر لفظ شرحِ صدر اپنے استعمال کا محل اور اپنی حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے، یہی شرح صدر ہے جس کو قرآن نے جیسا کہ اوپر سورۂ زمر کے حوالہ سے گزرا، نورِ ربانی یا نورِ بصیرت کہا ہے۔

آنحضرت ﷺ کو شرحِ صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اس کے سمجھنے سے پہلے بلاغت کا ایک مسئلہ سمجھ لینا چاہیے، جب کوئی لفظ متعلقات کے صلہ اور مفعول کے ساتھ مقید ہو کر بولا جاتا ہے تو اس سے معنی کی تخصیص و تحدید ہو جاتی ہے لیکن وہی لفظ جب متعلقات کے صلہ اور مفعول کی قید کے بغیر بولا جائے گا تو وہ عموم کے ساتھ فعل کے ثبوت کا فائدہ دے گا مثلاً: علم (جاننا) مفعول کو چاہتا ہے۔ جس چیز کا علم ہوتا ہے اس کو عبارت میں مفعول بناتے ہیں اور اس عبارت میں اس علم سے مقصود اسی خاص شے کا علم ہوگا جس کو مفعول بنایا ہے، لیکن اگر مفعول کو حذف کر دیں تو اس کا مقصد کسی خاص علم کے بجائے مطلق اور عام علم کا ثبوت ہوگا ایک جگہ قرآن میں ہے: ﴿ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ﴾ (۳۰/ الروم: ۷) ''وہ حیات دنیا کا ظاہری پہلو جانتے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ اس علم کا تعلق صرف ایک چیز کے علم سے ہے یعنی دنیا کی ظاہری زندگی کے علم سے عام علم سے نہیں لیکن دوسری جگہ ہے: ﴿ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۹) ''کیا جو جانتے ہیں اور وہ جو نہیں جانتے (یعنی جو علم رکھتے ہیں اور جو علم نہیں رکھتے) دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ: ۱۴۰۰۔

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن: ۴۹۸۶۔

یہاں یہ ذکر نہیں کہ کس خاص بات کو جانتے ہیں، بلکہ مقصود عام علم ہے تو یہاں معنی ہوں گے کہ جو ہر طرح کے علم والے ہیں اور جو مطلق بے علم ہیں دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ بلاغت کی کتابوں میں: "هُوَ يَأْمُرُ وَيَنْهٰى يُعْطِي وَيَمْنَعُ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى" کی مثالوں سے اس مفہوم کی توضیح کی گئی ہے۔

اس تمہید کے بعد شرح صدر کے گزشتہ استعمالوں اور مثالوں پر نظر ڈالئے ہر جگہ آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ جس بات کے سمجھنے کے لئے سینہ کھولا جاتا ہے اس پر لام آتا ہے، یا قرینہ سے سمجھا جاتا ہے، مثلاً: اسلام کے لئے سینہ کھول دیا، یا جمع قرآن کے لئے سینہ کھول دیا، مانعینِ زکوۃ کے قتال کے لئے سینہ کھول دیا، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ کے لئے قرآن میں جس شرحِ صدر کا ذکر ہے، اس میں اس بات کا ذکر نہیں ہے جس کے لئے ان انبیا علیہم السلام کے لئے سینے کھولے گئے، اس سے یہ مقصود ہے کہ ان انبیا کو امورِ دین میں مطلق اور عمومی شرحِ صدر عنایت ہوئی اور یہیں سے عام امت اور انبیا کے فرقِ مراتب کا اظہار ہوتا ہے کہ امت کے عام افراد کو خاص خاص امر کے سمجھنے کے لئے شرحِ صدر ملتی ہے اور انبیا کو اپنے دائرہ میں کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عنایت ہوتی ہے۔

ایک اور لطیف پہلو بھی یہاں ذکر کے قابل ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر احسان دونوں موقعوں پر لِیْ اور لَكَ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں "میرے لئے میرے سینہ کو کھول دے" اور آنحضرت ﷺ کے لئے خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ "کیا میں نے تیرے لئے تیرے سینہ کو کھول نہیں دیا" سوال یہ ہے کہ "میرے لئے" اور "تیرے لئے" کے اضافہ کی ضرورت "اور اس لام" کی حاجت کیا تھی؟ مفسرین میں امام زمخشری نے اس سوال کے جواب دینے کی کوشش کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ صرف تاکید کے لئے ہے حالانکہ یہ لام تملیک کے بجائے لام افادہ ہے [1] جیسا کہ ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (۲/ البقرۃ:۲۹) میں ہے مقصد یہ ہے کہ یہ شرحِ صدر کی دولت تجھ کو تیرے لیے ملی ہے یعنی تیرے کشفِ علم کے لیے یا تائید کرنے کے لیے، یا فائدہ کرنے کے لیے اور یہ کشفِ علم اور شرحِ صدر خود تیری ذات کے لیے ہے کہ وہ کامل سے کامل تر ہو کر ظاہر ہو۔

اب آخری سوال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو دین کی جو یہ عمومی شرح صدر عنایت ہوئی اس کا کوئی اثر ونتیجہ بھی تو نمایاں ہوگا تو دراصل اسی کے یہ آثار ونتائج ہیں جو "افعال واقوال" اور "احادیث وسنن" کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں۔

تبیینِ کتاب

آنحضرت ﷺ دنیا میں جس شریعت کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی تھی اور ایسی آخری اور ابدی

[1] تفسیر کشاف، تفسیر سورۃ الانشراح، ج ۲، ص:۱۶۱۸ میں علامہ زمخشری کی یہ تشریح موجود ہے۔

شریعت کے لئے ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور، شریعت کے کلی اور ابدی اصول ومبادی پر دے، چنانچہ اس آخری وحی الٰہی نے اپنی کتاب الٰہی کو صرف اصول وکلیات تک محدود رکھا اور جزئیات کے لئے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے جن کے سہارے سے وہ دل جو علم ومعرفت سے پرنور اور حکم وحکمت سے معمور اور شرحِ صدر اور تائید ربانی سے فیضیاب ہوں وہ علی قدرِ مراتب جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں، چنانچہ یہ رتبہ سب سے پہلے خود نبی ﷺ کو ملا اور چونکہ وہ خطا سے معصوم ہے، اس لئے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے محفوظ ہیں، پھر رسول اللہ ﷺ کے وسیلہ سے یہ رتبہ خلفائے راشدین، اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم، ائمہ تابعین و تبع تابعین و مجتہدین عظام اور علمائے اعلام رحمہم اللہ کو ہمیشہ کے لئے ملتا رہا اس کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے جس کو ہر زمانہ کے فیض یاب علومِ نبوت اور حاملینِ اسرارِ شریعت، خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی توضیح وتفسیر کی ذمہ داری بھی خود اپنے اوپر لی ہے۔ فرمایا:

﴿ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ ﴾ (٧٥/ القيامة:١٦-١٩)

''تو قرآن کی وحی کے ساتھ اپنی زبان کو اس غرض سے حرکت نہ دے، تاکہ تو اس کی تلاوت و اشاعت میں جلدی کرے، ہم پر ہے قرآن کو جمع کرنا اور اس کا پڑھانا اور جب ہم نے اس کو پڑھا دیا، تو تو اس پڑھائی کی پیروی کر، پھر ہم پر ہے اس کی شرح کرنا۔''

اس ''بیان اور شرح'' کی ذمہ داری کبھی بذریعہ وحی ادا ہوئی ہے جو قرآن میں مذکور ہے اور کبھی رسول کی تقریر وعمل سے پوری ہوئی ہے جو عملی تواتر سے منقول اور احادیث اور سنن کے مستند دفتر میں موجود ہے۔

یہ امر کہ اس بیان وشرح کی طاقت اور اس شرح وبیان کا اختیار رسول کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا، حسب ذیل آیت سے ثابت ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ﴾

(١٦/ النحل:٤٤)

''اور ہم نے تیری طرف یہ نصیحت (کی کتاب) اتاری، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا ہے، تو اس کو کھول کر بتا دے شاید وہ سوچیں۔''

''بیان'' اور ''تبیین'' کے لفظی معنی کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں اور ان کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ایک اعلان اور اظہار کے معنی میں یعنی اخفا کے مقابل، دوسرے توضیح وتفسیر کے معنی میں، قرآن پاک میں یہ لفظ ''تبیین'' اپنے دونوں معنوں میں آیا ہے۔ اب یہ تمیز کہ کس آیت میں کیا معنی مراد ہے، سیاق وسباق

اور موقع ومحل سے ہوسکتی ہے، مثلاً: ایک جگہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴾ (٥/ المآئدة:١٥)

''اے کتاب والو! تمہارے پاس ہمارا رسول آیا، کہ کتاب کی جو باتیں تم چھپاتے تھے، وہ ان کو تمہارے لئے ظاہر کردے اور بہت سی باتوں سے درگزر کرے۔''

یہاں ''تبیین'' صریح طور کے اخفا کے مقابلہ میں ہے اس لئے یہاں ''تبیین'' کے معنی یقینی طور پر ''اظہار و اعلان'' کے ہیں لیکن یہی لفظ دوسری جگہ سورۂ نحل میں اس طرح آیا ہے:

﴿ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (١٦/ النحل:٦٤)

''اور ہم نے تجھ پر کتاب نہیں اتاری، لیکن اس لیے، تاکہ تو واضح کردے اس کو، جس میں انہوں نے اختلاف کیا اور ایمان والوں کے لیے راہنمائی اور رحمت بنا کر اس کو اتارا۔''

اختلاف کے مقابلہ میں اظہار اور اعلان کی نہیں بلکہ توضیح وتشریح کی ضرورت ہے کہ جس امر میں اختلاف ہو، وہ توضیح وتفسیر کے بعد دور ہوجائے اب پہلی آیت پر غور کرنا چاہیے جو اسی سورۂ میں ایک اور مقام پر ہے:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴾

(١٦/ النحل:٤٤)

''اور ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف نصیحت کی کتاب (قرآن) کو اتارا، تاکہ لوگوں کی طرف جو اتارا گیا تو اس کو ان کے لیے کھول کر بتادے، شاید کہ وہ سوچیں۔''

سوال یہ ہے کہ اس آیتِ پاک میں بیان کرنے کا مفہوم ظاہر کرنے کے ہیں یا تشریح وتفصیل کرنے کے ہیں، ہمارا دعویٰ ہے کہ ظاہر کرنے کے بجائے یہاں غور وفکر کی مناسبت اور قرینہ کے سبب سے تشریح و تفصیل کے معنی لینا صحیح ہے، امرِ مخفی کا اظہار سننے اور ماننے کے تو مناسب ہوسکتا ہے مگر سوچنے کے لیے نہیں اور غور وفکر کے لیے یہاں تشریح وتفصیل کی ضرورت ہے نہ کہ اظہار واعلان کی اب جبکہ آنحضرت ﷺ کے لیے تفصیل وتبیین کا منصب خدا کی طرف سے ثابت ہے تو اس تفصیل وتبیین کی پیروی اور اتباع بھی خدا ہی کے احکام کی پیروی ہوگی اور آپ کی یہ تبیین وتشریح آپ کے نورِ حکمت کا فیضان ہوگا جس کے اشارے خود کتاب الٰہی کے اندر آپ کو موجود نظر آتے ہیں۔

ارائت

انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جاسکے، جو ایک طرف

اختلاف فہم سے محفوظ رہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جا سکتا، تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے، اسلام نے اپنے قانون الٰہی سے جو بہر حال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے، اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے رسول کی معرفت زبانی، اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کرا دی گو انسانی ذرائع وحفظ وروایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس تشریح و تبیین میں بھی اختلاف فہم پیدا ہو گیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلافات کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روز مرہ کے پیش آتے رہنے والے جزئیات کے فیصلہ کی یہ صورت رکھی گئی کہ آنحضرت ﷺ کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہوتے رہے اور آپ وحی کتاب کے اصول وکلیات کے تحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہے۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے عہد میں ان نو بنو اور تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لیے اولاً وحی کتابی کو اور اس کے بعد آنحضرت ﷺ کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت اور نور بصیرت اور ارائت الٰہی کے ذریعہ فیصل ہوئے تھے اپنا ماخذ قرار دیا اور یہی اصول بعد کے فقہا اور مجتہدین نے اختیار کیا، ہر نئے واقعہ کو وحی کتاب اور فیصلہ نبوی کے معصوم ومسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے دیے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل وانصاف، رسم ورواج، عقل وفکر، استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا، یہی مجموعہ آج ''فقہ اسلامی'' کہلاتا ہے۔

وحی الٰہی قرآن پاک میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلے احادیث وسنن کی صحیح روایتوں میں محفوظ ہیں، وحی الٰہی کی صداقت میں تو کلام نہیں ہو سکتا، اب رہ گئی آنحضرت ﷺ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی، تو اس کے متعلق بھی وحی الٰہی ناطق ہے:

﴿ اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ﴾

(٤ / النسآء:١٠٥)

''ہم نے (اے پیغمبر!) تیری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری، تاکہ تو لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ سوجھائے اس کے ذریعہ سے فیصلہ کرے۔''

اس کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے کہ تو اے پیغمبر! اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعہ جو اللہ تعالیٰ تجھ کو سوجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کر۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو یہی سوجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلام

کے قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

آنحضرت ﷺ کے عدل وانصاف پر خود منافقین تک کو بھروسہ تھا، چنانچہ ان کا قاعدہ تھا کہ جب ان کا حق کسی پر ہوتا تو وہ دوڑے ہوئے عدالت نبوی ﷺ میں حاضر ہوتے، کیونکہ سمجھتے تھے کہ یہ حق آپ ہی کی عدالت سے ہم کو ملے گا لیکن جب ان پر کسی کا حق نکلتا تو وہ ٹال جاتے اور دوسرے طریقہ سے فیصلہ چاہتے اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی سرزنش کی:

﴿ وَإِذَا دُعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُم مُّعْرِضُونَ ۝ وَإِن يَكُن لَّهُمُ ٱلْحَقُّ يَأْتُوٓا۟ إِلَيْهِ مُذْعِنِينَ ۝ أَفِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَمِ ٱرْتَابُوٓا۟ أَمْ يَخَافُونَ أَن يَحِيفَ ٱللَّهُ عَلَيْهِمْ وَرَسُولُهُۥ ۚ بَلْ أُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ۝ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ ٱلْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا۟ إِلَى ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَن يَقُولُوا۟ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۚ وَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُفْلِحُونَ ۝ وَمَن يُطِعِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَخْشَ ٱللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْفَآئِزُونَ ۝ ﴾ (۲۴/ النور:۴۸۔۵۲)

''اور جب وہ اللہ تعالیٰ اور رسول کی طرف بلائے جائیں کہ رسول ان کے درمیان فیصلہ کردے، تو ان میں سے کچھ لوگ منہ موڑتے ہیں اور اگر ان کو کچھ حق پہنچتا ہو تو فرماں بردار بن کر رسول کے پاس چلے آئیں، کیا ان کے دل میں بیماری ہے یا وہ شک میں ہیں یا وہ ڈرتے ہیں کہ خدا اور اس کا رسول ان کے ساتھ بے انصافی کرے گا، بلکہ وہی لوگ بے انصاف ہیں۔ ایمان والوں کی بات یہ تھی کہ جب ان کو خدا اور رسول کی طرف بلایا جائے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کردے تو وہ کہیں ہم نے سنا اور مان لیا، انہیں لوگوں کا بھلا ہے اور جو کوئی اللہ کے اور اس کے رسول کے حکم پر چلے اور اللہ سے ڈرتا رہے، اور اللہ سے بچ کر نکلے وہی لوگ ہیں مراد کو پہنچے۔''

ان آیات سے معلوم ہوا کہ رسول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے، بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے:

﴿ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا۟ فِىٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا۟ تَسْلِيمًا ۝ ﴾ (۴/ النسآء:۶۵)

''تو قسم ہے تیرے رب کی، وہ مومن نہ ہوں گے، جب تک وہ تجھے اپنے جھگڑوں کا منصف نہ بنائیں اور پھر جو تو فیصلہ کرے اس سے اپنے دل میں خفگی نہ پائیں اور پوری طرح تسلیم کریں۔''

﴿ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى ٱللَّهُ وَرَسُولُهُۥٓ أَمْرًا أَن يَكُونَ لَهُمُ ٱلْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۗ وَمَن يَعْصِ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَـٰلًا مُّبِينًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۶)

”اور مومن مرد یا مومن عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول فیصلہ کر دے، تو ان کو اپنے کام کا اختیار رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلا گمراہ ہوا۔“

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کا قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی ذمہ داری ہر حاکمِ وقت اور سلطانِ زمانہ کے لیے نہیں، یہ انبیا علیہم السلام کے لیے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم نبوت، نورِ نبوت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور ارائت (دکھانا اور سوجھانا) کے ذریعہ فرماتا تھا لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سوجھاتا تھا۔

آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے، آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات اور معاملات میں ہم وہی فیصلے جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کئے کہ آپ کے فیصلے بحکمِ خدا غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی اور عصمت کا درجہ اور رتبہ حاصل نہیں۔

رسول کا وجود مستقل ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و راہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و راہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی راہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں، جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت و راہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں، جن دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے، خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ۝ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۰۰۔۱۰۱)

”اے مومنو! اگر تم اہل کتاب کے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ ایمان لا چکنے کے بعد تمہیں مرتد کر کے کافر بنا دیں گے اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیے درآنحالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔“

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس

تھیں ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود، جو اپنی تعلیم، تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے ان کو بھٹکنے نہ دے گا اور ضلالت سے مانع آتا تھا اگر صرف کتابِ الٰہی اس کتاب کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت کیا تھی اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت (قرآن) اس کی کتاب ناطق (رسول) سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے۔اور غالباً اس حدیث صحیح کے بھی یہی معنی ہیں، جس کا اعلان آپ ﷺ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے فرمایا:

((انی تارك فیکما الثقلین کتاب اللّٰه وسنتی)) [1]

"مسلمانو! میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ جاتا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت۔" (یعنی اپنی عملی زندگی)

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد آپ کا ظاہری وجود چھپ گیا مگر آپ کی عملی زندگی جس کو سنت کہتے ہیں قائم و باقی ہے اور وہ بھی قرآن کے بعد ہماری ہدایت کا دوسرا سرچشمہ ہے۔

تزکیہ

انبیا علیہم السلام کا عموماً اور آنحضرت ﷺ کا خصوصاً ایک اور امتیازی وصف تزکیہ ہے، تزکیہ کے معنی پاک و صاف کرنے کے ہیں۔نبوت محمدیہ ﷺ کے اس وصف کا ذکر ان آیتوں میں ہے جن میں آپ کی یہ توصیف کی گئی ہے، ایک رسول جو لوگوں پر خدا کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور ان کو پاک و صاف کرتا ہے ظاہر ہے کہ آپ کا یہ تیسرا وصف پہلے دو اوصاف سے الگ ہے یہ پاک و صاف کرنا، آیاتِ الٰہی کی تلاوت اور کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد نبی کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تعلیم و تربیت، فیضانِ صحبت، حسنِ اخلاق، پند و موعظت اور تبلیغ و دعوت کی تاثیر سے برے اچھے، بد نیک اور اشرار، اخیار بن جاتے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی ہر تاریخ اس واقعہ کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ گمراہ اور بدکار قوموں میں مبعوث ہوئے ہر طرح کی اذیتیں اٹھائیں، تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں اور آخر تاریکی کو روشنی سے، جہالت کو علم سے اور کفر کو توحید سے بدل کر رہے اور مدت تک ان کی تاثیر کا فیض جاری رہا ان کا یہ وصف تزکیہ، وحی والہام کے علاوہ ان کے جسم و جان اور زبان و دل کی کیمیا اثری کا نام ہے، خواہ ان کی زبان اس وقت وحی الٰہی سے مترنم ہو یا خاموش ہر آن آفتابِ حق کی کرنیں مطلعِ نبوت سے نکل نکل کر دلوں کی سرزمین کو روشن کرتی رہتی تھیں۔

[1] یہ روایت مختلف الفاظ میں حدیث کی کئی کتابوں میں ہے۔صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی بن ابی طالب: ٦٢٢٥ تا ٦٢٢٨؛ ترمذی: ٣٧٨٨؛ دارمی: ٣٣١٦؛ موطا امام مالك: ١٦٦٢؛ مسند احمد، ج٣، ص: ١٤، ١٧، ٢٦، ٥٩۔

نور

اس لیے نبوت کا سینہ صدق وصفا کا آئینہ ہوتا ہے، نبی کا مجسم پیکر ظلمت کدہ عالم کا چراغ اور علم وہدایت کا مطلع نور ہوتا ہے، جس طرح اس کا صحیفہ الہامی اور وحی ربانی نور ہوتی ہے وہ خود بھی سراپا نور ہوتا ہے، جس سے اندھے دیکھتے، گمراہ راہ پاتے اور حق کے طالب روشنی حاصل کرتے ہیں خود آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۴۵، ۴۶)

''اے نبی! ہم نے تجھ کو بتانے والا، خوشخبری سنانے والا، چوکنا کرنے والا، خدا کی طرف اس کے حکم سے بلانے والا اور روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا۔''

یہ آس پاس کی چیزوں کو روشن کرنے والا چراغ خود رسول ﷺ کی ذات ہے، سوال یہ ہے کہ اگر آپ کے جسم وجان، زبان ودل، خلق وعمل، علم وفہم میں روشنی نہیں تو آپ کی ذات جو انہیں چیزوں کا مجموعہ ہے روشن چراغ کیونکر ثابت ہوگی اور جب آپ کی ذات مبارک کی یہ تمام چیزیں انوار الٰہی ہیں تو ان انوار میں سے ہر نور کی روشنی میں چلنا ہدایت ہے اور ان میں سے کسی سے قطع نظر کرنا بھی ظلمت کے ایک گوشہ میں قدم دھرنا ہے۔

آیات وملکوت کی رؤیت

جس طرح انبیا علیہم السلام اپنی قوتِ سامعہ سے ندائے غیب کو سنتے اور صدائے وحی کو سماعت کرتے ہیں اسی طرح ان کی آنکھیں بہت کچھ دیکھتی ہیں جو عام انسان نہیں دیکھتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

﴿ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ ﴾

(۶/ الانعام:۷۶)

''اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی مملکت دکھاتے تھے، تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں ہو۔''

استعدادِ نبوت کی تربیت اور نشوونما کے لیے یہ رؤیت وبصیرت کی مافوق قوت ان کو عطا ہوئی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر جو کچھ نظر آیا وہ جلوہ گری حسن وعشق کی مشہور کہانی ہے، آنحضرت ﷺ کے مشاہدات روحانی کا تذکرہ معراج کے تعلق سے ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

﴿ لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۱)

''تاکہ ہم اس (رسول بندہ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ ﴾

(۵۳/ النجم:۱۱۔۱۳)

"دل جھوٹ نہیں بولا جو اس نے دیکھا، اس پر اس سے جھگڑتے ہو اور دوسری بار اس کو اترتے دیکھا۔"

﴿ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝ ﴾

(۵۳/ النجم:۱۷، ۱۸)

"نگاہ نہ بہکی اور نہ سرکش ہوئی، اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں۔"

ایک اور مقام پر ہے:

﴿ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۝ ﴾ (۸۱/ التکویر:۲۳)

"اور اس نے یقیناً اس کو آسمان کے کھلے کناروں میں دیکھا۔"

یہ مشاہدہ وحی والہام کے علاوہ نبوت کے دوسرے حاسۂ بصارت کے امتیاز کو ظاہر کرتا ہے۔

سماعِ غیب

جس طرح آیات وملکوت کا مشاہدہ انبیا کے حاسۂ سماعت کا امتیازی وصف ہے، اسی طرح غیب کی آواز اور وحی کی صدا کو سننا بھی ان کے حاسۂ سماعت کا خصوصی امتیاز ہے۔ قرآن پاک میں اس کی تصریحات موجود ہیں کہ انبیا خدا سے ہم کلام ہوتے تھے اور وحی کو پاتے تھے ﴿ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ ﴾ (۴/ النسآء:۱۶۴)

"اور خدا نے موسیٰ سے بات کی۔"

حضور کو حکم ہوا:

﴿ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۱۱۴)

"اور اس سے پہلے کہ قرآن کی وحی تجھ پر پوری ہو، قرآن کے پڑھنے میں جلدی نہ کر۔"

خدا نے پیغمبروں کو پکارا اور انہوں نے اس کی آوازیں سنیں "نَادَيْنَا" "ہم نے پکارا" بار بار یہ الفاظ قرآن میں پیغمبروں کے متعلق آئے ہیں۔

تبلیغ ودعوت

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فرض تبلیغ اور دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے، اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا، اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی

پیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں ان کو رگ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا اور مال ومنال، اہل وعیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور ان کی ان ساری کوشش وکاوش کا مقصد خدا کی رضامندی مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیا علیہم السلام کی تبلیغ ودعوت کا مفہوم، دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بےکسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلاواسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہیں کی دعوت وتبلیغ اور جدوجہد کا اثر اور نتیجہ ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے مفکر، بڑے سے بڑے شاعر، بڑے سے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا دینا سمجھتے ہیں، لیکن انبیا علیہم السلام، جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے سمجھانے اور ہر ممکن طریق سے اس کو پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں اور ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔ انبیا علیہم السلام کی تعریف میں خدا فرماتا ہے:

﴿ اِلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰهِ وَیَخْشَوْنَهٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰهَ ؕ وَکَفٰی بِاللّٰهِ حَسِیْبًا ۝ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۳۹)

''جو اللہ کے پیغاموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اور اللہ بس ہے حساب اعمال کے لیے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

﴿ اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۲٤)

''فرعون کے پاس جا کہ اس نے سرکشی کی۔''

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ پیغام ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں اور دشمنوں سے نہ ڈریں کہ تمہاری حفاظت کا خود شہنشاہ عالم ذمہ دار ہے:

﴿ یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ یَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:٦٧)

''اے پیغمبر! تیرے رب کے پاس سے جو تیری طرف اترا ہے، اس کو پہنچا دے اور اگر یہ نہ کیا

تو، تو نے اس کے پیغام کو پہنچانے کے فرض کو ادا نہیں کیا، اللہ تجھ کو لوگوں سے بچائے گا۔''

انبیا کی تبلیغ و دعوت میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں، تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوش خبری سنانا اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا عذاب الٰہی کا خوف دلانا اور ان کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کرنا اور انبیا کی آمد اس شان سے ہوتی ہے کہ خدا کے بندوں پر حجت تمام ہو جائے:

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٥)

''یہ سب پیغمبر خوش خبری سناتے اور ہشیار و بیدار کرتے ہوئے آئے، تاکہ پیغمبروں کے آنے کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت نہ رہے۔''

ان سب نے پیغامِ الٰہی پہنچانے کے ساتھ اپنی خیر خواہی، دلسوزی و اخلاص مندی کا اعلان کیا:

﴿ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ اَمِيْنٌ ۝ ﴾ (٧/ الاعراف:٦٨)

''میں تم کو اپنے رب کے پیغام پہنچاتا ہوں، اور میں تمہارا امانت دار خیر خواہ ہوں۔''

﴿ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ ﴾

(٧/ الاعراف:٧٩)

''اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کا پیام تم کو پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، لیکن تم خیر خواہوں کو پیار نہیں کرتے۔''

﴿ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(٧/ الاعراف:٩٣)

''اے میرے لوگو! میں نے اپنے رب کے پیام تم کو پہنچا دیے اور تمہاری خیر خواہی کر چکا، تو پھر کیسے نہ ماننے والے لوگوں پر میں غم کھاؤں۔''

یہ بھی فرمایا کہ

﴿ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ ﴾ (١١/ هود:٥١)

''میں اپنی نصیحت کی تم سے مزدوری نہیں مانگتا، میری مزدوری تو خدا پر ہے، جس نے مجھ کو پیدا کیا۔''

﴿ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ﴾ (١١/ هود:٢٩)

''میں اپنی تبلیغ کے بدلہ تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں، میری مزدوری تو خدا پر ہے۔''

ایک شبہ کا ازالہ

اس سلسلہ میں ہم کو ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور ﷺ کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ ''رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (البلاغ) ہے'' اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف ''وحی الٰہی کی تبلیغ ہے'' یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک بعینہٖ پہنچا دینا اس کا کام ہے، اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح کا نہ اس کو منصب ہے اور نہ اس کا اس کو حق ہے، ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے، جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے، مگر اس خط کے مفہوم ومعنی کی تشریح کا اُس کو حق نہیں ہوتا، بلکہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند لفافہ میں کیا ہے۔

شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ ''رسول'' سے بھی ہوا ہے، جس کے لفظی معنی پیغمبر اور قاصد کے ہیں، لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے، کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے، ''نبی'' (خبر پانے والا) بھی تو کہا گیا ہے، مبشر (خوشخبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن چراغ) صاحب حکمت، صاحبِ خلقِ عظیم، صاحبِ مقامِ محمود، مجتبیٰ (مقبول)، مصطفیٰ (برگزیدہ)، مبین (بیان اور شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا)، مزکی (پاک وصاف کرنے والا)، داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے، کیا یہ اوصاف والقاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں، کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے، جس کو اصل پیغام کے مفہوم ومعنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں؟ اس کے پیغام کے مفہوم ومعنی کی تشریح وتفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے اور نہ اس کی اصل حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے، مگر خود صاحبِ پیغام کو اپنی پیغمبری کے وقت نہ مفہوم ومعنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا، ﴿ إِنَّ هَٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ ﴾ (۳۸/ صٓ:۵) ہم نے پچھلے صفحات میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس غلط خیال کی پوری تردید ہو جاتی ہے۔

ان کے اشتباہ کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے، وہی اصلی شارع ہے، اب اگر رسول کو بھی وحی کتابی سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا، لیکن اس کا پہلا جواب تو یہ ہے، کہ ہم رسول کو شارع نہیں شارح قرار دیتے ہیں، کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح وتشریح کرتا ہے، تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر واضعِ قانون کا منصب حاصل کرتا ہے، یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے؟ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے، جس کو ہم نبی اور رسول اور معلم اور مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقۂ خاص کے ذریعہ اپنے پیغمبر کو مطلع نہیں فرماتا، جس طریقہ خاص سے قرآن مجید نازل ہوا ہے، بلکہ وہ اپنی تینوں قسموں کے ذریعہ سے اپنے اغراض اس رسول پر واضح کرتا ہے اور ان میں سے ہر طریق کی وحی کی اطاعت تمام امت پر فرض ہے، خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو، جس کو قرآن کہتے ہیں، یا ربانی مفہوم ومعنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں، جس کو حدیث وسنت کہتے ہیں، الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعہ سے ہو یا، حکمتِ ربانی کے فیض سے ہو۔

قرآن مجید کی وہ آیتیں جن کے معنی یہ ہیں، کہ ''ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچانا ہے'' ان کا یہ منشا نہیں کہ وہ صرف پیغام پہنچانے والا ہے، خوش خبری سنانے والا نہیں، ہشیار و بیدار کرنے والا نہیں، پیغامِ الٰہی کے الفاظ سنانے کے بعد ان کی تعلیم دینے والا نہیں، آیاتِ الٰہی کی تبیین وتشریح کرنے والا نہیں، راہنما اور ہادی نہیں، نجاستوں سے پاک وصاف کرنے والا نہیں، ایسا کہنا قرآن کا انکار، اور عقل وفہم کا ماتم ہے، قرآن میں کئی جگہ ہے:

﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ ﴾ (۱۳/ الرعد:۷، ۷۹/ النازعات:۴۵)

''تو تو صرف ڈرسنانے والا ہے۔''

ایک جگہ ہے:

﴿ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ﴾ (۳۸/ صٓ:۶۵) ''میں تو صرف ڈر سنانے والا ہوں۔''

کیا ان آیتوں کا مفہوم یہی ہے کہ ڈر سنانے کے سوا، رسول کا کام بشارت اور خوشخبری سنانا نہیں اور وہ صرف منذر ہے، مبشر نہیں، اصل یہ ہے کہ اس قسم کی آیتوں:

﴿ اَنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۹۲)

''ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔''

کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ صرف پیغام رساں اور قاصد ہے، مبین اور شارح نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کام صرف خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے، زبردستی لوگوں کے دلوں میں اس کا پیغام اتار دینا نہیں، بزور لوگوں کو مسلمان بنا دینا نہیں، جبراً منوالینا نہیں اور نہ پیغام پہنچا دینے کے بعد تمہارے کفر وانکار وعدم ایمان کی ذمہ داری اس پر ہے۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں اس معنی کی آیتیں آئی ہیں، ان کا منشا یہی اور صرف یہی ہے، قرآن پاک کی تیرہ مختلف آیتوں میں یہ بات کہی گئی ہے، اور ہر جگہ یہی ایک مفہوم ہے:

﴿ وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّیّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ ﴾ (۳/ آل عمران:۲۰)

''کتاب والوں اور ان پڑھوں سے کہہ دے، کیا تم نے اسلام قبول کیا، اگر کیا ہدایت پائی، اور

اگر منہ پھیرا تو تجھ پر (اے رسول ﷺ) صرف پیام پہنچانا ہے اور اللہ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔"

مفہوم بالکل ظاہر ہے، کہ اسلام کی ہدایت قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں، اگر لوگ قبول کریں تو انہوں نے حق کی راہ پائی اور اگر انکار کریں تو رسول ﷺ کا کام صرف پیغام پہنچا دینا تھا، وہ اس نے پہنچا دیا اس کا فرض ادا ہو چکا، اب خدا جانے اور اس کے بندے جانیں:

﴿ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ ﴾ (۱۳/ الرعد: ۴۰)

"تو تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور ہمارا فرض ان سے حساب لینا ہے۔"

اس کی مزید تفصیل سورۂ غاشیہ میں ہے:

﴿ فَذَكِّرْ ۗ إِنَّمَآ أَنتَ مُذَكِّرٌ ۝ لَّسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ ۝ إِلَّا مَن تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۝ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۝ إِنَّ إِلَيْنَآ إِيَابَهُمْ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُم ۝ ﴾ (۸۸/ الغاشیہ: ۲۱۔۲۶)

"تو (اے پیغمبر)! تو نصیحت کر، تو تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، ان پر داروغہ نہیں، لیکن جس نے منہ پھیرا اور انکار کیا، تو خدا اس کو بڑی سزا دے گا، بے شک پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے، اور ہمیں پر ان کا حساب ہے۔"

یہی مفہوم سورۂ شوریٰ میں ہے کہ رسول کا کام صرف سمجھانا اور تبلیغ کرنا ہے، وہ سلطان، کارفرما، داروغہ اور فرمانروا بنا کر نہیں بھیجا گیا، کہ لوگوں سے بزور اپنی بات منوالے:

﴿ فَإِنْ أَعْرَضُوا فَمَآ أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۖ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلٰغُ ۗ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۴۸)

"تو اگر وہ انکار کریں تو ہم نے تجھ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، تیرا کام صرف پہنچا دینا ہے۔"

کافروں نے جب کبھی رسولوں کو جھٹلایا، انہوں نے یہی کہا کہ ہمارا کام پہنچا دینا ہے، ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہے:

﴿ قَالُوا مَآ أَنتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۙ وَمَآ أَنزَلَ الرَّحْمٰنُ مِن شَيْءٍ ۙ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَكْذِبُونَ ۝ قَالُوا رَبُّنَا يَعْلَمُ إِنَّآ إِلَيْكُمْ لَمُرْسَلُونَ ۝ ﴾ (۳۶/ یٰس: ۱۵۔۱۷)

"کافروں نے کہا تم تو ہماری ہی طرح آدمی ہو، خدا نے کچھ نہیں اتارا، تم جھوٹ کہتے ہو، رسولوں نے جواب دیا، ہمارا پروردگار خوب جانتا ہے کہ ہم بھیجے ہوئے ہیں اور ہمارا فرض صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔"

خود اللہ تعالیٰ نے بھی رسولوں کو تسلی دی ہے، کہ ان منکروں کے انکار سے دل شکستہ نہ ہوں، اگلے پیغمبروں کے منکروں نے بھی یہی کیا تھا، پیغمبروں کا فرض لوگوں کو منوانا نہیں، بلکہ ان تک ہمارا پیام پہنچانا ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ آبَآؤُنَا وَلَا

حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝﴾ (١٦/ النحل:٣٥)

''اور مشرکوں نے کہا اگر خدا چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی اور کو نہ پوجتے، نہ ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام کرتے، (خدا کہتا ہے کہ) ایسا ہی کیا تھا ان کے پہلوں نے، کیا ہمارے پیغمبروں پر پہنچا دینے کے سوا کچھ ہے؟''

﴿وَاِنْ تُكَذِّبُوْا فَقَدْ كَذَّبَ اُمَمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝﴾

(٢٩/ العنكبوت:١٨)

''اگر تم جھٹلاؤ، تو (کیا ہے) تم سے پہلے بھی قومیں جھٹلا چکی ہیں اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔''

رسول کا کام پہنچا دینا ہے، باقی علام الغیوب جو چاہے سو کرے:

﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ۝﴾ (٥/ المآئدة:٩٩)

''رسول پر نہیں ہے، لیکن پہنچا دینا اور اللہ جانتا ہے، جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو۔''

بقیہ آیتیں حسب ذیل ہیں، جو ایک ہی مفہوم کو ادا کرتی ہیں:

﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝﴾ (٥/ المآئدة:٩٢)

''اور اللہ کا فرمان اور رسول کی بات مانو اور بچو اور اگر تم نے منہ پھیرا تو جان لو کہ ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔''

﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝﴾ (٢٤/ النور:٥٤)

''کہہ دے اے پیغمبر! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ پھیریں، تو رسول پر وہ ہے جس کا اس پر بوجھ ہے اور تم پر وہ ہے جس کا بوجھ تم پر ہے، اگر اس کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پاؤ گے اور رسول پر نہیں لیکن کھول کر پہنچا دینا۔''

﴿كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۝﴾

(١٦/ النحل:٨١، ٨٢)

''اسی طرح اللہ تم پر اپنا احسان پورا کرے گا، تا کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور اگر انہوں نے منہ پھیرا تو تجھ پر سوا اس کے کچھ نہیں کہ کھول کر پہنچا دے۔''

﴿ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ ﴾

(٦٤/ التغابن:١٢)

''اور خدا کا کہا مانو اور رسول کی فرمانبرداری کرو، اگر تم نے منہ پھیرا تو ہمارے رسول پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔''

پیغمبر کا قول ہے:

﴿ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖۤ اِلَيْكُمْ ؕ ﴾ (١١/ هود:٥٧)

''تو اگر تم منہ پھیرو تو میں جو پیام دے کر تمہارے پاس بھیجا گیا تھا وہ میں نے تم کو پہنچا دیا۔'' (یعنی میرا فرض ختم ہو چکا)

ان تمام آیتوں کا تعلق نبوت کے منکروں سے ہے، یہاں پر یہ نکتہ بھی لحاظ کے قابل ہے، کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں، ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہے، لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت کو حاصل کر لیں، تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی و اطاعت کا ہو جاتا ہے، اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں، بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے، کوئی حکومت، دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی، لیکن اگر کوئی شخص از خود اس حکومت کی رعایا بن جائے، تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا، کہ رعایا بننے کے معنی ہی اس کے قانون کے قبول کرنے کے ہیں۔

انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا امتیازی نتیجہ

دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے، وہ ایک ہی دین اور ایک ہی عقیدہ لے کر آئے، وہی توحید، وہی نبوت، وہی عبادت، وہی اخلاق، وہی جزا و سزا اور عمل کی پرسش، اس لحاظ سے انبیا علیہم السلام کی تعلیم میں کوئی اصولی فرق نہیں، اس لیے فرمایا کہ ﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا ﴾ الأية (٤٢/ الشورى:١٣) یعنی ''خدا نے تمہارے لیے وہی دین مشروع کیا، جو نوح وغیرہ دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا اور اسی کا نام اسلام ہے۔'' لیکن انبیا علیہم السلام کی تعلیم کا اہم الاصول اور سب سے ضروری جز توحید ہے اور وہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے۔

ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے لوگ گزرے ہوں، ان کی دعوت بھی مفید ہو، ان کے اخلاقی وعظ بھی دل پسند ہوں، وہ یونان کے حکیم ہوں، یا ہندوستان کے اوتار، لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید کی دعوت شامل نہیں، تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں، کہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے، اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں، فرمایا:

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ ۝ ﴾

(٢١/ الانبيآء:٢٥)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا لیکن ان کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں،

میری ہی پرستش کرو۔"

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ﴾

(١٦/ النحل:٣٦)

"اور ہر قوم میں ہم نے ایک رسول بھیجا، کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں سے پرہیز کرو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تعلیمی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہو سکتی ہے، اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جزو توحید نہیں، اس کو دعوائے نبوت کا کوئی حق نہیں۔

نبوت کی غرض و غایت

انبیا علیہم السلام کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوشِ بیان میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے، لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ ان اغراض کو گنایا جائے جو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی مبارک کی زبان سے ادا ہوئے ہیں، اصل دعویٰ وہی ہے، جس کو مدعی ظاہر کرتا ہو، نہ کہ گواہ۔

انبیا علیہم السلام کی بعثت کی سب سے پہلی غرض اس روز اَلَسْتُ کے بھولے ہوئے ازلی عہد و پیمان بندگی کی یاددہانی ہے:

﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛۚ شَهِدْنَا ۛۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۙ ﴾

(٧/ الاعراف:١٧٢)

"اور جب تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی نسلوں سے عہد لیا اور ان کو خود اپنے اوپر آپ گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں، انہوں نے کہا کیوں نہیں تو ہے، ہم نے گواہی دی، کہ قیامت کے دن یہ نہ کہو کہ ہم اس کو بھول گئے تھے۔"

اس لیے ضروری ہوا کہ ان کو موقع بموقع ان کا یہ وعدہ یاد دلایا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول کی بعثت کی ایک غرض یہ بھی بتائی گئی ہے، کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت ہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ بجا عذر کریں کہ ہم کو کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا، اس لیے فرمایا:

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٥)

"رسول خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے، تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے لیے خدا پر کوئی حجت باقی نہ رہے۔"

تذکیر کے بعد نبی کا فرض اولین ہدایت اور راہنمائی ہے، کہ وہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفت ہادی کے

مظہر اور مورد ہیں، اسی لیے ایک آیت میں نبی اور رسول کے لیے ہادی کا لفظ آیا ہے، فرمایا:

﴿ وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ﴾ (۱۳/ الرعد:۷)

''اور ہر قوم کے لیے ایک راہ دکھانے والا آیا۔''

سورۂ شوریٰ میں فرمایا:

﴿ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۵۲)

''اور تو اے پیغمبر سیدھی راہ دکھاتا ہے۔''

سورۂ انبیا میں بہت سے پیغمبروں کے ذکر کے بعد ہے:

﴿ وَجَعَلْنٰهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۷۳)

''اور ہم نے ان پیغمبروں کو ایسا پیشوا بنایا، جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے۔''

اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی تھیں، بار بار ھُــدًی (ہدایت) کہا گیا ہے اور کہیں ان کو ضیا اور نور (روشنی) کے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔

اس ہدایت اور راہنمائی کا دوسرا مفہوم یہ ہے، کہ وہ بندگانِ الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں، انسان جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں، انبیا ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں، ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں:

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ﴾

(۵۷/ الحدید:۹)

''وہی اللہ جو اپنے بندہ پر کھلی آیتیں اتارتا ہے، تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے۔''

اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے، جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، افراط و تفریط پیدا ہوگی، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا، انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے، کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرہ کی کمی بیشی نہیں ہے، جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے، ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں بھی اس توازن کی ضرورت ہے، عقائد ہوں کہ عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات، اسی توازن کا نام حق اور عدل ہے، فرمایا:

﴿ وَالسَّمَاۗءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا

تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۷۔۹)

''اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی، کہ اس ترازو میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو ٹھیک رکھو اور ترازو کو گھٹاؤ نہیں۔''

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرہ ذرہ اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالقِ فطرت کے اندازہ اور تقدیر سے قائم ہے، یہی توازن اور برابر کی تول رسولوں کے ذریعہ آئی ہوئی میزانِ شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیے، بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے اور بالا رادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے، بے ارادہ دنیا کا نظام عدل اسی خدائی میزان فطرت سے چل رہا ہے، اگر اس میزان میں ایک ذرہ بھی کمی بیشی ہو جائے، تو عالم کا نظام درہم برہم ہو جائے، اسی طرح انسانی دنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی میزان شریعت کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو اس کا نظام درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے، فرمایا:

﴿لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۵)

''ہم نے بے شبہ اپنے پیغمبروں کو کھلی دلیلیں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری، تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں۔''

انبیا علیہم السلام کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ شریعت کی میزان کے مطابق عدل اور توازن کو قائم رکھیں، اس موجودہ دنیا ہی کے نظام کی امن و سلامتی کے لیے ہے، آج یورپ کے اتحاد کی گونج نے دنیا کے گوشہ گوشہ کو پر شور بنا دیا ہے، آج رسولوں کی اہمیت اور ان کی تعلیمات کی ضرورت پر شکوک و شبہات کی ژالہ باری ہو رہی ہے، لیکن وہمی و خیالی مباحث سے قطع نظر کر کے عملی حیثیت سے دنیا کی ایک ایک اقلیم اور ایک ایک آبادی کا جائزہ لو، آج جہاں کہیں بھی سچائی کی کوئی روشنی اور حقیقت کی کوئی کرن چمکتی ہے، وہ اسی مطلعِ خورشید سے چھن کر نکلی ہے، کوئی دین دار ہو یا ملحد، خوش عقیدہ ہو یا بے عقیدہ، یونان کا حکیم ہو یا افریقہ کا جاہل، یورپ کا متمدن ہو یا صحاریٰ کا وحشی، رومی ہو یا زنگی، عیسوی ہو یا موسوی، بت پرست ہو یا موحد، مجوسی ہو یا ہندو، مسلم ہو یا غیر مسلم، شہری ہو یا دیہاتی، ہمالیہ کی چوٹی پر آباد ہو، یا زمین کی گہرائی میں، کہیں بھی ہو، کوئی بھی ہو، اگر وہ اللہ کے نام کی عظمت سے واقف ہے اور نیکی اور بدی کی تمیز سے آشنا ہے، تو وہ خدائی رسولوں اور ربانی پیغمبروں کے علاوہ کس معلم کی کوششوں کا ممنون ہے؟ آج جہاں بھی عدل و میزان کا وجود ہے، وہ کسی یونانی حکیم، یا یوروپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف و تقریر و خطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقہ انبیا ہی کے بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے، آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی مگر نیکی، عدل، احسان، ہمدردی،

نیکوکاری، حسنِ خلق کی تعلیم تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسول کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں، جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کو بھی نیکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے، اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور سے پیغمبروں کے منکر ہیں، وہ بھی عملی طور سے ان کی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں، اسی لیے انبیا علیہم السلام کا وجود تمام دنیا کے لیے رحمت بن کر ظاہر ہوا ہے، قرآن نے آسمانی کتابوں کو بار بار رحمۃ و ھدًی، رحمت اور راہنمائی کی غرض سے بھیجنے کا جو اعلان کیا ہے، وہ تمام تر اسی غرض و غایت کی تشریح ہے، اسی لیے خاتم نبوت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ والا صفات تمام عالم کے لیے رحمت بن کر آئی، فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۱۰۷)

''اور ہم نے تجھ کو (اے محمد)! تمام دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

تائید و نصرت

انبیا علیہم السلام جو مقصد لے کر آتے ہیں، خواہ کس قدر مشکلات پیش آئیں، کتنی ہی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو، بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ، خود اس دعویٰ پر گواہ صادق ہے، قرآن نے کہا:

﴿ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۷۱۔۱۷۳)

''اور ہماری بات اپنے رسول بندوں کے لیے پہلے ہی طے ہو چکی ہے، کہ یقیناً انہیں کی مدد ہوتی ہے اور ہمارا لشکر غالب ہوتا ہے۔''

نہ صرف اس دنیا میں بلکہ حشر کے دن بھی انہیں کو اور ان کے ذریعہ اہلِ ایمان کو کامیابی ہوگی:

﴿ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ۝ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ۝ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۵۱، ۵۲)

''اور بے شبہ ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد اس دنیا میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جب گواہ کھڑے ہوں گے، جس دن گناہگاروں کو ان کے بہانے کام نہ دیں گے ان پر پھٹکار ہوگی اور ان کے لیے برا گھر ہوگا۔''

پیغمبروں پر ایسے بھی سخت وقت آتے ہیں، جب ان کو اپنی قوم کے قبول ہدایت کی طرف سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں دیر ہونے کے سبب سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی، تو دفعتہً امید کا دروازہ کھلتا ہے اور خدا کی تائید و نصرت کے پرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے دل قبول کے لیے کھول دیے جاتے

ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آ کر ان کا استیصال ہو جاتا ہے، فرمایا:

﴿ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَاۗءَهُمْ نَصْرُنَا ﴾

(۱۲/ یوسف:۱۱۰)

''یہاں تک کہ جب پیغمبروں کو (اپنی قوم کے ایمان سے) مایوسی ہونے لگی اور ان کے منکروں کو یہ خیال ہونے لگا کہ ان سے جھوٹ کہا گیا تو ہماری مدد آ گئی۔''

اللہ تعالیٰ کی اسی تائید ونصرت وحفاظتِ دعوت کا یہ یقین ان کو ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں، مخالفوں کی فوج ولشکر، تیغ وخنجر اور خوف وخطر کے باوجود اپنی دعوت وتبلیغ کے فریضہ سے باز نہیں آتے اور کسی دام پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے ،منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بے چارگی اور تنہائی کو دیکھ کر، ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سوئے ظن کی تردید کرکے فرماتا ہے:

﴿ فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ﴾ (۱۴/ ابراهيم:۴۷)

''سو تو مت خیال کر کہ اللہ اپنے رسولوں سے وعدہ خلافی کرے گا۔''

ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہو گی:

﴿ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ﴾ (۵۸/ المجادلة:۲۱)

''اللہ لکھ چکا کہ میں ہی غالب ہوں گا اور میرے رسول۔''

خاتمہ: اس تفصیل اور تشریح سے مقصود ناظرین کو نبوت کے اصلی کمالات کا ایک جلوہ دکھانا تھا:

فلسفی را از پیمبر وا شناس — آبگینہ راز گوہر وا شناس
آبگینہ را نہ پنداری بدست — جزدمے کہ گوہرے آری بدست
چوں گہر آمد بدستت شب چراغ — آبگینہ شدسیہ چون پرزاغ
فلسفی اندربنِ چاہ نژند — نردباں دارد بخورشیدِ بلند
نردبانش می برد تاچند ارش — پس بخاك افتدنگوں گشتہ سرش
وآں پیمبرّ خود زبام آسماں — رشتۂ افگندہ سوئے خاکیاں
رشتہ جاں رابدیں رشتہ بتاب — پس برآ تابارگاہ آفتاب
زآسمان پیغمبر آوازت دہد — فلسفی ازخاك پروازت دہد

ایں زدورت رہ نماید سوئے جاں
واں بخواند خود ترا از کوئے جاں [1]

[1] از دیوان فارسی مولانا حمید الدین رحمہ اللہ المتوفی ۱۹ جمادی الثانیہ ۱۳۴۹ھ (۱۹۳۰ء) ونوائے پہلوی، ص ۴۸-۴۹۔

شبِ ظلمت

پیغمبرِ اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کی مذہبی اور اخلاقی حالت

اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کی ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، بارش کی خنکی سخت اُمس کے بعد ہی زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے، روشنی کی پوری قدر شب تارہی میں ہوتی ہے اور فضا جس قدر تاریک ہو بجلی کی چمک اتنی ہی زیادہ درخشاں نظر آتی ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ہر اصلاحی تحریک کی وقعت اور عظمت کے جانچنے میں یہ لحاظ رکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت کتنی گمراہی میں مبتلا اور اصلاح کی محتاج تھی اور ایسی اصلاح کی محتاج تھی جس کے لیے پیغمبرانہ دست وبازو کی حاجت تھی اور وہ بھی ایک ایسے پیغمبر کے دست وبازو کی جس کے متعلق خود خدا یہ فرما چکے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ ﴾ (۴۸/ الفتح: ۱۰)

''جو تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، وہ خدا کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کے اوپر خدا کا ہاتھ ہے۔''

اسلام یا محمد رسول اللہ ﷺ کے پیغام اور تعلیم کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی ایک عظیم الشان روحانی واخلاقی معاشرتی دعوت تھی، اس بنا پر ہمیں دیکھنا ہے کہ ظہور اسلام کے وقت دنیا کی کیا حالت تھی؟ اس وقت کی دنیا کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ ایک ایسا کرۂ ارضی تھا جس پر آفتاب نہیں چمکتا تھا تو بالکل سچ ہوگا، تمام دنیا میں سچے اور صحیح عقیدہ کا کہیں وجود نہ تھا، توحید کی روشنی سے دنیا کا ذرہ ذرہ محروم تھا، مصر و یونان وروم میں سورج، چاند اور مختلف سیاروں اور ستاروں کی خدائی تھی، انہیں کے معبد تھے اور انہیں کے ناموں پر بے گناہ انسانوں اور جانوروں کی قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں، ہر جگہ پتھر کی مورتوں اور مٹی کی صورتوں اور سونے چاندی اور جواہرات کے بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔

اس وقت کی دنیا میں اخلاق کے تین معلم تھے، رواقی، عیسائی اور بودھ مت کے پیرو اور یہ تینوں کے تینوں تجرد، رہبانیت اور جوگی پن میں مبتلا ہو کر اس طرح عضو معطل ہو گئے تھے کہ دنیا کا دست ترقی شل ہو کر رہ گیا تھا اور ایسی سخت سنگدلانہ ریاضتوں کو نیکی اور عبادت کا مرادف سمجھ رکھا تھا کہ آج ان کی تفصیلات سننے سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مسیح نے چھ صدی قبل تزکیہ نفس کے کچھ درس دیے تھے لیکن مدت ہوئی دنیا اس سبق کو بھلا چکی تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس سے بھی پیشتر ہدایت ونجات کی ایک شمع جلائی تھی لیکن فتنوں اور ہنگاموں کی آندھی میں یہ چراغ طور بھی جل کر گل ہو گیا تھا اور پھر یہ بھی سچ ہے کہ مدت مدید ہوئی کہ زردشت نے روحانیت کی آگ سلگائی تھی لیکن یہ شعلہ بھی انسانی خون کے چھینٹوں سے سرد ہو چکا تھا یہ بھی سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے بودھ نے آریہ ورت کے پہاڑوں اور غاروں میں روح کا دار الامن ڈھونڈ نکالا تھا مگر حوادث

کے طوفان نے ان پہاڑوں کو بے نام ونشان صحرا اور ان غاروں کو درندوں کا بھٹ بنا دیا تھا۔ ہر قوم دوسری قوم سے برسر پیکار اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے خون کا پیاسا تھا، حرص وطمع اور کشت وخون کی گرم بازاری تھی، نفسِ انسانی کی ملکوتی طاقت جذبات خبیثہ کے دیوتا کے سامنے پامال ہو چکی تھی، عدل وراستی اور پاکبازی وپارسائی کے عطر معنبر کی خوشبو انسان کے جامہ خاکی سے اڑ چکی تھی، توحید اور خدا پرستی کا نور دیوتاؤں، دیویوں، ستاروں، شہیدوں، ولیوں اور مجسموں کی پرستش کی عالم گیر تاریکی میں چھپ گیا تھا، غرض دنیا کے حالات ہر طرح سے اس ضرورت کے متقاضی تھے کہ کوئی عالم کا مصلح، اخلاق کا معلم، حق کا داعی، بنی نوعِ انسانی کا نجات دہندہ، آخری بار وجود میں آئے اور انسانیت کے شیرازہ میں، جو عرصۂ دراز سے پراگندہ اور منتشر ہو رہا تھا، پھر نظم وانتظام پیدا کر دے اور روحانیت وخدا پرستی کے خزاں رسیدہ باغ کو از سرِ نو پر بہار بلکہ سدا بہار اور دنیا کے ظلمت کدہ کو پھر مطلعِ انوار بنا دے۔

یہ اس عہد کی دنیا کی حالت کا ایک اجمالی خاکہ تھا، تفصیل کے لیے ہمیں مختلف قوموں اور ان کے مذہبوں میں سے ایک ایک قوم اور اس کے مذہب کی تاریخ پر نظر کرنی چاہیے۔

ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی تمدنی اور مذہبی حالت کیا تھی؟

محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت مصر، یونان، کلدانیا، اسیریا اور بابل کی عظمت افسانۂ پارینہ بن چکی تھی خود عرب ومضافاتِ عرب میں جو نامور حکومتیں کبھی تھیں مثلاً: نابتی، حمیری، سبائی وغیرہ مدت گزری کہ ان کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

اس موقع پر صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ صبحِ سعادت کے طلوع کے وقت کون کون سی قومیں دنیا پر حکمران تھیں اور ان کی مذہبی واخلاقی حالت کیا تھی اور دنیا کے مذاہب اس وقت کی روحانی حالت کے سنبھالنے کی کہاں تک استطاعت رکھتے تھے اس وقت روئے زمین کی اہم طاقتیں دو ہی تھیں، فارس اور روم۔ فارس کا مذہب مجوسیت تھا، جس کا دائرہ عراق سے لے کر ہندوستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسوی تھا، جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے تھا، لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی ذکر کے قابل ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہندو ہیں۔

مجوس فارس

عرب کی پہلی ہمسایہ سلطنت فارس تھی، جس کے تمدن کا ستارہ ایک زمانہ میں اوجِ کمال پر تھا، مگر عہدِ بعثت سے ڈیڑھ سو برس پہلے سے ساسانی شان وشوکت اور کیانی جاہ وجلال مٹتے مٹتے سایہ سا رہ گیا تھا، مسلسل بغاوتوں، سفاکانہ خونریزیوں اور سیاسی بدامنیوں نے اس کو تہ وبالا کر دیا تھا، بادشاہوں کے ظلم وستم اور امرا کی عیاشیوں اور خود غرضیوں نے صداقت، اخلاق اور ہر قسم کے اخلاقی جوہر کو، جس کے خمیر سے قوم کی

زندگی کی تعمیر ہوتی ہے، فنا کر دیا تھا۔

ایران میں بابل کے اثر سے ستارہ پرستی بہت عام تھی، اسی کا اثر ہے کہ فارسی لٹریچر میں افلاک اور ستاروں کی کارفرمائی آج تک نمایاں ہے، زردشت نے اس تاریکی میں اپنی آگ روشن کی اور نور وظلمت یا خیر وشر کے دو خالق یزداں واہرمن اس کے دو خدا اور آگ اس کی مسجود بنی، اسلام سے کچھ صدیاں پیشتر مانی نے مسیحیت اور مجوسیت کی آمیزش سے مذہب کا ایک نیا مرقع تیار کیا تھا جس میں نور وظلمت کے فلسفہ کا ایک ایسا گورکھ دھندا بنایا تھا جس سے اخیر تک اس قوم کو نکلنا نصیب نہ ہوا۔ [1] اس کی تعلیم یہ تھی کہ دنیا سے گوشہ گیری کر کے اس کو ویران وبرباد اور ترک ازدواج سے نسل انسانی کو منقطع کر دیا جائے، تاکہ بدی کا خاتمہ ہو جائے۔ [2] اخلاقی حیثیت سے محرمات کا وجود ہمیشہ ان کے ہاں مختلف فیہ رہا، باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو اپنی زوجیت میں لینا، وہاں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ [3] یہ سن کر کس قدر حیرت ہوگی کہ یزدگرد ثانی جو پانچویں صدی عیسوی کے اوسط میں وہاں کا بادشاہ تھا، اس نے اپنی بیٹی سے اپنا عقد کیا اور پھر اس کو قتل کر ڈالا۔ [4] عورتوں کو اس قوم اور اس مذہب میں جو حیثیت حاصل تھی، وہ ان افسانوں اور مقولوں سے ظاہر ہے، جو ایرانی ادبیات کا اب بھی جزو ہیں اور جو شاہنامہ کے اوراق میں اب بھی ہر شخص کو نظر آ سکتی ہے، عورتوں کی بے وفائی بداخلاقی اور ان پر عدم اعتماد پرانے ایرانی تمدن کا سب سے بڑا جزو تھا۔

سلاطین اور امرا درجہ بدرجہ رعایا کے خدا اور دیوتا تھے، جن کو سجدے کیے جاتے تھے۔ [5] ان کی الوہیت کے گیت گائے جاتے تھے، ان کے دربار میں کوئی بیٹھ نہیں سکتا تھا، ان کے خلاف کوئی لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، ان کے جرائم پر ان کو سزا نہیں دی جا سکتی تھی اور رعایا ان کے مظالم کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

ملک کا بڑا حصہ رومی عیسائیوں کی دائمی جنگ سے پریشان حال تھا اور گرجاؤں اور آتش کدوں کی باہمی آویزش کا مختتم سلسلہ قائم تھا جب رومی فاتح ہوتے تو آتش خانے ٹوٹ کر کلیسے بن جاتے اور جب ایرانی غالب آتے تو کلیسے ٹوٹ کر آفتاب دیوتا کے معبد اور آتش خانے تعمیر ہو جاتے، یہودیوں پر جو مظالم توڑے جاتے، اس کا ایک مختصر سا نقشہ توراۃ کے قصۃ البر میں نظر آتا ہے اور بعد کو مفتوح عیسائیوں پر وہ جس جس طرح ظلم کرتے تھے، اس کی تفصیل گبن کے اوراق میں منتشر طور پر ملے گی۔

بعثت سے پہلے جہانبانی کا قرعہ قباد اول بن فیروز کے نام پڑا، بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمیوں کا سلسلہ روز بروز بڑھتا گیا، آخر رعایا نے قباد کو قید کر دیا [6] قباد نے قید خانہ سے بھاگ کر تاتاریوں کے پاس

---

[1] کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر مانی، ص:٤٥٨ وما بعد وکتاب البدء والتاریخ مقدسی، ج٤، ص:٢٤۔

[2] تاریخ غرر اخبار الفرس ثعالبی مطبوعہ پیرس، ص: ٥٠٢۔

[3] ایضا، ص: ٢٧ وابوداود میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں حکم دیا کہ مجوسیوں کو اس فعل شنیع سے باز رکھا جائے کتاب الخراج والامارۃ والفيء، باب فی اخذ الجزیۃ من المجوس:٣٠٤٣۔ [4] مورخوں کی تاریخ عالم، ج٨، ص: ٨٤۔

[5] غرر اخبار الفرس ثعالبی، ص: ٥٠٠ پیرس۔ [6] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدھم، جلد ٢١، ص: ٢٢٣۔

پناہ لی اور ان کی اعانت سے دوبارہ تاج حاصل کیا، لیکن ملک پر اس سے بھی زیادہ مصیبت یہ نازل ہوئی کہ اس عہد میں مزدک نام ایک شخص پیدا ہوا، جو اس امر کی تعلیم دیتا تھا کہ دولت اور عورت کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں بلکہ ان کو تمام جماعت میں مشترک ہونا چاہیے، چنانچہ ایک شخص کی بیوی مزدک کے عقائد کی رو سے ہر شخص کے ساتھ ہم بستر ہوسکتی تھی، عیش پرست اور ہوس ران امرا اور عوام دونوں نے اس کو خوشی خوشی قبول کرلیا[1] اس مذہب نے بہت جلد شاہی سایہ میں ترقی حاصل کی اور خود قباد نے اس دین کی ترویج اور اشاعت میں نمایاں حصہ لیا، قوم کی اخلاقی حالت پر اس تعلیم کا جو اثر پڑسکتا تھا، وہ ظاہر ہے نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ملک عیش پرستی اور ہوس رانی کے نشہ میں سرشار ہوگیا۔

۵۳۱ء میں قباد کی جگہ نوشیرواں نے لی، ایرانیوں میں اس کی عدل پروری اب تک مشہور ہے مگر اس کو یہ مبارک لقب اپنے عزیزوں اور افسروں اور ہزاروں بے گناہوں کے قتل کی بدولت ملا، مزدکی فتنہ کو اس نے تلوار کے زور سے دبانا اور کیش زرتشی کو دوبارہ فروغ دینا چاہا مگر خود اس کا بیٹا نوشہزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا، اس کی پاداش میں قید ہوا اور قید سے بھاگ کر ایک عیسائی فوج لے کر زردشتیوں سے صف آرا ہوا اور مارا گیا۔

۵۷۹ء میں نوشیرواں نے وفات پائی اور ایران کا تخت، ہرمز چہارم کے حصہ میں آیا، اغیار کی دست اندازیوں کے ساتھ اندرونی بدنظمی اور باہمی خانہ جنگی، بادشاہوں کی تغافل شعاری اور امرا کی عیش پرستی اور عوام کے اخلاقی انحطاط میں برابر ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ۶۳۶ء میں مجاہدین اسلام کی فتح مندی کے طوفانی صرصر کے سامنے ملک فارس کی یہ ٹمٹماتی ہوئی شمع ہمیشہ کے لیے بجھ گئی۔

اوپر کے بیانات سے معلوم ہوگا کہ ایران کی سرزمین نغمہ توحید سے کبھی گوش آشنا نہیں ہوئی، اخلاق کے متعدد ابواب ہیں جو ان کے آئین میں کبھی داخل نہیں ہوئے، یزداں و اہرمن، نور و ظلمت اور خیر و شر کی بھول بھلیوں نے ان کو ہمیشہ سرگرداں رکھا، حکومت اور شاہی کے متعلق ان کا تخیل خدائی کا ہم رتبہ تھا، اسلام و فارس کی جنگ میں مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر جب سپہ سالار ایران کی بارگاہ میں گئے اور آزادی کے ساتھ جا کر اس کے ساتھ بیٹھ گئے تو ایرانی امیروں کو اس میں اپنے نائب السلطنت کی توہین نظر آئی اور ان مغیرہ کو سامنے سے ذلت کے ساتھ اٹھا دیا، انہوں نے جواب میں کہا: ''ہم عربوں کا یہ دستور نہیں کہ ایک خدا بن کر بیٹھے اور دوسرے اس کے سامنے غلامی اور بندگی کریں۔''[2]

آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تقریباً ڈیڑھ صدی پیشتر سے ایران میں جس قسم کا سیاسی انحطاط شروع ہوگیا تھا وہ روز بروز بڑھتا ہی گیا، اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ فارس کے روحانی آتش کدہ میں اب زندگی کی کوئی چنگاری باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے جب اسلام کا نور طلوع ہوا تو اس کے شیوع کے لیے کوئی

[1] غرر اخبار الفرس ثعالبی، ص: ۵۹۸ تا ۶۰۰ پیرس۔ [2] تاریخ طبری واقعات ۱۴ھ ج ۵، ص: ۲۲۷۴ مطبع بریل۔

دوسرا پردہ بیچ میں حائل نہ ہوا، ہرجان ملکم جن کا مسیحی تعصب، عساکر اسلامی کو ان کی زبان سے ''قزاقانِ عرب'' کا لقب دلواتا ہے، فتح فارس کے متعلق حسب ذیل رائے دیتے ہیں:

''یزدجرد ثالث کا عہد حکومت اس لیے یادگار رہے کہ اسی زمانہ میں فارس کی قدیم شہنشاہی کا تختہ برہنہ تن ''سوسار خواروں'' کے ایک دستہ نے الٹ دیا کہ اسی تحقیر آمیز لقب کے ساتھ عرب قبائل کے یہ مغرور ہمسائے ان کا ذکر کرتے تھے، اس انقلاب عظیم کی علت کوئی معمولی سبب نہیں ہو سکتا (مسلمان) فارسی مؤرخین کچھ تو اپنے حب وطن اور کچھ اپنی وہم پرستی کی بنا پر اس واقعہ کو ایک معجزۂ عظیم خیال کرتے ہیں جس کے ذریعہ سے خدا نے محمد ﷺ کی صداقت کو ظاہر کر دیا تھا لیکن جو لوگ دنیاوی حیثیت سے اس واقعہ پر غور کرتے ہیں انہیں فوراً نظر آ جاتا ہے کہ فارس کی ایسی سلطنت، جو عیش پرستی کے ہاتھوں لاغر و نحیف ہو چکی تھی، جس میں اندرونی مناقشات کے باعث بدنظمیاں پھیلی ہوئی ہوں جو بیرونی محاربات سے یکسر خستہ و ناتواں ہو اور جو اپنی کبرسنی اور نقاہت سے قصر زوال کی جانب خمیدہ پشت ہو، اس کے لیے پرجوش ''قزاقان عرب'' کی مدافعت کرنا سخت دشوار تھا۔'' [1]

مگر سوال یہ ہے کہ پاک نژاد ساسانیوں کی خستگی و ناتوانی اور نقاہت و کمزوری، قزاقان عرب ہی کی ترقی کی تمہید کیوں بنی؟ کیا نہتے عربوں کے پاس اس سے زیادہ سامان جنگ اور سپاہی تھے، جو عراق و ایران کے اخیر معرکوں میں بھی ایرانی عربوں کے مقابلہ میں لاتے رہے؟ واقعہ یہ ہے کہ زرتشت کی آگ میں اب گرمی نہیں باقی رہی تھی، نور و ظلمت، خیر و شر، نیکی و بدی کے فلسفہ نے ایران کی ہر قسم کی عملی طاقت فنا کر دی تھی ''یزداں اور اہرمن'' کی دو عملی حکومت نے روحانی امن و امان کی سلطنت برباد کر دی تھی، بیسیوں چھوٹے بڑے فلسفیانہ مذہبی فرقے پیدا ہو گئے تھے جن میں سب سے اہم مانوی فرقہ تھا، جو عیسائیت اور مجوسیت کا معجون مرکب تھا، آخر میں مزدکی فرقہ کی بہیمانہ تعلیم نے ایران کی اخلاقی روح کو اور بھی موت کے قریب کر دیا [2] نوشیرواں نے تلوار کی نوک سے اس فتنہ کو دبایا اور اس کے صلہ میں بادشاہِ عادل و دادگر کا خطاب پایا، تاہم ایران کی روحانی زندگی ان خون کے چھینٹوں کے بعد بھی اسی طرح تشنہ لب رہی جس طرح پہلے تھی اور منتظر تھی کہ دنیا کے خشک صحرائے عرب سے چشمہ ابل کر ادھر آئے تو وہ اپنی پیاس بجھائے۔

عیسائی رُوم

آغازِ اسلام کے وقت جس قدر ایران کی جسمانی و روحانی شہنشاہی کے اوراق منتشر و پراگندہ تھے روم کی قبائے سلطنت اس سے کچھ کم کرم خوردہ نہ تھی حالانکہ یہ وہی رومۃ الکبریٰ ہے جو یونان کے زوال کے بعد

---

[1] ملکم صاحب کی تاریخ ایران جلد اول صفحہ ۱۳۴۔ [2] تفصیل کے لیے فہرست ابن ندیم دیکھو صفحہ ۴۷۹، ۴۸۰ مصر۔

دنیا کی سب سے بڑی سلطنت سمجھی جاتی تھی اور جس کے ایک تاجدار جولیس سیزر کا نام ہمیشہ کے لیے قیصر کی صورت میں بادشاہ وشہنشاہ کا مرادف بن گیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی سلطنت میں مبعوث ہوکر دنیا کو امن وسلامتی کا پیام سنا کر رخصت ہوئے، ان کے رفع وصعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوئیں اور بالآخر پال نے جو ایک نوعیسائی یہودی تھا، اس طرح عیسائیوں پر غلبہ پایا کہ اس کے بدعات کی خاک میں اصل عیسویت ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئی اور باپ، بیٹے، روح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہوگیا اور توراۃ جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی مٹا نہیں سکتے تھے [1] وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی (پال) کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی، [2] ۳۲۵ء میں رومی سلطنت کے مشرقی ومغربی دو حصے ہوگئے، مشرقی حصہ کے تاجدار قسطنطین اعظم نے عیسائی مذہب اختیار کیا اور رفتہ رفتہ پوری رومی حکومت میں یہ مذہب پھیل گیا، مگر درحقیقت اس مشرقی تاجدار روم کے اس قبول مذہب کا جذبہ اخلاص وصداقت سے زیادہ سیاست اور سلطنت کی مصلحت پر مبنی تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب باپ بیٹے اور روح القدس کی تثلیثی الوہیت میں ہر نیا ملک جو فتح ہوتا، اس کا دیوتا کسی نہ کسی نام اور رسم سے اس مذہب میں شامل ہوجاتا تھا تختِ سلطنت کے غیر متوقع حصول نے مذہبی خاکساروں میں یہ حوصلہ پیدا کردیا کہ، کلیساؤں نے مذہبی شہنشاہی کا خواب دیکھنا شروع کردیا اس کے لیے عقائد کی وہ لڑائیاں کھڑی کی گئیں کہ شاہانہ سایہ میں بیٹھ کر کونسلوں نے خدا کے دین کا خاکہ تیار کیا، اتحاد اور اجتماع کی ہر نئی کوشش، نئی مذہبی تفریق کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اور ایک عیسوی مذہب ایک صدی کے اندر اندر بیسیوں فرقوں میں تقسیم ہوگیا۔

۳۳۷ء میں قسطنطین کی وفات پر مذہبی خانہ جنگی کے ساتھ ساتھ رومیوں کی سیاسی خانہ جنگیوں کی زیر خاکستر آگ بھی زوروشور سے شعلہ زن ہوئی، اعیان سلطنت میں مختلف گروہ بندیاں ہوگئیں اور باہمی نفاق اور فتنہ وفساد کا بازار گرم ہوگیا، بالآخر سلطنت روم مختلف صوبوں میں تقسیم ہوکر مختلف دعویدارانِ حکومت کے حصہ میں آئی [3] ناقابل فرمان رواؤں کی کمزوری دیکھ کر ایک طرف گوتھ، ونڈال وغیرہ بعض وحشی قوموں نے حملے شروع کیے اور دوسری طرف خود دور افتادہ صوبوں کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی کے آخر میں سلطنتِ روم کا مغربی بازو جو برطانیہ اور فرانس وغیرہ پر مشتمل تھا، بالکل کٹ گیا اور خود روم کا دارالحکومت دشمنوں کے حملے سے محفوظ نہ رہ سکا۔ [4] اس وقت یعنی پانچویں صدی کے بیچ میں لوگوں کو صاف نظر آرہا تھا کہ ان کے مورث اعلیٰ نے بارہ کرگسوں کو خواب میں دیکھا تھا اور جس کی بنا پر اس زمانہ کے کاہنوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ یہ سلطنت بارہ صدیوں تک قائم رہے گی، اب اس پیشین گوئی کے

---

[1] انجیل متی: ۵۔ ۱۷۔ ۱۸۔ [2] یہ مضامین عیسائیوں کی انجیل کے حصہ اعمال اور خطوط میں جا بجا بتصریح مذکور ہیں۔

[3] گبن کی تاریخ زوال وانحطاط سلطنت روم، ج ۱، ص: ۴۸۸۔ ۴۹۱۔

[4] ایضاً، ج ۲، باب ۳۶ و باب ۳۸۔

پورا ہونے کا وقت آ گیا۔ مؤرخ گبن اس زمانہ کی تصویر ان لفظوں میں کھینچتا ہے:

''اس پیشین گوئی نے، جس پر اس قوم نے اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں کبھی اعتنا بھی نہ کی تھی، اب بارہ صدیوں کے خاتمہ پر جب کہ ہر طرف سے ذلت و بدقسمتی کا سامنا تھا، اہل روم کو یاس آمیز جذبات سے پر کر دیا لیکن ان کے زوال کی علامتیں کرگسوں کے خواب سے زیادہ واضح و نمایاں موجود تھیں، رومن حکومت، مخالفین کی نظروں میں روز بروز زیادہ کمزور اور خود اپنی رعایا کی نظر میں زیادہ ظالمانہ اور ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی، کفایت شعاری جتنی زیادہ ضروری ہوتی جاتی تھی، اسی نسبت سے اس کی جانب سے بے اعتنائی بڑھتی جاتی تھی اور جس نسبت سے رعایا کے مصائب روز افزوں تھے اسی نسبت سے ٹیکس میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ [1]

امرا نے اپنے مصارف کا بار بھی عام رعایا پر ڈالنا شروع کیا جس کے باعث وہ اپنی قلیل آمدنی سے بھی محروم ہوگئی اس کی عدم ادائیگی کی صورت میں رعایا پر اس قدر جبر کیا جاتا تھا کہ اس کے دل میں حکومت کی طرف سے نفرت و عداوت پیدا ہوگئی یہاں تک کہ وہی رومن قوم جو کبھی اپنے اس لقب پر فخر کرتی تھی، اب اپنے کو اس قوم کی طرف منسوب کرتے شرمانے لگی اور رومن حکومت پر ہر وقت وحشی سے وحشی سلطنت کی محکومیت کو ترجیح دینے لگی، امرا، وزرا اور سلاطین خود اپنی ناعاقبت اندیشیوں سے رعایا کو اپنا دشمن بناتے اور جب بغاوت ہوتی تو فوج کشی کرتے اور ناکام رہتے، غرض اندرونی بدنظمیوں سے ملک کی یہ نوبت پہنچ گئی تھی کہ گبن کے الفاظ میں:

''اگر اس وقت روم کے تمام بیرونی وحشی مخالفین بھی فنا ہو جاتے تو ان کی مجموعی معدومیت بھی سلطنت کے مغربی بازو کو زوال و بربادی سے بچا نہیں سکتی تھی۔'' [2]

پانچویں صدی کے خاتمہ پر مغربی حصہ کے نکل جانے کے بعد، مشرقی صوبوں تک یعنی ڈینیوب سے لے کر دجلہ و نیل تک کی سرزمین روم کے ماتحت رہ گئی تھی لیکن اس کی حالت بھی روز بروز نازک سے نازک تر ہوتی جاتی تھی، مؤرخین کا بیان ہے کہ رومن فوج کی مجموعی تعداد جو ایک زمانہ میں ۶۴۵۰۰۰ تھی، اب شاہ جسٹنین کے زمانہ (یعنی ۵۲۷ء) میں گھٹ کر ایک چوتھائی سے بھی کم یعنی ۱۵۰۰۰۰ رہ گئی تھی اور وہ بھی نہایت متفرق و ابتر حالت میں۔ رعایا کی جیبیں خالی تھیں، فوج کی تنخواہیں چڑھتی جا رہی تھیں اور امرا و اعیان سلطنت اپنے ذاتی مصارف کے لیے ہر طرح کے جعل و فریب، رشوت ستانی اور لوٹ مار کو جائز رکھتے تھے، فوج میں یوں تو بہت سے سپاہیوں کے نام لکھے ہوئے تھے، لیکن میدان جنگ میں جانے کے وقت بہت تھوڑے سے لوگ تیار ہوتے، فوجی افسر فنِ جنگ کے بجائے اپنا وقت باہمی حسد و رقابت میں صرف کرتے اور ہر افسر کی یہ کوشش رہتی کہ دوسرے افسر کی بدنامی و ذلت سے فائدہ اٹھا کر خود ترقی و منصب حاصل کر لے۔ [3]

---

[1] ایضًا، ص: ٤٦١۔ [2] ایضًا، ص: ٤٦١۔

[3] حوالہ مذکور، ج٣، ص: ١١٣۔

اندرونی بدنظمیوں پر مستزاد یہ تھا کہ بیرونی غنیم اہلِ روم کو ایک دم کے لیے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے، روم وفارس کے درمیان مدت سے لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا، پھر لومبارڈس، گوتھس اور ونڈالس وغیرہ کے پیہم حملے روم کی رہی سہی قوت کو اور بھی پامال کر رہے تھے۔

الغرض چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر یعنی خاتم النبیین ﷺ کی ولادت سے دو چار سال بعد روم بقول گبن کے اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گیا تھا اور گبن کی زبان میں اس کی مثال بعینہٖ اس عظیم الشان درخت کی ہوگئی تھی، جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوامِ عالم آباد تھیں مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ وبار کے ساتھ اس کی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہوگئی تھیں اور اب خالی تنا خشک ہو رہا تھا خود پایہ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے، وہ بازار اور تماشا گاہیں جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی اب ویرانے اور سنسان پڑی تھیں، عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی زیادہ پسند کرتے تھے، تاکہ زیادہ آسانی اور آزادی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں۔ ❶

ملک کی عام سیاسی واخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو اس سے بھی زیادہ دلخراش تصویر نظر آتی ہے بت پرست رعایا کو چھوڑ کر جو ستاروں، دیوتاؤں اور بتوں کی پوجا میں بدستور مصروف تھی اور لوگ جنہوں نے عیسائیت قبول بھی کر لی تھی، وہ باپ، بیٹا، روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے حضرت عیسیٰ اور مریم وروح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کے تعین نے بیسیوں فرقے پیدا کر دیے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ وجدل کی نوبت آ گئی تھی یہاں تک کہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔ ❷ اس جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت وخون کی نوبت آ جاتی، پادریوں نے اپنے منصب مذہبی کو حصولِ جاہ کا ایک ذریعہ قرار دے لیا تھا اور اس بنا پر محض حبِ جاہ کی خاطر وہ ہر طرح کی ناجائز کوششوں میں مصروف رہتے تھے، ان پادریوں کے ایک اسقف اعظم سینٹ سرل نے جو جو سفاکیاں کی ہیں ان کی تفصیل کے لیے ایک پوری کتاب درکار ہے، ایک مرتبہ اس نے اپنے مریدوں کو ہمراہ لے کر غیر مسلح یہودیوں پر دھاوا کیا اور ان سب کو جلاوطن کر دیا اور ان کا مال اسباب سرل کے مریدوں کے ہاتھ لگا اور ان کے معابد زمین کے برابر کر دیے گئے، سرل کا حریف ارسٹس نامی پادری تھا، ایک روز جب ارسٹس راستہ سے گزر رہا تھا تو ۵۰۰ راہبوں کی جماعت اس پر ٹوٹ پڑی اور اپنی سنگ باری سے اس کو خون میں نہلا دیا ❸ سرل کی ایک خاتون دوست بلیشیا نامی تھی ایک روز وہ اپنی درسگاہ

❶ گبن، ج۳، ص: ۳۷۲۔ ❷ گبن، ج۳، ص: ۳٤٤۔ ❸ ایضاً، ص: ۳۲۷۔

سے واپس آ رہی تھی کہ راہبوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے اس پر حملہ کر دیا، گاڑی سے اتار کر برہنہ کی گئی اور اس حالت میں تمام شہر کی سڑکوں پر گھسیٹتے ہوئے اسے کلیسا میں لائے جہاں پہنچ کر پادری پیٹر کے گرز سے اس کا خاتمہ کر دیا گیا، قتل کے بعد اس کا گوشت ہڈیوں سے جدا کیا گیا، نعش کے ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور آلائش جسم کو آگ میں ڈال دیا گیا۔ [1] یہ ایسے واقعات ہیں جن کے ذکر سے آج قلم لرزتا ہے مگر یہ عیسائی مذہب کے علمبرداروں کا سب سے روشن کارنامہ ہے۔

یہی حالت ان تمام ملکوں کی تھی جہاں رومیوں کے زیر سایہ عیسوی مذہب پھیلا ہوا تھا، یعقوبی، نسطوری اور دوسرے فرقے جو سرکاری عیسوی مذہب سے الگ تھے، وہ دور دراز صوبوں اور ملکوں میں پناہ ڈھونڈتے تھے، نائیس کی کونسل کے بعد آریوس اور اس کے حریفوں میں جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، انہوں نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ''شہزادۂ امن'' کا مذہب ان جنگجوؤں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچ نہیں سکتا۔

مسٹر مارس، جو پیغمبر اسلام کو، نعوذ باللہ، بہت بڑا مکار قرار دیتے ہیں اپنی ''تاریخ ہندوستان'' میں ضمناً ایک موقع پر تحریر کرتے ہیں:

> ''اس نازک موقع پر (یعنی ظہور اسلام کے وقت) ان بے باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو نجس کر رہے تھے اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان، جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوئے تھے اگرچہ مشرق میں اصلی مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت ہی مدھم، روم کے قیصروں کی قوت کچھ تو اندرونی نزاعوں اور کچھ بیرونی حملوں کے باعث اپنی بنیاد سے اکھڑ کر قصر فنا کی طرف تیز رفتاری کے ساتھ جا رہی تھی، یہود بے صبری کے ساتھ گلیلی کے اس حقیر شخص کے مذہب پر نظر کر رہے تھے جس کے دین کو اب شاہ قسطنطین کے مسیحی ہو جانے کے بعد پوری شان و شوکت اور شاہی عظمت حاصل ہو گئی تھی اور ہر اس تحریک کی مدد کے لیے تیار تھے جو ایسے قابل نفرت مذہب کا خاتمہ کرنا چاہے، اہل فارس نہایت غیظ و غضب کے ساتھ ان پر جوش اور ناروادار فتح مند عیسائیوں کو دیکھ رہے تھے، جنہوں نے ان کے معبود ''آتش شمسی'' کی بے حرمتی کی تھی اور شرک کی ساری دنیا اپنے برباد شدہ معبودوں اور ڈھے ہوئے معبدوں پر ماتم کر رہی تھی اور ان کے انتقام کے لیے آمادہ اور مستعد تھی۔'' [2]

مارس صاحب خود واقعات کی نقشہ کشی میں خواہ کتنا ہی مسیحی رنگ بھریں لیکن نفس واقعات کی صحت ان کو شاید ہم سے بھی زیادہ مسلّم ہے۔

بہر حال مؤرخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی

---

[1] ایضاً، ص: ۳۲۷، ۳۲۸ نیز ڈریپر تاریخ معرکہ آرائی مذہب و سائنس صفحہ: ۵۵۱۔

[2] مارس کی تاریخ ہندوستان، ج ۱، ص: ۱۸۳۔

ہے وہ اس کے لیے باعث ننگ ہے مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی، اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا، حضرت مسیح کی ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں کی تحلیل، مصر کو قابو میں لانے کے لیے کی گئی تھی جس سے حضرت مسیح کے ''وہی ایک ہے'' کی تعلیم ہمیشہ کے لیے ان کے مذہب سے مٹ گئی، ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہوگئی تھی اور ہر بڑے پادری سے اس کی وفات کے بعد دعا مانگی جاتی تھی، ملک شام میں جو بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے، [1] مسیح ومریم، روح القدس اور حوارین اور مسیحیت کے دیگر اساطین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے ہونے لگی کہ اس کی نظیر زمانہ مابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔ [2]

سیل صاحب ترجمۂ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں: ''گرجا کے پادریوں (CLERGY) نے مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے، اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیے باعث ننگ ہیں، مذہبی صورت میں قائم کیے گئے خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی سے ہونے لگی۔ نیس کاؤنسل کے بعد مشرقی چرچ روزانہ کے مناظرات میں مشغول ہوگیا، اور ارینس، سلینس، نسطوریس اور یوٹیکینس کے جھگڑوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا، انصاف علانیہ فروخت کیا جاتا تھا اور ہر طرح کی بدعنوانیاں ہوتی تھیں، مغربی چرچ میں ڈینس اور ارسلیسی نس نے بشپ کی جگہ حاصل کرنے کے لیے قتل تک نوبت پہنچادی اور آخر ڈینس کی فتح ہوئی، اس موقعہ پر کہا جاتا ہے کہ سیسی نینس (SICININUS) کے گرجا میں ایک روز میں ۱۳۷ آدمی قتل ہوئے پائے گئے اور کوئی حیرت نہیں کہ یہ لوگ ان جگہوں کے اس قدر خواہاں ہوتے تھے، اس لیے اس ذریعہ سے ان کو گراں بہا تحفے ملتے تھے، اپنی گاڑیوں پر نہایت تزک واحتشام سے نکلتے تھے اور ان کے دسترخوان پر بادشاہوں سے زیادہ شان وشوکت ہوتی تھی۔ ان مناقشات کا سبب زیادہ تر شہنشاہ ہوا کرتے تھے۔ جسٹینین کے وقت میں حالت اور زیادہ خراب ہوگئی اس کے نزدیک اپنے عقیدہ کے مخالفوں کو مار ڈالنا کوئی جرم ہی نہ تھا:

> ''بادشاہوں اور پادریوں میں عقائد اور اخلاق کی جو برائیاں پھیلی ہوئی تھیں اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عوام کی حالت بھی متبذل ہوگئی، ان کا مقصد صرف روپیہ پیدا کرنا رہ گیا خواہ کسی ذریعہ سے ہو اور اس روپیہ کو وہ نفاست اور عیاشی میں اڑاتے تھے۔'' عقائد کی خرابی کے علاوہ روم اور فارس کی سلطنتیں بھی کمزور ہوگئی تھیں، شہنشاہ قسطنطین کے بعد روم کی سلطنت روز بروز کمزور ہوتی گئی، عام طور سے اس کے جانشین بزدلی اور مظالم کے لیے مشہور تھے، آنحضرت ﷺ کے

---

[1] سنن ابن ماجه، كتاب النكاح، باب حق الزوج على المرأة: ١٨٥٣۔

[2] سیل صاحب کا انگریزی ترجمۂ قرآن مقدمہ، صفحہ: ۲۵، ۲۶۔

وقت تک ملک کا مغربی حصہ گلاتھ (GOTHS) لوگوں نے روند ڈالا تھا، یونانیوں کی عیش پسندی اور اخلاقی خرابیوں نے ان کی قوت کو زائل کر دیا تھا۔ رومیوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا، اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔ ''دونوں (عیسائیت اور بت پرستی) کی باہمی کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر وشکر ہوگئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہوگیا۔ جس میں بت پرستی وعیسائیت دونوں کی شانیں پہلو بہ پہلو جلوہ گر تھیں ❶ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے متغیر ہوکر ایک عام پسند مگر پایۂ اخلاق سے گرے ہوئے مذہب کی شکل اختیار کرتے گئے، ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہوگیا...... عقیدۂ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچہ میں ڈھال لیا گیا، مریم عذرا کو تو (خدا کی ماں) کا لقب دیا گیا۔'' ❷

اسی زمانہ میں ایک گروہ ''مریمی'' کے نام سے پیدا ہوا جو کہ حضرت مریم علیہا السلام کو بھی شریک الوہیت کرکے بجائے اقانیم ثلثہ! کے، اقانیم اربعہ کا اعتقاد رکھتا تھا، جس کی تردید قرآن پاک نے سورۂ آل عمران میں فرمائی ہے، اسی کے ساتھ اور بہت سے معتقدات رومی بت پرستوں سے لے کر عیسائیت میں داخل کیے گئے اور نام بدل بدل کر رومی بت پرستوں کے دیوتاؤں کے رسوم، مقدس عیسائی کلیساؤں میں جگہ پانے لگے اور ان مسائل میں بھی مختلف فرقوں کے اندر اختلاف باہمی نہایت شد ومد سے پیدا ہوئے، یہاں تک کہ ان مذہبی مناقشات کے تصفیہ کے لیے حکومت کو بار بار دست اندازی کرنی پڑتی تھی، رفتہ رفتہ رشوت ستانی کا بازار گرم ہوگیا اور یہ حالت ہوگئی کہ جو شخص کسی بڑے دنیاوی عہدہ دار کے پاس جتنا رسوخ وتقرب حاصل کر سکتا اسی نسبت سے اس کو بڑی دینی خدمت مل جاتی۔ ❸

یہ تو مسیحی دنیا کے مشرقی حصہ کا حال تھا، مغربی حصہ کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی، یہاں رومن امپائر کی ماتحتی میں مذہبی مناصب کے لیے کشت وخون ایک عام ومعمولی واقعہ تھا، یہاں تک کہ بعض دفعہ مقتولین کی تعداد کسی سخت خونریز جنگ کے مقتولوں کے مساوی پہنچ جاتی، چنانچہ ایک مرتبہ جب ایک اعلیٰ مذہبی عہدہ کے لیے دو پادریوں کے درمیان مقابلہ ہوا تو صرف ایک دن میں ۱۳۷ آدمی کام آئے۔ ❹

اس سفاکانہ جدوجہد کا باعث صرف یہ تھا کہ اس زمانہ کے مذہبی عہدے اکتساب زر، حصول لذائذ اور کسب جاہ کے بہت بڑے ذرائع تھے، چنانچہ جتنی نفیس غذائیں پادریوں کے دستر خوان پر رہتی تھیں، اتنی بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی تھیں۔ ❺

سلاطین اور مذہب کے حاکمین کے اخلاق کا پرتو عام رعایا اور پیروؤں پر لازمی طور پر پڑتا ہے، نتیجہ یہ

---

❶ معرکہ مذہب وسائنس، ڈریپر، ص:۶۲۔ ❷ ایضاً صفحہ:۶۵، ۶۶۔
❸ ایضاً، ص:۲۶۔ ❹ ایضاً صفحہ:۲۶۔ ❺ ایضاً صفحہ:۲۶۔۶۸۔

ہوا کہ بداخلاقی، اسراف اور ہوس پرستی مسیحی دنیا کی آب و ہوا میں سرایت کر گئی، لوگ ہر طرح کے ناجائز وسائل سے روپیہ کماتے اور کمال بے دردی کے ساتھ اپنے مسرفانہ لہو ولعب اور عیاشی میں اڑا ڈالتے۔ ❶

پوپوں نے اور ان کے بعد درجہ بدرجہ مذہبی عہدہ داروں نے اپنی اپنی جگہ شہنشاہانہ بلکہ خدائی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے، جو وہ زمین پر کھولتے تھے وہ آسمان پر کھولا جاتا تھا اور جو یہاں بند کرتے تھے وہ وہاں بھی بند ہو جاتا تھا، قرآن مجید نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے: ﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۱) ''انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو اپنا خدا بنا لیا تھا۔'' دینداری کا سب سے اہم جز وتجرد کی زندگی اور رہبانیت تھی ہر قسم کے آرام و آسائش سے جسم کو محروم کر کے ہر قسم کے تکلیف دہ عذاب میں اپنے کو تمام عمر مبتلا رکھنا بہترین عبادت تھی، کسی نے تمام عمر غسل نہ کرنے کی قسم کھائی تھی، کسی نے اپنے کو دلدل میں ڈال دیا تھا، کوئی اپنے کو بوجھل زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھا، کسی نے سایہ میں بیٹھنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور کسی نے اپنے کو اندھیری کوٹھری میں بند کر لیا تھا۔ ماں، باپ اور عزیز واقارب، دینداری وتقویٰ شعاری کی راہ میں کانٹے تھے، ان سے پرہیز، بلکہ ان سے نفرت، کمالِ تقویٰ سمجھا جاتا تھا اور اسی پر فخر کیا جاتا تھا۔

ہندوستان

دنیا کے ان متمدن ملکوں میں جہاں کوئی باا ثر مذہب قائم تھا ایک ہندوستان بھی ہے، ہندوستان کے تمدن کے پانچ مختلف دور گزرے ہیں، ایک اصلی ہندو ویدک عہد، جو دو ہزار سال ق م سے لے کر تقریباً چودہ سو سال ق م تک قائم رہا، دوسرا دور جنگ، یعنی جس میں کوروؤں اور پانڈوں وغیرہ کے مناقشات رہے اور جو چودہ سو سال ق م سے لے کر تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح تک رہا، تیسرا دور عقلیت جس میں حکما اور عقلیین کا دور دورہ تھا اور جو ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لے کر تقریباً تیسری صدی قبل مسیح کے نصف تک رہا، چوتھا دور بودھ جس میں اس مذہب کا عروج تقریباً دو سو پچاس قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی کے خاتمہ تک رہا، پانچواں دور پرانک جس میں بجائے ویدیا گوتم بدھ کی تعلیمات کے، پرانوں کی تلقین پر عمل درآمد ہوتا تھا اور یہ عہد تقریباً پانچویں صدی عیسوی کے اواخر سے لے کر مسلمانوں کے داخلہ ہند تک قائم رہا۔

مؤرخین کا اجماع ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریک اور نقائص سے معمور آخری دور ہے جو تقریباً ۵۰۰ء سے شروع ہوتا ہے اس دور کے نمایاں خصوصیات حسب ذیل تھے:

❶ شرک جو ابتدا ہی سے ہندوستان کے خمیر میں داخل تھا اب وہ حد اعتدال سے باہر ہو گیا تھا چنانچہ وید میں جو ۳۳ دیوتاؤں کی تعداد تھی وہ اب بڑھتے بڑھتے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں تک پہنچ گئی۔ ❷

---

❶ تاریخ اخلاق یورپ لیکی کی دوسری جلد میں یہ واقعات مفصل لکھے ہیں۔ ❷ آرسی دت کی ہندوستان قدیم جلد ۳، صفحہ: ۲۷۶۔

❷ ویدک عہد میں اصنام کی پرستش کا رواج نہ تھا لیکن اس زمانہ میں مندروں کے اندر بت پرستی علی العموم رائج ہوگئی۔ ❶

❸ مندروں کے محافظین بد اخلاقی کا سرچشمہ تھے جو لاکھوں کروڑوں ناواقف پرستش کرنے والوں کو مذہب کے نام سے خوب لوٹتے۔ ❷

❹ ویدک عہد میں ساری ہندو قوم میں یگانگی تھی لیکن اب ذات پات کی تفریق شروع ہوگئی جو نظام معاشرت کے لیے تباہ کن تھی۔ ❸

❺ عورتوں کو محکومیت وغلامی کا درجہ دیا گیا تھا۔ ❹

❻ قوانین اس قدر غیر معقول و نامنصفانہ وضع کیے گئے جن سے علانیہ بعض ذاتوں کی پاسداری وحمایت اور بعض پر جبر وستم مقصود تھا مثال کے لیے چند قوانین درج ذیل ہیں:

(الف) برہمن کو کسی حالت میں خواہ وہ کتنے ہی سنگین جرائم کا مرتکب رہ چکا ہو سزائے موت نہیں دی جاسکتی۔

(ب) کسی اونچی ذات کے مرد کا کسی نیچی ذات کی عورت کے ساتھ زنا کرنا کوئی جرم نہیں۔

(ج) کسی بودھ راہبہ کی عصمت دری کی سزا میں کچھ جرمانہ کافی تھا۔

(د) اگر کوئی اچھوت ذات کا شخص کسی اعلیٰ ذات والے کو چھو لے تو اس کی سزا موت ہے۔

(ھ) اگر کوئی نیچی ذات والا اپنے سے اونچی ذات والے کو مارے تو اس کے اعضا قطع کر ڈالنا چاہیے اگر اسے گالی دے تو اس کی زبان کاٹ ڈالنی چاہیے اور اگر اسے تعلیم دینے کا دعویٰ کرے تو گرم تیل اس کے منہ میں ڈالنا چاہیے۔ ❺

❼ راجاؤں کے محل میں بادہ نوشی کثرت سے رائج تھی اور رانیاں اسی حالتِ خمار میں جامہ عصمت اتار ڈالتی تھیں۔ ❻

❽ شاہراہوں پر آوارہ گرد اور جرائم پیشہ افراد کا مجمع لگا رہتا تھا۔ ❼

❾ خدا کی تلاش آبادیوں اور بازاروں میں کرنے کے بجائے جنگلوں اور پہاڑوں میں کی جاتی تھی جسم کو سخت سے سخت ایذا اور تکلیف ان کی بہترین عبادت تھی۔

❿ اوہام وخیالاتِ فاسدہ، بھوتوں پلیتوں اور سینکڑوں قسم کے ظنون واوہام ان کا مذہب تھا اور آسمان سے لے کر زمین تک ہر چیز ان کا خدا تھی اور ہر ایک کے سامنے سربسجود ہونا ان کا دھرم تھا۔ بتوں، دیوتاؤں اور دیویوں کا شمار اندازہ وقیاس سے باہر تھا اور ان کے افسانوں کا گیت ان کا ترانہ حمد تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد بھی جو عرب

---

❶ آر سی دت کی ہندوستانِ قدیم جلد ۳ صفحہ: ۲۸۱۔ ❷ ایضاً ص: ۲۸۳۔ ❸ ایضاً ص: ۳۰۷۔

❹ ایضاً ص: ۳۳۱۔ ❺ ایضاً ص: ۳۴۲، ۳۴۳۔ ❻ ایضاً ص: ۴۶۹۔

❼ آر سی دت کی ہندوستانِ قدیم صفحہ: ۴۶۹۔

سیاح یہاں آتے رہے انہوں نے تپشا کرنے والے جوگیوں کے وہ دردناک حالات لکھے ہیں جن کو پڑھ کر ان کی حالت پر افسوس آتا ہے [1] اور اسی طرح وہ عرب سیاح جو سندھ اور دکن کے شہروں اور ساحلوں سے گزرے ہیں ان کے معبدوں میں پجاری عورتوں اور دیوداسیوں کی جو اخلاقی کیفیتیں لکھی ہیں [2] وہ حد درجہ شرمناک ہیں اور اس سے زیادہ شرمناک یہ ہے کہ یہ سب خدا کی خوشنودی اور مذہبی عقیدہ کی رو سے انجام دیا جاتا تھا۔

عورتیں جوؤں میں ہاری جاتی تھیں، ایک عورت کے کئی کئی شوہر ہوتے تھے [3] وہ بیوہ ہو کر زندگی کی ہر لذت سے عمر بھر کے لیے قانوناً محروم کردی جاتی تھیں اور اسی لیے شوہر کے مرنے پر بعض عورتیں زندہ در آتش ہونا پسند کرتی تھیں۔ لڑائی میں شکست کے خوف کی صورت میں ان کو خود ان کے باپ اور بھائی اپنے ہاتھوں سے قتل کر ڈالتے تھے یہاں کے بعض فرقوں میں عورتیں مرد کو اور مرد عورتوں کو ننگا کر کے ان کی پوجا کرتے تھے [4] مذہبی تہواروں میں شراب پی پی کر ایسے بدمست ہوتے تھے کہ پھر انہیں ماں، بہن، بیٹی اور اپنی اور پرائی کی تمیز باقی نہیں رہتی تھی اور اس کو وہ نیکی کا کام سمجھتے تھے۔ شودروں کے نام سے ایک پوری قوم کی قوم ایسی غلامی میں مبتلا تھی کہ تعلیم و تربیت، تہذیب و اخلاق اور دین و ایمان ہر چیز سے محروم رہنا اس کا فرض تھا۔ وید کی آواز بھی اس کے کان میں پڑ جائے تو اس میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کا حکم تھا۔

راجاؤں کی بیویوں کی کوئی تعداد قانوناً مقرر نہ تھی۔ قانون کی بنیاد مساوات انسانی پر نہیں بلکہ ذاتوں پر تھی۔ عورتیں فروخت کی جاتی تھیں۔ اس مختصر سے خاکہ سے معلوم ہوا ہوگا کہ ابتدائے اسلام سے ایک صدی پیشتر سے دیوتاؤں کی یہ جنم بھومی بھی شیطانوں کے اس جال میں گرفتار تھی جس کے شکار فارس و روم ہو رہے تھے۔

یہود

دنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ امید اسی قوم سے ہو سکتی تھی جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الٰہی کی امانت دار بنی، اس لیے قرآن نے ان سے کہا: ﴿ وَلَا تَكُونُوٓا۟ أَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهِۦ ﴾ (۲/ البقرۃ:٤١) ''اور سب سے پہلے تم ہی پیغامِ الٰہی کے منکر نہ بنو'' مگر یہ قوم سخت جانی کے ساتھ سنگ دل بھی ثابت ہوئی، اس نے پتھروں کے سینوں کو پھٹتے اور ان کی چھاتیوں سے میٹھے پانی کا دودھ بہتے دیکھا اور پیا مگر پھر بھی اس کے سینہ کا دل پتھر ہی رہا۔ قرآن نے اپنے زمانہ میں اس کو طعنہ دیا:

﴿ فَهِىَ كَٱلْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً ﴾ (۲/ البقرۃ:٧٤)

''ان کے دل پتھروں کے مانند بلکہ ان سے بھی بڑھ کر سخت ہیں۔''

اس نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا، ان کو تکلیفیں دیں بلکہ ان کو قتل کر ڈالا، حضرت

---

[1] دیکھو ابو زید سیرافی کا سفرنامہ، صفحہ: ۱۱۵، ۱۱۸ پیرس و آثار البلاد قزوینی، صفحہ: ۸۱۔

[2] سفرنامہ ابو زید، ص: ۱۳۰، اور احسن التقاسیم مقدسی، ص: ٤٨٣۔ [3] مہابھارت کے قصہ کا آغاز پڑھو۔

[4] ستیارتھ پرکاش سمولاس گیارہ، ص: ۳۷۸، ۳۷۹ مطبوعہ سیوک اشٹیم پریس لاہور ۱۹۱۲ء۔

موسیٰ علیہ السلام اوران کے بعد کوئی پیغمبران میں ایسا نہیں آیا، جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اوران کی سرکشی پران کے حق میں بددعا نہ کی ہو۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے کہا:

﴿ لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰي لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۷۸، ۷۹)

''بنی اسرائیل میں سے جنھوں نے کفر کیا، ان پر داوٗد اور مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے لعنت کی گئی، یہ اس لیے کہ انہوں نے نافرمانی کی اور حد سے آگے بڑھتے تھے اور ایک دوسرے کو اس برائی سے، جو وہ کرتے تھے منع نہیں کرتے تھے ان کا کام کتنا برا ہے۔''

حضرت داوٗد علیہ السلام نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز وگداز کی لے میں کیا ہے۔ زبور ۷۸ میں ہے:

''اے میرے گروہ! میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منہ کی باتیں کان دھر کے سنو، تا کہ آنے والی پشت میں وہ فرزند جو پیدا ہوں، سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو نہ بھلا دیں، بلکہ اس کے حکموں کا تحفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں، نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے باوجود اس سب کے پھر انہوں نے گناہ کیے اور اس کے عجائب قدرتوں کے سبب اعتقاد نہ کیا لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے (خدا کے) ساتھ ریا کاری کی اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے، کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے، کتنی بار انہوں نے بیابان میں اس خدا سے بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا۔ تس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا، بلکہ برگشتہ ہوئے اور اپنے باپ دادوں کے مانند بے وفائی کی اور وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے۔''

زبور ۸۱ میں ہے:

''اے میرے لوگو! سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا، اے بنی اسرائیل! اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا، خداوند تیرا خدا میں ہوں، جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا، اپنا منہ کھول کہ اسے بھر دوں گا، پر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا تب میں نے ان کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔''

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤد علیہ السلام سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ تھے، حضرت داؤد علیہ السلام نے ان کے متعلق یہ بددعا کی:

''کہ تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے ساتھ نہیں رہ سکتا، وہ جو شیخی باز ہیں تیری آنکھوں کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکتے، تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے، تو ان کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کر دے گا، اے خداوند! اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ کو سیدھا کر، ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے اے خدا! تو انہیں ملزم جان، ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں، ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب سے نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔'' (زبور۔۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی انجیل میں بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

''اے ریا کار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پر بھیتر مردوں کی ہڈیوں سے اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہوئی ہیں، اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو پر باطن میں ریاکار اور شرارت سے بھرے ہو۔''

''اے ریاکار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں ان کے شریک نہ ہوتے، اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو، پس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو، اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔'' (متی ۲۳۔۲۷۔۳۳)

بعینہ یہی الزام قرآن نے بھی ان کو دیا ہے:

﴿ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۶۱)

''اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں، اس لیے کہ وہ نافرمان اور حد سے بڑھنے والے ہیں۔''

﴿ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنبِيَاءَ اللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۱)

''کہہ پھر کیوں اللہ کے نبیوں کو پہلے تم قتل کرتے رہے، اگر تم مومن تھے۔''

آل عمران میں اس سے بھی بڑھ کر ہر حق کے داعی اور خیر کے مبلغ کے قتل کر دینے کا ان پر بجا الزام ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴾ (۳/ آل عمران:۲۱)

''بے شک وہ لوگ جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے اور پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے اور ہر اس شخص کی زندگی کے دشمن بن جاتے ہیں جو ان کو عدل و نیکی کی بات سمجھاتا ہے، تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنادے۔''

سورۂ بقرہ اور آل عمران میں یہودیوں کے ایک ایک عیب کو کھول کھول کر بیان کیا گیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دین و ملت کا قوام کتنا بگڑ گیا تھا، ان کی مذہبی سنگدلی اور تعصب کا سب سے دردناک سانحہ وہ ہے جو اسلام سے ۵۰، ۶۰ برس پہلے یمن میں پیش آیا کہ یہودی حمیریوں نے نجران کے عیسائیوں کو گڑھوں میں آگ جلا کر ان میں جھونک دیا اور وہ کنارے بیٹھے اس حسرت ناک منظر کا تماشا دیکھتے رہے، چنانچہ قرآن مجید نے اس پر درد داستان کو ان لفظوں میں انہیں یاد دلایا:

﴿ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِۙ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِۙ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌۙ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌؕ۝ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِۙ۝ ﴾

(۸۵/ البروج:۴۔۸)

''گڑھے والے لوگ مارے گئے، بھڑکتی آگ کے گڑھے، جب وہ ظالم ان کے کنارے بیٹھے ایمان والوں کے ساتھ جو کر رہے تھے اس کو دیکھ رہے تھے، ان کا گناہ یہی تھا کہ وہ غالب اور خوبیوں والے خدا پر ایمان رکھتے تھے۔''

جزئیات کو چھوڑ کر کلی طریقہ سے ان میں حسب ذیل نقائص تھے:

① ان کو اپنے محبوب خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا، وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں، ہمیں قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا:

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔''

﴿ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۰)

''اور کہا، ہم کو دوزخ کی آگ ہرگز نہیں چھوئے گی، لیکن چند روز۔''

وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف انہی کے لیے خاص ہیں، قرآن نے کہا:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۴)

''کہہ دے کہ اگر آخرت کا گھر تمام لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے تو موت کی آرزو کیوں نہیں کرتے اگر تم سچے ہو۔''

وہ سمجھتے تھے کہ نبوت اور رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے، کسی دوسرے کا اس میں حق نہیں قرآن نے ان کے جواب میں کہا:

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ﴾ (۶۲/ الجمعة:۴)

''یہ خدا کی مہربانی ہے، وہ جس کو چاہے دے۔''

جو ان میں پڑھے لکھے عالم تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لیے اپنی باطل تاویلوں سے ادلتے بدلتے رہتے تھے اور اپنی تصنیفات اور اجتہادات کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے:

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ﴾ (۵/ المآئدة:۴۱)

''وہ لفظوں کو اپنی مناسب جگہوں سے ہٹا دیتے ہیں۔''

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾ (۲/ البقرة:۷۹)

''تو پھٹکار ہو ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، تاکہ وہ اس سے دنیا کا معمولی فائدہ اٹھائیں، تو پھٹکار ہے ان پر جو وہ لکھتے ہیں اور پھٹکار ہو ان پر جو وہ کماتے ہیں۔''

جو ان میں ان پڑھ اور جاہل تھے وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے:

﴿ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾

(۲/ البقرة:۷۸)

''اور ان میں بعض ان پڑھ ہیں، جن کو تورات کا علم نہیں، لیکن بناوٹی باتیں معلوم ہیں، وہ صرف ان کے خیالات ہیں۔''

احکام الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق حکم ہوتا، اس کو قبول کرتے اور دوسرے حکموں کو پس پشت ڈالتے:

﴿ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴾

(۲/ البقرة:۱۰۱)

''جن کو خدا کی کتاب دی گئی تھی، ان میں سے ایک فریق اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈالتا ہے گویا کہ وہ جانتا ہی نہیں۔''

﴿ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴾

(۲/ البقرة:۸۷)

’’کیا جب کوئی رسول تمہارے پاس وہ لے کر آیا جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے موافق نہ ہو، تم نے غرور کیا تو کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو مار ڈالتے ہو۔‘‘

ایک دفعہ جب آنحضرت ﷺ مدینہ تشریف لا چکے تھے اور یہود نے بھی آپ کی ملکی سرداری کو ایک گونہ قبول کر لیا تھا تو ایک زنا کا مقدمہ آپ ﷺ کی عدالت میں لائے، آپ نے پوچھا کہ ’’تمہارے مذہب میں اس جرم کی سزا کیا ہے؟‘‘ بولے ہم مجرم کو کوڑے مارتے ہیں اور اس کی تشہیر کرتے ہیں، آپ نے ان سے توراۃ طلب فرمائی جب وہ لائے تو اس جرم کے متعلقہ حکموں کی آیتوں کو پڑھ کر سنانے لگے تو بیچ سے سنگ ساری کا حکم چھپا دیا، مگر ایک نومسلم یہودی عالم نے اس حکم کو پڑھ کر بتا دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ’’خداوندا! میں پہلا شخص ہوں گا جو تیرے مردہ حکم کو زندہ کروں گا۔‘‘ [1]

آپس میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا، ان میں ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا تھا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے تھے، قرآن نے کہا:

﴿ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۵)

’’پھر تم ہی لوگ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے اور ایک گروہ کو ان کے گھروں سے نکالتے ہو اور ان کے برخلاف گناہ اور ظلم سے مدد کرتے ہو اور اگر وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ ان کا نکالنا تم پر حرام تھا، کیا تم کتاب کے کچھ حکموں کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔‘‘

② دوسری چیز مال و دولت کی حرص و طمع تھی اس کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوری پیدا ہو گئی تھی، کسی بڑے کام کی خاطر وہ اپنی راحت و آرام اور جسم و جان کو قربان نہیں کر سکتے تھے:

﴿ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۶)

’’ان کو سب لوگوں سے زیادہ زندگی کا لالچی پاؤ گے، مشرکوں سے بھی زیادہ، ان میں ایک ایک چاہتا ہے کہ اس کو ہزار برس کی زندگی ملے۔‘‘

عربوں کے ساتھ ان کے لین دین کے تجارتی تعلقات قائم تھے مگر وہ سخت نادہند تھے اور سمجھتے تھے کہ عربوں کے ساتھ جس طرح سختی اور بددیانتی کے ساتھ بھی برتاؤ کیا جائے وہ مذہباً منع نہیں، قرآن نے اس

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب احکام اهل الذمة واحصانهم اذا زنوا ورفعوا الى الامام: ٦٨٤١؛ مسلم، کتاب الحدود، باب رجم الیهود: ٤٤٤٠؛ ابوداود، کتاب الحدود، باب فی رجم الیهودیین: ٤٤٤٦، ٤٤٤٧۔

معاملہ میں عیسائی اہل کتاب کی تعریف کے بعد اسرائیل اہل کتاب کی نسبت فرمایا:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۷۵)

''کتاب والوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر ان کو ایک دینار بھی امانت رکھنے کے لیے دو، وہ تم کو اس وقت تک واپس نہ دیں، جب تک تم ان کے سر پر کھڑے نہ رہو، اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ان جاہل عربوں کا ہم پر حق نہیں اور وہ جان بوجھ کر خدا پر جھوٹ بولتے ہیں۔''

توراۃ میں ''اپنے بھائی'' کے علاوہ ''اجنبی'' سے سود لینے کی اجازت کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ یہود یہود سے نہ لے اور اہلِ عرب جو یہود نہ تھے ان سے بھاری سے بھاری شرح سے سود وصول کرنا جائز سمجھتے تھے اور تعجب پر تعجب یہ تھا کہ ان کے علما ان کو اس سے باز نہیں رکھتے تھے، اس حرام خوری اور ان کے علما کی اس خاموشی پر ان کو قرآن نے بار بار ٹوکا:

﴿ وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُونَ فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ لَوْلَا يَنْهَاهُمُ الرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْإِثْمَ وَأَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۚ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۶۲، ۶۳)

''اور ان میں سے بہتوں کو تو دیکھے گا کہ وہ گناہ اور ظلم کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں ان کے کرتوت کتنے برے ہیں ان کے درویش اور عالم گناہ کی بات بولنے اور حرام کھانے سے کیوں باز نہیں رکھتے ان کے کام درحقیقت کتنے خراب ہیں۔''

﴿ سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲)

''جھوٹ کو سننے والے اور حرام کو کھانے والے ہیں۔''

﴿ وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ ﴾ (۴/ النسآء:۱۶۱)

''اور ان کے سود لینے کے سبب سے، حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کا مال ناجائز طریقوں سے کھا جانے کی وجہ سے۔''

اسی لیے وہ تورات کی آیتوں میں تحریف اور ان کے معنوں میں تاویل کر کے ایسے فقہی حیلے تراشتے تھے کہ وہ ہر حکم کو اپنے مطلب کے مطابق بنا لیتے تھے، خدا نے فرمایا:

﴿ إِنَّا أَنْزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِنْ كِتَابِ اللَّهِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۴)

''ہم نے تورات اتاری، جس میں ہدایت اور روشنی ہے، اسی کے مطابق نبی جو تابعدار تھے، یہودیوں کا فیصلہ کرتے تھے، اور ان کے درویش و عالم بھی خدا کی کتاب کے جن حصوں کو انہوں نے بچار کھا تھا، ان میں سے فیصلہ کرتے۔''

اس کے بعد اس کے احکام کے اجرا اور خاص کر قصاص کا ذکر کیا اور فرمایا:

﴿ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٤٤)

''اور جو خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی لوگ کافر ہیں۔''

ان میں مشرکانہ بت پرستی کے بھی بعض اثرات پیدا ہو گئے وہ جبت اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا تھے قرآن ان کو خطاب کر کے کہتا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ... اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ ﴾ (٤/ النسآء:٤٧۔٤٨)

''اے کتاب والو! ہم نے جو اتارا وہ تمہاری کتاب کی تصدیق کرتا ہے، اس پر ایمان لاؤ بے شک خدا شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے معاف کر دے۔''

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٥١)

''کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا، وہ بتوں اور شیطانوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کافر مسلمانوں سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔''

اوہام و خرافات پر ان کا ایمان تھا، تعویذ، گنڈا، جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی تعلیم ہے (بقرہ) لبید اعصم وغیرہ مدینہ میں بہت سے عامل تھے، جو کنگھیوں اور بالوں میں منتر پڑھ کر پھونکتے تھے۔ [1]

عرب سے باہر یہودی، یونانیوں اور رومیوں کی حکومتوں میں یورپ، افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں اور شہروں میں اس طرح پراگندہ اور منتشر تھے کہ عرب سے باہر دنیا کی قوموں میں ان کا کوئی شمار نہ تھا عرب کے اندر جو یہود زمانۂ دراز سے آباد تھے ان کا بڑا شغل زراعت اور تجارت تھا، سودی کاروبار کرتے تھے، غریب عربوں کو اپنے گراں شرح سود اور قرضوں کے بار میں اسی طرح دبائے تھے کہ ان کی حالت ان کے سامنے غلاموں کی سی تھی اس سلسلہ میں صرف ایک واقعہ کا ذکر پوری حالت کے اندازہ کے لیے کافی ہوگا:

محمد رضی اللہ عنہ بن مسلمہ انصاری اور ان کے رفقا جو مدینہ کے یہودی سردار کعب بن اشرف کے قتل پر مامور ہوئے تھے وہ اس سے ملنے اور بات چیت کرنے گئے انہوں نے اس سے کہا، اے کعب! اس شخص محمد (رسول

[1] صحیح بخاری، کتاب الطب، باب السحر:٥٧٦٣۔

اللہ ﷺ) نے تو صدقہ وصول کر کر کے ہم کو دق کر ڈالا اب میں تم سے کچھ قرض لینے آیا ہوں اس نے کہا، خدا کی قسم! مجھے معلوم تھا کہ تم اس سے آخر بے زار ہو جاؤ گے۔ انہوں نے کہا، میں نے اس کی پیروی اختیار کی ہے لیکن اس کو چھوڑ نا نہیں چاہتا انتظار ہے کہ معاملہ کی صورت کس رخ پلٹتی ہے میں تم سے کچھ غلہ قرض لینے آیا ہوں۔ اس نے کہا، مگر تم کفالت میں کیا چیز رہن رکھو گے؟ انہوں نے کہا تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، اپنی بیویاں گروی رکھو! انہوں نے جواب دیا ہم اپنی بیویاں گروی کیسے رکھ سکتے ہیں کہ تمام عرب میں تمہارے حسن کا جواب نہیں۔ بولا، اچھا تو اپنے لڑکوں کو گروی رکھو کہا، ہم اپنے لڑکوں کو گروی کیسے رکھیں، ان کی کوئی بے عزتی نہ کرے، یہ ہمارے لیے بڑی شرم کی بات ہے، ہاں ہم اپنے ہتھیار گروی رکھ سکتے ہیں۔ [1]

اس سوال و جواب سے اندازہ ہوگا کہ یہود کی اخلاقی حالت کتنی پست اور ذلیل ہو چکی تھی، کوئی غیر عورت اگر ان کے بازار کی طرف جا نکلتی تو اس کی عزت بچنی مشکل ہو جاتی تھی۔ [2] کسی بچہ کو معمولی سے زیور کے لالچ میں، موقع پاتے تو بے دردی سے قتل کر کے زیور اتار لیتے۔ [3] علما اور پیشوایانِ دین کی وہی کیفیت تھی جس کا ماتم اس وقت سے چھ سو برس پیشتر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا۔ لفظی موشگافیوں اور ظاہری دین داری کے سوا روح و اخلاق کا جوہر ان سے کھو گیا تھا اسلام جو ابراہیم حنیف کے ترانۂ توحید اور موسیٰ علیہ السلام کی صدائے طور کی آواز بازگشت تھا وہ ان کے نزدیک عرب کے بت پرستوں کے جاہلانہ مذہب سے زیادہ برا تھا وہ کہتے تھے کہ ''ان مسلمانوں سے یہ مشرک زیادہ راہِ راست پر ہیں۔'' (٤/ النسآء: ٥١) اسلام کی اس مصالحانہ دعوت:

﴿ قُلْ يَٰٓأَهْلَ الْكِتَٰبِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ﴾ (٣/ آل عمران: ٦٤)

''اے کتاب والو! آؤ اس ایک بات پر ہم سب متحد ہو جائیں، جو ہم میں تم میں مشترک ہے، ہم خدا کے سوا کسی کو اپنا معبود نہ بنائیں اور نہ ہم خدا کو چھوڑ کر ایک دوسرے کو اپنا رب بنائیں۔''

میں بھی عداوت اور دشمنی ہی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اس لیے مدینہ میں اسلام کی صلح کی ہر کوشش کو وہ ٹھکراتے رہے کیونکہ روحانی عظمت کے مقابلہ میں اس دعوت کے قبول میں ان کو اپنی قومی و مالی و تجارتی عظمت کی بربادی نظر آتی تھی۔

عیسائیوں کی نقل میں وہ بھی عزیر (عزرا) کو خدا کا بیٹا کہتے تھے: ﴿ وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ ﴾ (٩/ التوبة: ٣٠) اپنی دولت و ثروت کے غرور میں وہ کہتے تھے: ﴿ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ ﴾ (٥/ المآئدة: ٦٤) ''خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔'' قرآن کی دعوت کے جواب میں کہتے تھے کہ ہم پر اس دعوت کا اثر نہیں

[1] صحیح بخاري، کتاب المغازي، قتل کعب بن الاشرف: ٤٠٣٧۔ [2] دیکھو کتب سیر میں غزوۂ بنی نضیر کے اسباب۔ علامہ شبلی نے سیرۃ النبی حصہ اول پر غزوہ بنوقینقاع کے اتفاقیہ سبب کے پیش آنے کا ایک واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ایک انصاری کی بیوی نقاب پوش یہودی کی دکان میں آئی تو یہودیوں نے اس کی بے حرمتی کی ایک مسلمان نے غیرت سے بے تاب ہو کر یہودی کو قتل کر ڈالا۔ ممکن ہے کہ سید صاحب نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہو۔ [3] صحیح بخاري، کتاب الدیات، باب من اقاد بالحجر: ٦٨٧٩۔

ہوسکتا کہ ہمارے دل نامختون ہیں: ﴿ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ﴾(۲/ البقرۃ:۸۸) ان فقروں سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اب دنیا میں نیابتِ الٰہی کے منصب کے قابل نہیں رہے تھے۔

عرب کے باہر یہودیوں کی پراگندہ ٹولیاں مختلف سلطنتوں کے سایہ میں پناہ گزین تھیں ان کا مذہبی مرکز ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا سیاسی اہمیت وہ مدت ہوئی کھو چکے تھے ان کے مذہبی فرقوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جن میں باہمی عداوت قائم تھی اور اس وقت سے چھ سو برس پہلے کی طرح بنی اسرائیل اب پھر ایک نبی اعظم کی بعثت کا بے تابانہ انتظار کررہے تھے (بقرہ) خود عرب میں یہود اس وقت اس نبی کے جلد پیدا ہونے کی بشارت کا اپنی مجلسوں میں تذکرہ کرتے رہتے تھے جس کی پیشین گوئیوں سے تورات کے صفحے بھرے تھے اور انہیں سے سن کر یثرب کے اوس وخزرج ایک نبی کی آمد کی پیشین گوئیوں سے باخبر تھے۔ [1]

دنیا کی ان مختلف قوموں کے حالات پر ایک اجمالی نظر ڈالنے کے بعد ضرورت ہے کہ اس قوم کے حالات پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائے جس کے وطن کے افق سے نبوت کی صبحِ سعادت طلوع ہونے والی تھی۔

---

[1] سیرت ابن ہشام ذکر بیعت عقبہ ، جزء اوّل ، ص:۲۵۹۔

ظہور اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت

یمن میں جب وہ مشہور سیلاب آیا جس کی بلندی سطح زمین سے ایک سو بیس فٹ تھی، تو اس کا پائے تخت مآرب اور اس کے اضلاع دفعتہً تباہ و برباد ہو گئے، یہ دوسری صدی عیسوی کا واقعہ ہے۔ [1] قرآن مجید نے اسی سیلاب کو سیلِ عرم کہا ہے، اس سیلاب کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ بڑے بڑے خاندان جلا وطن ہو کر ادھر ادھر نکل گئے، جس سے نظام سلطنت میں ضعف آ گیا۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں کے فرمانروا ذونواس سے جو مذہباً یہودی تھا، رعایا نے بغاوت کی اور شاہِ حبش سے اعانت چاہی، اس نے ۵۲۹ء میں ایک فوج بھیجی جس نے ذونواس کو معزول کر دیا اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۶۰۳ء میں قبیلہ حمیر کے ایک با حوصلہ شخص ذویزن نے فارس کی مدد سے اپنا ملک واپس لیا لیکن چند روز کے بعد وہ قتل کر دیا گیا اور یمن شہنشاہی فارس کا ایک معمولی صوبہ رہ گیا۔

جو قبیلے یمن سے نکلے، ان میں سے ایک نے دوسری صدی عیسوی میں حیرہ میں جہاں اب کوفہ آباد ہے ایک سلطنت قائم کی لیکن وہ فارس کے زیر اثر اور مذہبی خیالات میں مجوس سے متاثر تھی، دوسرا قبیلہ شام میں جا کر آباد ہوا جو غسانی خاندان کہلاتا ہے۔ [2] چونکہ یہ خاندان رومیوں کے زیر اثر تھا اس لیے رفتہ رفتہ وہ عیسائی ہو گیا اور اسلام کے زمانہ تک عیسائی رہا۔

غرض عرب کے اصلی تمدن پر بیرونی اثر جو کچھ پڑا تھا وہ مجوسیت یا نصرانیت کا تھا یہودی معتقدات اور خیالات کا اثر بھی بہت کچھ تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کا ایک بڑا حصہ یعنی وادی القریٰ اور خیبر و فدک تمام تر یہودی آبادیاں تھا اور خود مدینہ میں یہودی ہی صاحب اقتدار اور صاحب حکومت تھے باقی تمام ملکوں میں مشرکانہ رسوم جاری اور جاہلانہ مذاہب پھیلے ہوئے تھے، لوگ بتوں، پتھروں، درختوں، ستاروں، فرشتوں اور جنوں کی پرستش کرتے تھے۔

خدا کا اعتقاد

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ عرب زمانۂ دراز سے ایک خدائے برتر پر اعتقاد رکھتے تھے، آج کل عرب کے جو قدیم کتبات دستیاب ہوئے ہیں ان پر اللہ کا لفظ خدا کے معنی میں لکھا ہوا ہے، البتہ اس کا املا اللہ نہیں بلکہ ھلّہ ہے۔ عربِ شمال کے عرب جو نابتی کہلاتے ہیں ان کے ناموں کے ساتھ اللہ کا لفظ بھی شامل ہوتا تھا، مثلاً زید الٰہی عبد الٰہی [3] خود قرآن مجید میں خدا کفار کی نسبت کہتا ہے:

---

[1] اس بند کے انہدام کی تاریخ کی تعیین مشکل ہے اور اسی لیے اس کی تعیین میں کئی نظریے ہیں ایک اس کو دوسری صدی عیسوی کا واقعہ بتاتا ہے تو دوسرا پانچویں صدی عیسوی کا، اصلیت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس بند کے مختلف حصے مختلف زمانوں میں منہدم ہوتے رہے اور بنتے رہے آخری دفعہ پانچویں صدی عیسوی میں بالکل برباد ہو گیا۔ (سلیمان)

[2] اکثر علمائے انساب کا بیان یہی ہے کہ یہ قبائل یمن سے آئے تھے لیکن میں نے ارض القرآن میں بدلائل اس سے اختلاف کیا ہے۔ (سلیمان) دیکھیے حصہ اول زیر عنوان سبا و حمیر۔ ''ص''

[3] مذاہب و اخلاق کی انسائیکلوپیڈیا، جلد اول، صفحہ: ۶۶۴ بحوالہ پروفیسر نولدیکی۔

﴿ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۭ ﴾ (۳۱/ لقمان:۲۵)

''اور اگر تم ان سے پوچھو کہ آسمان اور زمین کس نے پیدا کیا ہے تو وہ بول اٹھیں گے کہ خدا نے۔''

یہ اصل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم تھی لیکن رفتہ رفتہ شرک کا اعتقاد پیدا ہوا یعنی یہ کہ خدائے اعظم کے سوا اور بھی چھوٹے چھوٹے خدا ہیں، گو اللہ ان میں سب سے بڑا ہے، یہ اعتقاد اس قدر راسخ ہو گیا کہ اور معبودوں کے انکار سے ان کو اس قدر رنج ہوتا تھا جس قدر خود خدا کے انکار سے ہو سکتا تھا بلکہ چونکہ ان کے نزدیک دنیا کا کاروبار اور روزمرہ کی ضرورتیں انہی چھوٹے چھوٹے خداؤں سے انجام پاتی تھیں اور کام اکثر انہیں خداؤں سے پڑتا تھا اس لیے اللہ کا خیال کچھ یوں ہی سا رہ گیا، انہی خداؤں کی پرستش کرتے تھے، انہی پر قربانی چڑھاتے تھے، انہی سے حاجتیں مانگتے تھے، اللہ تو زمین وآسمان بنا کر بیکار سا ہو چکا تھا، جو کچھ کرتے تھے یہی خدایان اصغر کرتے تھے، یہی سبب تھا کہ کوئی شخص اللہ کا خالی نام لیتا تھا تو لوگ بہت کبیدہ ہوتے تھے:

﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۴۵)

''اور جب خالی اللہ کا نام لیا جاتا ہے تو یہ لوگ، جو کہ قیامت کے معتقد نہیں ہیں، ناک بھوں چڑھاتے ہیں، لیکن جب خدا کے سوا اوروں (معبودوں) کا بھی ذکر کیا جائے تو وہ دفعتہً کھل جاتے ہیں۔''

اور سمجھتے تھے کہ ان چھوٹے معبودوں کی نذر ونیاز وقربانی سے خدا خوش رہے گا اور وہ اس کے دربار میں سفارش کریں گے۔ چنانچہ وہ کہتے تھے:

﴿ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۭ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳)

''ہم ان بتوں کو اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو خدا کے قریب کر دیں۔''

ملائکہ کی الوہیت: شرک کے علاوہ خدائے اعظم کی نسبت یہ مانتے تھے کہ اس کے بال بچے بھی ہیں، چنانچہ فرشتوں کو وہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰۗىِٕكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۲۷)

''جو لوگ قیامت پر ایمان نہیں لاتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے ہیں۔''

﴿ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۲۱، ۲۲)

''تمہارے تو لڑکے ہوں اور خدا کے لڑکیاں! یہ تو کچھ اچھی تقسیم نہیں۔''

اس لیے جس طرح بعض یہود عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی کا مستحق سمجھتے تھے وہ فرشتوں

کو خدا کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے بھی قائل تھے:

﴿ وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا ﴾ (۳/ آل عمران:۸۰)

''اور نہ تو خدا تم کو اس کا حکم دیتا ہے کہ فرشتوں اور پیغمبروں کو خدا ٹھہراؤ۔''

﴿ وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُبِينٌ ۝ أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُمْ بِالْبَنِينَ ۝ .... وَجَعَلُوا الْمَلَٰٓئِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ۝ وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ ۗ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۱۵۔۱۶۔۱۹۔۲۰)

''اور ان مشرکوں نے خدا کے بندوں میں سے خدا کا ایک حصہ بنایا، بے شک انسان کھلا نافرمان ہے کیا خدا جو پیدا کرتا ہے وہ اپنے لیے لڑکیاں لے اور تم کو لڑکے دے کر عزت دے اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں لڑکیاں قرار دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت موجود تھے ان کی گواہی لکھی اور باز پرس کی جائے گی اور کہتے ہیں اگر خدا نہ چاہتا تو ہم ان کی پرستش نہ کرتے۔''

﴿ فَاسْتَفْتِهِمْ أَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُونَ ۝ أَمْ خَلَقْنَا الْمَلَٰٓئِكَةَ إِنَاثًا وَهُمْ شَاهِدُونَ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ مِنْ إِفْكِهِمْ لَيَقُولُونَ ۝ وَلَدَ اللَّهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۴۹۔۱۵۲)

''تو ان سے پوچھ کہ کیا تیرے رب کی لڑکیاں ہوں اور ان کے لڑکے ہوں، کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں پیدا کیا، وہ حاضر تھے، ہاں یہ ان مشرکوں کی بناوٹ ہے، وہ کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہوئی اور وہ جھوٹے ہیں۔''

ان کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ یہ فرشتے خدا کے ہاں اپنے پرستاروں کے سفارشی بنیں گے۔ خدا نے اس کی تردید میں کہا:

﴿ وَكَمْ مِنْ مَلَكٍ فِي السَّمَاوَاتِ لَا تُغْنِي شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا ﴾ (۵۳/ النجم:۲۶)

''اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں کہ ان کی سفارش خدا کی اجازت کے بغیر کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔''

قیامت میں فرشتوں سے پرسش ہوگی کہ یہ مشرک تمہاری پوجا کرتے تھے:

﴿ يَقُولُ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ أَهَٰٓؤُلَاءِ إِيَّاكُمْ كَانُوا يَعْبُدُونَ ۝ ﴾ (۳۴/ سبا:۴۰)

''پھر خدا فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ انسان تمہیں کو پوجتے تھے۔''

جنات کی الوہیت

فرشتوں کی طرح وہ جنات کو بھی خدا کے عزیز وقریب سمجھتے تھے اور خدا کے ان سے رشتے لگاتے تھے۔

﴿ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۵۸)

''اور مشرکوں نے خدا اور جنوں کے درمیان رشتہ داری بنادی۔''

اس لیے وہ جنات کو خدا کی خدائی کا شریک کرتے تھے:

﴿ وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ﴾

(۶/ الانعام:۱۰۰)

''اور انہوں نے جنوں کو خدا کا شریک بنایا اور وہ خدا کی مخلوق ہیں اور بن جانے خدا کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑیں۔''

اور جب وہ خدا کے رشتہ دار اور خدائی کے شریک ٹھہرے تو ان کی عبادت اور پرستش بھی ضروری تھی چنانچہ جاہلیت میں اہلِ عرب ان جنوں کو بھی پوجا کرتے تھے [1] ﴿ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ﴾ (۳۴/ سبا:۴۱) ''بلکہ یہ جن کو پوجتے تھے اور ان میں سے اکثر انہیں پر ایمان رکھتے تھے۔'' مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں کے جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے، قرآن میں ہے: ﴿ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ﴾ (۷۲/ الجن:۶) ''اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا تھا۔'' چنانچہ بعض مقامات میں خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی اور ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں (مکان الدراہم) پر جانور ذبح کرکے چڑھائے جاتے تھے، تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ [2] قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی پوجا کرتی تھی اور کلبی کا بیان ہے کہ انہیں کے متعلق یہ آیت اتری ہے: [3]

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۹۴)

''خدا کو چھوڑ کر تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری ہی طرح بندے ہیں۔''

بت پرستی

جن خداؤں کو یہ لوگ مانتے تھے ان کے بت بنا لیے تھے اور جا بجا عظیم الشان بت کدے قائم ہوگئے تھے۔ یہ رواج اس قدر عام ہوگیا تھا کہ جہاں کوئی خوبصورت پتھر مل گیا، اٹھا لیا اور اس کی پرستش شروع کردی، زیادہ خوبصورت مل گیا تو اس کو پھینک دیا اور اس کی پرستش کرنے لگے، جہاں کوئی پتھر ہاتھ نہ آیا خاک کا ایک تودہ بنالیا ایک بکری لا کر اس کا دودھ اس پر دھویا پھر اس کے گرد طواف کیا اور اب وہ ایک معبود بن جاتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب المغازی باب وفد بنی حنیفہ:۴۳۷۶ میں یہ پوری تفصیل مذکور ہے۔

[1] صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قولہ تعالیٰ: اولئك الذین یدعون یبتغون الی ربهم الوسیلة:۷۵۵۴ تا ۷۵۵۷۔

[2] لسان العرب لفظ سکن، ج ۲، ص:۱۷۴۔ [3] کتاب الاصنام ہشام الکلبی مطبوعہ مصر، ص:۳۴۔

اس بت پرستی کی ابتدا یوں ہوئی کہ قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحی تھا اور جو قبیلہ جرہم کو شکست دے کر کعبہ کا متولی بن گیا تھا ایک دفعہ بلقاء گیا اور وہاں لوگوں کو بت پرست دیکھ کر بت پرستی کی طرف مائل ہوا اور وہیں سے ایک بت لا کر کعبہ میں نصب کیا چونکہ اس کا اثر تمام عرب پر تھا اس لیے تمام عرب نے بت پرستی قبول کر لی اور گھر گھر بت خانے بن گئے۔ ان میں ہبل سب سے بڑا تھا، اس سے اتر کر منات، لات اور عزیٰ تھے۔ منات مدینہ منورہ سے سات میل پر تھا، انصار کے قبیلے یعنی اوس و خزرج اور آس پاس کے قبائل اسی کا حج کرتے تھے کعبہ کا حج بھی جب یہ لوگ کرتے تھے تو احرام یہیں آ کر اتارتے تھے، حلفیہ معاہدے بھی یہیں ہوتے تھے، عبدالعزیٰ مزنی کہتا ہے: ❶

انی حلفت یمین صدق برۃ بمناۃ عند محل آل الخزرج

''میں نے منات کی سچی قسم کھائی اہل خزرج کے احرام اتارنے کی جگہ کے پاس۔''

لات قبیلہ ثقیف کا معبود تھا جو مقامِ طائف میں نصب تھا اہل طائف اس کو کعبہ کے برابر تسلیم کرتے تھے۔ عزیٰ ایک درخت تھا اس کے پاس ایک بت تھا یہ قبیلہ غطفان کا بت تھا لیکن قریش بھی اس کی نہایت عزت کرتے تھے اور اس کی زیارت کو جاتے تھے۔ قریش جب کعبہ کا طواف کرتے تھے تو یہ پڑھتے تھے: ❷

وَاللَّاتَ وَالْعُزّٰى وَمَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى اِنَّهُنَّ الْغَرَانِيْقَ الْعُلٰى وَاَنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى۔

''لات، عزیٰ اور تیسرا مناۃ یہ بڑے برگزیدہ ہیں اور ان کی سفارش کی خدا کے ہاں امید ہے۔''

بت پرستی نے رفتہ رفتہ اور بہت سی برائیاں پیدا کر دیں، جانوروں سے گزر کر انسانی قربانیاں چڑھائی جانے لگیں، آنحضرت ﷺ کے جد امجد عبدالمطلب نے جو اپنے صاحب زادہ عبداللہ کی قربانی کرنی چاہی تھی اسی کہنہ رسم کی تقلید تھی۔

بحیرہ سائبہ، حام کے نام سے بتوں کے نام پر سانڈ چھوڑتے تھے، کعبہ کے سامنے جو قربانی کرتے تھے اس کا خون کعبہ کی دیواروں پر ملتے تھے۔ ❸ بتوں کے سامنے شگون کے تیر رہتے تھے، ان میں سے ایک پر ''ہاں'' ایک پر ''ناں'' لکھا رہتا تھا جو کام کرنا چاہتے پجاری سے کہتے فال نکالے، ہاں کا تیر نکلتا تو اس کو کرتے ورنہ باز رہتے۔

جاہلیت میں جن چیزوں کی پرستش کی جاتی تھی وہ مختلف قسموں کی تھیں اصنام و اوثان، انصاب اور بیوت۔ اصنام و اوثان جن کا واحد صنم اور وثن ہے یہ انسانی شکل وصورت کے بت تھے، اگر وہ لکڑی کے ہوتے تو بغیم کہلاتے اور اگر رنگ اور مسالے سے بنتے تو ان کو دمیہ کہتے، انصاب اور نصب بن گھڑے پتھر ہوتے

❶ یہ پوری تفصیل معجم البلدان لفظ مناۃ، ج ۸، ص: ۱۶۷، ۱۶۸ میں ہے۔

❷ معجم البلدان لفظ لات، ج ۶، ص: ۱٦٦ و کتاب الاصنام للکلبی، ص: ۱۹۔

❸ نیل المرام فی تفسیر آیات الاحکام، ص: ۱۱۰، ۱۱۱۔

تھے جن کو کھڑا کر کے ان پر چڑھاوے چڑھاتے اور جانور ذبح کرتے تھے۔ بیوت جس کا واحد بیت ہے چند گھر تھے جیسے رضا، رئام، قلیس وغیرہ جن میں بت پرستانہ رسوم ادا کیے جاتے تھے جن بتوں کے اردگرد چکر لگاتے تھے ان کو دوار کہتے تھے اور ان پر جو قربانی کی جاتی اس کو عتیرہ کہتے تھے پتھروں کا ڈھیر لگا کر اس کے چاروں طرف چکر لگاتے تھے اس ڈھیر کو رجمہ کہتے تھے۔ جاہلی شاعر کہتا ہے:

کماطاف بالرجمة المرتجم

''جیسے پتھروں کے ڈھیر کا طواف کرنے والا طواف کرے۔'' [1]

جن بتوں کی پرستش کی جاتی تھی انکی کوئی انتہا نہ تھی۔

ع قبیلہ قبیلہ کا بت اک جدا تھا۔

خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو ساٹھ ۳۶۰ بت تھے [2] ان میں سے قرآن پاک میں جن کے نام بتائے گئے ہیں وہ یہ ہیں (۱) لات (۲) عزیٰ (۳) منات (۴) یغوث (۵) یعوق (۶) نسر (۷) ود (۸) سواع (۹) بعل۔ لیکن جاہلیت کے پرانے مؤرخوں اور لغت نویسوں نے جاہلیت کے شخصی ناموں اور شعرا کے اشعار سے بہت سے نام ذکر کیے ہیں ہشام کلبی کی کتاب الاصنام میں جو اس موضوع پر پہلی کتاب ہے اور جواب مصر میں چھپ بھی گئی ہے تقریباً تیس ۳۰ بتوں کے نام ہیں علامہ ذکی پاشا جنہوں نے کلبی کی اس کتاب کو ۱۳۴۳ھ/ ۱۹۲۴ء میں تحشیہ اور تکملہ کے بعد شائع کیا ہے، اپنے تکملہ میں چھیالیس نام اور بڑھائے ہیں یمن اور حجاز میں آثارِ قدیمہ کے محققوں نے عہدِ جاہلیت کے جو کتبے پڑھے ہیں ان میں المقہ، عشتار، نکرہ، قینان وغیرہ بہت سے اور ناموں کا پتہ لگایا ہے، میں نے ارض القرآن کی دوسری جلد میں جو ۱۳۳۶ھ/ ۱۹۱۸ء میں چھپی ہے، ان معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔

ذیل میں ہم ان بتوں کی فہرست درج کرتے ہیں جن کے نام اب تک معلوم ہو چکے ہیں:

بتوں کے نام	قبیلوں کے نام جو ان کو خاص طور سے پوجتے تھے
لات	ثقیف۔
عزیٰ	قریش و بنوشیبان بن جابر۔
مناۃ	اوس و خزرج اور عام عرب۔
یغوث	بنومذحج اور اہل جرش۔
یعوق	بنوہمدان اور اہل خیوان۔

[1] ان الفاظ کے لیے دیکھو لسان العرب۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ الرایة...... :۴۲۸۷۔

نسر	حمیر۔
ودّ	بنوکلب۔
سواع	بنولحیان۔
اساف	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
نائلہ	بت، جس پر حج میں قربانی ہوتی تھی۔
اقیصر	قضاعہ ولخم وجذام وعاملہ وغطفان۔
باجر	ازدوطی وقضاعہ۔
ذوالخلصہ	بنوامامہ، خثعم، بجالہ، ازدوالسراۃ۔
رضا یا رُضی	بنوربیعہ کا بت خانہ۔
رُمام	حمیر کا بت خانہ۔
سبحہ	
سعد	بنی ملکان بن کنانہ۔
سعیر	عنزہ۔
ذوالشریٰ	بنوحارث۔
عائم	ازدوالسراۃ۔
عم انس یا عمیانس	خولان۔
فلس	طی۔
ذوالکفین	بنودوس۔
مناف	قریش۔
نہم	مزنیہ۔
ہبل	قریش۔
بعل	قبائل بنی عدنان۔
یغوب	حدیلہ (بنی طی)۔
اشہل	بنوعبدالاشہل۔
اوال	بکروتغلب۔

بس	غطفان کا بت خانہ۔
بعیم	ایک لکڑی کا بت۔
بلج	ایک بت۔
جیہ	ایک بت۔
جُرَیش یا جَرِیش	ایک بت جس کی طرف عبد جریش کی نسبت ہے۔
جلسد	ایک بت کا نام۔
جہار	ہوازن کا معبود۔
دار	بنو عبد الدار۔
دوار	ایک بت کا نام۔
ذوالرجل	حجاز کا ایک بت۔
شارق	ایک بت کا نام جس کی طرف عبد الشارق کی نسبت ہے۔
شمس	بنو عبد شمس۔
صدا	عاد کا بت۔
صمودا	عاد کا بت۔
ضمار	عباس بن مرداس سلمی کا قبیلہ۔
ضیزن	منذر اکبر۔
عبعب	قضاعہ۔
عوض	بکر بن وائل۔
عوف	ایک بت کا نام۔
غبغب	اس پر جانور ذبح کیے جاتے تھے۔
فراض	سعد العشیرہ۔
کثریٰ	جدیس وطسم۔
کسعہ	ایک بت کا نام۔
محرق	بکر بن وائل۔
مدان	عبد المدان۔
مرحب	حضر موت۔

منہب	ایک بت کا نام۔
ہبا	عاد۔
ذات الودع	ایک بت کا نام۔
یا لیل	عبد یا لیل۔

ستارہ پرستی

عرب میں ستارہ پرستوں کا بھی ایک گروہ تھا، مختلف قبیلے مختلف ستاروں کی پوجا کرتے تھے ان میں سب سے اہم سورج اور چاند تھے، اسی لیے قرآن پاک نے خصوصیت کے ساتھ کہا:

﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدة:۳۷)

''نہ سورج کو سجدہ کرو نہ چاند کو۔''

یمن میں سبا کی قوم سورج ہی کو دیوی مانتی تھی (۲۷/ النمل:۲۴) یمن کے بادشاہ شمر یرعش نے سورج دیوی کا مندر بنوایا تھا۔ [1] سورج اور چاند کے بعد ستاروں میں شعریٰ کی بڑی قدر و منزلت تھی، اس لیے قرآن پاک نے کہا:

﴿ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ۙ ﴾ (۵۳/ النجم:۴۹)

''اور وہی خدا شعریٰ کا مالک ہے۔''

صاعد اندلسی المتوفی ۴۶۲ھ نے اپنی کتاب طبقات الامم میں عرب کے حسب ذیل قبیلوں کو مختلف ستاروں کا پرستار بتایا ہے قبیلہ حمیر سورج کو پوجتا تھا، کنانہ چاند کو، تمیم دبران کو، لخم اور جذام مشتری کو، طی سہیل کو، قیس شعری العبور کو اور اسد عطارد کو۔ [2]

جن اور شیاطین اور بھوت پلیت

جن اور شیاطین کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے وہ جن اور شیاطین بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے گو اختلاف صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے، جو اجنۃ جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں یا لباس بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مؤنث بھی۔

عبید بن ایوب الغبری

وغولا قفرة ذكر وانثى   كان عليهما قطع البجاد

''اور بیابان کے دو غول مرد اور عورت بھی گویا ان دونوں پر کمل کے ٹکڑے پڑے ہیں۔''

[1] تاريخ ملوك الارض حمزة اصفهانى، ص:۱۱ كلكته۔ [2] طبقات الامم قاضى صاعد اندلسى، ص:۴۳ بيروت۔

مونث کو سعلاۃ کہتے تھے:

ازل وسعلاۃ وغول بقفرة اذا اللیل واری الجن فیه ارنّت

''میں پھسلتا ہوں اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی تھی تو اس میں بھوت آواز دیتے تھے۔''

عمرو بن یربوع ایک ممتاز شخص تھا، اس نے سعلاۃ سے نکاح بھی کیا تھا اور اس سے اولاد بھی ہوئی تھی راجز کہتا ہے:

یا قاتل اللہ بنی السعلاۃ۔ ''خدا سعلاۃ کے فرزندوں کو مارے۔''

بلقیس ملکۂ یمن (ان کے زعم میں) سعلاۃ ہی کے پیٹ سے تھی۔

یہ اکثر گاتے بجاتے تھے اور اہل عرب ان کے نغموں سے محظوظ ہوتے تھے:

کم حببت دونك من بهماء مظلمة تیه اذا ما مغنّی جنه سمرا

''کتنی اندھیری گھپ راتوں میں، میں نے صحرا کو قطع کیا جب وہاں کے جنات کا مغنی افسانہ گوئی کر رہا تھا۔''

یہ صحرا نشین بدوؤں کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ جاڑوں میں جب بدو آگ جلا کر بیٹھتے تھے یہ بھی آگ تاپنے کو آ جاتے تھے، لیکن جب ان کو کھانے پر بلاتے تھے تو وہ عذر کرتے تھے کہ ہم آدمیوں کی غذا نہیں کھا سکتے۔

اتوا ناری فقلت ممنون انتم فقالوا الجن قلت عموا ظلما

دعوت الی الطعام فقال منهم زعیم نحسد الانس الطعامَا

''وہ لوگ رات کو میرے پاس آئے تو میں نے کہا: تم کون ہو؟ انہوں نے کہا: ہم جن ہیں، میں نے کہا: اس تاریکی میں خوش رہو۔ میں نے ان کو کھانے کے لیے بلایا تو ان میں سے ایک سردار نے کہا ہم انسان کے کھانے پر حسد کرتے ہیں۔''

یہ زیادہ تر جہاں آباد تھے ان موضعوں کے نام بدی بقار اور عبقر تھے:

ع: جن البدی رواسیا اقدامها ''بدی کے جن، جن کے قدم جمے تھے۔''

ع: تحت السنور جنة البقار ''زرہوں کے نیچے بقار کے بھوت تھے۔''

ع: علیهن فتیان کجنة عبقر

''اوران پر شہسوار جوان عبقر کے بھوت معلوم ہوتے تھے۔''

ان کے اقسام حسب ذیل تھے:

جو آدمیوں کے ساتھ مل جل کر رہتے تھے ان کو عامر کہتے تھے۔

جو بچوں کو ستاتے تھے ان کا نام روح تھا۔

جو زیادہ شریر تھے ان کو شیطان کہتے تھے۔

اس درجہ سے بڑھ کر جو شریر ہوتا تھا اس کو عفریت کہتے تھے۔

یہ اکثر بچوں اور جوانوں کو اٹھا کر لے جاتے تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایک بھائی طالب تھے ان کو اٹھا کر لے گئے اور پھر ان کا پتہ نہ چلا۔ عمرو بن عدی لخمی جو عرب کا بادشاہ تھا اس کو بھی اٹھا لے گئے تھے لیکن کئی برس کے بعد جذیمۃ ابرش کو لا کر دے گئے۔

اسی طرح خرافہ کا قصہ ہے جس کو جن اٹھا کے لے گئے تھے مدت کے بعد وہ واپس آیا تو عجیب عجیب باتیں بیان کرتا تھا۔ [1]

ان اجنہ یا شیاطین سے جن لوگوں کے تعلقات زیادہ بڑھ گئے تھے ان میں تابط شرا اور ابو البلاد طہوی زیادہ مشہور تھے۔ طہوی نے ایک دفعہ ایک بھوت گوت کو مار ڈالا اس کے واقعات ایک نظم میں لکھے ہیں:

لقیت الغول تسری فی ظلام فصدت وانتحیت لها بعضب

حسام غیر مؤتشب یمانی فقد سراتها والبرد منها

فخرت للیدین والجوان [2]

”میں غول بیابانی سے ملا جو رات کو اندھیرے میں چلتے ہیں گو اس نے روکا اور میں یمن کی بنی ہوئی اصیل تلوار لے کر اس کی طرف بڑھا تو اس نے اس کے سر کو اور اس کی زرہوں کو کاٹ ڈالا اور وہ دونوں ہاتھوں اور سینہ کے بل زمین پر گر پڑا۔“

انہیں اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا۔ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے اس سے اندازہ ہوگا کہ جاہل عربوں پر ان کا کس قدر استیلا تھا:

﴿ یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْاِنْسِ ۚ وَقَالَ اَوْلِیٰٓؤُهُمْ مِّنَ الْاِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٨)

”اے جنوں کے گروہ! تم نے انسانوں سے بہت کچھ وصول کیا اور ان کے دوست دار انسان بولے، اے ہمارے رب! ہم میں سے ایک نے دوسرے کا کام نکالا۔“

---

[1] شمائل ترمذی، باب ما جاء فی کلام رسول اللہ ﷺ فی السمر: ٢٥١۔ [2] یہ تمام تفصیل کتاب الحیوان جاحظ سے ماخوذ ہے اس نے کئی ورق میں نہایت تفصیل سے یہ واقعات لکھے ہیں، دیکھو کتاب مذکور از صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۸۰ جزششم مطبوعہ مطبع سعادت، مصر۔

کہانت

کہانت ایک سخت بلا تھی جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے اور آسمانی خبریں بتاتے تھے اہل عرب کا اعتقاد اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک ایک جن [1] رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے وہ اپنی شکل وصورت ایسی بناتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے چنانچہ ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے سے ایک آدمی گزرا انہوں نے قیافہ سے اس کو پہچان لیا کہ وہ کاہن ہے اس کو بلا کر پوچھا کہ تیرے جن نے تجھ سے سب سے عجیب تر بات کیا بیان کی اس نے کہا: میں ایک روز بازار میں پھر رہا تھا کہ میرا جن گھبرایا ہوا آیا اور کہا:

الم ترالی الجن وابلاسها ویاسها من بعد انکاسها ولحوقها بالقلاص واحلاسها۔

''کیا تم جنوں کی سراسیمگی ان کی ناامیدی اور ان کے کاروبار کی ابتری نہیں دیکھتے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: سچ کہتا ہے، میں ایک روز زمانہ جاہلیت میں بتوں کے پاس سویا ہوا تھا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی نے ایک گوسالہ لا کر ذبح کیا، اس کے بعد ایک شخص زور سے چلایا:

یا جلیح امر نجیح رجل فصیح یقول لا اله الا اللّٰه۔

''اے جلیح، کامیاب امر، ایک فصیح شخص لا اله الا اللّٰه کہتا ہے۔''

اس کے چند ہی دنوں بعد آنحضرت ﷺ کی بعثت ہوئی تھی صحیح بخاری (تفسیر سورۂ والضحیٰ) میں روایت ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کچھ علیل ہو گئے اور دو تین دن رات کو عبادت کے لیے نہیں اٹھے، اس پر ایک عورت (یہ ابولہب کی زوجہ تھی) نے آ کر آنحضرت ﷺ سے کہا:

انی ارجوان یکون شیطانك قد ترکك۔ [2]

''میرا خیال ہے کہ تیرے شیطان نے تجھ کو چھوڑ دیا۔''

یہ وہی خیال تھا چونکہ کفار آپ کو کاہن خیال کرتے تھے اس لیے ان کا خیال تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی جن یا شیطان رہتا ہے۔ قرآن پاک نے اسی کی تردید اس آیت میں کی ہے:

﴿هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَن تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝ يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ۝﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۲۱۔۲۲۳)

''کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیطان کس پر اترتا ہے شیطان ہر جھوٹے گناہگار پر اترتا ہے جو سنی سنائی بات القا کرتے ہیں اور وہ اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔''

---

[1] کتاب البیان والتبیین للجاحظ، ج۱، ص: ۱۱۳ مطبوعہ علمیہ مصر۔

[2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ والضحیٰ: ۴۹۵۰۔

یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا ان میں سے حازی، شق، سطیح، عزی بہت مشہور تھے جاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے، کتاب البیان، ج ۱، ص: ۱۳۳ میں نقل کیے ہیں:

والارض والسماء والعقاب والصقعاء واقعة ببقعاء لقد نفر المجد بنی العشراء للمجد السناء۔

''قسم ہے زمین اور آسمان کی اور عقاب اور آفتاب کی ایک واقعہ میدان میں واقع ہوا کہ بزرگی بنو عشرا پر غالب آ گئی بوجہ بڑائی اور بلندی کے۔''

یہ کاہن جو خبریں بتاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے تکلف اور مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے، اس لیے جب ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایک ساقط الحمل بچہ کا مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے اس کی دیت کا فیصلہ کیا تو ایک شخص نے عرب کے دستور کے مطابق اعتراضاً کہا:

ارأیت من لاشرب ولا اکل ولا صاح فاستهل الیس دمه بطل۔ [1]

غور فرمایئے کہ جس بچہ نے نہ کھایا نہ پیا نہ چیخا نہ رویا، کیا اس کا خون معاف نہ ہوگا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کاہنوں کے بھائیوں میں سے ہے۔''

یہ کاہن بت خانوں میں رہتے تھے اور کسی خاص بت کے پجاری ہوتے تھے جب لوگ ان سے غیب کی بات پوچھتے یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگتے تو ایک خاص کیفیت اپنے اوپر طاری کرتے، مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں یہ مصیبتوں اور بلاؤں کے دور کرنے کے لیے بت پرستانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے یہ اپنی کہانت کی اجرت میں بڑی بڑی رقم اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ اسلام کے بعد ان میں جو مسلمان ہوگئے وہ علانیہ اپنے خدع و فریب کا اعتراف کرتے تھے ان کو نذر و نیاز اور اجرت کی جو رقم یا تحفہ ملتا اس کا نام حلوان الکاہن تھا یعنی کاہن کا منہ میٹھا کرنے کے لیے تحفہ، اسلام نے آکر اس کو روک دیا۔ [2]

غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ انہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

شعرا کی نسبت بھی عرب کا یہ خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے، چنانچہ مخبل شاعر کی شیطانہ، عمرو کی بیٹی تھی اور اعشیٰ جو عرب کا مشہور شاعر تھا اس کے شیطان کا نام مسحل تھا، اعشیٰ خود کہتا ہے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الطب، باب الکهانة: ۵۷۵۸، ۵۷۶۰؛ صحیح مسلم، کتاب القسامة، باب دیة الجنین: ۴۳۹۱۔ [2] بخاری، کتاب، الطب، باب الکهانة: ۵۷۶۱۔

دعوت خلیلی مسحلا ودعوا له بجهنام یدعی للهجین المذمم
حبانی اخی الجنی نفسی فداءه یاقبح جیاس العشیات مرجم ❶

''میں نے اپنے دوست مسحل کو پکارا اور انہوں نے اس کے لیے جہنام کو پکارا اور یہ کمینہ بد اطوار کے لیے بلایا جاتا ہے، مجھ کو میرے جن دوست نے میری جان اس پر فدا ہو، شاموں کے وقت سب سے بڑے جوش مارنے والے اور سخت پتھراؤ کرنے والے کو دیا۔''

جو اعلیٰ درجے کا شاعر ہوتا اس کا شیطان یا جن مذکر ہوتا تھا، ابو النجم کہتا ہے:

انی وکل شاعر من البشر شیطانة انثی وشیطانی ذکر۔

''ہر شاعر کا شیطان تو مؤنث ہے مگر میرا شیطان مذکر ہے۔''

شنقنان اور شیصبان رؤسائے شیاطین تھے جو شاعری سکھلاتے تھے۔ ایک شاعر کو اس پر فخر تھا کہ اس کا معلم اسی شیصبان کی اولاد سے ہے:

ولی صاحب من بنی الشیصبان فطورا اقول وطورًا هوه

''میرا ساتھی شیصبان کی اولاد ہے تو کبھی میں شعر کہتا ہوں کبھی وہ۔''

اوہام پرستی

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مارا جائے تو اس کا جوڑا آ کر بدلہ لیتا ہے۔ ❷ یہ اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد روح ایک پرند بن کر اڑتی رہتی ہے اس کو ہامہ کہتے تھے، یہ اعتقاد تھا کہ پیٹ میں ایک سانپ رہتا ہے جو بھوک کے وقت کاٹتا ہے۔ جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لے لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرندہ داہنی جانب سے اڑا تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اس وقت اس کام سے باز رہتے تھے۔ بکری کا جب بچہ پیدا ہوتا تو اگر نر ہوتا تو بت پر چڑھا دیتے، اونٹنی جب دس بچے جن لیتی تو اس کو چھوڑ دیتے وہ سانڈ کی طرح چھوٹی پھرتی۔ کسی شخص کے پاس جو اونٹوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ جاتی تو ایک اونٹ کی آنکھ پھوڑ دیتے کہ نظر نہ لگ جائے۔ جب کبھی قحط پڑتا تو بھیڑ یا دنبہ کی دم میں گھاس پھونس باندھ کر آگ لگا دیتے اور سمجھتے کہ اس سے پانی برسے گا۔ سفر میں جاتے تو کسی درخت میں ڈور وغیرہ باندھ کر گرہ لگا دیتے واپس آ کر دیکھتے اگر گرہ کھل گئی ہے تو سمجھتے کہ ان کی بیوی نے بدکاری کی۔ سفر میں راستہ بھول جاتے تو کپڑے الٹ کر پہن لیتے اور سمجھتے کہ اس سے راستہ مل جائے گا ❸ یہ خیال تھا کہ جو شخص لات وعزیٰ کو گالی دیتا ہے اس کو برص یا جذام ہو جاتا ہے ❹ ہاتھوں میں پیتل کی انگوٹھی پہنتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ضعف جاتا رہتا ہے ❺ اس قسم کے

❶ اعشٰی کے دیوان مطبوعہ ویانا صفحہ ۶۵ (اور شعراء النصرانیة القسم الثالث، ص: ۳۷۷) میں صرف پہلا شعر ہے اور اس کا بھی دوسرا مصرع اس طرح ہے: جهنام جدعا للهجین المذمم۔ ❷ ابوداود، کتاب الادب، باب فی قتل الحیات: ۵۲۵۰۔ ❸ یہ باتیں بلوغ العرب اور اطوار العرب وغیرہ کتابوں میں مذکور ہیں۔ ❹ دارمی، کتاب الصلوٰۃ، باب فرض الوضوء والصلوٰۃ: ۶۵۲۔ ❺ ابن ماجه، ابواب الطب، باب تعلیق التمائم: ۳۵۳۱۔

سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یہ تو ان کے مذہبی حالات و خیالات تھے ان کی اخلاقی کیفیت بھی ایسی ہی پست تھی ان کے اخلاقی معائب میں سب سے نمایاں چیز ان کی جنگ جوئی تھی جس نے ان کو حد درجہ خونخوار، سنگدل اور سفاک بنا دیا تھا۔

جنگ جوئی

ذرا ذرا سی بات پر لڑنا مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسر پیکار تھا، ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس مقدس فرض کو انجام دیتا تھا اور اس طرح ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا تھا۔ انہیں لڑائیوں کو مؤرخین اور اہل ادب ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد یہ لکھا ہے:

هذا الفن لايتقصاه الاحصاء فاقتصرت علىٰ ما ذكرت۔ [1]

''یہ فن شمار کا استقصا نہیں کر سکتا اس لیے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس پر میں نے قناعت کی۔''

یہ تمام لڑائیاں وہ ہیں جو اسلام سے چالیس پچاس برس پیشتر سے اسلام تک ہوئیں ان میں سب سے زیادہ مشہور لڑائی عبس و ذبیان کی ہے جس کا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں قبیلوں کے دو گھوڑے داحس اور غبرا کا باہمی مقابلہ تھا ان میں سے ایک فریق نے گھوڑ دوڑ کے قواعد کی خلاف ورزی کی اور لڑائی ہو پڑی یہ لڑائی ان دونوں قبیلوں میں پورے چالیس برس تک قائم رہی۔ دوسری مشہور لڑائی حرب بسوس ہے اس کا واقعہ یہ ہے کہ بسوس نامی ایک قبیلہ کی عورت کی اونٹنی کلیب بن وائل کی چراہ گاہ میں جا پڑی کلیب نے اپنے تیر سے اس کے تھن کو زخمی کر دیا اس بات نے قبیلہ میں آگ لگا دی کلیب جان سے مارا گیا اور بکر و تغلب میں خونریز جنگ ہوئی۔ عکاظ کے میلہ میں سلیم اور غطفان کے سرداروں میں کچھ مناقشہ ہوا چند روز کے بعد موقعہ پا کر ایک کو قتل کر دیا گیا اس کے انتقام کے لیے خون کی ندیاں بہیں۔ بکر و تمیم میں ایک چراہ گاہ کے معاملہ میں خونریز لڑائی ہوئی۔ اوس و خزرج مدینہ کے دو قبیلوں میں جو ہولناک لڑائیاں ہوتی رہیں ان میں سب سے مشہور یوم بعاث ہے، جس میں دونوں قبیلوں کے اکثر سردار کام آئے اس لڑائی کا خاتمہ انصار مدینہ کی بیعت پر ہوا۔ قریش کی مشہور لڑائیوں کا نام ایام فجار ہے۔ ایک اور مشہور لڑائی کا نام ذی قار ہے۔

---

[1] کتاب الامثال للمیدانی، ج ۲، ص: ۳۷۱۔

الغرض معمولی سے اشتعال سے قتل تک نوبت پہنچتی تھی، قتل سے انتقام کا جذبہ پیدا ہوتا تھا اور لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ قائم ہو جاتا تھا [1] ان میں لڑنا اور مرنا جاہلیت کا شرف اور ایک قبیلہ کی آن سمجھی جاتی تھی اور اس خون آشامی کا ذوق ان کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی ان لڑائیوں میں سفا کی بے رحمی اور قتل و غارت کی بدترین مثالیں پیش آتی رہتی تھیں۔

شراب خوری

شراب جو ہر قسم کے فسق و فجور اور مظالم اور بدکاری کا سرچشمہ ہے عربوں میں اس کا اس قدر رواج تھا کہ ہر گھر ایک مے کدہ بن گیا تھا۔ اس کا نہ پینا اس قدر نامانوس بات تھی کہ جن چند آدمیوں نے اسلام سے پہلے اس کے پینے سے پرہیز کیا تھا، ان کے نام یادر کھے گئے تھے۔ دوست واحباب کسی گھر میں جمع ہوتے شراب کا دور چلتا، ساتھ ہی جوئے کھیلتے، ان میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی، جو جیتتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کر کے لوگوں کو کھلا دیتا، کبھی نشہ میں سرشار ہو کر خود صاحب خانہ اٹھ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا اور لوگ گوشت بھونتے، کباب لگاتے اور کھاتے اور کھلاتے اور اپنی اس بے جا فیاضی پر فخر کرتے، سامنے فاحشہ عورتیں گاتیں بجاتیں اور اسی مخموری کے عالم میں بے شرمی کی باتیں کرتے، جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے:

فان تبغنی فی حلقة القوم تلقنی وان تقتنصنی فی الحوانیت تصطد

”پس اگر تو مجھے لوگوں کے حلقہ میں ڈھونڈے تو پائے گا اور اگر شراب خانوں میں مجھے شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔“

متی تاتنی اصبحك كاسا رویة وان كنت عنها غائبا فاغن وازدد

”جب بھی تو میرے پاس آئے میں تجھے شراب کا پیالہ پلاؤں گا اور اگر تو اس سے بے نیاز ہو کر نہ آئے تو جا اور بے نیازی کر۔“

ندامای بیض كالنجوم وقینة تروح الینابین بردو مجسد

”میری محفل شراب کے ہم نشین ستاروں کی طرح گورے چٹے ہیں ایک مغنیہ ہے جو شام کو ہمارے پاس یمنی چادر اور زعفرانی کپڑوں میں آتی ہے۔“

رحیب قطاب الجیب منها رفیقةٌ بجس الندامی بضّة المتجرد

”اس کے گریبان کا شگاف بڑا ہے شرابی رفیقوں کی دست اندازی سے مانوس، اس کے بدن کے برہنہ حصے لطیف ہیں۔“

---

[1] ان لڑائیوں کے مفصل حالات کے لیے دیکھو: عقد الفرید ابن عبدربه، ج ۳، ص: ٤٤ اور امثال میدانی الجز الثانی، الباب التاسع والعشرون فی اسماء العرب، ص: ٢٦٠ و ما بعد۔

اذا انحن قلنا اسمعینا انبرت لنا علی رسلھا مطروقۃ لم تشدد

''جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سناؤ تو آہستہ آہستہ نزاکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔''

ومازال تشرابی الخمور ولذتی وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

''اور میری شراب نوشی اور لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کو خرچ کرنا میرا شعار ہے۔''

ولو لا ثلث ھن من لذۃ الفتی وجدك لم احفل متی قام عودی

''اگر تین باتیں نہ ہوتیں جو ایک شریف کا لطف ذوق ہیں تو میں اپنی موت کی پروانہ کرتا۔''

فمنھن سبقی العاذ لات بشربۃ کمیت متی ماتعل بالماء تز بد

''ان میں سے ایک تو نصیحت کرنے والیوں کی بات کا خیال کیے بغیر سرخ وسیاہ رنگ شراب کا پیالہ پی لینا جس میں پانی ملانے سے جوش آئے۔''

وتقصیر یوم الدجن والدجن معجب ببھکنۃ تحت الخباء المعمد

''اور دوسری بات گھنگھور گھٹا کے دن کو اور وہ کیسا پرلطف دن ہوتا ہے کسی بلند خیمہ کے نیچے حسین معشوقہ سے لطف اندوزی میں چھوٹا کرتا ہے۔''

کریم یروی نفسہ فی حیاتہ ستعلم ان متناغدا اینا الصدی

''میں وہ فیاض ہوں جو اپنی زندگی میں اپنے آپ کو شراب پلا کر سیراب کرتا ہے موت کے بعد معلوم ہوگا کہ ہم میں پیاسا کون ہے۔''

وبرك ھجود قد اثارت مخافتی بوادیھا امشی بعضب مجرد

''اور کتنے بیٹھے ہوئے سوئے اونٹ تھے کہ میرے خوف نے ان کے اگلوں کو بھڑکا دیا جب میں ننگی تلوار لے کر چلا۔''

فمرت کھاۃ ذات خیف جلالۃ عقیلۃ شیخ کالو بیل یلندد

''تو ایک موٹی اونٹنی جو ایک بڈھے کی، جو ایک لٹھ کی طرح جھگڑالو تھا قیمتی چیز تھی، سامنے آگئی۔''

وقال الاماذا ترون بشارب شدید علینا بعینہ متعمد

''(اور جب میں نے تلوار سے کونچ کاٹ کر اونٹنی کو گرادیا) تو اس بڈھے نے کہا: اس بدمست کو دیکھو جو جان بوجھ کر ظلم کر رہا ہے۔''

فظل الاماء یمتللن حوارھا ویسعی علیھا بالسدیف المسرھد [1]

---

[1] شرح المعلقات السبع للزوزنی، ص:۵۷ وما بعد۔

’’تو لونڈیاں اونٹنیکے بچہ کو (جو اس کے پیٹ سے نکلا تھا) بھوننے لگیں اور چربی دار کوہان کا گوشت لے کر ہمارے پاس دوڑا جانے لگا۔‘‘

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے، کہتا ہے:

بل انت لا تدرین کم من لیلۃ　　طلق لذیذ لھوھا وندامھا

’’بلکہ تو نہیں جانتی کہ کتنی کھلی ہوئی راتیں جن کی دلچسپی اور ہم نوشی پر لطف تھی۔‘‘

قد بت سامرھا وغایۃ تاجر　　وافیت اذ رفعت وعز ندامھا

’’میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب نوش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہوگئی۔‘‘

اغلی السباء بکل ادکن عاتق　　اوجونۃ قدحت وفض ختامھا

’’میں اس کی قیمت کو اور گراں کر رہا تھا پرانی خاکی رنگ کی مشک یا خم خرید کر جو پیالوں میں بھری جاتی اور اس کی مہر توڑی جاتی۔‘‘

وصبوح صافیۃٍ وجذب کرینۃ　　بموترتأتالہ ابھامھا

’’اور کتنی صبح کی صاف شراب اور مغنیہ کا عود کو کھینچ کر اپنے انگوٹھے سے دبانا۔‘‘

بادرت حاجتھا الدجاج بسحرۃٍ　　لاعلَّ منھا حین ھب نیامھا [1]

’’میں نے شراب کی ضرورت مرغ سحر سے پہلے پوری کی، تاکہ میں اس کے سونے والوں کے جاگنے سے پہلے دہرالوں۔‘‘

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب نے بھی عربوں کو اس بری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر انہیں عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی، تغلب کا سب سے بڑا شاعر اپنے فخریہ میں کہتا ہے:

الا ھبّی بصحنک فاصبحینا　　ولا تبتقی خمور الاندرینا

’’ہاں اپنا پیالہ لیکر اٹھ جا اور مجھے صبح کی شراب پلا اور اندرین کے (شامی گاؤں) کی کوئی شراب چھوٹنے نہ پائے۔‘‘

مشعشعۃ کان الحص فیھا　　اذا ما الماء خالطھا سخینا

’’پانی میں ملی ہوئی گویا اس میں کسم کے پھول پڑے ہیں جب گرم پانی اس میں ملاؤ۔‘‘

تجور بذی اللبانۃ عن ھواہ　　اذا ما ذا قھا حتی یلینا

’’غرض مند کو اس کی غرض بھلا دے اگر اس کو چکھ لے یہاں تک کہ اس کو نرم کر دے۔‘‘

[1] شرح المعلقات، ص: ۱۰۹ وما بعد۔

تری اللحز الشحیح اذا أمرّت　　علیه لماله فیها مهینا

''تنگ دل بخیل پر بھی اگر اس کا ایک دور گزار دیا جائے تو وہ اپنی دولت کو لٹا دے۔''

صبنت الکأس عنا امّ عمرو　　وکان الکأس مجراها الیمینا

''اے عمرو کی ماں! تو نے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دور داہنی طرف تھا۔''

وما شر الثلثة ام عمرو　　بصاحبك الذی لاتصبحینا

''حالانکہ تیرا وہ ہم نشین جس کو تو نہیں پلاتی تین میں سب سے بدتر نہیں۔''

کأس قد شربت ببعلبك　　واخریٰ فی دمشق وقاصرینا ❶

''اور ایک وہ پیالہ جس کو بعلبک میں پیا اور دوسرا وہ جو دمشق اور قاصرین میں پیا۔''

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا۔ شراب فروشوں کی دوکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لیے وہاں جھنڈا اڑا کرتا تھا جس کو غایۃ کہتے تھے (دیکھو اوپر لبید کا دوسرا شعر) انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ شراب فروشی کا مترادف بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو بن قمیہ کہتا ہے:

اذا سحب الریط والمروط الی　　ادنی تجاری وانفض اللمم ❷

''یاد ہے وہ دن جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانے میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔''

بدر میں قریش کے جو دولت مند روسا مارے گئے تھے ان کے مرثیہ میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے ان کی بزم شراب اور مجلس رقص وسرود کی بربادی کا ماتم کرتا ہے:

وما ذا بالقلیب قلیب بدر　　من القینات والشرب الکرام ❸

''بدر کے گڑھے میں (جس میں مقتولین کی لاشیں ڈالی گئی تھیں) ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے۔''

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے خاص ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ تمام گھروں میں شراب کی مجلسیں قائم ہوتیں، گھر کی عورتیں اور چھوٹے بچے ساقی بنتے تھے۔ یہ شعر اوپر گزر چکا ہے جس میں شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

صبنت الکأس عنا ام عمر　　وکان الکاس مجراها الیمینا۔

''اے ام عمرو! تو نے شراب کا پیالہ ہم سے ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کی گردش داہنی طرف سے تھی۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ اسلام لانے سے پہلے میں اپنے باپ (عباس) کی زبان سے کم

❶ شرح المعلقات السبع، ص:۱۱۷، ۱۱۸۔ ❷ دیوان حماسه، جزء الثانی، باب الادب:۱۰۔
❸ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب الهجرة واصحابه الی المدینة:۳۹۲۱۔

سنی میں یہ سنا کرتا تھا: اِسْقِنَا كَأْسًا دِهَاقًا ''شراب کا ایک لبریز پیالہ ہم کو پلا۔'' ❶

صحیح بخاری کتاب الاشربۃ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب شراب حرام ہوئی تو اس وقت ایک مجلس تھی جس میں حضرت ابو دجانہ، ابوطلحہ رضی اللہ عنہما، سہیل بن بیضا شریک تھے اور میں جو کہ سب سے کمسن تھا ساقی گری کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ ❷

شراب کس بے تکلفی سے پی جاتی تھی، کس درجہ کے لوگ پیتے تھے، کس قسم کے افعال اس حالت میں سرزد ہوتے تھے، اس کا اندازہ صحیح بخاری کی ایک روایت سے ہوگا ❸ جو حرمت شراب سے قبل کا واقعہ ہے۔

غزوۂ بدر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی خمس میں سے ایک اور اونٹنی آنحضرت ﷺ نے عطا فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک گھاس کا نام) لائیں اور زرگروں کے ہاتھ فروخت کریں اس ارادہ سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لیے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے۔ لوگوں سے پوچھا یہ کام کس کا ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ چند انصار کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع گایا:

الا یا حمز للشرف النواء ''اے حمزہ! موٹی اونٹنیوں کے لیے۔''

حضرت حمزہ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لیے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جا کر آنحضرت ﷺ کو خبر کی اور یہ ماجرا بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے چادر اوڑھی حضرت علی اور زید رضی اللہ عنہما کو لے کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مخمور تھے، آنحضرت ﷺ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور کہا: ''تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔'' آنحضرت ﷺ یہ حالت دیکھ کر چلے آئے۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ۳ ھ میں شہادت پائی اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔

شراب کی حرمت جس تدریج سے نازل ہوئی ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا۔ کس طرح وہ مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنایہ اشاروں سے گزر کر جب تک صاف ممانعت نہیں کر دی گئی لوگ سمجھ نہیں سکے۔

ابوداؤد کتاب الاشربۃ میں روایت ہے کہ جب شراب کی ممانعت نازل ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے خدا! شراب کے بارہ میں ہم کو صاف صاف بتا دے۔'' ان کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

اللّٰهم بين لنا في الخمر بيانا شفاء۔ ❹

❶ صحيح بخاری، كتاب مناقب الانصار، باب ايام الجاهلية: ۳۸٤۰۔ ❷ صحيح بخاری، كتاب الاشربة، باب نزول تحريم الخمر وهي من البسر والتمر: ۵۵۸۲، ۵۵۸۳۔ ❸ صحيح بخاری، كتاب المغازی، باب غزوة بدر: ٤۰۰۳۔ ❹ ابوداود، كتاب الاشربة، باب تحريم الخمر: ۳۶۷۰۔

"اے خدا! شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کر دے۔"

اس پر سورۂ بقرہ کی یہ آیت اتری:

﴿ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۹)

"لوگ تم سے شراب اور قمار بازی کی نسبت سوال کرتے ہیں تو کہہ دو کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدے بھی ہیں، لیکن فائدہ سے گناہ بڑھ کر ہے۔"

اس آیت کے اترنے کے بعد بھی لوگ شراب پیتے پلاتے رہے یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک انصاری نے حضرت علی اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما وغیرہ کی دعوت کی، شراب کا دور چل رہا تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت آ گیا ایک صاحب [1] نے امامت کی، مگر نشہ کے خمار میں ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ۙ﴾ کی سورہ کو کچھ

[1] شراب کی حرمت یہ تدریجی صورت حضرت عمر رضی اللہ عنہ (ترمذی، ابواب التفسیر، تفسیر سورۃ مائدۃ:۳۰۴۹؛ ابو داود کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر:۳۶۷۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۵۱) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ (ابو داود، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر:۳۶۷۱) سے مروی ہے یہ بات کہ وہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں غلط سلط سورہ پڑھ دی تھی، روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتی، ایک روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام اور تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے حضرت الاستاذ نے سیرۃ جلد دوم (تاریخ احکام ذکر حرمتِ شراب) میں ابو داود کتاب الاشربۃ باب فی تحریم الخمر:۳۶۷۱ کے حوالہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام لکھ دیا تھا مگر مزید تحقیق سے یہ نسبت مشکوک معلوم ہوتی ہے، اس خاص روایت کا مرکزی راوی عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن ہے ابو عبدالرحمن سلمی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے، اس سے یہ روایت مختلف طریقوں سے آئی ہے اور ہر ایک میں شراب پینے والوں اور حالتِ نشہ میں نماز پڑھانے والے کے نام کا اختلاف ہے، چنانچہ ہر روایت کے اصل الفاظ میں وہ روایتیں جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے:

۱۔ ((عن ابی جعفر الرازی عن عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمن السلمی عن علی بن ابی طالب قال صنع لنا عبدالرحمن بن عوف طعامًا فدعانا وسقانا من الخمر فاخذت الخمر منا وحضرت الصلوۃ فقد مونی فقرات قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكَا فِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ونحن نعبد ما تعبدون فانزل اللہ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾)) (ترمذی، ابوابِ التفسیر، تفسیر سورہ نساء: ۳۰۲۶) "ابو جعفر رازی نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابو عبدالرحمن سلمی سے، ابو عبدالرحمن سلمی نے حضرت علی بن ابی طالب سے روایت کی ہے، انہوں نے فرمایا کہ عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ہمارے لیے کھانا تیار کرایا اور ہم کو مدعو کیا اور شراب پلائی، جب ہم شراب کے نشہ میں چور ہو گئے اور نماز کا وقت آیا تو لوگوں نے مجھ کو امام بنایا اور میں نے ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ۙ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ۙ﴾ ونحن نعبد ما تعبدون پڑھی اس پر خدا نے یہ آیت اتاری: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ (یعنی مسلمانو! نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو)"

۲۔ ((عن سفیان حدثنا عطاء بن السائب عن ابی عبدالرحمٰن السلمی عن علی علیہ السلام ان رجلا من الانصار دعاہ وعبدالرحمن بن عوف فسقا هما قبل ان تحرم الخمر فامهم علی فی المغرب فقرا ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ فخلط فيها فنزلت ((لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون))

(ابو داود، کتاب الاشربۃ، باب تحریم الخمر: ۳۶۷۱) (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(گزشتہ سے پیوستہ) سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے کہ انصار کے ایک شخص نے ان کو اور عبدالرحمٰن بن عوف کو مدعو کیا اور تحریم شراب سے پہلے ان دونوں کو شراب پلائی پھر علی رضی اللہ عنہ نے نماز مغرب کی امامت کی اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی لیکن اس میں گڈمڈ کر دیا اس پر آیت اتری ﴿لا تقربوا الصلوٰة وانتم سكارىٰ حتى تعلموا ما تقولون﴾ ''نشے کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ یہاں تک کہ جو کچھ کہتے ہو، اس کو جان لو۔''

وہ روایتیں جن میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا نام ہے۔

۳۔ ((حدثنا سفيان عن عطاء بن السائب عن ابى عبدالرحمٰن السلمى عن على قال دعانا رجل من الانصار قبل ان تحرم الخمر فتقدم عبدالرحمٰن بن عوف وصلى بهم المغرب فقرأ قل يايها الكافرون فالتبس عليه فنزل ﴿لا تقربوا الصلوٰة وانتم سكارى﴾)) (مستدرك حاكم الاشربة، ج ٤، ص: ١٤٢)

''سفیان نے عطاء بن سائب سے، عطاء نے ابوعبدالرحمٰن سلمی سے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ تحریم شراب سے پہلے انصار کے ایک شخص نے ہم کو مدعو کیا تو عبدالرحمٰن بن عوف نے امامت کی اور ان کو مغرب کی نماز پڑھائی اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی، لیکن اس میں غلط ہو گیا اس پر یہ آیت اتری: ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ ''نشے کی حالت میں نماز نہ پڑھو۔''

۴۔ ((سفيان عن عطاء بن السائب عن ابن(؟) عبدالرحمٰن عن على انه كان هو وعبد الرحمن ورجل آخر يشربون الخمر فصلى بهم عبدالرحمٰن بن عوف فقرأ ﴿قل يا ايها الكفرون﴾ فخلط فيها فنزلت ﴿لا تقربو الصلوٰة﴾)) (مستدرك حاكم، كتاب الاشربة، ج ٤، ص: ١٤٢)

''سفیان نے عطا بن السائب سے، عطا نے ابن عبدالرحمٰن سے، ابن عبدالرحمٰن نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ اور عبدالرحمٰن بن عوف اور ایک دوسرے آدمی شراب پی رہے تھے اور ان کو عبدالرحمٰن بن عوف نے نماز پڑھائی اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی جس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری: ﴿لَاتَقْرَبُو الصَّلٰوةَ﴾۔''

۵۔ ((خالد عن عبدالله عن عطاء بن السائب عن ابى عبدالرحمن ان عبدالرحمن صنع طعاما فدعا ناسا من اصحاب النبى ﷺ فيهم على بن ابى طالب فقرأ: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لا اعبد ما تعبدون﴾ ونحن عابدون ما عبدتم فانزل الله عزوجل ﴿لاتقربوا الصلوٰة﴾ الاية)) (مستدرك حاكم، كتاب الاشربه، ج ٤، ص: ١٤٢)

''خالد بن عبداللہ، عطاء بن سائب سے، عطاء ابی عبدالرحمٰن سے روایت کرتے ہیں کہ عبدالرحمٰن نے کھانا تیار کرایا اور صحابہ میں سے چند لوگوں نے کہ جن میں علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی تھے بلایا پھر انہوں نے قُلْ يايها الكافرون لا اعبد ما تعبدون ونحن عابدون ما عبدتم پڑھی اس پر یہ آیت اتری ﴿لا تقربوا الصلوٰة﴾ الاية۔''

وہ روایت جس میں نام کی تعیین نہیں۔

۶۔ ((سفيان عن عطاء بن السائب عن ابى عبدالرحمٰن عن على قال دعانا رجل من الانصار قبل تحريم الخمر فحضرت صلوة المغرب فتقدم رجل فقرأ ﴿قل يايها الكفرون﴾ فالتبس عليه فنزلت ﴿لا تقربوا الصّلوٰة﴾ الاية))۔ (مستدرك حاكم، تفسير سورنساء، ج ٢، ص: ٣٠٧)

''سفیان، عطاء بن سائب سے، عطاء، ابوعبدالرحمٰن سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: تحریم شراب سے پہلے ہم کو انصار کے ایک شخص نے مدعو کیا، نماز مغرب کا وقت آیا تو ایک آدمی نے امامت کی اور ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ﴾ پڑھی لیکن اس میں خلط ملط کر دیا اس پر یہ آیت اتری ﴿لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ﴾ (الاية)۔''

ان چھ روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں:

(۱) پہلی اور پانچویں روایت میں ہے کہ داعی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے، دوسری اور چھٹی میں ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(۞۞ گزشتہ سے پیوستہ) کہ داعی کوئی انصاری تھے۔ چوتھی میں دعوت کے بغیر مجلسِ شراب کا ذکر ہے۔

(۲) پہلی اور دوسری میں ہے کہ امام حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، جنہوں نے نشہ میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا، تیسری، چوتھی، پانچویں میں ہے کہ وہ امام عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تھے اور چھٹی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کوئی آدمی امام تھا۔

(۳) اور روایتوں میں ہے کہ وہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی، چھٹی میں شراب کا مطلق ذکر نہیں ہے، بلکہ وہ شخص جو امام بنا تھا وہی شاید کہیں سے پی کر آیا ہو گو کہ حرمتِ شراب سے پہلے پینا کوئی شرعی جرم نہیں، تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا جو بچپن سے آنحضرت ﷺ کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے، خصوصاً اس آیت کے بعد ﴿قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ﴾ (کہہ دے کہ شراب اور جوئے میں بڑا گناہ ہے) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پینا اور بھی زیادہ واقعہ کی صورت میں شک پیدا کرتا ہے، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ راویوں پر نظر ڈالی جاتی ہے، سب سے پہلا راوی ابوعبدالرحمٰن سلمی جن کا نام عبداللہ بن حبیب ہے وہ پہلے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرفدار حامی (شیعہ) تھا، بعد کو عثمانی (بنوامیہ کا طرف دار) اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مخالف ہو گیا، پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سنا ہے، محدثین میں مسلم نہیں، بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے، (تهذيب التهذيب، ج ٥، ص: ١٨٤) روایت کے دوسرے راوی عطاء بن سائب کا حافظہ خراب ہو گیا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کو چھوڑ دیا تھا، گو سفیان کی اس سے روایتیں حافظہ کی خرابی سے پہلے کی سمجھی جاتی تھیں، مگر اوپر کی روایتوں میں دیکھو کہ خود سفیان کی روایتوں میں بھی وہی ناقابلِ تطبیق اختلاف موجود ہے، ان وجوہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف فیہ جزئیات غیر مسلم ہیں (تهذيب التهذيب، ج ٧، ص: ٢٠٥) اور واقعہ کی اصلی صورت وہی ہے جو چھٹی روایت میں ہے کہ وہ مجلس محض دعوت کی تھی جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ موجود تھے کہ نماز کا وقت آ گیا اور ایک صاحب جو مخمور تھے۔ نماز پڑھانے کھڑے ہو گئے اور آیتیں خلط ملط پڑھ دیں چونکہ اس واقعہ کے راوی حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور وہ دعوت میں شریک تھے اس لیے یا تو ابوعبدالرحمٰن سلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطاء نے ذرا سی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے اُدھر کر دی۔

اس آخری چھٹی روایت کی تائید حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہوتی ہے جس کی سند پورے سلسلہ سے الگ اور مستقل ہے۔

۷۔ ((عن ابی هريرة قال: حرمت الخمر ثلاث مرات قدم رسول اللهﷺ المدينة وهم يشربون الخمر ويأكلون الميسر فسألوا رسول اللهﷺ عنهما فانزل الله على نبيهﷺ: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ الآية (٢/ البقرة:٢١٩) فقال الناس: ماحرم علينا انما قال ((فيهما اثم كبير)) وكانوا يشربون الخمر حتى اذا كان يوم من الايام صلى رجل من المهاجرين ام اصحابه في المغرب خلط في قراء ته فانزل الله فيها اية اغلظ منها ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ وكان الناس يشربون حتى ياتي احدهم الصلوة وهو مفيق ثم انزلت اية اغلظ من ذٰلك: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ فقالوا انتهينا ربّنا)) (مسند احمد، ج ٢، ص:٣٥١)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ شراب تین بار حرام کی گئی رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو لوگ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے۔ لوگوں نے آپ سے ان دونوں کے متعلق سوال کیا خدا نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَآ إِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَآ أَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ الآية لیکن لوگوں نے کہا کہ خدا نے ہم پر حرام نہیں کی صرف یہ کہا کہ ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اب بھی لوگ شراب پیتے رہے یہاں تک کہ ایک دن ایک مہاجر نے نمازِ مغرب پڑھائی اور اپنی قراءت میں خلط ملط کر دیا، اس لیے خدا نے شراب کے متعلق اس سے زیادہ سخت آیت اتاری ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ اب بھی لوگ شراب پیتے رہے البتہ جب کوئی نماز پڑھنے جاتا تھا تو ہوش کی حالت میں جاتا تھا، پھر اس سے زیادہ سخت آیت نازل ہوئی: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوْٓا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ اب لوگوں نے کہا کہ خداوندا ہم باز آئے۔'' اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر ۞۞)

کا کچھ پڑھ گئے، اس پر یہ آیت اتری:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء:٤٣)

''نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھو، یہاں تک کہ تم جو کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔''

اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا تھا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔ لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی عام حکم نہ تھا اس لیے نماز کے علاوہ اور اوقات میں لوگ پیتے پلاتے رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر دعا کی، اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی دعوت کی۔ اس میں شراب کا دور بھی چلا یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے بہتر ہیں اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی، اس پر حکم آیا: [1]

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴾ (٥/ المآئدة:٩٠)

''اے ایمان والو! بے شک شراب، جوا، بت اور پانسے ناپاک اور شیطان کے کام ہیں تو ان سے بچو، تا کہ فلاح پاؤ۔''

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی، حرمتِ شراب کی یہ آخری آیت جس وقت اتری حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ امین ھذہ الامہ اور ابی بن کعب جو سید القراء تھے، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی گری کی خدمت حضرت انس سے متعلق تھی، چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زبانی روایت ہے:

كنت اسقى ابا عبيدة وابا طلحة وابى بن كعب فجاء هم أت فقال: ان الخمر حرمت۔ [2]

(﴿﴾ گزشتہ سے پیوستہ) کہیں ذکر نہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے قرآن کے صاحب فہم کی نسبت یہ خیال کرنا کہ پہلی آیت کے اشارہ سے وہ شراب کی حرمت کو نہ سمجھ سکے تھے، قبول کے قابل نہیں، محدثین میں حاکم نے مستدرک میں چھٹی روایت کو لکھ کر بیان کیا ہے کہ اس واقعہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام شامل کرنا خوارج کی کارستانی ہے جس کی تردید اس روایت سے ہو جاتی ہے جس کو خود علی رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں، حاکم کہتے ہیں:

وفي هذا الحديث فائدة كثيرة وهي ان الخوارج تنسب هذا السكر وهذا القراءة الى امير المؤمنين على بن ابى طالب دون غيره وقد براه الله منها فانه راوى هذا الحديث (مستدرك تفسير سورة نساء، ج ٢، ص: ٣٠٧)

''اور اس حدیث میں بہت بڑا نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ خوارج نے نشہ اور اس غلط قراءت کو امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہی کی طرف منسوب کیا تھا تو خدا نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا کہ وہی اس حدیث کے راوی ہیں۔''

درحقیقت واقعہ کے صرف راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صاحب واقعہ بنایا۔

1. صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب فى فضل سعد بن ابى وقاص: ٦٢٣٨۔
2. صحيح بخارى، كتاب الاشربة، باب نزل تحريم الخمر: ٥٥٨٢۔

''میں، ابوعبیدہ ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آ کر کہا کہ شراب حرام ہوگئی۔''

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے، جن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی شریک تھے، اس موقع پر لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے۔ [1] تاہم جوں ہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کر دی کسی نے پوچھ گچھ تک نہیں کی اور دفعتہً جام و سبو توڑ ڈالے۔ یہ صرف ابوطلحہ کے گھر کا حال نہیں تھا بلکہ تمام مدینہ کے گلی کوچوں میں شراب کی ندیاں بہہ گئیں۔ بخاری باب المظالم میں ہے:

فجرت فی سکك المدینة۔ [2] ''مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔''

ان ندیوں کی روانی سے اندازہ ہوگا کہ عرب میں شراب نوشی کی کثرت کا کیا عالم تھا۔

قمار بازی

شراب خوری کے ساتھ ساتھ ان میں قمار بازی کا عام رواج ہوگیا تھا، عرب کے مال و دولت کا تمام تر سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا، اس لیے جوا بھی انہیں کے ذریعہ سے کھیلا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے:

اعیّرتنا البانها ولحومها وذلك عار یا بن ریطة ظاهر

''کیا تو ہم پر عیب لگاتا ہے کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں، اے ابن ریطہ! ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔''

نحابی بها اکفاء نا ونهیننا ونشرب فی اثمانها ونقامر

''ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور انکو مہمانی میں صرف کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔''

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کر کے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر کر لیے تھے جن کے نام یہ ہیں فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلیٰ، منافس، منیح، سفیح، وغد، ان میں ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لیے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا تھا جس کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تین تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جس کے نام پر نکلتے ان کو ناکامی ہوتی تھی، اس طرح گوشت کے جو

[1] فتح الباری، ج ۱۰، ص: ۳۱ بحواله روایت ابی عاصم۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المظالم، باب صب الخمر فی الطریق: ۲٤٦٤۔

ٹکڑے جمع ہوتے تھے ان کو فقیروں محتاجوں اور دوستوں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا، اس لیے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو ''برم'' کا خطاب دے رکھا تھا ❶ جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے تھے، ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنی بی بی کو وصیت کرتا ہے:

واذا هلكت فلا تريدى عاجزًا　　　عنسا ولا برما ولا معزالا

''اور اگر میں ہلاک ہو جاؤں تو عاجز، کمزور اور جوئے میں نہ شریک ہونے والے اور سفر میں قوم سے علیحدہ رہنے والے سے نکاح نہ کرنا۔''

جوئے کی ایک صورت جس کو ''رہان'' کہتے تھے یہ تھی کہ شرط پر بازی لگاتے تھے اور جب وہ شرط پوری ہوتی تھی تو جس چیز پر بازی لگائی جاتی تھی اس کو لے لیتے تھے چنانچہ جب رومیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی اور باوجود رومیوں کی شکست کے قرآن مجید نے پیشین گوئی کی کہ ان کو چند سال میں ایرانیوں پر غلبہ حاصل ہو جائے گا تو کفار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اسی قسم کی شرط لگائی اور اس فتح کے لیے چھ برس کی مدت مقرر کی چنانچہ جب یہ مدت گزر چکی اور رومیوں کو فتح و ظفر نصیب نہ ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بازی ہارنا پڑی۔ ❷ اور رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بیوی اور بال بچوں پر بازی لگا دیتے تھے۔ ❸ یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی کے عالم میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی تھی عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قمار بازی کا نتیجہ تھی۔ حصول دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے۔

سود خوری

عرب میں سود خوری کا عام رواج تھا، تمام دولت مند سود پر لین دین کرتے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب نے جو قریش کے سردار اور آنحضرت ﷺ کے چچا تھے، تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سود خوری میں نہایت شہرت رکھتے تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ نے جب حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان ہی کے سود کو باطل قرار دیا، حضرت عثمان اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما سود پر قرض دیتے تھے۔ مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبدیالیل، حبیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے، بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سود پر داد و ستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور چاروں بھائی اسلام لائے تو انہوں نے مغیرہ سے سود کا تقاضا کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ❹

---

❶ یہ پوری تفصیل تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۳۳۱ میں ہے۔
❷ ترمذی، ابواب التفسیر، سورۃ الروم: ۳۱۹۴ جوئے کی صورت کو رہان کہتے تھے اور اب تک وہ حرام نہیں ہوئی تھی۔
❸ تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۳۳۱۔ ❹ تفسیر کبیر، ج ۲، ص: ۵۴۰۔

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۸)

''مسلمانو! خدا سے ڈرو اور بقیہ سود کو اگر تم مسلمان ہو تو چھوڑ دو۔''

ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لیے وہاں کے لوگ عموماً سود پر بیوپار کرتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سودخوری نہ کریں گے۔ [1] اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔ [2]

سود کا عام اور متداول طریقہ تو یہ تھا کہ ایک معین شرح پر قرض دیتے اور راس المال کے ادا کرنے کے لیے میعاد مقرر کر دیتے تھے جب میعاد گزر جاتی تو اس کا تقاضا کرتے تھے اگر مدیون اس کو ادا نہیں کر سکتا تھا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے اور اس کے عوض میں شرح سود بڑھا لیتے تھے لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد متعینہ کے لیے کسی کو مثلاً: سو روپیہ دیتے تھے لیکن مدت گزر چکتی اور تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہیں کر سکتا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضہ میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے تھے یہاں تک کہ کبھی کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا تھا اس طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی تھی، یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشتکاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو تھا، قرآن مجید کی یہ آیت اسی طریقہ سود کو مٹانے کے لیے نازل ہوئی:

﴿ يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۳۰)

''مسلمانو! دونا، چار گنا سود نہ کھاؤ اور خدا سے ڈرو یقین ہے کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔''

سود کے علاوہ قرض کے متعلق اور بھی مختلف قسم کی ناجائز سختیاں پیدا ہو گئی تھی مثلاً: اگر راہن میعادِ متعینہ پر مالِ مرہونہ کو چھڑا نہ سکتا تھا تو مرتہن اس کا مالک ہو جاتا تھا [3] مال و دولت سے گزر کر عورتوں اور بال بچوں تک کو رہن رکھواتے۔ [4]

لوٹ مار

عرب میں روز کی لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو قتل و غارت گر اور راہزن بنا دیا تھا، تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے تھے، جنہوں نے راہزنی کو اپنا بالکل ذریعۂ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا، اس قسم کے

---

[1] فتوح البلدان بلاذری فتح طائف، ص:٦٣۔ [2] ابوداود، کتاب الامارۃ، باب فی اخذ الجزیۃ:٣٠٤١۔
[3] مؤطا امام مالک، ص: ٣٠٤۔ [4] بخاری، کتاب المغازی قتل کعب بن الاشرف:٤٠٣٧۔

لوگوں کو ''لصوص'' کہتے تھے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔

یہ گروہ شہر سے باہر میدانوں میں، جنگلوں میں، پہاڑ کے کھوؤں میں رہتا تھا اور ادھر سے جو مسافر یا قافلے گزرتے تھے ان کو لوٹ لیتا تھا ان کا استیصال صرف ایک پرزور نظام حکومت ہی سے ہو سکتا تھا جو عرب میں مفقود تھا، چنانچہ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب آپ سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے یہ پیشین گوئی کی کہ ''وہ دن آئے گا کہ جب حیرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف وخطر حضر موت کا سفر کرے گی۔'' چونکہ وہ قبیلہ طے کے رئیس تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لیے ان کو تعجب ہوا کہ طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے؟ [1] ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال و دولت، مویشی بلکہ اہل وعیال تک پر ڈاکہ ڈالنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ تاجروں اور سوداگروں کے قافلے بغیر کسی بھاری انعام کے کسی میدان میں سے بسلامت نہیں گزر سکتے تھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کی عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا اور مویشیوں کو ہانک کر لے جاتا تھا۔ چنانچہ صبح کا وقت جبکہ رات بھر چلنے کے بعد مسافر آرام کرتے تھے اس کام کے لیے مخصوص ہو گیا تھا، چنانچہ صبح کا لفظ عربی میں لوٹنے کے معنی میں جاہلیت میں عام طور پر بولا جاتا تھا۔ کامیاب ڈاکو اپنے کارناموں کو نظم کرتے تھے اور فخریہ پڑھتے تھے۔ ایک قبیلہ کا شاعر حارث نامی ڈاکو کے سلامت نکل جانے پر کہتا ہے:

یا لهف زيابة للحارث الصابح فالغانم فالآئب

''اے زیابہ کا افسوس حارث کے لیے جو صبح کو ڈاکہ ڈالنے والا، پھر لوٹنے والا، پھر بسلامت واپس جانے والا ہے۔''

حج کے تین مہینوں میں البتہ وہ اس پیشہ سے باز رہتے تھے لیکن اس سے زیادہ مدت پر وہ صبر نہیں کرتے تھے اور چونکہ ہر قبیلہ کے مال و دولت اور مویشی پر موقع پا کر اسی طرح تصرف کرتا تھا، اس لیے وہ اس کو عیب نہیں بلکہ بہادری کا کام سمجھتے تھے اور اس طرح ملک میں مسلسل قتل وغارت اور لوٹ مار کا طریقہ جاری تھا۔

چوری

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج عام تھا، مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہیں رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے تھے، وہ تنہا بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جا کر اس کام کو انجام دیتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، ان میں سے سلیک بن السلکہ اور تابط شرًا شہرت عام رکھتے تھے، تابط شرًا کا ایک قطعہ حماسہ میں ہے جس میں اپنی چوری اور حیلہ گری کا ذکر بڑے فخر سے کیا ہے۔

قریش میں تجارت کے سبب سے دولت بھی تھی اور خود خانہ کعبہ میں تحفوں اور نذرانوں کا خزانہ جمع رہتا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب علامات النبوة فی الاسلام: ۳۵۹۵۔

تھا، اس لیے ان میں چوری کے مواقع بھی زیادہ تھے، چنانچہ کلبی نے متعدد ممتاز قریشیوں کے نام بتائے ہیں جنھوں نے اس خزانہ سے سونے کا ہرن چرالیا تھا [1] بلکہ اس کے لیے خاص طور سے ابولہب کا نام لیا جاتا ہے۔ [2]

عام بدو عربوں میں یہ برائی جتنی عام ہوگئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ آنحضرت ﷺ ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے تھے دوسری باتوں کے ساتھ ان سے یہ معاہدہ بھی لیتے تھے کہ ''وہ آئندہ چوری نہ کریں گے۔'' [3] بلکہ خود قرآن پاک نے آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔ [4]

چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ٹیڑھا لوہا (مِحجن) لگا رکھا تھا حج کے زمانہ میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔ [5]

جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے، چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبیلے تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال واسباب کی چوری کیا کرتے تھے۔ [6]

چونکہ یہ چوری عربوں کی اقتصادی کمزوری کا نتیجہ تھی، اس لیے اس کے لیے غیر و بیگانہ کی تخصیص نہ تھی بلکہ اس کا اثر اعزہ واقارب، ہمسایہ، دوست و آشنا، خاندان غرض سب پر پڑتا تھا چنانچہ مدینہ میں بشر، بشیر، مبشر تین آدمی تھے، جن کو ''بنوابیرق'' کہا جاتا تھا، ان میں بشیر منافق تھا اور آنحضرت ﷺ کی ہجو میں شعر کہہ کر دوسروں کی طرف منسوب کر دیتا تھا یہ لوگ نہایت تنگ دست اور فاقہ مست تھے، انہوں نے رفاعہ نامی ایک شخص کے بالا خانہ سے جس میں ہتھیار و تلوار اور زرہ وغیرہ بھی رکھی ہوئی تھی نقب لگا کر چوری کی، آپ ﷺ نے رفاعہ کے ہتھیار واپس دلائے، لیکن رفاعہ نے ان کو خدا کی راہ میں وقف کر دیا اور بشیر بھاگ کر مشرکین سے جاملا۔ [7]

مردوں کے علاوہ عورتیں بھی اس مرض میں گرفتار تھیں، اسی لیے قرآن پاک نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت یہ عہد لینے کی بھی تاکید کی کہ ﴿ وَلَا يَسْرِقْنَ ﴾ (٦٠/ الممتحنة: ١٢) یعنی ''وہ چوری نہ کریں گی۔'' شرفا اگر اس الزام میں پکڑے جاتے تو وہ چھوڑ دیے جاتے تھے اس لیے یہ برائی رکنے نہیں پاتی تھی،

[1] فتح الباری، ج ١٢، ص: ٧٧۔ [2] کتاب المعارف لابن قتیبة، ص: ٥٥۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب الحدود کفارة: ٦٧٨٤۔ [4] ٦٠/ الممتحنة: ١٢۔

[5] مسلم، کتاب الکسوف، باب ماعرض علی النبی ﷺ فی صلوة الکسوف من امر الجنة والنار: ٢١٠٢۔

[6] بخاری، کتاب المناقب، باب ذکر اسلم وغفار ومزینة: ٣٥١٦؛ مسلم، کتاب المناقب، باب من فضائل غفار واسلم وغفار: ٦٤٤٤۔ [7] ترمذی، کتاب التفسیر سورة النساء: ٣٠٣٦۔

چنانچہ اسلام کے بعد بھی جب قبیلہ مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو اس پر قریش کو سخت تردد ہوا اور لوگوں نے کہا، اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی خدمت میں کون سفارش کرے گا؟ لوگوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا جن کو آپ بہت پیار کرتے تھے، انہوں نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم حدود اللہ کے متعلق سفارش کرتے ہو؟'' پھر کھڑے ہو کر خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ ''گزشتہ قومیں صرف اس لیے ہلاک ہو گئیں کہ جب شریف آدمی چوری کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے اور ضعیف چوری کرتا تھا تو اس کو سزا دیتے تھے، خدا کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ لیتا۔'' [1]

خود شہر کے اندر اس قسم کی واردات کی یہ حالت تھی کہ صفوان بن امیہ ایک روز ایک بیش قیمت چادر اوڑھ کر سو رہے تھے ایک شخص نے موقع پا کر اس کو اڑا لیا وہ گرفتار کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لایا گیا، تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا صفوان کو اس پر رحم آیا اور آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ایک چادر کے لیے ایک عرب کا ہاتھ کاٹا جائے گا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''میرے پاس لانے سے پہلے ہی اس کا خیال رکھنا تھا، حاکم تک معاملہ پہنچنے کے بعد کسی کو سفارش کا حق حاصل نہیں۔'' [2]

سفاکی و بے رحمی و وحشت

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے، زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی مرغوب غذا تھی۔

زندہ جانوروں کو درخت سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے، مقتولوں کے ناک کان کاٹ لیتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتیں، منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔

سزا دینے کا ایک یہ طریقہ تھا کہ مجرم کو دو درختوں کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان میں باندھ دیتے اور پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔ کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیتے، اس کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے، اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور رؤسا دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی آدمی کو کسی کوٹھری میں قید کر کے اس کا کھانا پینا بند کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ کر مر جاتا تھا اس طریقہ سزا کا نام ان کے ہاں ''صبر'' تھا، مردوں کی قبر پر اونٹ باندھ دیتے تھے اور اس کو کھانے کو نہیں دیتے تھے وہ چند روز میں مر جاتا تھا، سمجھتے تھے کہ یہ مردے کی سواری بنے گا، اس اونٹ کو ''بلیہ'' کہتے تھے۔

---

[1] بخاری، کتاب الحدود، باب کراهية الشفاعة فی الحدود إذا رفع الی السلطان:٦٧٨٨۔

[2] دار قطنی، کتاب الحدود والدیات، ٣/ ٢٠٤: ٣٤٣٠۔

زنا اور فواحش

زنا اور فسق و فجور عام تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کیے جاتے تھے۔ امرء القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا اس کے ساتھ شہزادہ اور والی ملک بھی تھا، اس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیزہ، اور دیگر عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل کے ساتھ لکھی ہیں، باوجود اس کے کہ اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اہل جاہلیت گو بالاعلان زنا کو جائز نہیں سمجھتے تھے لیکن چوری چھپے کرنے کو جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں مضائقہ نہیں [1] فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں [2] اور صاحب جائداد کہلاتی تھیں۔ ان کی اولاد اصلی اور حلالی اولاد کے برابر سمجھی جاتی تھی۔ اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ معظمہ میں تھیں ان میں سے ایک کا نام ''عناق'' تھا۔ مرثد غنوی نے آنحضرت ﷺ سے اجازت مانگی کہ میں عناق سے نکاح کرلوں۔ اس پر یہ آیت اتری: [3]

﴿ وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ ﴾ (۲٤/ النور:۳۰)

''اور زانیہ عورت سے زانی یا مشرک ہی نکاح کرتے ہیں۔''

بڑے بڑے رؤسا گھر کی لونڈیوں کو یہ حکم دیتے تھے کہ بدکاری کے ذریعہ سے جا کر کچھ کما لائیں اور ان کی نذر کریں، عبداللہ بن ابی مدینہ کا رئیس تھا اور اس درجہ کا شخص تھا کہ ہجرت سے پہلے تمام انصار نے تاج بنوالیا تھا کہ اس کو بادشاہ بنا کر پہنائیں گے، چنانچہ صحیح بخاری میں یہ واقعہ منقول ہے۔ عبداللہ بن ابی کی دو لونڈیاں تھیں ایک کا نام مسیکہ تھا اور دوسری کا نام امیمہ تھا وہ ان دونوں کو زنا کاری کرانے پر مجبور کرتا تھا، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت اتری: [4]

﴿ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَاۗءِ ﴾ (۲٤/ النور:۳۳)

''اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو۔''

موجودہ طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں بدکاری ہی کی قسمیں تھیں ایک یہ کہ کوئی شجاع اور بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو بھیج دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے

---

[1] تفسیر طبری آیت: محصنت غیر مسافحت، ج٥، ص: ١٣، مصر۔
[2] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب من قال: لا نکاح الا بولی: ٥١٢٧۔
[3] ابوداود، کتاب النکاح، باب قوله: الزانی لا ینکح الا زانیة: ٢٠٥١۔
[4] صحیح مسلم، کتاب التفسیر، باب قوله تعالی ﴿ولا تکرهوا فتیٰتکم علی البغاء﴾: ٧٥٥٣۔

پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہو جاتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی تھی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلوا بھیجتیں وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح باب من قال لا نکاح الا بولی:۵۱۲۷ میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔ ایک اور قسم عارضی نکاح کی جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت متعینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گزرنے کے بعد اس کی اجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے تھے اس کو متعہ کہتے تھے، اسلام نے شروع میں اس کو ضرورۃً چندے باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لیے اس کو حرام کر دیا۔

بے شرمی و بے حیائی

شرم و حیا کا وجود نہ تھا، حجِ کعبہ میں ہزاروں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن (قریش کے سوا) باقی سب مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، عورتیں جب ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ سترِ عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں:

اليوم يبدُوْ بعضُهٗ او كلُّهٗ   فما بدا منه فلا اُحِلُّهٗ

''آج بدن کا کچھ حصہ کھلے گا یا سارا اور جو کھلا ہے اس سے لطف اٹھانے کی میں اجازت نہیں دیتی۔''

صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے۔ [1]

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔ [2]

پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے [3] جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے [4] سوتیلی ماؤں پر وراثۃً قبضہ کر کے بیوی بناتے۔

عورتوں پر ظلم

عورتوں کی حالت نہایت خراب تھی، مورث کے متروکہ میں سے ان کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ عرب کا قول تھا کہ میراث اس کا حق ہے جو تلوار پکڑ سکتا ہو، اسی بنا پر چھوٹے بچے بھی وراثت سے محروم رہتے تھے۔

لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عینِ میدانِ جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آ جاتیں اگر صلح ہو جاتی

---

[1] صحيح مسلم، كتاب التفسير، باب قوله تعالىٰ: ﴿خذوا زينتكم عند كل مسجد﴾: ۷۵۵۱۔

[2] نسائی، كتاب الغسل، باب الاستتار عند الغسل: ۴۰۶۔ [3] ابوداود، كتاب الطهارة، باب الاستبراء من البول: ۲۱۔ [4] ابوداود، كتاب النكاح، باب مايكره من ذكر الرجل ما يكون من اصابته اهله: ۲۱۷۴۔

اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو چکے ہوتے بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور یہ کوئی عیب نہیں خیال کیا جاتا تھا، فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اشعار میں ادا کرتے۔ بنو ضبہ نے جب بنو عامر پر فتح پائی تو ان کی عورتوں کو عین میدان جنگ میں رسوا کیا۔ فرزدق نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

فظلت وظلت یرکبون هبیرها　　　ولیس لهم الا عوالیها ستر

''تو لوگ عورتوں پر متصرف ہو گئے اور اگر کوئی پردہ بیچ میں تھا تو وہ صرف نیزے تھے۔''

قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا وہ حرحان کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت جریر کہتا ہے:

نکحت نساء هم بغیر مهور　　　''ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا۔''

عمرو معد یکرب، عرب کے مشہور بہادر اور شاعر تھے، ان کی بہن ریحانہ کی عصمت اسی طرح جب برباد ہوئی تو عمرو نے کہا:

امن ریحانة الداعی السمیع　　　''کیا ریحانہ کی طرف سے کوئی پکارنے والا سننے والا ہے۔''

یؤرقنی واصحابی هجوع　　　''جس نے مجھے بے خواب رکھا ہے لیکن میرے احباب سوتے ہیں۔''

اذالم تستطع امرا فدعه　　　''اگر تم کسی کام کو نہ کر سکو تو اس کو چھوڑ کر

وجاوزه الی ماتستطیع [1]　　　وہ کرو جو کر سکتے ہو۔''

طلاق کے لیے کوئی مدت اور عدت نہ تھی یعنی جب تک شوہر چاہے عورت نہ شوہر کے پاس رہ سکتی تھی نہ کسی اور سے شادی کر سکتی تھی۔

نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ غیلان بن سلمہ ثقفی جب اسلام لائے تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ وہب اسدی نے اسلام قبول کیا تو ان کے عقد نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں۔ [2]

دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے باپ مرجاتا تو اس کی کل بیویاں (بجز حقیقی ماں) بیٹے کے تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتی تھیں۔

ایام کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔

عورت جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری رہنے کو اور خراب سے خراب کپڑے پہننے کو دیئے جاتے خوشبو وغیرہ کی قسم کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی، اس حالت کے ساتھ جب پورا سال گزر جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے جسم کو مس کرتی پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی وہ مینگنی کو پھینک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی اور قدیمی حالت قائم ہوتی [3] عورت کا جو مہر مقرر ہوتا

[1] کتاب الاغانی، جزء تاسع، ص: ۱۲ اخبار درید بن الصمة۔

[2] ابو داود، کتاب الطلاق، باب فی من اسلم وعنده نساء اكثر من اربع: ۲۲۴۱۔

[3] ابو داود، کتاب الطلاق، باب احداد المتوفی عنها زوجها: ۲۲۹۹۔

وہ باپ کو ملتا عورت کو اس سے سروکار نہ ہوتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ گاہِ مشق تھی، رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا:

﴿ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ ﴾ (١٦/ النحل: ٥٨، ٥٩)

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے، تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور سوچتا ہے) کہ ذلت کے ساتھ اس کو قبول کر لے یا زندہ زمین میں دفن کر دے۔''

ابوحمزہ ایک رئیس تھا اس کے لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے گھر میں رہنا چھوڑ دیا اس پر اس کی بیوی یہ اشعار پڑھ پڑھ کر بچی کو لوریاں دیتی تھی:

مالا بی حمزۃ لا یاتینا یبیت فی بیت اللتی تلینا

''ابوحمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے پاس نہیں آتا اور ہمسایہ کے گھر میں رات بسر کرتا ہے۔''

غضبان الا نلد البنینا تاللہ ماذاك بایدینا

''اس پر ناراض ہے کہ ہم بیٹے نہیں جنتے، خدا کی قسم یہ ہمارے اختیار کی بات نہیں۔''

ونحن کالزرع لزارعینا ننبت ما قد زرعوہ فینا

''ہم بطور کھیت کے ہیں، ہم میں جو بویا جائے گا وہی اگے گا۔''

رفتہ رفتہ دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی۔ لڑکی پیدا ہوتی تو اس کو میدان میں لے جا کر زمین کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے اس کو عربی میں واد کہتے ہیں۔ ایک صاحب نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر ظاہر کیا تھا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کیں۔ [1]

عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا تھا ان کا قانون تھا کہ وراثت کا حق اسی کو ہے جو تلوار چلائے۔ [2] عورت بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک سمجھی جاتی تھی وہ اگر بیوہ پر چادر ڈال دیتا تو وہ اس کی جائز مدخولہ بن جاتی۔ [3]

وحشت و جہالت

حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ تھی ہر چیز اور ہر جانور جو کھا سکتے تھے کھاتے تھے۔ حشرات الارض عام غذا تھی،

[1] تفسیر ابن جریر تفسیر سورہ ﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ﴾ جز ٣٠، ص: ٤٠؛ تفسیر ابن کثیر، تفسیر سورہ مذکورہ، جز ٤، ص: ٤٧٨۔ [2] تفسیر ابن جریر، تفسیر ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ﴾ جز ٤، ص: ١٧١۔ [3] ایضاً، ص: ١٩٢ تفسیر ﴿وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ﴾

چھپکلی تک کھا جاتے تھے، خون کو جما لیتے تھے اور قاشیں تراش تراش کر کھاتے، مردہ جانور کھانا عام بات تھی۔ ❶ چمڑے کو آگ میں بھون کر کھاتے، زندہ جانور کا گوشت کاٹ کر کھا لیتے تھے، گردن مروڑ کر، ڈنڈے سے مار کر، درندوں کا مارا ہوا سب کھاتے تھے، ❷ گدھے کا گوشت بھی کھاتے تھے۔ ❸

عرب کا مشہور جاہلی شاعر اعشی، میمون جس نے آغازِ اسلام کا زمانہ پایا اور اہلِ عرب نے آنحضرت ﷺ کی مدح میں اس کا قصیدہ نقل کیا ہے، اس میں وہ اسلام کی تائید میں اہلِ عرب کو جن باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہے، وہ یہ ہیں:

وایاك والمیتات لا تا کلنها ❹ ولا تاخذن سهمًا حدًا لتفصّدا

''مرداروں سے پرہیز کر اور ان کو نہ کھا اور نہ تیز تیر سے جانور کو فصد دے کر مار کر کھا۔''

وذا النصب المنصوب لا تنسکنه ولا تعبد الاوثان واللّٰه فاعبدا

''اور نہ کھڑے کیے ہوئے بتوں پر قربانی کر اور نہ بتوں کی پوجا کر اور اللہ کی عبادت کر۔''

ولا السائل المحروم لا تترکنه لعاقبة ولا الاسیر المقیدا

''اور محروم بھیک مانگنے والے کو کسی اور انجام کے لیے مت چھوڑ اور نہ زنجیر میں بندھے ہوئے قیدی کو۔''

ولا تسخرن من بائس ذی ضرارة ولا تحسبن المال للمرءِ مخلدا

''اور نہ کسی مصیبت زدہ مفلس سے ٹھٹھا کر اور نہ کبھی یہ سمجھ کہ مال آدمی کے لیے ہمیشہ رہنے والا ہے۔''

ولا تقربن جارة ان سرها علیك حرام فانکحن اوتابّدا

''اور نہ اپنی ہمسایہ خاتون سے بدکاری کر، وہ تجھ پر حرام ہے تو یا نکاح کر لے اور یا کنوارا رہ جا۔''

---

❶ اسباب النزول سیوطی آیت ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ برحاشیہ تفسیر القران العظیم، ج۱، ص: ۹۸۔

❷ تفسیر طبری، سورۃ مائدۃ بیان ماکولات۔

❸ صحیح نسائی، کتاب الصید والذبائح، باب تحریم اکل لحوم الحمر الاهلیة: ۴۳۴۵، ۴۳۴۶۔

❹ دیوان اعشی مطبوعہ ویانا ۱۹۲۷ء ص: ۱۰۳ وشعراء النصرانیة، قسم ثالث، ص: ۳۶۵۔

عربوں کی خصوصیات

خیر الامم بننے کی اہلیت

لیکن ان تمام مفاسد اور برائیوں کے باوجود اہل عرب میں کچھ ایسی خصوصیتیں بھی تھیں جو دنیا میں صرف انہیں کے ساتھ مخصوص تھیں اور ان کی انہی فطری اور طبعی خصوصیات وامتیازات کا اثر تھا کہ خالق فطرت نے ان کو اپنی نبوت ورسالت اور تعلیم وشریعت کا اہل سمجھا اور ان کو اپنے اس خلعتِ خاص سے سرفراز کیا۔

صحتِ نسب

ان خصوصیات میں سب سے پہلی چیز ان کی صحیح النسبی ہے۔شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے اور یہ بات ایسی مشہور ومتواتر روایتوں سے ثابت تھی کہ کسی نے اس کی تردید کی ہمت نہیں کی،توراۃ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جن اولادوں کے نام بتائے ہیں ان میں سے ایک ایک نام کا سراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے،چنانچہ ریورنڈ فارسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو تاریخی جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں،قدیم یہودی مؤرخ یوسیفوس نے بھی یہی لکھا ہے [1] اور آج کل ایک یہودی فاضل ڈاکٹر اسرائیل ولفنسون نے تاریخ الیھود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے،اس میں بھی اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلیلیں پیش کی ہیں [2] اور بعض حال کے مناظر عیسائیوں کے علاوہ اس واقعہ کے تواتر میں کسی نے شک نہیں کیا ہے اور غالباً اسی لیے سینٹ پال نے اپنے خطوط میں عرب کی ہاجرہ کی تمثیل استعمال کی ہے [3] اور قرآن پاک نے اہل عرب اور قریش کو خطاب کر کے صاف کہا:

﴿ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸) ''تمہارے باپ ابراہیم کا مذہب۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام تک نام بنام سلسلہ نسب کے پہنچنے میں پشتوں کی کمی بیشی یا ناموں کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے مگر مجموعی حیثیت سے یہ دعویٰ کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے کسی حیثیت سے مشکوک نہیں ہے خصوصاً جب اس کے ساتھ خارجی قرآئن پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہی تمدن اور طرز معاشرت جو توراۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے اہل وعیال کی نظر آتی ہے اسلام کے بعد تک بلکہ آج تک وہ اسی طرح عربوں میں قائم وباقی ہے وہی خیمے ہیں،وہی صحرا ہیں،وہی مویشی ہیں،وہی بدویانہ زندگی ہے،وہی رسوم ورواج ہیں جن کو اسلام نے آ کر اور زیادہ نکھار دیا،وہی بیت اللہ کا حج اور قربانی کی عبادتیں ہیں اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔مشہور جرمن محقق نولڈیک کہتا ہے:

[1] ترجمہ انگریزی ۱۸۲۲ء جلد اول،ص:۲۵۔ [2] تاریخ الیھود فی بلاد العرب لا سرائیل ولفنسون مطبوعہ مطبعة الاعتماد مصر، ص: ۷۵، ۷۶۔ [3] سینٹ پال گلیتون کے نام باب ۴۔۲۵ کتاب العہد الجدید،ص:۵۸۱۔

''اور نیز عربوں میں قدیم سامی کیریکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔'' [1]

اہل عرب کو اپنے حسب ونسب کی حفاظت کا جو خیال ولحاظ تھا، اس کے ذکر سے عرب کی تاریخیں معمور ہیں، چنانچہ نسب پر فخر کرنا ان کی شاعری کا اور نسبی مفاخرت ان کی تقریر کا سب سے بڑا موضوع تھا۔ اپنے باپ دادوں کے مسلسل ناموں کو یاد رکھنا ان کا خاندانی فرض سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ انسانوں سے ہٹ کر جانوروں (گھوڑوں) تک کے نسب نامے محفوظ رکھتے تھے قبائل کے نسبی تعلقات کو یاد رکھنے والے خاص خاص لوگ ہر قبیلہ میں موجود رہتے تھے اور یہی سبب ہے کہ آج بھی ان کے اکابر اور مشاہیر کا سلسلہ نسب آپ کو معلوم ہو سکتا ہے اور اس پر بہت سی اہم کتابیں لکھی گئی ہیں اور یہ وہ خصوصیت ہے جو دنیا میں صرف اہل عرب کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہود اور بنی اسرائیل بھی گو حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی نسل سے تھے مگر وہ بھی اس خصوصیت میں ان کی برابری نہیں کر سکتے کہ دوسری قوموں کے اختلاط اور میل جول اور کسی خاص وطن نہ ہونے کے سبب سے ان کی اکثر خاندانی خصوصیتیں مٹ گئیں۔

نسب بجائے خود کوئی فخر کی چیز نہیں اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے عمل کے مقابلہ میں نسبی فخر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کی ہدایت کے لیے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان میں ایک نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور خدا نے ان کی نسل میں دینی اور دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے اور ان کے حقیقی مصداق بننے کے لیے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو اس شرف کے ساتھ مخصوص کیا۔

کسی پہلے مذہب میں داخل نہ تھے

اسی طرح ان کو ان تمام اثرات سے محفوظ رکھا جو قوموں کے عادات و اخلاق اور استعدادات کو بدل دیتے ہیں، مثلاً: وہ باوجود اس کے کہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا تھا۔ مجوسیت خلیج فارس سے لے کر یمن تک حکمران تھی، یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج ولشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دل بادل کے ساتھ یمن سے لے کر شام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بنا بھی چکی تھی مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر باقی تھا۔ عرب میں جو نیک طبع اور دیندار لوگ ہوتے تھے وہ مجوسی یا یہودی یا عیسائی ہونے کے بجائے اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لیے اپنے مذہب کا نام ''دین حنیفی'' رکھتے تھے اور یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ خاتم الانبیاء ﷺ کے ذریعہ دین ابراہیمی کی دعوت وتجدید کا راستہ کھلا رہے۔

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ''السنہ سامیہ'' میں نے ارض القرآن، جلد اول، ص: ۱۰۷ سے ص: ۱۱۶ تک اس پر مدلل بحث کی ہے اور علمائے یورپ کے حوالے یکجا کر دیے ہیں۔

محکوم نہ تھے

عرب کا ملک تخلیقِ عالم کے آغاز سے اسلام تک ہر غیر قوم کی حکومت سے ہمیشہ آزاد رہا، شمالی عرب نے کبھی کسی قوم کی غلامی نہیں کی، بابل کے بخت نصر نے بنی اسرائیل کو زیروزبر کر دیا مگر عرب کی طرف آنکھ نہ اٹھا سکا، یونانیوں اور رومیوں نے مصر سے لے کر عراق کی سرحد تک صدیوں تک حکومت کی مگر خاص عرب کے اندر قدم نہ رکھ سکے، سکندر نے اور اس کے بعد رومی سپہ سالاروں نے جب ادھر نظر اٹھائی تو فطرت نے ہمیشہ ان کو شکست دی، عرب کا ملک دنیا کی دو عظیم الشان حکومتوں یعنی ایران اور روم کی سرحد پر واقع تھا مگر وہ دونوں اپنے حرص وآز کا ہاتھ اس کی طرف بڑھانے سے قاصر رہیں، گستاخ عیسائی حبشیوں نے یمن فتح کرنے کے بعد ہاتھیوں کے جھرمٹ کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی مگر قدرتِ الٰہی نے ان کو تباہ کر دیا۔ یہ تمام اہتمام وانتظام اس لیے تھا کہ کوئی دوسری جابرانہ قوت ان کے دل ودماغ کی استعداد برباد نہ کر سکے، ان کی آزادی کی روح برقرار اور ان کی فاتحانہ طاقت بدستور قائم رہے، تاکہ یہ مخفی خزانہ خدا کے آخری مذہب کی حکومت کے قیام وبقا میں کارآمد ہو۔

کتابی فاسد تعلیم سے ناآشنا تھے

جس طرح وہ خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے یعنی اس ذریعہ سے بھی وہ دوسری قوموں کے دماغی اثرات سے محفوظ تھے اور علم کی جاہلانہ اور کج بحثانہ ذہنیت سے پاک تھے وہ اُمّی تھے، تاکہ ایک اُمی معلم کی ربانی تعلیم کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح تیار رہیں۔

وہ زمین کے وسط میں آباد تھے

عرب کا ملک پرانی دنیا کے وسط میں واقع ہے، ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے۔ پھر بحری جائے وقوع نے اس کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا اس لیے عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر، ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل، ہندوستان تک پہنچ گئے اور دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور اسپین تک جا پہنچے اور بحری راستوں سے ایک طرف سے تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار پھر ادھر جزائر ہند، جاوا، سماٹرا، اور چین تک ان کا گزر ہوا، اور دوسری طرف سائپرس، کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا۔ یہ تمام مواقع اس لیے میسر آئے کہ عرب کی جائے وقوع اس دعوت کے لیے مناسب مرکز تھا۔ فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہوتا پھر یہ کہ اس وقت تک دنیا جن دو مشرقی اور مغربی طاقتوں کے زیر فرمان تھی ان دونوں کے زور کو برابر طور سے اور ایک ساتھ توڑنے کے لیے عرب کے سوا دنیا میں کوئی جگہ موزوں نہ تھی جہاں سے دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دنیا کو ان کے خون آشام پنجوں سے نجات دینا با آسانی ممکن ہو۔

بعض اخلاقی خوبیاں

ان کے علاوہ اہل عرب کو خیر الامم بننے اور عالم کے لیے شاہد، نمونہ اور مصلح بننے کے لیے کچھ اور اخلاقی خوبیوں کی بھی ضرورت تھی اور وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ ان خوبیوں کے بغیر وہ اسلام کی عظیم الشان تحریک کے علم بردار نہیں ہو سکتے تھے اور نہ وہ دنیا کی راہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے۔

شجاع و بہادر تھے

وہ حد سے زیادہ شجاع و بہادر تھے، وہ خطرات سے بے خوف تھے اور لڑائی کو کھیل سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے یہی سبب ہے کہ وہ تمام دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کے مقابلہ میں تنہا کھڑے ہوئے اور کسریٰ و قیصر کو انہوں نے ایک ساتھ چیلنج دیا اور اس تحریک کے پھیلانے میں تھوڑی تھوڑی غیر مسلح جمعیتوں سے ہزاروں اور لاکھوں کی فوج کا بے خطر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

پرجوش تھے

ساتھ ہی وہ پرجوش بھی تھے اس لیے جس دعوت اور تحریک کو لے کر اٹھے اس کو پوری کوشش، عزم اور جوش کے ساتھ دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلایا ان کے عزم اور جوش کو نہ پہاڑ روک سکا اور نہ سمندر اس سے ٹکرا سکا، ہر جگہ وہ توحید کا علم لیے بحر و بر، دشت و جبل میں پھیل گئے اور اپنے عزمِ راسخ سے ارکان عالم کو متزلزل کر دیا۔

حق گو تھے

ان کی جسمانی شجاعت و بہادری نے ان کو دل کا شجاع اور بہادر بھی بنا دیا تھا، جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی وہی ان کی زبان پر تھی، اہل مدینہ میں جو نفاق کا عنصر پیدا ہو گیا تھا وہ یہود کے اثر کا نتیجہ تھا ورنہ قریش اور عام اہل عرب میں یہ بات نہ تھی یا تو وہ کھلے دشمن تھے یا کھلے دوست۔ اپنے نزدیک وہ جس کو حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ان کو کسی کا باک نہیں ہوتا تھا۔

عقل و دانش والے تھے

باوجود اس کے کہ وہ عموماً ظاہری نوشت و خواند سے عاری تھے مگر فطرت کے عطیۂ عقل و دانش سے وہ کافی طور بہرہ مند تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، طلحہ، زبیر، خالد، ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم وغیرہ سینکڑوں ہزاروں صحابہ نے علم، مذہب، اخلاق اور سیاست میں جو نکتہ سنجیاں کیں وہ خود ان کی عقل و دانش کی گواہ ہیں، روم و ایران کی متمدن قوموں سے جس طرح انہوں نے معاملہ، مراسلہ اور نامہ و پیام کیا اور علم و سیاست کے الجھے سے الجھے ہوئے مسئلہ کو جس طرح سلجھایا وہ خود اسی نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کے شعرا کے کلام، ان کے مقرروں کی تقریریں، ان کے فصحا کے مقولے سنئے تو ان کی اس فطری صلاحیت کا

اندازہ ہوگا کہ ظاہری تعلیم کے بغیر کیونکر یہ لعل و گہر وہ اپنے منہ سے اگل سکے۔

ذہن اور حافظہ کے تیز تھے

فطرت کا قاعدہ ہے کہ اگر اس کے بعض قویٰ بیکار ہیں تو ان کی قوت دوسرے زیر عمل قویٰ کو وہ منتقل کر دیتی ہے اور جس عضو سے زیادہ کام لیا جاتا ہے اس کی قوت کو وہ ترقی دیتی رہتی ہے۔ اسی اصول کے موافق ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند سے محروم ہونے کے سبب سے جہاں ان کے بعض قویٰ بیکار ہو رہے تھے وہاں ان کو اپنی یادداشت کے لیے تحریری اوراق اور سفینوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے دل و دماغ پر بھروسہ کرنے کی عادت تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کا ذہن اور حافظہ بہت قوی تھا یہی سبب ہے کہ ان کے شعرا اپنے بڑے بڑے قصیدوں کو زبانی پڑھتے تھے اور جو کچھ کہتے تھے اس کو برزبان یاد رکھتے تھے اور ان کی اسی قوت کا یہ فیض تھا کہ ان میں کا بڑا طبقہ تحریر کے بغیر قرآن پاک کی بڑی بڑی سورتوں کو یاد رکھتا تھا اور بہتیرے ایسے تھے جو پورے قرآن کو یاد رکھتے تھے اور یہ انہیں کی تقلید ہے کہ دنیا کے ہر حصہ میں ایسے ہزاروں مسلمان پائے جاتے ہیں جو پورے قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اور اہل عرب کی اسی خصوصیت کا مظہر یہ بھی تھا کہ احادیث و سیر اور واقعات کا بڑا سرمایہ تحریر کے علاوہ زبانی ایک دوسرے کو پوری ذمہ داری اور حفاظت کے ساتھ منتقل ہوتا رہا اور سینکڑوں اصحاب ایسے تھے جو ہزاروں لاکھوں احادیث کو حرف حرف اور لفظ لفظ کی پابندی کے ساتھ یاد رکھتے تھے، اہلِ عرب کی اس خصوصیت نے اسلام کی حفاظت اور اشاعت کا نہایت اہم فرض انجام دیا۔

فیاض تھے

اہل عرب کی ایک خاص امتیازی صفت ان کی فیاضی تھی، مہمان نوازی ان کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں وہ اپنی جان تک لڑا دیتے تھے، اپنی شہرت اور ناموری کے لیے اونٹوں کو ذبح کر کے کھلا دینا یا جوئے میں جیتی ہوئی دولت کو احباب کے جلسہ دعوت میں اڑا دینا اور اس پر فخر کرنا ان کی قومی رسم تھی اور یہی اوصاف ان کی شاعرانہ مدح میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتے ہیں۔ اسلام نے ان کی اسی صفت کو تھوڑی سی اصلاح کے بعد خدا کی راہ میں خیرات و صدقات و زکوٰۃ سے بدل دیا اور اسلام کی مشکل کشائی میں اس نے سب سے زیادہ مدد دی۔

مساوات پسند تھے

چونکہ وہ کبھی کسی دوسری قوم کے محکوم نہ ہوئے تھے اور نہ وہ کسی ایک مطلق العنان بادشاہ کے تابع فرمان بنے تھے، اس لیے ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا، وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے، وہ اپنے کو ذلیل کرنا پسند نہیں کرتے تھے اور وہ بڑے سے بڑے شخص کے سامنے برابری کے ساتھ بے باکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔

عرب میں بیسیوں لڑائیاں صرف اسی خودداری کی حفاظت میں پیش آئی تھیں جس کا ایک منظر سبعہ معلقہ کے آخری قصیدہ میں نظر آتا ہے۔ اہل عرب کے اس جذبہ نے حق گوئی مساوات اور جمہوریت پسندی وغیرہ اسلامی تعلیمات کے پھیلانے میں بڑی مدددی۔

عملی تھے

اہل عرب کے فطری اخلاق وکردار کی آخری دفعہ یہ ہے کہ وہ طبعاً عملی اور عملیت پسند تھے وہ اہل ایمان اور اہل ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آراء اور نظریہ باز نہ تھے وہ مجسم عمل تھے اور عملیت کو پسند کرتے تھے، وہ چون وچرا اور کیسے، کیونکر کی فلسفیانہ الجھنوں سے پاک تھے، وہ دنیا کے کاروباری آدمیوں اور سپاہیوں کی طرح چند اچھی باتوں کو قبول کر کے ان پر فوراً عامل بن جاتے تھے، یہی سبب ہے کہ عجمیانہ نکتہ آفرینی اور بال کی کھال نکال کر اس کی الجھنوں کے سلجھانے میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوئے، وہ ہمہ تن عمل اور صرف عمل تھے اسی بنا پر شارع علیہ السلام نے ان کے سامنے ایک عملی مذہب کو پیش کر کے ان کو سرتاپا عملی بنا دیا اور جو کچھ وہ تعلیم لائے تھے اس کا مجسم پیکر بن کر چند سال میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور دور دور سے بدوی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آتے اور شک وحجت اور مناظرہ وقیل وقال کے بغیر فرائض واخلاق کی عملی تعلیم حاصل کر کے اپنے قبیلہ میں واپس چلے جاتے تھے اور بالآخر اپنی عملی دعوت سے اپنے پورے قبیلے کو مسلمان بنا لیتے تھے وہ اگر مگر اور ممکن وناممکن کی بحث میں نہیں پڑتے تھے وہ تعلیم کو دیکھتے تھے اور سنتے تھے، وہ اچھی معلوم ہوتی تو اس کو قبول کرتے اور اس پر عمل کر کے دینی اور دنیاوی فوائد اور نتائج کے حصول کا یقین کرتے تھے اور اسی غیر متزلزل یقین اور ایمان کے بھروسہ پر وہ مشکل سے مشکل اور خطرناک سے خطرناک کام کر گزرتے تھے، اہلِ عرب کی اسی خصوصیت نے اسلام کی سادگی کو برقرار اور عجمی فلسفیت ونظریت سے پاک ومبرا رکھا اور ساتھ ہی چند سال کے اندر اندر مغرب ومشرق اور شمال وجنوب میں اسلام کا پھریرا آسمان پر اڑنے لگا۔

ان اوصاف کی مصلحت

اہل عرب کے ان تمام فطری وطبعی اوصاف واخلاق کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری دین کی اشاعت اور حفاظت کے لیے جس قوم کا انتخاب کیا تھا وہ ازل سے اس کے لیے منتخب ہو چکی تھی باوجود ان کی ہر قسم کی گمراہیوں کے ان کے یہ چند اچھے اوصاف اس لیے ان میں ودیعت کیے گئے تھے، تاکہ جب خدا کی بادشاہی کا دن آ پہنچے تو ان کی فطری استعداد کا یہ سرمایہ اس کی امداد واعانت کے لیے خزانہ غیب کا کام دے، یہی وہ سرمایہ تھا جو اس وقت نہ ہند وعجم میں تھا نہ روم وفرنگ میں اور نہ ترک میں تھا نہ زنگ میں، وہ عرب اور صرف عرب میں تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری نبوت کے لیے اسی قوم کو برگزیدہ کر کے یہ امانت اس کے ہاتھ میں سپرد کی، آنحضرت ﷺ نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام

کی اولاد میں اسماعیل کو پسند کیا اور اسماعیل کی اولاد میں بنی کنانہ کو اور بنی کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنو ہاشم اور بنو ہاشم میں سے مجھ کو۔'' ❶ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میں عبدالمطلب کے بیٹے عبداللہ کا بیٹا ہوں، اللہ نے ان تمام لوگوں کو پیدا کیا تو مجھے اس نے ان سب میں سے بہتر نسل میں رکھا، ان کو دو حصوں میں (عرب وعجم) میں تقسیم کیا تو مجھے اس حصے میں یعنی عرب میں بنایا جو سب سے بہتر تھا، اس حصے کو بھی قبیلوں میں تقسیم کیا تو مجھے اس قبیلہ میں پیدا کیا جو سب سے بہتر تھا، پھر اس قبیلہ کو گھرانوں میں تقسیم کیا تو مجھے سب سے بہتر گھرانے میں پیدا کیا، پھر اس گھرانے کو افراد پر تقسیم کیا تو مجھے اس گھرانے کا سب سے بہتر فرد بنایا۔'' ❷

❶ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فضل نسب النبی ﷺ: ۵۹۳۸؛ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۵، ۳۶۰۶۔

❷ جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب ما جاء فی فضل النبی ﷺ: ۳۶۰۷۔

صبحِ سعادت

دنیا اور عرب کی سرزمین اس ظلمت میں تھی کہ صبح سعادت نمودار ہوئی اور خورشید نبوت کے طلوع کا غلغلہ برپا ہوا، ظلمتِ شب کافور ہوئی اور تھوڑی دیر میں ذرہ ذرہ سورج کی کرنوں سے پرنور ہو گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سورج گو دنیا کو روشن کرنے نکلا تھا لیکن وہ نکلا عرب ہی کے اُفق سے تھا اس لیے ضروری تھا کہ اس کے نور سے پہلے اسی ملک کی زمین روشن ہو۔

ایک قوم کا انتخاب

سرور کائنات ﷺ کو گو خدا نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے بھیجا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی شریعتِ کامل عطا کی جو نہ صرف عربوں بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو، وہ جس کی ہر بات، ہر ادا، ہر جنبش عملی خطیب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنا لے۔

اس بنا پر خاتم الانبیاء ﷺ کا سب سے اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاح عالم کے لیے تیار کرنا تھا [1] دنیا کی اور قومیں باری باری اس منصب پر ممتاز ہو چکی تھیں ایک زمانہ تھا کہ جب بنی اسرائیل جیسی قوم جو آج تمام دنیا میں خوار اور ذلیل ہے ﴿ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝ ﴾ (۲/البقرہ:۴۷) ''ہم نے تم کو دنیا کی قوموں پر فضیلت دی۔'' کا تاج پہن چکی تھی لیکن اوپر بہ تفصیل گزر چکا کہ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا، صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح مادہ ہائے نشو و نما سے لبریز تھا اور ایک لوح سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا مشیت ایزدی نے اسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتاپا جہل، سرتاپا وحشت اور سرتاپا درندہ بن چکا تھا ﴿ كُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (۳/آل عمران:۱۱۰) ''تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لیے (پردۂ عدم سے) باہر لائی گئی ہو جو نیکیوں کا حکم دیتی اور برائیوں سے روکتی ہے۔'' کا مظہر بن گیا۔

---

[1] شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کے لیے مبعوث ہوتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں ہیں چند اور نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے:

يدعو قوما الى السنة الراشدة ويزكيهم ويصلح شانهم ثم يتخذهم بمنزلة جوارحه فيجاهد اهل الارض ويفرقهم فى البلاد وهو قوله تعالىٰ: ﴿ كُنتم خير امة اخرجت للناس ﴾۔

(حجة الله البالغة ، ص: ۱۲۳ مطبوعه هند)

''وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے، پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے اور ان کے ذریعہ سے مجاہدہ کرتا ہے جیسا کہ خدا نے کہا کہ تم بہترین امت ہو جو دنیا کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔''

ان لوگوں کا حلیہ و جمال اور خط و خال یہ تھا:

﴿ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (۲۲/ الحج:٤١)

''وہ لوگ کہ ہم جب ان کو دنیا میں اقتدار دیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوۃ دیں گے، اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔''

اصلاح وہدایت کی مشکلات

ہر قوم کی اصلاح وہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں لیکن ان کی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن عرب کی اصلاح میں ہر نوع، ہر حیثیت، ہر جہت کی گوناگوں اور لاعلاج مشکلات تھیں اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا۔ بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور وظلم کا طوفان ان کے سر سے گزر چکا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسانِ عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آ گئی تھی کہ جب ان سے یہ کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لو اور اسی پر تخت سلطنت بچھاؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صاف کہہ دیا کہ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے۔ یہ ایک امتدادِ معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت سے مر کر منقرض نہیں ہو گئی، بنو اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔

جہالت

عرب کی قوم اُمی محض تھی، الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی، جس سے ان کے کان آشنا ہوں، اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن مجید نے ان کے اس جاہلانہ حیرت واستعجاب کو متعدد آیتوں میں ذکر کیا ہے:

﴿ یٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِیْمِ ۝ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۝ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۝ تَنْزِیْلَ الْعَزِیْزِ الرَّحِیْمِ ۝ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّاۤ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝ ﴾ (۳٦/ یٰس:١-٦)

''قرآن حکیم کی قسم، تو بے شبہ پیغمبروں میں سے ہے، راہِ راست پر ہے، یہ قرآن رحمت والے غالب خدا کے پاس سے اترا ہے، تاکہ تو اس قوم کو آگاہ کرے، جن کے اسلاف کو آگاہ نہیں کیا گیا اور اس لیے وہ غفلت میں پڑے ہیں۔''

یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی۔

﴿ وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ ۡ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ ۚ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۚ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ ۚ اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝ ﴾

(۳۸/ صٓ:۴۔۷)

''اورانہوں نے تعجب کیا کہ ان میں ایک پیغمبر ہوکران کے پاس آیا، کافروں نے کہا یہ دروغ گو، جادوگر ہے اس نے اتنے خداؤں کا ایک خدا بنا دیا، یہ عجیب بات ہے، ان کے پنچ اٹھ کھڑے ہوئے کہ چلواوراپنے معبودوں پر جمے رہو، اس میں اس کی پیغمبر کی کوئی غرض ہے، ہم نے تو سابق مذہب میں یہ نہیں سنا یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔''

﴿ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِیْبٌ ۚ ﴾

(۵۰/ قٓ:۲)

''بلکہ ان کو تعجب ہوا کہ ان ہی میں سے ایک ان کے پاس پیغمبر بن کر آیا، کافروں نے کہا: یہ تو بڑے تعجب کی بات ہے۔''

صفاتِ الٰہی، آثارِ نبوت، احوالِ معادان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے اور نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں اس منصب پر تو فرشتوں کو ممتاز ہونا چاہیے تھا:

﴿ وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۲۱)

''اور جو ایک دن ہمارے سامنے آنے کے منکر ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فرشتے پیغمبر بنا کر ہم پر کیوں نہ اتارے گئے۔''

﴿ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ قَالُوْا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۱۴)

''پیغمبر جب ان کے سامنے سے اور پیچھے سے آتے ہیں کہ ایک خدا کے سوا اور کسی کو نہ پوجو، تو وہ کہتے ہیں کہ خدا اگر کسی کو پیغمبر بنا کر بھیجنا چاہتا تو فرشتوں کو اتارتا، ہم تو تمہاری باتوں کا انکار ہی کریں گے۔''

﴿ وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ یُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓی اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآء یل:۹۵)

''ہدایت آنے کے بعد صرف اس شبہ نے لوگوں کو ایمان لانے سے باز رکھا ہے کہ کیا خدا نے

آدمی کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے جواب میں کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے بستے ہوتے تو البتہ ہم آسمان سے کسی فرشتہ کو پیغمبر بنا کر بھیجتے۔"

نبی کا تخیل اگر ان کے ذہن میں کبھی آتا تھا تو بشریت سے ماوراصورت میں یعنی یہ کہ وہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو، اس کے پیچھے خدا کا اور فرشتوں کا پرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دست قدرت میں ہوں:

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۙ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۙ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۙ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل: ۹۰، ۹۳)

"انہوں نے کہا اے پیغمبر ہم تجھ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک زمین سے ہمارے لیے تو چشمہ نہ بہا دے، یا تیری ملکیت میں کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ نہ ہو، جن میں نہریں جاری کر دی ہوں یا جیسا کہ تو نے کہا ہم پر بادل کا کوئی ٹکڑا گرا دے، یا خدا اور فرشتوں کو پرا بنا کر نہ لے آئے یا تیرے پاس کوئی سونے کا گھر نہ ہو یا تو آسمان پر نہ چڑھ جائے۔"

﴿ وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۭ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ اَوْ يُلْقٰٓى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ۭ ﴾

(۲۵/ الفرقان: ۷، ۸)

"انہوں نے کہا یہ عجیب پیغمبر ہے، یہ تو کھاتا پیتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہ اترا جو اس کے ساتھ مل کر لوگوں کو ڈراتا یا اس کے پاس کوئی خزانہ کیوں نہیں ڈال دیا گیا یا اس کے لیے خاص کوئی باغ ہوتا جس سے یہ کھاتا۔"

پیغمبر کے لیے ان کے خیال میں یہ بھی ضروری بات تھی کہ وہ بڑا دولت مند ہو، اس کے قبضہ میں کوئی بڑی جائیداد ہو، میووں کے ہرے بھرے باغ اور سونے چاندی کے خزانے اس کے پاس ہوں، چنانچہ گزشتہ آیت میں کفار کے اس خیال کی طرف بھی اشارہ ہے، اسی لیے مکہ اور طائف کے جو رؤسا دولت مند تھے وہ اس منصب کے سب سے زیادہ مستحق سمجھے جاتے تھے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰي رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ؀ ﴾

(۴۳/ الزخرف: ۳۱)

"وہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اترا۔"

کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنی ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی

لکھائی ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر آئے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ﴾ (۲۵/ الفرقان:۳۲)

''کافروں نے کہا، اس پر قرآن یکبارگی کیوں نہیں اترا۔''

﴿ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ﴾ (۱۷/ بنی اسرائیل: ۹۳)

''اور کافروں نے کہا ہم تیرے آسمان پر چڑھ جانے کے بھی اس وقت تک قائل نہیں ہوں گے، جب تک ہم پر کوئی ایسی کتاب نہ اتار لائے جس کو ہم لے کر پڑھنے لگیں۔''

﴿ وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾ (٦/ الانعام:٧)

''اور اگر کاغذوں میں لکھا ہوا کوئی قرآن آسمان سے تم پر اترے جس کو تم اپنے ہاتھ سے ٹٹول بھی سکتے تو کافر یہی کہتے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔''

غرض ایک آسمانی مذہب کی کیفیت سے بالکل بے خبر تھے۔ الوہیت اور صفاتِ الٰہی کے اسرار، نبوت کے خصائص، نزول کتاب کی حقیقت ہر چیز ان کے لیے حیرت اور استعجاب کا سرمایہ تھی:

﴿ اَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ اَمْ جَآءَهُمْ مَّا لَمْ يَاْتِ اٰبَآءَهُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ اَمْ لَمْ يَعْرِفُوْا رَسُوْلَهُمْ فَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:٦٨، ٦٩)

''کیا انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا یا ان کے پاس وہ تعلیم آئی ہے جو ان کے اسلاف کے پاس نہیں آئی یا انہوں نے اپنے رسول کو نہیں پہچانا، تو اس کے منکر ہیں۔''

اس بنا پر عرب کے مشرکین اور کفار کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے گوش آشنا ہونے کی حاجت تھی اور اس میں کئی برس صرف ہو گئے لیکن وہ لوگ جو اس صدا سے نامانوس نہ تھے ان تک آواز پہنچنے کی دیر تھی وہ سرتا پا لبیک تھے، حصہ اول میں گزر چکا ہے کہ سابقین اسلام عموماً وہی لوگ تھے جو اہل کتاب یا حنفا کے آغوش پروردہ تھے، اشخاص کے علاوہ قبائل کا بھی یہی حال تھا، مشرکین کلام الٰہی کا جواب خندۂ تحقیر سے دیتے تھے اور رموز نبوت کے دانا چشم پرنم اور دل پرکیف تھے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۝ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۱۰۷، ۱۰۹)

''جن کو اس سے پہلے علم دیا گیا ہے (یہود و نصاریٰ) جب ان کو قرآن کی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو منہ کے بل وہ سجدے میں گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پاک ہے ہمارا پروردگار، ہم سے

(ایک پیغمبر آخر الزمان بھیجنے کا) جو وعدہ کیا تھا وہ ضرور پورا ہوا، رو کر وہ منہ کے بل گر پڑتے ہیں اور یہ ان کے خشوع کو اور بڑھاتا ہے۔''

﴿ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۸۲، ۸۳)

''ان میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ محبت رکھنے والے وہ ہیں جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں، سبب یہی ہے کہ ان میں قسیسین اور راہب ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے اور جب وہ کلام سنتے ہیں جو پیغمبر پر اترا ہے تو ان کی آنکھوں کو تو دیکھے گا کہ حق کو پہچان کر آنسو بہاتی ہیں اور کہتے ہیں کہ خدایا! ہم ایمان لائے ہم کو بھی حق کی شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔''

مدینہ کے یہود جو اسلام سے سیاسی اور دینی کینہ اور تعصب رکھتے تھے اور اس بنا پر اسلام کے مقابلہ میں اپنی زبان سے اپنی کور باطنی کا اظہار وہ اپنا فرض سمجھتے تھے، تاہم چشمِ دل کو بینشِ حق سے باز نہیں رکھ سکتے تھے:

﴿ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ ۖ وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱٤٦)

''جن کو ہم کتاب دے چکے ہیں وہ اس پیغمبر کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، ان میں سے کچھ لوگ جان کر حق پوشی کرتے ہیں۔''

﴿ وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۹)

''اور جب خدا کے پاس سے پیغمبر وہ کتاب لے کر آیا جو خود ان کی آسمانی کتابوں کو سچ کر رہی ہے، تو باوجود اس کے کہ وہ کافروں کو اس سے پہلے اسی کے نام سے دباتے تھے، اب حق پہچان کر اس کا انکار کرتے ہیں۔''

قرآن مجید کی شہادتوں سے قطع نظر کر کے اگر واقعات پر غور کیا جائے تب بھی یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی، مجرد دعوت حق سننے کے ساتھ جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو لبیک کہا ان کے حالات پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل اور ذوق آشنا نگاہوں کا جویاں ہے، حضرت سعید بن زید، عثمان بن مظعون، صہیب رومی، ابوذر غفاری، سلمان فارسی رضی اللہ عنہم وغیرہ جو سابقین اسلام ہیں اسی قسم کے لوگ تھے۔ ابوجہل، ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل وغیرہ قریش کے مشرکین خدا کا کلام

تیرہ برس تک متصل سنتے رہے لیکن ان کے دل کی سنگینی میں کوئی فرق نہ آیا، ورقہ مکہ کا قریشی عیسائی صرف ایک بار قرآن سنتا ہے اور ناموس اکبر کی آواز پہچان لیتا ہے، مکہ کے مشرک ترپن (۵۳) برس تک آپ کے چہرہ پرنور کو دیکھتے رہے لیکن نورِ الٰہی کو نہ پہچان سکے اور عبداللہ بن سلام یہودی عالم نے صرف ایک دفعہ جمال پرانوار کو دیکھا اور پکار اٹھے کہ یہ حق کی تجلی ہے۔ رؤسائے قریش ہر روز اپنی آنکھوں سے نزول وحی کا تماشا دیکھتے ہیں اور جنبش نہیں کرتے، نجاشی حکومت کی مسند پر اور ہرقل شہنشاہی کے تخت پر بیٹھ کر غائبانہ کلام اللہ کی چند آیتیں سنتے ہیں اور تڑپ جاتے ہیں، قریش کے گھر یہ دولت خود اترتی ہے اور وہ اس کو ٹھکرا دیتے ہیں لیکن مدینہ سے بنی اسرائیل کے پڑوسی جوان کی زبان سے آخری نبوت کی بشارت سن چکے تھے اتفاقاً مکہ آتے ہیں اور اسی دولت ابدی کو اپنے گھر اٹھا لے جاتے ہیں، طائف کے سنگدل جاہل، نبی پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی ہنسی اڑاتے ہیں اور نجران کے عیسائی عالم مناظرہ کی غرض سے مدینہ آتے ہیں لیکن چہرہ پر پیغمبری کی معصومیت دیکھ کر دہل جاتے ہیں اور صلح کا ہدیہ پیش کرتے ہیں۔

قریش اور حجاز کے راز نبوت کے نامحرم دعوتِ حق کا جواب اکیس برس تک تیغ وسنان سے دیتے ہیں، لیکن یثرب، ہجر، یمن، عمان، بحرین کے بڑے بڑے عیسائی اور عظیم الشان قبائل جو یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے اثر سے ان رموز سے کس قدر آگاہ ہو چکے تھے وہ آوازِ حق پہنچنے کے ساتھ دفعتہً مسلمان تھے۔

آبائی دین ورسوم کی پابندی

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے عائق ہوتی ہے وہ قومی رسم ورواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے، انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں۔ دوست وآشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی، آل واولاد سے کنارہ کشی، مال وجائداد سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع اور وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے۔ ملکی رسم ورواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش وآئین کی موروثی الفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے۔ عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم، قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا اور استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے، دنیا کہاں سے کہاں بدلتی چلی گئی، پرانی سامی نسل کی بدویانہ خصوصیتیں جو توراۃ میں پڑھتے ہیں وہ تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں تھیں اور آج بھی نظر کے سامنے ہیں دینِ ابراہیم کے چند اصول حج، ختنہ اور قربانی وغیرہ ہزاروں برس کے بعد بھی عرب میں مٹ مٹا کر باقی رہ گئے تھے اور ان سے نہیں چھوٹے تھے ان کے شعر وشاعری اور فخر ومباہات کا سب سے پرجوش مضمون آباء واجداد اور نام ونسب پر فخر وغرور تھا جس کو چھوڑنا ان کے نزدیک اپنی پرانی عزت وعظمت کی دیوار کو خود گرا دینا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی آبائی دین کے ترک کا مسئلہ تھا اور یہی دینِ جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی، چنانچہ قرآن مجید نے بار بار ان کے اس قول کو دہرایا ہے اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَآ أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ ۗ أَوَلَوْ كَانَ ءَابَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْـًٔا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۰)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو کہتے ہیں (نہیں) بلکہ ہم اس کی پیروی کریں گے جس پر اپنے باپ دادوں کو ہم نے پایا، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور نہ راہ راست پر ہوں (تب بھی)۔''

﴿ بَلْ قَالُوٓا إِنَّا وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ ءَاثَـٰرِهِم مُّهْتَدُونَ ۝ وَكَذَٰلِكَ مَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ فِى قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ إِنَّا وَجَدْنَآ ءَابَآءَنَا عَلَىٰٓ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰٓ ءَاثَـٰرِهِم مُّقْتَدُونَ ۝ قَـٰلَ أَوَلَوْ جِئْتُكُم بِأَهْدَىٰ مِمَّا وَجَدتُّمْ عَلَيْهِ ءَابَآءَكُمْ ۖ قَالُوٓا إِنَّا بِمَآ أُرْسِلْتُم بِهِۦ كَـٰفِرُونَ ۝ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۲۲۔۲۴)

''بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم پر چل کر راہنمائی پائیں گے اور اسی طرح ہم نے اے پیغمبر تم سے پہلے کسی آبادی میں کوئی پیغمبر نہیں بھیجا، لیکن اس کے دولت مندوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم انہیں کے نقش قدم کے پیرو ہیں، کہو اے پیغمبر! کیا اگرچہ میں اس روش سے جس پر تم نے اپنے بزرگوں کو پایا زیادہ سیدھا راستہ لے کر تمہارے پاس کیوں نہ آؤں (تب بھی تم انہیں کی پیروی کرو گے) انہوں نے کہا کہ ہم تو (جو دے کر بھیجے گئے ہو) اس کا انکار ہی کرتے رہیں گے۔''

﴿ وَإِذَا فَعَلُوا فَـٰحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ ءَابَآءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۸)

''اور جب وہ کوئی بے شرمی کی بات کرتے ہیں، تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو اسی پر پایا اور اللہ نے ہم کو اسی کا حکم دیا ہے، کہہ دو اے پیغمبر کہ اللہ تو بے شرمی کی بات کا کبھی حکم نہیں دیتا، کیا تم اللہ پر وہ تہمت باندھتے ہو جو تم نہیں جانتے۔''

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَآ أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ ءَابَآءَنَآ ۚ أَوَلَوْ كَانَ ءَابَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْـًٔا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۰۴)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کے پاس اور اس کے رسول کے پاس آؤ تو کہتے ہیں، ہم نے اپنے باپ دادوں کو جس پر پایا ہے، وہی ہم کو کافی ہے، کیا ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور نہ سیدھے راستے پر ہوں (تب بھی وہ انہیں کی پیروی کریں گے؟)''

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝ وَإِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ۭ أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطٰنُ يَدْعُوْهُمْ إِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ ۝ ﴾ (۳۱/ لقمان: ۲۰، ۲۱)

''کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم، ہدایت اور روشن کتاب کے بغیر اللہ کے بارہ میں جھگڑا کرتے ہیں، اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو اتارا ہے اس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں، بلکہ ہم اسی کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا اگرچہ ان کو شیطان دوزخ کے عذاب ہی کی طرف کیوں نہ پکارے (تو وہ اسی کی پیروی کریں گے)''

کفار کے یہ سوال و جواب خود ظاہر کرتے ہیں کہ ان کو اپنے آبائی رسوم کو چھوڑنا کس درجہ محال نظر آتا تھا، آپ ﷺ نے بعثت کے تین برس بعد جب بت پرستی کی علانیہ مذمت شروع کی تو قریش کی عدالت میں آپ پر سب سے بڑا جرم یہی قائم کیا گیا کہ یہ خاندانی دیوتاؤں کی تحقیر، بزرگوں کی توہین اور آبائی رسم ورواج کی مذمت کرتے ہیں، مکہ میں جب آپ نے علی الاعلان لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور بہت سے نیک لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا تو قریش کے بڑے بڑے رئیسوں نے ابوطالب کے پاس جا کر آپ کے خلاف جو الزامات قائم کیے وہ یہ تھے ''اے ابوطالب! تمہارا بھتیجا ہمارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے، ہمارے مذہب کی توہین کرتا ہے، ہم کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے اور ہمارے باپ دادوں کو گمراہ بتاتا ہے تو یا تو تم ان کو روکو، یا ہم کو اور اس کو چھوڑ دو کہ باہم سمجھ لیں۔''

یہ ان کی عدالت کا پہلا مطالبہ تھا۔ ابوطالب نے ان کو سمجھا بجھا کر واپس کیا تو کچھ دنوں کے بعد انہوں نے پھر اپنا مطالبہ ان الفاظ میں پیش کیا ''اے ابوطالب! تم نے اپنے بھتیجے کو اب تک منع نہیں کیا اب خدا کی قسم! ہم اپنے بزرگوں کی برائی، اپنی نادانی اور اپنے دیوتاؤں کی ہجو نہیں سن سکتے، تو یا تو اس کو باز رکھو اور یا ہم سے لڑنے پر آمادہ ہو جاؤ۔'' اس اعلان جنگ سے کام نہ چلا تو وہ تیسری دفعہ ابوطالب کے پاس جاتے ہیں اور کہتے ہیں: ''اے ابوطالب! ولید کا بیٹا عمارہ کیسا خوشرو جوان ہے تم اس کو متبنیٰ بنالو اور اپنے بھتیجے کو قتل کے لیے ہمارے حوالہ کردو کہ اس نے تمہارے اور تمہارے بزرگوں کے دین و مذہب کی مخالفت کی ہے، تمہاری قوم کی جماعت کو پراگندہ کیا ہے اور ان کو بے وقوف اور نادان کہتا ہے۔'' سب سے آخری دفعہ قریش کے رئیسوں

نے خود آنحضرت ﷺ سے مل کر گفتگو کی اور کہا: ''اے محمد! تمہارے سوا کسی قوم میں کوئی ایسا آدمی نہیں ملا جو اپنی قوم پر وہ مصیبت لایا ہو جو تم لائے ہو تم نے باپ دادوں کو برا کہا، ہمارے مذہب کی تحقیر کی، دیوتاؤں کو گالی دی ہم کو بے وقوف اور نادان بنایا اور جماعت میں تفرقہ ڈالا غرض کوئی ایسی برائی نہ تھی جو تم نے ہمارے ساتھ نہیں کی۔'' ❶

ان الزامات کی فہرست کی ایک ایک دفعہ پڑھو معلوم ہوگا کہ آبائی دین، موروثی رسم ورواج اور خاندانی دیوتاؤں کی غلامی سے آزاد ہونا ان پر کتنا بار تھا اور وہ اس جرم کو کتنا سنگین سمجھتے تھے۔ موسم حج میں آنحضرت ﷺ جب لوگوں کے پاس جا جا کر توحید کا پیغام سناتے تھے تو ابولہب آپ کے اثر کو باطل کرنے کے لیے آپ کی تقریر کے بعد آپ کے پیچھے پیچھے صرف یہ کہتا جاتا تھا کہ ''لوگو! یہ وہی ہے جو تم کو تمہارے باپ دادوں کے مذہب سے برگشتہ کرتا پھرتا ہے۔'' ❷

ابوطالب جنہوں نے ہر موقع پر آنحضرت ﷺ کی حمایت کی اور وہ آپ کو اپنے دل و جان سے عزیز رکھتے تھے وہ بھی آپ کی دعوت حق کو اپنے آبائی دین کے مقابلہ پر پذیرائی کے قابل نہ سمجھتے تھے، بھتیجے نے بار بار کہا: ''چچا جان! کلمہ شہادت ایک دفعہ پڑھ لیجئے کہ قیامت میں آپ کی شفاعت کی ایک سند مجھے ہاتھ آجائے۔'' ابوطالب نے جواب دیا: ''جان پدر! سب کچھ تم پر نثار لیکن بزرگوں کے مذہب کو نہیں چھوڑ سکتا۔'' عین اس وقت جب ابوطالب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے اور نزع کی حالت تھی آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ ''چچا جان لا الہ الا اللہ کہہ دیجئے کہ میں خدا کے ہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں۔'' ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ جو ان کے پاس بیٹھے تھے کہا: ''ابوطالب! کیا تم (اپنے باپ) عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے۔'' آپ بار بار لا الہ الا اللہ پڑھنے کی درخواست کرتے تھے اور یہ دونوں ان کو وہی عبدالمطلب کے دین سے علیحدگی پر شرم دلاتے تھے، بالآخر ابوطالب نے یہی کہا کہ ''میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں۔'' اور لا الہ الا اللہ نہیں کہا، یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، ❸ صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے کہ ابوطالب نے کہا کہ ''اے بھتیجے! جو فقرہ تم کہتے ہو میں کہہ کر تمہاری آنکھیں ٹھنڈی کر دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ ابوطالب موت سے ڈر گیا۔'' ❹ ابن اسحاق میں ہے کہ انہوں نے آہستہ سے وہ فقرہ کہہ دیا ❺ بہر حال اس واقعہ سے جو دکھانا ہے وہ یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مخالفین کے پاس باز رکھنے کے لیے اس سے زیادہ پر زور اور پر اثر دلیل نہ تھی کہ ''ابوطالب! کیا آبائی مذہب چھوڑ دو گے؟'' اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام کی اشاعت کے راستہ میں یہ تخیل کتنا بڑا پتھر تھا۔

---

❶ یہ تمام واقعات ابن اسحاق اور سیرت کی تمام کتابوں میں بتفصیل مذکور ہیں۔ ملاحظہ ہوں سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص: ۲۵۲۔

❷ مستدرك حاكم، ج ۱، ص: ۱۵ كتاب الايمان۔ ❸ صحيح بخاري، كتاب الجنائز، باب اذا قال المشرك عند الموت لا اله الا الله: ۱۳۶۰۔ ❹ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الدليل على صحة الاسلام من حضره الموت...... الخ: ۱۳۵۔ ❺ ابن هشام وفات ابى طالب، ذكر الاسراء والمعراج، ج ۱، ص: ۲۵۳۔

توہم پرستی

عرب کی اصلاح وہدایت کی راہ میں ایک اور عائق عرب کی توہم پرستی تھی، ہر قوم میں جاہلوں کا جس طرح یہ اعتقاد ہوتا ہے کہ فلاں دیوتا یا فلاں پیر کے خلاف اگر زبان سے کچھ نکلا تو فوراً بلائیں آ کر ہم کو لپٹ جائیں گی، عرب میں گھر گھر سینکڑوں بت اور صنم خانے تھے، دنیا کے تمام کام انہیں اصنام اور بتوں سے متعلق سمجھے جاتے تھے، مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آتا تھا کہ فلاں بت کی پرستش یا خدمت گزاری میں اگر کوتاہی کی گئی تو آسمان سے پانی برسنا بند ہو جائے گا، فرزند نرینہ پیدا نہ ہوگا، باغوں میں پھل نہ آئیں گے، اسی بنا پر اسلام کے نام سے ان کو لرزہ آتا تھا اور یہ تخیل صرف اسی وقت پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ ایک مدت سے عرب میں چلا آتا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں ثمود نے کہا:

﴿ إِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ۭ ﴾ [1] (١١/ هود:٥٤)

''ہم تو اس کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے کہ ہمارے کسی دیوتا نے تم کو آ کے ستایا ہے۔''

ابتدا میں جب آنحضرت ﷺ نے بتوں کے خلاف وعظ کہنا شروع کیا تو اکثر لوگوں نے (نعوذ باللہ) پاگل سمجھ لیا [2] جاہلیت کے زمانہ کے بعض کافر احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے [3] ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں جب واپس گئے اور لات وعزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا کہ ''ضمام! ان کو برا نہ کہو، دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔'' [4] حضرت زنیرہ رضی اللہ عنہا مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئی تھیں، کفار نے کہنا شروع کیا ''لات وعزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔'' [5] حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن تشریف لے گئے اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا: ''دیکھو ذوالشریٰ (بت) کہیں برباد نہ کر دے۔'' [6]

فتح مکہ کے بعد جبکہ دیوتاؤں کے زور وقوت کا راز افشا ہو چکا تھا اور اکثر قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا تاہم لات، عزیٰ، منات، ذی الکفین، سواع کے بت خانوں کو وہ اپنے ہاتھ سے نہ توڑ سکے۔ خاص مدینہ سے راسخ الایمان مسلمان بھیجے گئے جنہوں نے اس فرض کو انجام دیا۔ پوجاریوں نے کوئی مزاحمت نہ کی وہ سمجھتے تھے کہ ان دیوتاؤں کو کون توڑ سکتا ہے جو اس گستاخی کا ارادہ کرے گا وہ خود تباہ وبرباد ہو جائے گا۔ [7]

---

[1] ابن کثیر تفسیر سورۂ ہود، (آیت مذکور، ج۲، ص:۴۴۹) زمخشری، ۸، ص:۶۱۷؛ ابن حیان، ج۵، ص:۳۳، بغوی وغیرہ تمام مفسرین نے لکھا ہے۔ [2] دیکھو تفسیر ابن کثیر، ج۴، ص:۴۰۲ تفسیر آیت ﴿مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝﴾ ونیز ﴿ما بصاحبهم من جنة﴾ صحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوة والخطبة:٢٠٠٨۔ [3] صحیح مسلم، باب تخفیف الصلوة والخطبة:٢٠٠٨۔ [4] دارمی، کتاب الصلوة، باب فرض الوضوء والصلوة:٦٥٢۔ [5] اسد الغابه، ترجمه حضرت زنیره، ج٥، ص:٤٦٢ وسیرة ابن هشام ذکر عدوان المشرکین علی المستضعفین، ج١، ص:١٩٥ [6] اسد الغابة ذکر طفیل بن عمرو دوسی، ج٣، ص:٥٤؛ سیرت ابن هشام، ج١، ص: ٢٣٣۔ [7] ابن سعد جز ثانی، قسم اول، ص: ٩٩ وطبری ذکر هدم اصنام، ج٣، ص:١٦٤٨۔

توہم پرستوں میں کسی مذہب کی صحت و بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ دنیا کے ظاہری، مادی فوائد اور جانی و مالی خیر و برکت ہوتی ہے، لیکن قوانین گاہ عالم میں ایک مذہب پرست بھی اسی طرح آلام و مصائب میں گرفتار ہوسکتا ہے جس طرح ایک غیر مسلم، عرب کے بدو اور اعراب ابتداءً مسلمان ہونے کی ہمت بھی کرتے تھے تو معاً یہ توقع بھی کر لیتے تھے کہ اب وہ ہر قسم کے آفات ارضی و سماوی سے محفوظ ہیں اس بنا پر اگر کبھی ان کی اس توقع کو صدمہ پہنچتا تو دفعتہً وہ متزلزل ہو جاتے تھے۔ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے: [1]

كان الرجل يقدم المدينة فيسلم فان ولدت امرأته غلاما ونتجت خيله قال هذا دين صالح وان لم تلد امرأته ولم تنتج خيله قال هذا دين سوء۔

''باہر کا جو شخص مسلمان ہو کر مدینہ آتا تھا اس کی یہ حالت تھی کہ اگر اس کی بیوی لڑکا جنتی اور اس کی گھوڑی بچہ دیتی تو وہ کہتا کہ یہ نہایت عمدہ مذہب ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کہتا یہ نہایت برا مذہب ہے۔''

قرآن مجید کی یہ آیت اسی قسم کے لوگوں کی شان میں نازل ہوئی: [2]

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ اِۨطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ اِۨنْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۱)

''اور بعض لوگ وہ ہیں جو خدا کی بندگی کنارہ پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں (یعنی دل سے نہیں کرتے) اگر ان کو فائدہ پہنچے تو ان کو اطمینان ہو جاتا ہے، لیکن اگر مبتلائے مصیبت ہوئے تو فوراً رو برگشتہ ہو جاتے ہیں۔''

ہجرت کے بعد جب مسلمان مدینہ آئے تو اتفاق سے ایک عرصہ تک کسی مسلمان گھرانے میں کوئی لڑکا پیدا نہ ہوا تو دشمن اس واقعہ کو اپنی بددعاؤں کا نتیجہ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے، آخر چھ مہینے کے بعد عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تو مسلمان بے انتہا مسرور ہوئے۔ [3] سوئے اتفاق یہ کہ اول اول جو لوگ مدینہ میں آتے تھے ان کو وہاں کی آب و ہوا راس نہیں آتی تھی، ابتدائے ہجرت میں حضرت ابوبکر و حضرت بلال رضی اللہ عنہما آئے تو سخت بیمار ہو گئے [4] حضرت طفیل بن عمرو دوسی رضی اللہ عنہ نے جب مدینہ کو ہجرت کی تو ان کو بھی مدینہ کی آب و ہوا ناموافق ہوئی [5] اگرچہ مخلصین ارباب فہم پر اس قسم کی عارضی ناگواریوں کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا تاہم عام لوگ جن کی وہم پرستی فطرت ثانیہ ہو گئی تھی وہ اس قسم کے اتفاقی واقعات سے بے حد متاثر ہوتے تھے، چنانچہ جب عکل و عرینہ کے چند لوگوں نے مدینہ میں آ کر اسلام قبول کیا اور آب و ہوا کی ناموافقت کے

---

[1] تفسير سورة الحج:٤٧٤٢۔ [2] ايضاً۔

[3] مستدرك حاكم، ج ٣، ص: ٥٤٨ واصابه ذكر عبدالله بن زبير، ج ٤، ص: ٦٩۔

[4] صحيح بخاری، كتاب المرضى، باب عيادة النسآء الرجال:٥٦٥٤ وباب مقدم النبی ﷺ المدينة:٣٩٢٦۔

[5] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الدليل على ان قاتل نفسه لا يكفر:٣١١۔

سب سے بیمار ہو گئے اور آنحضرت ﷺ نے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے ان کو اونٹوں کی چراگاہ میں بھیج دیا تو گو وہ صحیح ہو گئے تاہم مرتد ہو گئے [1] اسی طرح ایک بدو نے آ کر آپ کے دست مبارک پر بیعت کی لیکن سوئے اتفاق سے دوسرے دن بخار میں مبتلا ہوا تو اپنی بیعت توڑنی چاہی آپ ﷺ نے تین بار منع فرمایا لیکن اس نے اصرار سے آخر بیعت فسخ کر دی، تو آپ نے ﷺ فرمایا: [2]

((المدینة کالکیر تنفی خبثها و تنصع طیبها))

''مدینہ آگ کی بھٹی ہے جو میل کو الگ کر دیتا ہے اور حقیقی جوہر کو خالص کر دیتا ہے۔''

انہی اسباب کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے متعلق یہ دعا فرمائی:

((اللّٰهم حبب الینا المدینة کحبنا مکة او اشد اللّٰهم و صححها و بارك لنا فی مدها و صاعها وانقل حماها فا جعلها بالجحفة)) [3]

''خداوند مکہ کی طرح یا اس سے زیادہ ہمارے لیے مدینہ کو محبوب بنا دے، اس کو امراض سے صحیح کر دے اس کے پیمانے میں برکت دے اور اس کے بخار کو جحفہ میں منتقل کر دے۔''

قبائل کی خانہ جنگیاں

اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا مانع عرب کی باہمی خانہ جنگیاں تھیں جو عرب کے خصائص قومی کا عنصر اعظم بن گئی تھیں، یہ خانہ جنگیاں ہزاروں برس سے چلی آتی تھیں اور ان کی وجہ سے قبائل میں ایسے مستمر اور ثابت الاساس انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے جن کا مٹنا قریباً محال تھا، انہی لڑائیوں نے ثار (انتقام خون) کی رسم پیدا کر دی تھی جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور یہ رسم ایسی سخت اور شدید الاثر تھی کہ ایک شخص کے خون کے لیے قبیلہ کا قبیلہ مٹ جاتا تھا۔ ہزاروں برس کے خون قومی قرض کی طرح باقی چلے آتے تھے جو درج رجسٹر ہوتے رہتے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ ہوش سنبھالنے کے وقت سب سے پہلے ''ثار'' کا لفظ سنتا تھا یعنی خاندان میں فلاں شخص قتل کیا گیا ہے اور اس کے خون کا انتقام اب تک باقی ہے، اس لیے بچہ بچہ کا نصب العین ابتدائے زندگی سے یہی ''ثار'' ہوتا تھا۔

اس بنا پر ایک شخص یا ایک خاندان جس خلوص اور عقیدت مندی کے ساتھ اسلام کی طرف جھکتا تھا معاً اسی زور اور قوت کے ساتھ دوسرا فریق اسلام کی مخالفت اور اس سے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا تھا۔ مکہ میں اسلام کی مخالفت کا صرف یہی راز تھا کہ خدا نے نبوت کے لیے ہاشم کا گھرانہ چن لیا تھا، بنو امیہ کی مخالفت اس کے لیے لامحالہ ہوتی تھی۔

مدینہ میں اوس و خزرج دو قبیلے تھے، اسلام سے پہلے دونوں لڑ لڑ کر تھک گئے تھے، اسلام کی آواز آئی تو

[1] صحیح بخاری، کتاب المحاربین، باب لم یسق المرتدون المحاربون حتی ماتوا: ٦٨٠٤۔

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل المدینة، باب المدینة تنفی الخبث:١٨٨٣ وباب اعتصام السنة:٧٣٢٢۔

[3] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب مقدم النبی ﷺ المدینة:٣٩٢٦۔

گو دونوں نے ایک ساتھ لبیک کہا تاہم قبیلہ اوس کا ایک ایک فرد اگر ہمہ تن اخلاص و جوش تھا تو خزرج میں بیسیوں منافق تھے، انتہا یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں ہجرت سے پہلے دونوں قبیلوں کی نماز کی امامت کے لیے باہر سے ایک تیسرے قبیلہ کا آدمی بلوایا گیا تھا کہ خدا کے سامنے بھی ایک کو دوسرے کے پیچھے کھڑے ہونے سے عار تھا۔ ❶

خزاعہ اور بنو بکر باہم شدید دشمن تھے اور ان میں پرانی عداوت چلی آتی تھی مدینہ آنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان کو صلح کا پیام اور اسلام کی دعوت دی۔ خزاعہ نے اسلام کی دعوت قبول کی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔

خوب غور کرو کہ انصار اسلام لا کر ہمہ تن نیکوکاری اور پاکیزہ نفسی کے پیکر بن گئے لیکن ثار کے جذبات کس طرح آسانی سے دفعتہً مشتعل ہو جاتے تھے، ایک موقع پر ایک یہودی نے جنگ بعاث کا تذکرہ چھیڑ دیا تو انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) کی تلواریں میان سے نکل آئیں ❷ اور بڑی مشکل سے آنحضرت ﷺ نے ان کے جوش کو فرو کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ افک میں جب آنحضرت ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر اس کی شکایت کی اور حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا، یا رسول اللہ ﷺ! اگر وہ تہمت لگانے والا ہمارے قبیلہ کا ہے تو میں اس کی گردن اڑا دیتا ہوں، اگر ہمارے بھائی خزرج کے قبیلہ سے ہے تو آپ حکم دیں میں بجا لاؤں گا، اس پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ جو قبیلہ خزرج کے رئیس تھے، دفعتہً کھڑے ہو گئے اور کہا:

کذبت لعمر الله لا تقتله ولا تقدر علی قتله ولو كان من رهطك ما احببت ان يقتل۔

''خدا کی قسم! تو جھوٹ کہتا ہے، تو اس کو قتل نہ کرے گا، نہ کر سکتا ہے اور وہ شخص اگر تیرے قبیلہ کا ہوتا تو اس کا قتل کیا جانا پسند نہ کرتا۔''

اس پر اوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے یہاں تک کہ قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے، چنانچہ صحیح بخاری حدیث افک میں ہے:

فثار الحيان الاوس والخزرج حتى هَمُّوا ان يقتتلوا ورسول الله قائم على المنبر ❸۔

''پس دونوں قبیلے اوس اور خزرج مشتعل ہو گئے یہاں تک کہ دونوں کشت و خون پر آمادہ ہو گئے اور آنحضرت ﷺ اس وقت منبر پر کھڑے تھے۔''

❶ ابن هشام ذكر بيعت عقبه عرض رسول الله ﷺ نفسه على القبائل، ج ۱ ص: ۲٦۱۔ ❷ اصابه تذكره اوس بن قطيبى، ج ۱، ص: ۸۸؛ معجم صغير طبرانى میں بھی ایک اور اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے، معجم عبداللہ، ص: ۱۲۴۔

❸ صحيح بخاري، كتاب المغازي، باب حديث الافك: ٤١٤١۔

ایک بار محلم بن جثامہ لیثی نے عہد اسلام میں قبیلہ اشجع کے ایک شخص کو قتل کر ڈالا، آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، قبائل کے تعلقات کی بنا پر عیینہ نے مقتول اور اقرع بن حابس نے قاتل کی طرف سے وکالت کی اور بات بڑھی اور سخت شور وشغب ہوا تو آپ ﷺ نے عیینہ سے فرمایا: ''دیت کیوں نہیں قبول کر لیتے؟'' اس نے کہا: ''خدا کی قسم! اس وقت تک دیت نہ قبول کروں گا جب تک اس کی بیویوں کو اس قدر نہ ستالوں جس قدر اس نے ہماری بیویوں کو ستایا ہے۔'' اس پر شور وغل ہوا آپ نے پھر یہی الفاظ دہرائے اور عیینہ نے وہی پہلا جواب دیا چونکہ یہ اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا اور قتل کا یہ پہلا مقدمہ تھا جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تھا اس لیے قبیلہ بنولیث کے ایک شخص نے جو مسلح کھڑا تھا کہا کہ ابتدائے اسلام میں اس واقعہ کی مثال بکری کے اس ریوڑ کی سی ہے کہ اس کے پہلے حصہ کو تیر مارا گیا تو دوسرا بدک کے بھاگ گیا یعنی اگر قاتل کے موافق فیصلہ کیا گیا تو لوگ سمجھیں گے کہ اسلام قصاص کو دیت سے بدل دینا چاہتا ہے اور چونکہ دلوں میں اب تک انتقام کے جذبات تازہ ہیں اور لوگ دیت لینا پسند نہیں کرتے اس لیے ان کو اسلام کے قبول کرنے میں تامل ہوگا، لیکن آنحضرت ﷺ چونکہ سفر میں تھے اس لیے دیت میں ۵۰ اونٹ اسی وقت دیے اور مدینہ پہنچ کر ۵۰ اونٹ کا وعدہ فرمایا۔ [1] اہل عرب میں یہ جذبہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ گو آپ نے فتح مکہ میں امن عام کی منادی کر دی اور تلوار کو میان میں کر لینے کا حکم دیا تاہم انتقام کا جوش اب تک تازہ تھا۔

قبیلہ ہذیل کا ایک شخص اسلام لانے کی غرض سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں جا رہا تھا اس نے زمانہ جاہلیت میں قبیلہ خزاعہ کا کوئی جرم کیا تھا وہ لوگ انتقام کے لیے اس کو ڈھونڈ رہے تھے سوئے اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا اور ان لوگوں نے اس کو فوراً قتل کر دیا کہ اگر بارگاہ نبوت میں وہ پہنچ گیا تو پھر اس کا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ آپ کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت برہم ہوئے۔ ان لوگوں نے حضرت عمر، حضرت ابوبکر، حضرت علی رضی اللہ عنہم سے سفارش کی درخواست کی، آنحضرت ﷺ نے نماز کے بعد ایک خطبہ دیا جس کے الفاظ یہ تھے:

> ''خدا نے مکہ کو دار الحرام بنایا ہے، آدمیوں نے نہیں بنایا ہے، خدا نے کل چند گھنٹوں کے لیے اس کو میرے لیے حلال کر دیا تھا لیکن آج اس کی قدیم حرمت دوبارہ لوٹ آئی ہے اور خدا کے سب سے نافرمان بندے تین آدمی ہیں ایک وہ جس نے حدود حرم میں کسی کو قتل کیا، دوسرا وہ جس نے اپنے قاتل کے سوا کسی دوسرے شخص کو مار ڈالا، تیسرا وہ جس نے زمانہ جاہلیت کا انتقام لیا تم نے جس شخص کو قتل کر ڈالا ہے میں اس کی دیت دوں گا۔''

چنانچہ آپ ﷺ نے اس کی دیت ادا فرمائی۔ [2]

بنوثعلبہ کے ایک آدمی نے جاہلیت میں اوس وخزرج کے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا، بنوثعلبہ اسلام لا کر

[1] ابو داود، کتاب الدیات، باب الامام یأمر بالعفو فی الدم: ٤٥٠٣۔

[2] مسند امام احمد بن حنبل، ج ٤، ص: ٣١۔

جب مدینہ آئے تو آنحضرت ﷺ خطبہ دے رہے تھے، ایک انصاری بے اختیار چلا اٹھے کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ ہمارے مجرم ہیں ان سے قصاص دلوایئے، آنحضرت ﷺ نے ہاتھ اٹھا کر فرمایا:((الا لا یجنی والد علی ولدہ)) [1] یعنی ''لڑکے کے جرم کا بدلہ باپ سے نہیں لیا جائے گا۔''

ان واقعات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ثار کا جذبہ کس طرح رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور اس جذبہ کا مشتعل ہوجانا کس قدر آسان ہوتا تھا۔

خانہ جنگیوں پر ختم نہیں، یوں بھی تمام قبائل رقیب اور حریف مقابل تھے دو مختلف قبیلوں کے آدمیوں میں کسی ذاتی معاملہ پر بھی نزاع ہوجاتی تھی اور ان میں کوئی اپنے قبیلہ کا نام پکارتا تھا تو قومی جنگ کا سامان ہوجاتا تھا، ایک دفعہ ایک مہاجر نے ایک انصاری کو تھپڑ مار دیا انصاری نے یا للانصار (انصار کی دہائی) پکارا، مہاجر نے بھی یاللمھاجرین (مہاجرین کی دہائی) کا نعرہ مارا، آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی آپ نے نکل کر فرمایا کہ ''یہ کیا جہالت کی پکار ہے۔''

((مابال دعوی الجاھلیۃ)) [2] ''یہ کیا جہالت کا دعویٰ ہے۔''

لوگوں کو معلوم تھا کہ اسلام اس فعلِ شنیع کا سخت دشمن ہے اس لیے جب تک وہ اپنا انتقام نہ لے لیتے ان کو اسلام لانے میں تامل ہوتا تھا۔ عمرو بن اقیش ایک صاحب تھے وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام سے متاثر اور اس کے قبول کرنے کے لیے ہر طرح آمادہ تھے لیکن ایک عائق تھا جو اس راہ میں حائل تھا یعنی ثار، وہ جانتے تھے کہ اسلام لا کر اس خاندانی فرض کے ادا کرنے کی ان کو اجازت نہیں مل سکتی۔ ابن مندہ نے ان کے حال میں لکھا ہے:

> وکان لہ ثار فی الجاھلیۃ وکرہ ان یسلم حتی یأخذہ۔ [3]
>
> ''ان کا انتقام زمانہ جاہلیت میں باقی رہ گیا تھا جب تک وہ نہ لے لیں انہوں نے مسلمان ہونا پسند نہ کیا۔''

اسی طرح حضرت عمرو بن مالک رضی اللہ عنہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے اور اسلام کی دعوت دی تو قبیلہ والوں نے کہا بنوعقیل پر ہمارا ثار (انتقام) باقی ہے، وہ لے لیں تو اسلام لائیں، چنانچہ انہوں نے اسی وقت بنوعقیل پر جو مسلمان ہوچکے تھے حملہ کیا اور اس فرض سے سبکدوش ہوئے۔ [4]

سیاسی مشکلات

جہالت، وحشت، پابندیٔ رسوم، آبائی اثر وغیرہ وغیرہ ان میں سے ایک چیز بھی مانع اصلاح نہ ہوتی،

---

[1] دارقطنی، کتاب البیوع، ۳/ ٤٤: ۲۹۵۷۔

[2] صحیح بخاری، کتاب المناقب باب ما ینھی من دعوی الجاھلیۃ: ۳۵۱۸۔

[3] اسد الغابۃ، ج ٤، ص: ۸۵۔ [4] اصابہ فی تمییز الصحابۃ ذکر عمرو بن مالک، ج ۳، ص: ۱۳۔

تاہم صرف سیاسی اسباب ایسے جمع تھے کہ قریش یا دیگر قبائل عرب کبھی اسلام کے آگے سرنہیں جھکا سکتے تھے، مکہ میں دو خاندان برابر کے رقیب تھے، امیہ اور ہاشم اور آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے امیہ کا پلہ ترجیح علانیہ گراں ہو چکا تھا، آنحضرت ﷺ نے جب نبوت کا اظہار کیا تو سب سے پہلے امیہ کے خاندان نے سرکشی کی اور فتح مکہ تک یہی خاندان تھا جو تمام لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا علم بردار تھا، بنوامیہ کے بعد اور دوسرے خاندان بھی تھے وہ بھی حرم کے مناصبِ دہ گانہ (رفادہ وغیرہ) کے ممتاز حصہ دار تھے، ان میں سے ہر ایک دیکھ رہا تھا کہ اس جدید انقلاب میں ان فوائد اور اقتدار کا بالکل خاتمہ ہے ابوجہل سے جب ایک شخص نے کہا کہ "محمد کی دعوت اسلام کی نسبت تمہاری کیا رائے ہے" تو اس نے صاف کہا کہ "میں کیا کہوں محمد ﷺ کے خاندان نے عزت وشرف میں برتری کا دعویٰ کیا اور ثبوت میں دعوتیں کھلائیں، اس کے جواب میں ہم نے اسی شان سے دعوتیں دیں، انہوں نے خون بہا دیے ہم نے بھی خون بہا دیے، انہوں نے زرپاشیاں کیں ہم نے بھی کیں، ہم دونوں دوش بدوش ہو چکے تھے کہ دفعتہً ان کی طرف سے یہ دعویٰ پیش ہوا کہ ہمارے خاندان میں نبوت اور آسمان سے وحی بھی آ گئی، اب ہم کہاں تک برداشت کریں، خدا کی قسم! ہم کبھی محمد ﷺ پر ایمان نہیں لا سکتے۔" [1] یہی ابوجہل جب انصار کے ہاتھ سے قتل ہوا تو اس نے مرتے وقت حسرت سے کہا کہ کاش مجھ کو کاشتکاروں کے سوا کسی اور قوم نے قتل کیا ہوتا۔ [2]

خوب غور سے دیکھو بدر، احد، حمراء الاسد، احزاب وغیرہ تمام لڑائیوں میں یہی اموی عنصر تھا جو کام کرتا تھا، قریش کے قبیلہ سے باہر جو بڑے بڑے قبیلے تھے، مثلاً: غطفان اور اسد وغیرہ وہ یا اہل مکہ ہی کے خاندان کی کوئی شاخ تھی یا قریش کے حلیف وہم عہد تھے، خیبر میں یہود تھے جو قوم کے لحاظ سے قریش سے الگ تھے لیکن عرب تجارتی حیثیت سے تمام تر انہی یہودیوں کے زیر بار تھے، انہی سے قرض دام لیتے تھے، انہی کے ہاں مال ومتاع رہن رکھتے تھے [3] خیبر اور غطفان ایک مدتِ دراز سے باہم حلیف تھے اس طرح مکہ سے لے کر خیبر اور نجد تک تمام عرب ایک سلسلہ اتحاد میں مربوط تھا۔

کعبہ تمام عرب میں قبلہ گاہِ اعظم تھا، ہر سال تمام ملک حج کرنے کے لیے آتا تھا اور آستانۂ کعبہ پر سر جھکاتا تھا، کعبہ کے مجاور معمولی پنڈوے نہ تھے بلکہ خیمہ وخرگاہ، تیغ وسپر، جاہ وحشم غرض ریاست وامارت کے تمام تر سروسامان رکھتے تھے، اس لیے تمام عرب میں ان کی شہنشاہی قائم تھی یہی بات ہے کہ جب تک مکہ فتح نہ ہوا اسلام چین سے نہیں بیٹھ سکا لیکن اسلام کی مخالفت، صرف قریش کی متابعت پر محدود نہ تھی بلکہ بڑا سبب یہ تھا کہ اسلام سے خاص قریش کو جو نقصان پہنچ سکتا تھا براہ راست وہی تمام رؤسائے قبائل کو پہنچتا تھا۔ عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم ہوتا تھا جو تمام قبیلہ پر حکمران ہوتا تھا اور

---

[1] ابن ہشام، حصہ اول، ص: ۱۹۳ اسلام حمزہ۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب قتل ابی جهل: ۳۹۶۲، ۳۹۶۳، ۴۰۲۰۔ [3] طبری واقعہ خیبر، ج۳، ص: ۱۵۷۵۔

مال غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو "مرباع" کہتے تھے، اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا اور کوئی عمدہ چیز اس کو پسند آ جاتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام "صفی" تھا یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں، جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی، باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس منتخب ہوتا تھا، قبیلہ کے تمام معاملات، ذاتی نزاعیں، قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ میں فیصل ہوتے تھے۔ یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں ممتاز ہوتے تھے۔ قبائل میں یہی امتیازِ مراتب تھا کہ جو قبائل زیادہ شریف مانے جاتے تھے ان میں سے ایک آدمی کو اگر کوئی دوسرا قبیلہ قتل کر دیتا تھا تو اس کا خون دوسرے قبیلہ کے دو خون کے برابر سمجھا جاتا تھا اور اس لیے ایک کے بدلہ میں دو کو قتل کرتے تھے، یہ امتیاز اور فرق مراتب اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ جب غزوۂ بدر میں قریش کی فوج سے عتبہ وشیبہ میدان میں آئے اور مبارز طلب ہوئے اور انصار ان کے مقابلہ کو نکلے تو عتبہ نے اس بنا پر اس کے مقابلہ سے انکار کر دیا کہ قریش اور انصار کا جوڑ نہیں۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جبلہ بن الایہم خاندان غسان کا اخیر فرمانروا اسلام لایا اور مکہ میں آیا۔ ایک دن طواف میں اس کی چادر کسی شخص کے پاؤں کے نیچے آ گئی، جبلہ نے اس کے گال پر تھپڑ کھینچ مارا اس نے بھی برابر کا جواب دیا، جبلہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر شکایت کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ سن کر کہا، اس کا کیا قصور تم نے جو کیا اس کی جزا پائی، جبلہ نے کہا یہ میرا رتبہ ہے کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھاتا تو قتل کر دیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں زمانہ جاہلیت میں یہی قاعدہ تھا لیکن اسلام نے اس کا خاتمہ کر دیا، جبلہ نے کہا: جو مذہب شرفا کو ذلیل کر دیتا ہے، میں اس سے باز آتا ہوں۔ یہ کہہ کر چوری سے روم چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔ [2]

عرب کا ہر رئیسِ قبیلہ درحقیقت جبلہ تھا اور اسلام قبول کرنے کے وقت اس کو یہی منظر نظر آتا تھا، اسلام ان تمام واقعات اور خصوصیات کو مٹاتا تھا اس کے دربار میں شاہ وگدا، رئیس و عامی، شریف وحقیر کا ایک ہی درجہ تھا اس لیے عرب میں تمام رؤسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا ان کے ہر قسم کے فخر وامتیاز کا مٹ جانا ہے۔

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے تھے ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے، سامان واسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا، عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے پھر اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت ازبام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ وبنیاد سے اکھاڑ دے گی، چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیماء، وادی القریٰ وغیرہ کے

---

[1] ابو داود، کتاب الجهاد، باب في المبارزة: ٢٦٦٥۔

[2] فتوح البلدان بلاذری، ص: ١٢٤؛ دروس التاريخ، ج ٢، ص: ٩٠۔

یہودی زمیندار، سوداگر، مہاجن اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں اور دینِ توحید کے مقابلہ میں اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق واحزاب وغطفان کے معرکے پیش کیے، عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران وروم کی سلطنتیں فرمانروائی کرتی تھیں، عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کے شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا، عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے انہیں دو میں سے کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا دم بھرتے تھے اور یہ دونوں سلطنتیں اس بیچ کے سرحدی ملک کی ایک ایک حرکت اور جنبش پر نظر رکھتی تھیں، اس لیے اس ملک میں اتنی بڑی عظیم الشان تحریک کا قوت پکڑنا ان کو کسی طرح پسند نہ آ سکتا تھا اس لیے عرب میں اسلام کی قوت کا ان کو جب احساس ہوا تو انہوں نے اس کی داروگیر کرنی چاہی کسریٰ ایران نے اپنے ایرانی گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی کو پکڑ کر ہمارے سامنے حاضر کرو قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری ہی کر دی تھی جس کے باعث تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر آنحضرت ﷺ کے بعد اسلام کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

ذریعۂ معاش

اسلام لانے کا ایک بڑا مانع یہ تھا کہ عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری اور سلب اموال اور رہزنی تھا۔ اوپر ہم امالی قالی سے نقل کر آئے ہیں کہ عرب کا ذریعہ معاش غارت گری تھا اور چونکہ حج کے چار مہینے تک جنگ وغارت سے باز رہنے میں ان کے ذرائعِ معاش مسدود ہو جاتے تھے، اس ضرورت سے وہ حج کے مہینوں کو ادل بدل کر لیا کرتے تھے۔ اندرونی عرب تمام تر دشت وصحرا اور بالکل ویرانہ ہے، زراعت یا تجارت کی کوئی صورت نہیں باوجود اس کے لاکھوں نفوس آباد ہیں، اس لیے ان کو غارت گری کرنی پڑتی اور امتداد زمانہ سے یہ عادت ان میں راسخ ہو گئی تھی، رفتہ رفتہ ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعرا، چور اور راہزن ہوتے تھے۔

اکثر بڑے بڑے جتھے اس لیے قائم ہوتے تھے کہ بنجارے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ آنحضرت ﷺ نے دومۃ الجندل پر جو سریہ بھیجا تھا، اسی کے انسداد کی غرض سے بھیجا تھا دومۃ الجندل مدینہ منورہ سے پندرہ منزل کے فاصلہ پر ہے، تاہم یہ لوگ اس قدر فاصلہ سے خود مدینہ پر چھاپہ مارنے کی تدبیر کر رہے تھے کہ آپ کو خبر ہو گئی اور حفظ ماتقدم کے لیے خود وہاں تک گئے اور چند روز قیام کر کے ان اطراف کا بندوبست کیا۔ [1] حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے چند شخصوں کو قتل کر کے ان کا مال چھین لیا تھا، چنانچہ جب اسلام لائے اور اس واقعہ کا اظہار کر کے لوٹ کا مال بھی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

[1] ابن سعد، جز ثانی، قسم اول، ص: ٤٤؛ زاد المعاد، ج ١، ص: ٣٧٠۔

((اما الاسلام فاقبل و اما المال فلست منه في شيء)) [1]

''اسلام تو میں نے قبول کیا لیکن مال سے مجھ کو کسی قسم کا واسطہ نہیں۔''

ایک نکتہ یہاں خاص طور سے لحاظ کے قابل ہے حدیثوں میں جو یہ وارد ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر بیعت اسلام کے وقت جن باتوں کا اقرار لیتے تھے، ان میں ایک یہ بھی ہوتا تھا کہ ''چوری نہ کریں گے'' [2] اس کی یہی وجہ تھی کہ ان جرائم کا رواج تھا، ورنہ آج اگر شرفا سے بیعت کے وقت یہ اقرار لیا جائے تو لوگوں کو تعجب ہوگا کہ یہ بیعت لینے کی کیا چیز ہے۔ اسلام قبول کرنے کے ساتھ ان تمام جرائم سے توبہ کرنا ہوتا تھا اس لیے عرب کو اسلام قبول کرتے وقت یہ نظر آتا تھا کہ وہ تمام ذرائع معاش سے مجبور ہو جاتے ہیں، وہ قافلوں پر حملہ نہیں کر سکتے، کہیں ڈاکہ نہیں ڈال سکتے، کسی کا مال نہیں چھین سکتے تو اب ان کے لیے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

قریش خود رہزن اور غارت گر نہ تھے وہ شہر کی متمدن زندگی بسر کرتے تھے۔ تاہم دیگر اسباب کے ساتھ ان کے اسلام نہ قبول کرنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ قبول اسلام کا اثر ان کے وسائل معاش پر بھی پڑ سکتا تھا، قریش کا ذریعۂ معاش صرف ان تجارتی تعلقات تک محدود تھا جو انہوں نے باضابطہ طور پر دوسرے قبائل اور ممالک سے قائم کر لیے تھے اور یہ تمام قبائل اور ممالک مذہبی حیثیت سے اسلام کے دشمن اور حریف اور مقابل تھے اس بنا پر قریش کو خوف تھا کہ اگر وہ اسلام کے حلقہ میں داخل ہو جائیں گے تو دفعتہً یہ تمام تجارتی تعلقات منقطع ہو جائیں گے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ''الجواب الصحيح لمن بدل دين المسيح'' (صفحہ ۱۳۸ جلد ۴) میں امام شافعی رحمہ اللہ کی روایت سے لکھتے ہیں:

قال الشافعي كانت قريش تنتاب الشام انتيابًا كثيرًا وكان كثير من معائشها منه وتاتي العراق فيقال لما دخلت في الاسلام ذكرت للنبي ﷺ خوفها من انقطاع معائشها بالتجارة من الشام والعراق اذ فارقت الكفر ودخلت في الاسلام وخلاف ملك الشام والعراق لاهل الاسلام فقال النبي ﷺ **((اذا هلك كسرى فلا كسرى بعده فلم يبق بارض العراق كسرى يثبت له امر بعده))** وقال: **((اذا هلك قيصر فلا قيصر بعده فلم يكن بارض الشام قيصر فاجابهم على ماقالوا))**

''امام شافعی رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ قریش شام میں اکثر تجارتی حیثیت سے آمد و رفت رکھتے تھے اور ان کی معاش کا تعلق زیادہ تر اسی سے تھا اور اس غرض سے وہ عراق میں بھی آتے جاتے تھے تو کہا جاتا ہے کہ جب قریش کے لوگ اسلام لائے تو آنحضرت ﷺ سے ان ذرائع

[1] صحيح بخاري، كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد......: ۲۷۳۱۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الحدود، باب توبة السارق: ۶۸۰۱۔

معاش کے منقطع ہو جانے کا خوف ظاہر کیا اور شام و عراق کے بادشاہوں کی اس مخالفت کا ذکر کیا جو ان کو اہل اسلام کے ساتھ تھی اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب کسریٰ ہلاک ہو جائے تو پھر اس کے بعد دوسرا کسریٰ نہ ہوگا چنانچہ عراق سے کسریٰ کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔'' اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب قیصر ہلاک ہو جائے گا تو پھر دوسرے قیصر کا وجود نہ ہوگا چنانچہ ارض شام میں پھر کوئی قیصر نہ ہوا، جس کی وہاں حکومت ہو۔'' اس لحاظ سے آنحضرت ﷺ نے یہ جواب ان کے بیان کے موافق دیا ہے۔''

رفع شک

اس موقع پر ایک غلطی کا ذکر کرنا ضرور ہے جو عام طور پر یورپ میں پھیلی ہوئی ہے، اہل مغرب کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت کی وجہ زیادہ تر یہ ہوئی کہ اس میں عرب کی ہر قسم کی خواہش ہائے نفسانی کے پورے کرنے کا سامان موجود تھا، عرب جنگ و جدل اور لوٹ مار کے شائق تھے، اسلام نے انہی چیزوں کو جہاد وغنیمت کی صورت میں بدل دیا، عرب سخت نفس پرست تھے، اسلام نے چار بیویوں اور غیر محدود لونڈیوں کی اجازت دے دی، اہل عرب زاہدانہ زندگی سے بالکل آشنا نہ تھے اسلام نے بھی رہبانیت کی تحقیر کی، اب کیا چیز تھی جو اہل عرب کو اسلام سے روک سکتی تھی۔ لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے جہاد اور تعدد ِازواج اور سراری کی بحث کتاب کے دوسرے حصوں میں آئے گی یہاں اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جہاد یا تعدادِ ازواج جو کچھ بھی تھا قدیم آزادی سے کوئی نسبت نہیں رکھتا تھا، جہاد صرف کافروں سے جائز تھا، فرض کرو ایک قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا تو اس پر کوئی شخص ہتھیار نہیں اٹھا سکتا تھا اور اس کے مال و متاع سے تعرض نہیں کر سکتا تھا لیکن قدیم رسم کے لحاظ سے اتحاد مذہب کوئی روک نہ تھی، تمام قبائل بت پرستی میں متحد تھے، لیکن ہمیشہ ایک دوسرے کو لوٹتے رہتے تھے جہاد کے لیے اور بہت سی پابندیاں تھیں، جو پہلے بالکل نہ تھیں، جہاد میں صرف پاس پاس کے قبائل شریک ہوتے تھے اور دور کے قبائل اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے تھے جہاد میں جو لونڈیاں گرفتار ہوتی تھی ان سے اس وقت تمتع جائز ہوتا تھا جب ایک مہینہ کی مدت گزر جائے یا اگر حاملہ ہے تو بچہ پیدا ہو چکے لیکن اسلام سے پہلے فتح کے ساتھ ہی عورتوں کو تصرف میں لے آتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے، پہلے نکاح کے لیے تعداد کی کوئی قید نہ تھی ایک ساتھ آٹھ آٹھ، دس دس شادیاں کرتے تھے اب چار کی قید ہو گئی اور وہ بھی اس سخت شرط کے ساتھ کہ سب میں عدل و مساوات رہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ اسلام عرب کے مرغوبات کو قائم رکھتا تھا تمام تر غلط ہے، برخلاف اس کے عرب کی ایک ایک چیز روایاتِ قدیمہ، جہالت، عادات رسوم اور نفس پرستی ہر چیز اسلام کے قبول کرنے میں مانع تھی۔ ہر قوم پر جو چیز سب سے زیادہ سختی کے ساتھ حکمران ہے، وہ قدیم عادات اور رسوم اور خیالات ہیں، آج یورپ علوم وفنون اور آزادی خیال میں اس حد تک ترقی کر گیا ہے، لیکن جو بے ہودہ تعجب انگیز رسمیں پہلے قائم

تھیں، اب بھی قائم ہیں، یا تو تعود کی وجہ سے ان کی برائیاں سرے سے نظر ہی نہیں آتیں یا آتی ہیں تو عادت کی حکومت کے مقابلہ میں آزادی خیال اور علوم وفنون سب عاجز ہو کر رہ جاتے ہیں۔

عرب میں جس قدر رسمیں قومی عادتیں تھیں جو ان کی ہستی کی عناصر بن گئی تھیں، اسلام ایک ایک کا دشمن تھا ثار یعنی انتقامِ خون عرب کے جذبات کا سب سے بڑا مظہر تھا، اسلام نے اس کو بالکل مٹا دیا۔ خاندانی فخر و مباہات ان کی قومی زندگی کی روح تھی، فنا کر دی گئی۔ ابوسفیان رئیس العرب کو بلال رضی اللہ عنہ (جو حبشی غلام تھے) کے ساتھ بیٹھنا پڑا، یا تو قریش کو انصار کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے سے بھی عار تھا یا اب قریش کی لڑکیاں غلاموں (زید و سالم وغیرہ) کے گھر میں آ گئیں، عکاظ وغیرہ کے میلے جہاں عرب سال کے سال جمع ہو کر اپنے مفاخر کی داستانیں سناتے تھے، سرد پڑ گئے۔ اسلام ایک طرف تو عرب کے تمام تر مفاخر کو خاک میں ملاتا تھا، دوسری طرف خود اس میں ہوائے نفس اور تفریحِ طبع کا کوئی سامان نہ تھا، اسلام قبول کرنے کے ساتھ پانچ وقت کی نماز گلے کا ہار بن جاتی تھی جو آزاد مزاجوں پر سخت گراں تھی:

﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۵)

''اور وہ (نماز) خاشعین کے سوا اوروں پر یقیناً گراں ہے۔''

روزہ یعنی تیس دن تک متصل کھانا پینا چھوڑ دینا کوئی آسان کام نہ تھا، زکوٰۃ ایسا ٹیکس تھا کہ محض اس کے ادا کرنے پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں عام بغاوت ہو گئی، صرف حج ایک ایسا فرض تھا جو بظاہر زندہ دلی کا سامان رکھتا تھا، لیکن اب وہ حج جاہلیت کا حج نہیں رہا، طواف عریاں کی اجازت نہیں رہی تھی۔ بڑی دلچسپی کی چیز بت تھے وہ ایک ایک کر کے حرم سے نکال دیے گئے۔ مقام منیٰ میں خاندانی واقعات کی رجز خوانی کا جو طریقہ چلا آتا تھا بند کر دیا گیا یہ فرائض اور اوامر کا حال تھا اسی کے ساتھ محرمات اور نواہی کی وہ عالم گیری تھی کہ ان کے جاہلانہ خیال کے مطابق زندگی زندگی نہیں بلکہ زندان بن گئی تھی، زنا حرام، شراب حرام، قمار حرام، سونا چاندی حرام، اطلس وحریر حرام، چنگ وعود حرام، تصویر حرام، پھر زندہ دلی اور لطفِ زندگی کے لیے باقی کیا رہ جاتا ہے۔

خوب غور سے دیکھو! تمام مذاہب نے عبادتوں میں بھی دلچسپی کا سامان رکھا ہے، عیسائیوں کی نماز گا کر ادا کی جاتی ہے، پارسیوں میں زمزمہ ہوتا ہے، ہندو بھی عبادت کے وقت بھجن گاتے ہیں اور سامنے دلفریب بت ہوتے ہیں لیکن اسلام میں بظاہر دلآویزی اور دلفریبی کی ایک چیز بھی نہیں۔

مذکورہ بالا واقعات کی بنا پر یورپ کا یہ اعتراض کس قدر غلط اور تمام تر بے سروپا ہے کہ اسلام اس لیے پھیلا کہ وہ نفس پرستی کی ترغیب دلاتا اور اس کے سامان مہیا کرتا تھا۔ پھر کیا تھا؟

اس کا جواب آگے آتا ہے۔

تبلیغِ نبوی

اور اس کے اصول اور اس کی کامیابی کے اسباب

تمام گزشتہ موانع، عوائق، مشکلات اور دشواریوں کی دیواریں آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے ٹوٹتی گئیں، اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضرت ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا، اس لیے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ مخالفین کے نزدیک تو اس کا جواب صرف تلوار ہے لیکن کارلائل [1] کے بقول نہتے اور یکہ وتنہا اسلام کے ہاتھ میں یہ تلوار کس کے زور سے آئی؟ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغی دعوت تھی اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں اسلام کی اس طاقت کی تشریح کر دینا مناسب ہے۔

فریضہ تبلیغ

''تبلیغ'' کے لفظی معنی پیغام پہنچانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسرے لوگوں اور دوسری قوموں اور ملکوں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں۔ قرآن پاک میں تبلیغ کے ہم معنی چند اور الفاظ بھی ہیں جن میں سے ایک لفظ (انذار) ہے جس کے معنی ہشیار اور آگاہ کرنے کے ہیں، دوسرا دعوت جس کے معنی بلانے اور پکارنے کے ہیں اور تیسرا لفظ تزکیہ جس کے معنی یاد دلانے اور نصیحت کرنے کے ہیں۔ بعثت نبوی ﷺ کے وقت دنیا میں دو قسم کے مذہب تھے، دو ایسے جو تبلیغی تھے یعنی عیسائیت اور بودھ مت۔ باقی زیادہ تر ایسے تھے جو تبلیغی نہیں تھے، جیسے یہودیت، مجوسیت، ہندویت۔ جو دو تبلیغی سمجھے جاتے تھے ان کی نسبت یہ فیصلہ مشکوک ہے کہ آیا یہ تبلیغ ان کے اصل مذہب کا حکم تھا یا بعد کے پیرووں کا عمل کیونکہ ان کے مذہبی صحیفوں میں اس تعلیم کی دعوت کی کھلی ہوئی ہدایتیں اور ان کے بانیوں کی زندگی میں اس کی عملی مثالیں نہیں ملتیں، تمام مذاہب میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے تبلیغ کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے متعلق اپنے صحیفہ میں کھلے احکام دیے اور اس کے داعی وحامل علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اس کی عملی مثالیں پیش کیں۔

جن مذہبوں نے تبلیغ کو اپنا اصول نہیں ٹھہرایا ان کے ایسا کرنے کی اصلی وجہیں دو ہیں، ایک یہ کہ ان کے نزدیک اس حق کے قبول کرنے کی عزت کا استحقاق پیدائش سے حاصل ہوتا ہے کوشش سے نہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ جو حق ان کے پاس ہے وہ ان کے نزدیک اتنا پاک ومقدس ہے کہ ان کی خاص پاک وبزرگ و محترم نسل وقوم کے علاوہ دوسری تمام قومیں جو ناپاک ونجس وکمتر ہیں ان تک اپنے پاک مذہب کو لے جانا خود اس مذہب کی پاکی کو صدمہ پہنچانا ہے، یہی سبب ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک دفعہ جب ایک کنعانی (متی

---

[1] ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (محمد ﷺ)

۱۵) یا یونانی (مرقس ۷) عورت نے ان سے برکت چاہی تو فرمایا: ''میں اسرائیل کے گھر کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔'' (متی ۱۵۔۲۵) پھر فرمایا: ''مناسب نہیں کہ لڑکوں کی روٹی (بنی اسرائیل کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دیں۔'' (۲۷) پھر فرمایا: ''غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ پہلے اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو۔'' (متی ۔۶) پھر ارشاد فرمایا: ''وہ چیز جو پاک ہے کتوں کو مت دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ پھینکو۔'' (متی ۷۔۶)

ہندوؤں نے اپنے مذہب کو تمام قوموں سے جو چھپا کر رکھا اس کا بھی یہی سبب تھا کہ وہ اپنا پاک دھرم ملیچھوں اور اچھوتوں کو سکھا کر اس کو ناپاک نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہودیوں کا بھی یہی خیال تھا کہ نامختون اس نعمت کے اہل نہیں۔

تبلیغ کی اہمیت

آنحضرت ﷺ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا، اس لیے اپنی تبلیغ کے لیے قریش، وغیر قریش حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا ابتدائی وحی میں انجانوں کو ہشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا: ﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر: ۱، ۲) ''اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہشیار و آگاہ کر'' پھر بار بار حکم ہوتا رہا کہ ﴿ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ (۵/ المآئدہ: ۶۷) ''جو تیری طرف اتارا گیا اس کو اوروں تک پہنچا۔'' ﴿ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ: ۱۵) ''لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط قائم رہ جس طرح تجھے حکم دیا گیا۔'' ﴿ فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ: ۹) ''لوگوں کو نصیحت کر اگر نصیحت فائدہ مند ہو۔'' ﴿ وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۵۵) ''اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔'' ﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ ﴾ (۵۰/ ق: ۴۵) ''قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔'' اور ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں اس فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اے علی! تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق قبول کر لینا دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بڑھ کر ہے۔'' [1]

اس سے زیادہ یہ کہ اسلام نے اپنے ہر پیرو پر خیر کی دعوت امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تواصی بالحق

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب دعاء النبی ﷺ الی الاسلام: ۲۹۴۲؛ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل علی: ۶۲۲۳۔

یعنی باہم ایک دوسرے کو سچائی کی نصیحت کرنا ضروری قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیامِ الٰہی لوگوں تک پہنچایئے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہ دیا:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلرَّسُولُ بَلِّغْ مَآ أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُۥ ۚ وَٱللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ ٱلنَّاسِ ۗ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٦٧)

''اے خدا کے پیغام پہنچانے والے تیرے پروردگار کے پاس سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے اگر تو نے ایسا نہیں کیا، تو تو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچالے گا۔''

اس کی وسعت

اس کے بعد اس فریضۂ تبلیغ کی وسعت کی بحث ہے، پیغامِ الٰہی، سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے، جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنی قریب کی زمین کو، پھر آگے کو پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کو اس تبلیغ کا حکم اسی تدریج کے ساتھ ہوا سب سے پہلے خاص اپنے گھر اور خاندان کے لوگوں کو سمجھانے کا حکم ہوا:

﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ ٱلْأَقْرَبِينَ ۝ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢١٤)

''اور اپنے سب سے نزدیک کے اہل خاندان کو آگاہ وہشیار کر۔''

اس کے بعد یہ دائرہ بڑھ کر شہر مکہ اور اس کے اطراف کی آبادیوں تک پہنچتا ہے:

﴿ لِّتُنذِرَ أُمَّ ٱلْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:٧)

''تاکہ تو مکہ اور جو اس کے آس پاس کے بدوی ہیں ان کو آگاہ وہشیار کرے۔''

اب تبلیغ کا دائرہ اس سے بھی آگے بڑھتا ہے اور ہر زندہ روح یعنی سمجھ بوجھ، احساس و عقل وغیرہ حقیقی زندگی کی علامتیں جس میں موجود ہوں اس کی مخاطب ہوتی ہے:

﴿ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ وَقُرْءَانٌ مُّبِينٌ ۝ لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا ﴾ (٣٦/ یٰسٓ:٦٩، ٧٠)

''یہ قرآن تو صرف ایک نصیحت اور صاف صاف خدا کا کلام ہے، تاکہ وہ اس کو ہشیار کرے جو زندہ ہے۔''

پھر جس تک بھی وہ آواز پہنچ جائے سب سے اس کا خطاب ہے:

﴿ لِأُنذِرَكُم بِهِۦ وَمَنۢ بَلَغَ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٩)

’’تاکہ میں تمہیں آگاہ و ہوشیار کروں اور ان کو جن تک میری یہ آگاہ و ہوشیار کرنے والی آواز پہنچے۔‘‘

پھر تمام انسانوں تک اس کی وسعت ہے:

﴿ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ ﴾ (۱٤/ ابراھیم:۵۲)

’’یہ قرآن تمام انسانوں کے لیے پیغام ہے۔‘‘

آنحضرت ﷺ کو خطاب ہوا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾ (۳٤/ سبا:۲۸)

’’اور ہم نے تم کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری سنانے والا اور ہوشیار کرنے والے بنا کر بھیجا۔‘‘

آپ ﷺ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں:

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۸)

’’اے لوگو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔‘‘

اس سے زیادہ یہ ہے کہ تمام کائنات آپ کی دعوت وتبلیغ کے دائرہ میں داخل ہے۔ فرمایا:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرَا ۙ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۱، ۲)

’’برکت والا ہے وہ خدا جس نے حق اور باطل میں امتیاز بتانے والی کتاب اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر نازل کی، تاکہ وہ دنیا جہان کے لیے ہوشیار و آگاہ کرنے والا ہو وہ خدا جس کی ملکیت میں آسمانوں کی اور زمین کی سلطنت ہے۔‘‘

اس سے بھی زیادہ اہم یہ بات ہے کہ اس تبلیغ و دعوت کی وسعت اور اس میں کامیابی کی خوشخبری بھی اس وقت دے دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی تھی، چنانچہ آیت ذیل نازل ہوئی:

﴿ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ؀ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ؀ ﴾ (۳۸/ ص:۸۷۔۸۸)

’’یہ قرآن تو دنیا کے لیے نصیحت ہے اور تم ایک زمانہ کے بعد اس کی خبر جانو گے۔‘‘

انبیا اور بانیان مذاہب کے عملی نمونوں اور مثالوں کی تلاش اور جستجو کرو تو یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی کہ اسلام کے سوا اور جو مذہب تبلیغی سمجھے جاتے ہیں وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں، خود بودھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا واعظ اور مبلغ بھیجا، حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت موجود تھی۔

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر مکہ اور اس کے آس پاس کے لوگوں کو بیدار و ہشیار کیا، حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلہ کو جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانہ میں یمن اور حبشہ تک آپ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاشِ حق کے لیے آپ کے پاس مدینہ منورہ آئے تو قریش گو برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدِ راہ بنے رہے پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لیے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو تبلیغ کی پرامن آزادی ملے، چھ برس کے جنگ و جدل کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبہ کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی عطا کی، قرآن نے اسلام کی اس روحانی فتح کو فتح مبین قرار دیا اور ﴿ اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ﴾ (٤٨/ الفتح:١) [1] نازل ہوا، اس کے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے واعظ قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امرا اور سلاطین کو دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم، ایران، حبش اور روم کے طالبین اسلام لائے اور فیضانِ حق سے سیراب ہوئے مشرکینِ عرب، یہود اور عیسائی اور پارسی سب نے آپ کے زمانہ ہی میں آپ کے نور سے روشنی حاصل کی، لیکن نفسِ تبلیغ کی فرضیت و اہمیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اصول ہیں۔

تبلیغ کے اصول

یہ نکتہ کہ کس طرح لوگوں کو کسی سچائی کے قبول کی دعوت دینی چاہیے، دنیا میں پہلی دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کے دعوے رکھتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے لیکن صحیفۂ محمدی نے نہایت اختصار لیکن پوری تشریح کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی کو کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے:

﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾

(١٦/ النحل:١٢٥)

''اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو دانائی اور عمدہ نصیحت کے ذریعہ سے بلا اور ان سے مناظرہ خوش آئند طریق سے کر۔''

تبلیغ و دعوت کے یہ تین اصول مسلمانوں کو سکھائے گئے عقل و حکمت، موعظۂ حسنہ اور مناظرہ بطریق احسن۔ مسلمان متکلموں نے بیان کیا ہے کہ تبلیغ و دعوت کے یہ تینوں اصول وہی ہیں جو منطقی استدلال میں عموماً کام میں لائے جاتے ہیں یعنی ایک تو برہانیات جن میں یقینی مقدمات کے ذریعہ سے دعویٰ کے ثبوت پر دلیلیں لائی جاتی ہیں، دوسرے خطابیات ہیں جن میں مؤثر اور دلپذیر اقوال سے مقصود کو ثابت کیا جاتا ہے اور تیسرے

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية:٤٦٣٧۔

جدلیات جن میں مقبول عام اقوال اور فریقین میں مسلّم مقدمات سے استدلال کیا جاتا ہے۔قرآن پاک نے پہلے طریقہ کو حکمت اور دوسرے کو موعظت حسنہ اور تیسرے کو جدال سے تعبیر کیا ہے اور استدلال کے یہی وہ تین طریقے ہیں جن سے ایک شخص دوسرے کے سامنے اپنے مدعا کو ثابت کرتا ہے۔

خیر یہ تو فلسفیانہ نکتہ آفرینی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جب ہم کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کرتے ہیں اور اس کو قبول کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً تین طریقے برتتے ہیں یا تو اس بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دلنشین دلیلیں پیش کرتے ہیں یا اس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور مؤثر انداز سے اس کو نیک و بد اور نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اس کی دلیلوں کو مناسب طریقہ سے رد کر کے اس کی غلطی کو اس پر واضح کرتے ہیں، پہلے طریقہ کا نام حکمت اور دوسرے کا نام موعظہ حسنہ اور تیسرے کا نام جدال بطریق احسن ہے۔تبلیغ و دعوت کے یہی تین طریقے اسلام نے بتائے ہیں۔

قولِ لین

حکیمانہ استدلال ہو یا وعظ و نصیحت ہو یا جدال و مناظرہ ہو،ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کہ سختی اور شدت کا طریق دوسرے کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے کیسی ہی اچھی اور سچی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کر لیتے اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ پیدا کر دیتے ہیں جس سے دعوت کا فائدہ اور نصیحت کا اثر باطل ہو جاتا ہے اسی لیے قرآن پاک نے اپنے پیغمبروں کو اپنے مخالف سے مخالف دشمن کو بھی نرمی ہی سے باتیں کرنے کی تاکید کی ہے،حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے سرکش کے سامنے پیغام ربانی لے کر جانے کی ہدایت ہوتی ہے تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے:

﴿ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۚ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۴۳، ۴۴)

”تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے تو اس سے نرم گفتگو کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے۔“

دعوت و تبلیغ میں رفق و نرمی اور لطف و تحمل کی تعلیم کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ نہ کوئی داعی اور واعظ پیغمبروں سے بہتر ہو سکتا ہے اور نہ فرعون سے بڑھ کر کوئی مجرم ہو سکتا ہے پھر ایسے مجرم کے سامنے اس لطف و نرمی سے وعظ و نصیحت کی تعلیم جب پیغمبروں کو ہوتی ہے تو عام داعی و مبلغوں اور واعظوں کو عام مخالفوں مجرموں اور سرکشوں کے ساتھ بدرجہا زیادہ رفق و ملاطفت سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔

اعراض اور قولِ بلیغ

آنحضرت ﷺ کو ان منافقوں کے بارہ میں جو آپ ﷺ کی نافرمانی کے جرم کے مرتکب ہوئے

تھے یہ حکم ہوتا ہے:

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِیْغًا۝﴾ (٤/ النسآء:٦٣)

''تو ان سے درگزر کر اور ان کو یہ نصیحت کر اور ان سے ایسی بات کہہ جو ان کے دلوں میں اثر کرے۔''

اس تعلیم میں تین ہدایتیں ہیں

اول یہ کہ دعوت وتبلیغ میں مخالفت کی بدسلیقگی، بدتہذیبی اور درشتی سے ان کو درگزر اور برداشت کرنا چاہیے دوسرے یہ کہ ان کو نصیحت کرنا اور سمجھانا چاہیے اور تیسرے یہ کہ گفتگو کا وہ مؤثر طرز وانداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کرے۔

تیسیر وتبشیر

انہیں ربانی ہدایتوں کی تعمیل میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل اور ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو یمن میں اسلام کی دعوت وتبلیغ کے لیے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی ((یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا)) [1] ''دینِ الٰہی کو آسان کر کے پیش کرنا سخت بنا کر نہیں، لوگوں کو خوشخبری سنانا نفرت نہ دلانا۔'' یہ وہ تبلیغی اصول ہیں جو ایک داعی ومبلغ کی کامیابی کی جان ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کے سامنے اور صحابہ نے عام مسلمانوں کے سامنے اسی اصول کے مطابق دین الٰہی پیش کیا اور کامیابی حاصل کی۔ دین کی جائز آسانی اور سہولت کو پیش کرنا اور اس کو سخت، درشت اور مشکل نہ بنانا ہی اس کے قبول عام کی راہ ہے، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے لطف وشفقت، رحم وکرم اور مہر ومحبت کی دلنواز صداؤں سے دلوں کو پرامید اور مسرور بنانا، اس سے بہتر ہے کہ بات بات پر خدا کی قہاری وجباری اور ہیبت وجلال کا ذکر کر کے دلوں کو خوف زدہ اور مایوس بنایا جائے۔

تدریج

تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضرت ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اس کی گردن پر نہ ڈالا جائے بلکہ رفتہ رفتہ وہ اس کے سامنے پیش کیے جائیں پہلے توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہیے، اس کے بعد عبادات کو، عبادات میں بھی اہم پھر اہم کے اصول کو پیش نظر رکھنا چاہیے، عبادات میں سب سے اہم نماز ہے پھر زکوۃ ہے پھر دوسرے فرائض ہیں، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو ان کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمد ﷺ اس کا رسول ہے۔ جب وہ یہ مان لیں تو ان کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، بعث ابی موسی ومعاذ الی الیمن قبل حجة الوداع: ٤٣٤١، ٤٣٤٢۔

ان کو بتاؤ کہ اللہ نے ان پر صدقہ فرض کیا ہے یہ صدقہ ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دیا جائے جب وہ اس کو تسلیم کرلیں تو دیکھو صدقہ میں چن چن کر ان کے بہترین مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بد دعا سے ڈرتے رہنا کہ اس کے اور خدا کے درمیان کوئی پردہ نہیں۔'' ❶

تالیفِ قلب

تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں اسلام نے ایک اور طریقہ کو بھی پیش کیا ہے جس کو تالیفِ قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے ﴿ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ ﴾ (۹/ توبہ: ۶۰) اس کے لفظی معنی ہیں ''دلوں کو ملانا'' اور اس سے مقصود اس شخص کے ساتھ جس کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو لطف و محبت اور امداد و اعانت اور غم خواری و ہمدردی کرنا ہے کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے، یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات کو دور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے بہت سے لوگوں کو اپنے اس اعجاز سے اسلام کا حلقہ بگوش بنا لیا تھا، چنانچہ مکہ کے بعض رئیس اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اسلام لائے تھے، آنحضرت ﷺ نے حنین کی غنیمت کا سارا مال انہیں کو تقسیم کر دیا تھا نتیجہ یہ نکلا کر پھر حق کے خلاف ان کی گردنیں نہ اٹھ سکیں۔ صفوان جو اسلام کے سخت مخالف اور آنحضرت ﷺ سے نہایت بغض رکھتے تھے وہ کہتے ہیں کہ ''مجھ کو آنحضرت ﷺ نے دیا، جتنا دیا اور مجھے ان سے سخت بغض تھا لیکن آپ کے ان احسانات نے مجھے ایسا متاثر کیا کہ اب میری نگاہ میں ان سے زیادہ کوئی پیارا نہیں۔'' ❷ ایک دفعہ ایک بدو نے آ کر کہا کہ ان دونوں پہاڑوں کے درمیان بکریوں کے جتنے ریوڑ ہیں وہ مجھ کو عنایت کیجئے، آپ ﷺ نے وہ سب اس کو دے دیے یہ فیاضی دیکھ کر اس پر اتنا اثر پڑا کہ اس نے اپنے پورے قبیلہ کو آ کر کہا: ''بھائیو! اسلام قبول کرو کہ محمد اتنا دیتے ہیں کہ ان کو اپنے فقر و افلاس کا ڈر ہی نہیں رہتا۔'' ❸

ایک یہودی لڑکا آنحضرت ﷺ کی خدمت کرتا تھا وہ بیمار پڑا تو آنحضرت ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے اور جا کر اس کے سرہانے بیٹھے، پھر فرمایا کہ لڑکے اسلام قبول کر لے اس نے مستفسرانہ نگاہ سے باپ کی طرف دیکھا، اس نے کہا ابوالقاسم (آپ ﷺ کی کنیت) کی بات مان لے، چنانچہ وہ مسلمان ہو گیا اور جب آنحضرت ﷺ وہاں سے اٹھے تو زبان مبارک پر یہ فقرہ تھا کہ ''اس خدا کی حمد جس نے اس کو دوزخ سے بچا لیا۔'' ❹

دعوتِ عقل

اسلام نے تبلیغ و دعوت کے جو اصول بتائے ہیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہو، کہ بغیر اس کے حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور جدال و مناظرہ کی بنیاد قائم نہیں رہ سکتی، اس بنا پر

---

❶ صحیح بخاری، باب مذکور: ۴۳۴۷۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائہ ﷺ: ۶۰۲۲۔
❸ ایضاً: ۶۰۲۰۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب اذا اسلم الصبی ... الخ: ۱۳۵۶۔

مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمدیہ ﷺ یہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (توراۃ) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا، غور وفکر کی دعوت دی، فہم وتدبر کا مطالبہ کیا اس نے اپنی ہر تعلیم کی خوبی مصلحت اور حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیات الٰہی میں غور وفکر کی ہدایت کی۔ فرمایا:

﴿ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ۭ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٤٨۔١٤٩)

''کہہ اے پیغمبر کہ تمہارے پاس کوئی (یقینی) علم ہے کہ اس کو تم ہمارے لیے ظاہر کرو، تم گمان ہی کے پیچھے چلتے ہو اور تم تو اٹکل ہی کرتے ہو کہہ کہ اللہ ہی کی ہے پہنچتی ہوئی دلیل۔''

نیز ارشاد ہوا:

﴿ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْۢ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(٨/ الانفال:٤٢)

''تاکہ جو ہلاک ہو وہ دلیل سے ہلاک ہو اور جو جیتا رہے وہ دلیل سے جئے اور اللہ ہی سننے والا جاننے والا ہے۔''

غفلت شعار کافروں کی نسبت فرمایا:

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝ ﴾

(١٢/ یوسف:١٠٥)

''اور آسمانوں میں اور زمین میں خدا کی توحید کی کتنی نشانیاں (دلیلیں) ہیں جن پر وہ گزر جاتے ہیں اور ان پر غور نہیں کرتے۔''

غور وفکر کرنے والے اہل ایمان کی تعریف میں فرمایا:

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ۙ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ ﴾ (٣/ آل عمران:١٩٠، ١٩١)

''بے شبہ آسمانوں اور زمین کی بناوٹ اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں عقل والوں کے لیے نشانیاں ہیں، جو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اپنی کروٹوں پر یاد کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار تو نے یہ (عالم) بیکار نہیں بنایا۔''

اس سے زیادہ عقلی اور علمی استدلال کی دعوت اور کیا ہوگی مگر بہر حال یہ خارجی استدلال تھا اندرونی

استدلال کی بھی اس نے دعوت دی۔ فرمایا:

﴿ وَفِيٓ أَنفُسِكُمۡۚ أَفَلَا تُبۡصِرُونَ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۲۱)

''اور خود تمہارے اندر نشانیاں ہیں تم دیکھتے نہیں۔''

صحیفۂ محمدی ﷺ کی نسبت ہر جگہ یہ الفاظ فرمائے:

﴿ تَبۡصِرَةً وَذِكۡرَىٰ لِكُلِّ عَبۡدٖ مُّنِيبٖ ﴾ (۵۰/ ق:۸)

''یہ بصیرت اور نصیحت ہے ہر رجوع ہونے والے بندہ کے لیے۔''

﴿ هَٰذَا بَصَآئِرُ مِن رَّبِّكُمۡ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۰۳)

''یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے بصیرتیں ہیں۔''

﴿ هَٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ ﴾ (۴۵/ الجاثیة:۲۰) ''یہ لوگوں کے لیے بصیرتیں ہیں۔''

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلۡقُرۡءَانَۚ ﴾ (۴/ النسآء:۸۲) ''کیا یہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے۔''

﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ ٱلۡقُرۡءَانَ أَمۡ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقۡفَالُهَآ ﴾ (۴۷/ محمد:۲۴)

''کیا یہ قرآن میں غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے ہیں۔''

﴿ وَٱلۡقُرۡءَانِ ٱلۡحَكِيمِ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۲) ''حکمت والے قرآن کی قسم۔''

﴿ تِلۡكَ ءَايَٰتُ ٱلۡكِتَٰبِ ٱلۡحَكِيمِ ﴾ (۱۰/ یونس:۱، ۳۱/ لقمان:۲)

''یہ حکمت والی کتاب کی آیتیں ہیں۔''

نہ صرف اسی قدر بلکہ خدا کا وجود، توحید، رسالت، قیامت، جزا، سزا، عبادت، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان ظاہر کی ہیں آیندہ صفحوں میں ہر قدم پر اس کی دلیلیں آپ کو ملیں گی۔

مذہب میں زبردستی نہیں

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا آج ہر در و دیوار سے آتی ہے، لیکن شاید لوگوں کو معلوم نہیں کہ دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان، مبارک سے ہوا، اور ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں، جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو، وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا، اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں۔ اسلام میں مذہب کا اولین جزو ایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بہ زور پیدا نہیں کر

سکتی، بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔" فرمایا:

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۶)

"دین میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت گمراہی سے الگ ہو چکی۔"

یہ وہ عظیم الشان حقیقت ہے جس کی تلقین انسانوں کو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے ہوئی۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَمَنْ شَاۗءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاۗءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ ﴾

(۱۸/ الکہف:۲۹)

"اور کہہ دے کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے، تو جو چاہے قبول کرے اور جو چاہے انکار کرے۔"

ایمان اور کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے اس لیے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچا دینا ہے زبردستی منوانا نہیں:

﴿ اَنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۹۲)

"ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔"

آنحضرت ﷺ کو جو قریش کے اعراض و مخالفت سے حد درجہ غمگین تھے تسکین دی گئی:

﴿ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۴۸)

"اے پیغمبر ﷺ تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے۔"

﴿ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۝ۭ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَۜيْطِرٍ ۝ۙ ﴾ (۸۸/ الغاشیۃ: ۲۱، ۲۲)

"اے پیغمبر ﷺ! تو، تو صرف نصیحت کرنے والا ہے، تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔"

﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۭ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ ﴾

(۴۲/ شوریٰ:۴۸)

"پھر اگر وہ (اسلام کی دعوت سے) انکار کریں تو اے پیغمبر ﷺ! ہم نے تجھ کو ان پر گماشتہ بنا کر نہیں بھیجا، تیرے ذمہ صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے۔"

کسی دین کو زبردستی پھیلانا اسلام کی نگاہ میں ایک ایسا فعل ہے جس سے رسول کی شان کو اس نے بہت بلند سمجھا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّھُمْ جَمِيْعًا ۭ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا

مُؤْمِنِيْنَ﴾ (۱۰/ یونس:۹۹)

''اور اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ لوگوں کو زبردستی مومن بنادے تو زمین کے سب لوگ ایمان لے آتے، تو کیا اے پیغمبر ﷺ تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔''

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لیے لڑنا جائز ہے، اور آنحضرت ﷺ کو بھی مجبوراً لڑنا پڑا۔ اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ لڑائی صرف اس لیے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے، حالانکہ قرآن میں ایک بھی آیت ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو اور نہ آنحضرت ﷺ کی سیرت میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو، بلکہ اگر ہے تو یہ ہے:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (۹/ التوبۃ:۶)

''اور اگر لڑائی میں کوئی مشرک تجھ سے پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو وہاں پہنچادے جہاں وہ بےخوف ہو کہ یہ بےعلم لوگ ہیں۔''

یہ نہیں کہا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو، بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچادیا جائے، اور اس کو کلامِ الٰہی سنایا جائے، تاکہ اس کو غور وفکر کرنے کا موقع ملے، ظاہر ہے کہ جو مشرک اس طرح مسلمان ہوگا اس کے تبدیلِ مذہب کا محرک تلوار کے بجائے کوئی اور چیز (پیامِ حق) ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت، مظلوموں کی حمایت، جلاوطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدہ کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ہوئی تھی، جیسا کہ اس کا مفصل بیان کتاب میں کہیں آئے گا، قرآن کی اس آیت میں:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (۸/ الانفال:۳۹)

''اور ان کافروں سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ نہ رہے اور دین پورا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

''فتنہ'' سے مراد عقیدہ اور مذہب کی آزادی نہ ہونا ہے، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما صحابہ کی خانہ جنگیوں میں شریک نہ تھے۔ ایک شخص نے آکر ان سے کہا کہ خدا نے فتنہ کے مٹانے کے لیے لڑنے کا حکم نہیں دیا؟ اور اوپر کی آیت پیش کی انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ فرض آنحضرت کے زمانہ میں ادا کر چکے ہیں جب مسلمان کم تھے تو انسان اپنے دین کے سبب سے فتنہ میں مبتلا کیا جاتا تھا یا اس کو لوگ مار ڈالتے تھے یا قید کر لیتے تھے یہاں تک کہ مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تو پھر فتنہ باقی نہ رہا۔ [1]

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الانفال، باب قولہ تعالی ﴿وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ﴾ الآیۃ: ۴۶۵۰۔

میدان جنگ میں تبلیغ

ناواقفوں نے ایک اور مسئلہ کی غلط تعبیر کی ہے، اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آ پڑے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں، اوّل یہ کہ تم بھی کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ، اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے، اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری سیاسی حکومت کو قبول کر لو اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی، اگر وہ ان دو میں سے کسی بات کو قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں، اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خونریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گئی ہے۔

یہ قانون جو سرتاپا امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے اس کو مخالفوں نے اس صورت میں پیش کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے لوگوں کو تلوار کے زور سے مسلمان بنانے کی تعلیم دی، آنحضرت ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ کسی فوج کو متعین کرتے تو اس کے سردار کو یہ ہدایت فرماتے:

> ''جب تو مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے، ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لے اور اس پر حملہ کرنے سے رک جا، اس کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کر لے تو پھر اس سے رک جا، اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آ جائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فئی میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے، اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہہ، اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے بھی رک جاؤ، اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے۔'' [1]

یہ وہ اصول جنگ تھے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی مجبور کو بزور شمشیر مسلمان بنا لینا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدانِ جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ ''میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں'' اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے مذہب ہی پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم ہو کر رہو گے۔'' [2] اس سے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب تأمیر الامام الامراء علی البعوث .....: ٤٥٢٢۔

[2] جامع ترمذی، ابواب السیر، باب ما جاء فی الدعوة قبل القتال: ١٥٤٨۔

معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ قبیلہ بنی حنیفہ میں سے تھے اور یمامہ کے رئیس تھے۔ یہ وہ قبیلہ ہے جو آخر تک سرکش رہا اور اسی میں آنحضرت ﷺ کے آخر زمانہ میں مسیلمہ پیدا ہوا تھا۔ ثمامہ اتفاق سے مسلمانوں کے ایک لشکر کے ہاتھ میں گرفتار ہو گئے اور مدینہ لا کر مسجد نبوی کے کھمبے میں باندھ دیے گئے، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو پوچھا: ''ثمامہ تمہاری کیا رائے ہے؟'' جواب دیا: محمد میری رائے اچھی ہے، اگر مجھے قتل کرو گے تو ایک خون والے کو قتل کرو گے اور اگر احسان کرو گے تو ایک شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر زر فدیہ چاہتے ہو تو مانگو جو مانگو گے دیا جائے گا، آنحضرت ﷺ نے کچھ نہیں فرمایا پھر اسی طرح دوسرے دن سوال و جواب ہوا پھر تیسرے دن۔ تیسرے دن آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''ثمامہ کو چھوڑ دو۔'' لوگوں نے کھول دیا وہ رسی سے کھل کر آزاد ہو گئے مگر سچائی کی زنجیر ان کے پاؤں میں پڑ گئی، مسجد نبوی کے قریب ایک نخلستان میں جا کر خود بخود غسل کیا اور پھر مسجد میں آ کر کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گئے [1] کیا کسی کو زبردستی مسلمان بنانے کے لیے اس سے بہتر موقع ہو سکتا تھا؟ بدر کے قیدی گرفتار ہو کر آئے لیکن انہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تلوار یا اسلام اسی طرح جنگ کے دوسرے قیدیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ رہا۔ قرآن پاک نے جنگ کے قیدیوں کے متعلق کہا: ﴿فَاِمَّا مَنًّاۢ بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً﴾ (٤٧/ محمد: ٤) ''لڑائی ختم ہونے کے بعد ان قیدیوں کو احسان دھر کر چھوڑ دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔'' یہ ارشاد نہ ہوا کہ اسلام یا تلوار۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں، بالآخر شیر خدا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جاؤ وہ پوچھتے ہیں: یا رسول اللہ! کیا میں ان سے لڑوں یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا: ''آہستگی سے روانہ ہو، یہاں تک کہ ان کے میدان میں پہنچ جاؤ پھر ان کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہوگا وہ ان کو بتاؤ خدا کی قسم! اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعہ سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں۔'' [2] چنانچہ خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا لیکن اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہو کر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح کسی مسلمان کے لیے کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے۔ کفار کو مسلمانوں کا یہ طرز عمل معلوم تھا۔ اکثر لڑائیوں میں جب مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لیے کلمہ توحید پڑھ دیتا تھا اور ایک بپھرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنے غصہ کو ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔

ایک دفعہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب وفد بنی حنیفة وحدیث ثمامة بن اثال: ٤٣٧٢؛ ابو داود، کتاب الجهاد، باب فی الأسیر یوثق: ٢٦٧٩۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر: ٤٢١٠۔

جب میرے حملہ کی باری آئی تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے "میں مسلمان ہوتا ہوں" تو اے خدا کے رسول! میں کیا کروں اس کو قتل کروں؟ فرمایا: "نہیں اس کا قتل جائز نہیں۔" عرض کیا، یا رسول اللہ! میرا ہاتھ اس نے کاٹ ڈالا۔ فرمایا: "پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اب اس کو قتل کیا تو وہ، وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اس اقرارِ توحید سے پہلے تھا۔" ❶

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ آپ کے بڑے چہیتے خادم تھے، وہ ایک فوجی دستہ کے سپہ سالار بنا کر ایک لڑائی میں بھیجے گئے، جب گھمسان کا رن پڑا تو ایک کافر ان کی زد میں آیا، انہوں نے حملہ کا قصد کیا تو وہ لا الہ الاّ اللہ پکار اٹھا، ایک انصاری جو پہلے اس پر جھپٹے تھے وہ تو رک گئے مگر اسامہ نے اس کافر کے اس کلمہ پڑھنے کو اس کی جان بچانے کے فریب پر محمول کر کے اس کا کچھ خیال نہ کیا اور نیزہ سے اس کا کام تمام کر دیا، آنحضرت ﷺ کو یہ خبر ہوئی تو اسامہ سے سخت آزردہ ہوئے، اسامہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! اس نے صرف تلوار کے ڈر سے کلمہ پڑھا تھا، فرمایا اور کتنا بلیغ فقرہ فرمایا: "اے اسامہ! تم نے کیا اس کا دل چیر کر دیکھ لیا تھا؟" پھر برابر یہ فرماتے رہے: "اے اسامہ! تم قیامت میں اس کے لا الہ الاّ اللہ کا کیا جواب دو گے؟" اسامہ کہتے ہیں کہ مجھ کو اتنی ندامت ہوئی کہ میں نے دل میں آرزو کی کہ کاش! میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا۔ ❷

دیکھو کہ واقعہ کی تصویر کتنی الٹ دی گئی ہے واقعہ تو یہ تھا کہ اپنی حملہ آورانہ لڑائی کے گھمسان میں بعض کفار و مشرکین جن کو یہ معلوم تھا کہ کسی کلمہ گو کو مسلمان اپنے مذہب کے حکم کے بموجب قتل نہیں کرتے وہ جب مسلمانوں کی زد میں پڑتے تھے تو اپنی جان بچانے کے لیے فوراً کلمہ شہادت پڑھ دیتے تھے اور بیان اس صورت میں کیا جاتا ہے کہ اسلام نے کفار کو تلوار کی نوک سے کلمہ پڑھنے پر مجبور کیا۔ کیا یہ صداقت ہے؟

اسی طرح آنحضرت ﷺ کا ایک اور اعلان ہے جس کو اکثر غلط معنی میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللّٰہ)) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک لڑائی کروں جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کریں جب وہ اقرار کر لیں تو انہوں نے اپنے جان و مال کو مجھ سے بچا لیا اور ان کی نیت کی پرسش خدا کا کام ہے۔" ❸ اس حدیث کا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ مسلمان سے لڑنا جائز نہیں لیکن کسی غیر مسلم قوم سے بھی لڑنا اسی وقت جائز ہے جب تک وہ توحید کا اقرار نہ کرے اور جب اس نے یہ کر لیا تو پھر اس سے بھی لڑنا روا نہیں خواہ وہ حملہ کے ڈر سے لا الہ الا اللہ پڑھے یا سچے دل سے اس نے یہ اقرار کیا ہو، اس کی تحقیق کہ کس نیت سے اس نے کلمہ پڑھا انسان کا فرض نہیں خدا کا ہے۔ یہ بالکل ایک مصالحانہ اعلان ہے لیکن لوگ اس کو اس معنی میں پیش کرتے ہیں کہ گویا یہ اسلام کا حکم تھا کہ

❶ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم قتل الکافر بعد قولہ لا الہ الا اللّٰہ: ۲۷۴۔
❷ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ایضًا: ۲۷۸، ۲۷۹۔
❸ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الأمر بقتال الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللّٰہ: ۱۲۴۔

مسلمان دیوانہ وار تلوار لیے پھرتے اور جس کو پاتے اس کو ڈرا دھمکا کر کہتے کہ کلمہ پڑھو ورنہ سر قلم کر دیں گے، غور کرو اگر یہ حکم ہوتا تو قیدی اقرارِ توحید کیے بغیر اس آسانی سے چھوڑے جاتے اور ہاری ہوئی قوموں سے اسلام نہیں، صرف چند درہم کا جزیہ لے کر ان کو آزاد کر دیا جاتا اور کیا مسلمانوں کو یہ اجازت ملتی کہ

﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ﴾ (۸/ الانفال:۶۱)

''اگر کفار کا محارب فریق صلح کے لیے جھکے تو، تو بھی جھک جا۔''

بلکہ اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں ان سے صلح نہ کرنا اور نیز کیا مسلمانوں کو یہ حکم ہو سکتا تھا کہ

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۶)

''اور اگر لڑائی کے میدان میں مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دے یہ اس لیے کہ یہ بے علم لوگ ہیں۔''

بلکہ یہ ہوتا کہ پناہ ملنے اور کلامِ الٰہی سننے کے بعد وہ مسلمان نہ ہوتا تو اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچانے کے بجائے اس کو قتل کر کے جہنم میں پہنچا دو مگر ایسا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو کس طرح الٹ کر بیان کیا جاتا ہے حالانکہ اسلام نے ان مشرکوں سے بھی جو ہمارے کسی دوست مشرک قبیلہ کے دوست ہوں اور ہم سے صلح و آشتی سے رہنا چاہتے ہوں لڑنے کو منع کیا ہے:

﴿ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝ ﴾ (۴/ النسآء:۹۰)

''تو اگر وہ تم سے کنارہ پکڑیں پھر نہ لڑیں اور تمہارے سامنے صلح کی طرح ڈالیں تو اللہ نے تم کو ان پر حملہ کرنے کی راہ نہیں دی۔''

یعنی پھر ان پر تلوار اٹھانا درست نہیں، حالانکہ اگر اسلام کی مذہبی جنگ جوئی کے وہی معنی ہوتے کہ یا تلوار یا اسلام تو کیا اس امن پسندی اس صلح جوئی اور اس ترکِ جنگ کی صورت ممکن ہو سکتی تھی؟

مسلح تبلیغی جماعتیں

غلط فہمی پھیلانے کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے لیے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں وہ مسلح ہوتی تھیں لیکن یہ حقیقت بھلا دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی منظم اور باضابطہ حکومت نہ تھی جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو، ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم

کیے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار تھا، راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا جن سے اکا دکا آدمی کا صحیح وسالم بچنا ناممکن تھا، اس لیے جب کہیں کوئی تبلیغی مہم بھیجی جاتی تھی، تو بدامنی کے ملک میں رہنے والوں کے عام دستور کے مطابق وہ اپنی ممکن حفاظت کے لیے مسلح جاتی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا تبلیغ ودعوت کے سوا کوئی مقصد نہ تھا اس سے ظاہر ہے کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملہ کے لیے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ نے بعض بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ وتعلیم کے لیے ادھر ادھر بھیجا تب وہ بھی اکثر راستہ میں جان سے ماری گئیں۔ واقعہ رجیع میں ستر (۷۰) داعیوں کا مارا جانا، واقعہ بیر معونہ میں چھ یا دس داعی مسلمانوں کا قتل ہونا، سریہ ابن ابی العوجاء میں پچاس مسلمانوں کی شہادت کا واقعہ، ذات اطلاح میں چودہ داعی مسلمانوں کا تیروں سے مارا جانا، عروہ بن مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ کا تیروں سے چھد جانا اس دعویٰ کی شہادت ہے۔

تبلیغ ودعوت کی تنظیم

آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں تشریف فرما رہے، بنفسِ نفیس اس فرض کو انجام دیتے رہے ایک ایک کے پاس جاتے اور حق کا پیغام سناتے، شہر سے نکل کر مکہ کے آس پاس آجاتے تھے اور آنے جانے والوں کو بشارت سناتے۔ مکہ سے نکل کر طائف گئے اور وہاں بھی اپنا فرض ادا کیا، یہ بھی خدا کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے آخری دین کا مرکز مکہ معظمہ کو قرار دیا جو عرب کا مرکزی شہر تھا اور حج کے موسم میں تمام قبیلے یہاں آجاتے تھے، آپ سالہا سال حج کے موسم میں ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے اور خدا کی دعوت پیش کرتے، اسی سالانہ تبلیغ سے اسلام کو وہ جماعت ہاتھ آئی جس کا نام انصار ہے۔ الغرض ان تبلیغی سرگرمیوں سے مکہ میں سینکڑوں آدمی مسلمان ہو چکے تھے، مگر قریش کے ظلم سے وہ ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے وہ حبشہ کی طرف روانہ ہوئے، اس سفر کی مصلحت عجیب وغریب تھی ان مظلوم مسلمانوں کی ہجرت نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ وہ اس مسافرت میں جہاں جہاں سے گزرے، اسلام کی آواز پہنچاتے گئے اور اس طرح یمن اور حبشہ دونوں ملکوں میں اسلام کی تحریک روشناس ہوگئی۔

مکہ میں آنحضرت ﷺ کے بعد عام مسلمانوں میں سب سے پہلے مبلغ اور داعی حق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ مکہ کے بہت سے معزز گھرانوں کے پرجوش نوجوان انہیں کی تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوئے، حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر رضی اللہ عنہم، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کی کوششوں سے دائرہ اسلام میں آئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد اسلام کے دوسرے مبلغ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ تھے جن کے مؤثر وعظوں کو سن کر

آنحضرت ﷺ کی ہجرت سے پہلے ہی مدینہ کے گھرانے کے گھرانے توحید کے پرستار ہو گئے تھے۔ مدینہ منورہ آ کر اسلام نے امن و اطمینان کی سانس لی تو آنحضرت ﷺ نے ان نومسلموں کی تعلیم کے لیے جو اطرافِ ملک سے دار السلام میں آتے تھے نیز ملک کے مختلف گوشوں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے ایک جماعت قائم کی جس کا نام عام طور سے اصحابِ صفہ (چبوترہ والے) مشہور ہے، اس میں وقتاً فوقتاً سو سے زیادہ آدمی داخل رہے ہیں، یہ لوگ ملک میں اسلام کی دعوت کے لیے بھیجے جاتے اور خود نومسلموں کو تعلیم دیتے۔ بیر معونہ میں ستر کے قریب جو داعی اور مبلغ راہ میں بیدردانہ قتل ہوئے وہ اسی جماعت کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ وہ اکابر صحابہ جو وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں، بادشاہوں، قوموں اور قبیلوں میں اسلام کی دعوت لے کر پھیلے، احادیث و سیر کی کتابوں میں ان کے نام متفرق طور سے ملتے ہیں۔ میں نے تھوڑی سی کوشش سے اس قسم کے پینتیس (۳۵) صحابیوں کے نام جمع کیے ہیں جنہوں نے از خود آنحضرت ﷺ کے مشورہ سے اس فرض کو انجام دیا، ان کے نام یہ ہیں: ابوذر غفاری، طفیل بن عمرو دوسی، جعفر طیار، عمرو بن عنبسہ سلمی، ضماد بن ثعلبہ، خالد بن ولید، علی بن ابی طالب، مہاجر بن ابی امیہ، زیاد بن لبید، خالد بن سعید، عدی بن حاتم، علاء بن حضرمی، ابوموسیٰ اشعری، معاذ بن جبل، جریر بن عبداللہ بجلی، دحیہ کلبی، عمرو بن امیہ ضمری، مغیرہ بن شعبہ، عمرو بن العاص، وبر بن یحنس، عروہ بن مسعود ثقفی، عامر بن شہر، منقذ بن حبان، ثمامہ بن اثال، محیصہ بن مسعود، احنف، ابوزید انصاری، عمرو بن مرہ، عیاش بن ربیع مخزومی، واثلہ بن اسقع، عبداللہ بن حذافہ سہمی، حاطب بن ابی بلتعہ، سلیط بن عمرو بن عبد شمس، شجاع بن وہب اسدی رضی اللہ عنہم۔ انہیں مبلغوں اور داعیوں اور قاصدوں کی پکار تھی جس نے یمن، یمامہ، بحرین، حجاز، نجد غرض پورے عرب کو بیدار کر دیا اور عرب سے باہر ایران، شام، مصر، حبش ہر جگہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا۔

مبلغوں کی تعلیم و تربیت

سیرت کی دوسری جلد کے آغاز میں اشاعتِ اسلام کی تاریخ اور دعاۃ معلمین کی تعلیم و تربیت کا حال لکھا جا چکا ہے، سلسلہ بیان کے لیے یہاں صرف اس قدر کہنا ہے کہ ان کو سب سے پہلے قرآن پاک کی سورتیں یاد کرائی جاتی تھیں، لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا، آنحضرت ﷺ کے شب و روز کے ارشادات سننے کا موقع بھی ان کو ملتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درسِ اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔

دعوت بالقرآن

قرآن پاک اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے اور وہی اس کے مذہب کا صحیفہ ہے، خود آنحضرت ﷺ اور دوسرے مبلغ صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی اور یہ فرض خود قرآن نے اپنا آپ قرار دیا

تھا، اس کی تبلیغ کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں، بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک ڈھال اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو اسی تلوار سے جہاد کا حکم دیا۔ فرمایا:

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۲)

''تو اے پیغمبر! منکروں کا کہنا نہ مان اور اس قرآن سے ان کے ساتھ بڑے زور وشور سے جہاد کر۔''

اس پیغامِ الٰہی کے زمین میں اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا کے بھولے ہوئے بندوں کو ان کا عہد یاد دلائے۔ فرمایا:

﴿ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۴۵)

''تو اے پیغمبر ان کو جو میری دھمکی سے ڈرتے ہوں قرآن کے ذریعہ سے یاد دلا۔''

قرآن رحمتِ عالم کا پیامِ عمومی ہے اور یہی اس کے نزول کی غرض وغایت ہے۔ فرمایا:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۱)

''برکت والا ہے وہ جس نے حق وباطل میں امتیاز کرنے والی کتاب اپنے بندہ پر اس لیے اتاری تا کہ تمام دنیا کو بیدار اور ہشیار کر دے۔''

یہی قرآن اسلام کی طاقت اور محمد رسول اللہ ﷺ کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہ کی۔

اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب

عرب میں صرف تین قومیں تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرہ نمائے عرب کا اسلام لانا تھا یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ مشرکینِ عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا اور ان کے مذہبی پیشوا قریش تھے، یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا، نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے تھے۔ اس بنا پر الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے اشاعتِ اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفارِ مکہ کو پہلے دعوتِ توحید دی جاتی پھر یہود کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا جاتا اور اس کے بعد نصاریٰ اور مجوس کو دعوت دی جاتی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی اشاعت کی اور اسی بنا پر قرآن مجید کا طریق دعوت مختلف نظر آتا ہے، تمام مکی سورتوں کے مخاطب کفار مکہ تھے اس لیے ان میں بت پرستی کی مذمت، توحید کی ترغیب، عجائب قدرت کا بیان، عذابِ الٰہی سے تخویف اور صنادید قریش کی مخالفت کے جواب کے سوا کچھ نہیں لیکن جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو یہود سے سابقہ پڑا اور اب قرآن کا طرزِ خطاب بدل گیا، چنانچہ ابتدائی مدنی سورتیں زیادہ تر یہود کی مذہبی تاریخ، ان کی تحریفات اور ان کی اخلاقی کمزوریوں اور قصصِ بنی اسرائیل پر مشتمل ہیں۔ سب سے اخیر میں نصاریٰ کی باری آئی اور فتح مکہ کے بعد قبائلِ عرب کے وفود کے سلسلہ میں نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا اسی زمانہ میں سورۂ آل عمران نازل ہوئی جس میں نصاریٰ کا ذکر ہے۔

مجوس عرب میں بہت کم تھے، بحرین اور یمن میں خال خال وہ پائے جاتے تھے وہ بھی ایرانی النسل تھے، خالص عرب نہ تھے، اس لیے قرآن مجید نے خاص طور پر کسی سورۂ میں ان کے ساتھ خطاب نہیں کیا ہے، البتہ جا بجا مناسب موقعوں پر ان کا نام لیا ہے اور ان کے عقائد کی تردید اور ان کو ثنویت یعنی دو خداؤں کی پرستش کے بجائے توحید کی دعوت دی ہے۔

قبول اسلام کے لیے کیا چیز درکار تھی

اگرچہ یورپ کا یہ عام دعویٰ ہے کہ عرب میں اسلام صرف تلوار کے زور سے پھیلا لیکن ابتدا میں جن اشخاص اور جن قبائل نے اسلام کو قبول کیا ان کے اوصاف پیش نظر کر لینے کے بعد صاف ثابت ہوتا ہے کہ اسلام اپنے لیے صرف اثر پذیر دل کا جویا تھا اور جب یہ آشیانہ مل جاتا تھا تو اس کے سامنے یہ طائرِ قدس اپنے پر ڈال دیتا تھا۔ چنانچہ ابتدائی بعثت میں جن اشخاص نے اسلام کو قبول کیا وہ وہی تھے جو نیک طبع، ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے اور جو نبوت کے اوصاف وخصائص سے واقف تھے گزشتہ آسمانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ آگاہ تھے اور معاشرت اور تمدن سے بہرہ ور تھے۔ اشخاص کے علاوہ جن قبائل اور آبادیوں نے اسلام کے قبول کرنے میں پیش دستی کی وہ بھی وہی تھے جن میں یہ خصوصیتیں پائی جاتی تھیں۔ عرب کے دو مختلف حصوں جنوبی و شمالی میں سب سے زیادہ اسلام کو کامیابی عرب کے جنوبی حصہ یعنی یمن، عمان، بحرین، یمامہ میں ہوئی اور شمالی حصہ میں سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں ہوئی کیونکہ وہ تمدنی حیثیت سے دنیا کی دو ممتاز متمدن قوموں ایرانیوں اور رومیوں سے متاثر تھے اور مذہبی حیثیت سے یہودیوں اور عیسائیوں سے ان کا میل جول اور خلا ملا تھا، اہلِ مدینہ بھی یہودیوں کے تمدن ومعاشرت روایات اور رسم ورواج سے بہت کچھ متاثر تھے۔ [1]

اسلام کو عربوں سے جس قدر لڑائیاں پیش آئیں وہ سب نجد اور حجاز میں پیش آئیں لیکن مسلمانوں کی کوئی جرار فوج مدینہ، یمن، عمان، یمامہ اور بحرین فتح کرنے کے لیے نہیں بھیجی گئی۔ انصارِ مدینہ نے خود آکر اسلام کو لبیک کہا، اطرافِ مدینہ کے قبائل میں غفار نے خود مکہ آکر قریش کی تلوار کی آگ میں کھڑے ہو کر لا الہ الا اللہ پڑھا، یمن سے دوس کے قبیلہ کے آدمیوں نے خود مکہ معظمہ پہنچ کر ایمان کی دولت حاصل کی اور اس کے بعد انہوں نے اپنا قلعہ اسلام کی پناہ کے لیے پیش کیا۔ اشعر کا قبیلہ بھی اسی زمانہ میں غائبانہ مشرف بہ اسلام ہوا۔ ہمدان کا قبیلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعوت پر ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

عمان کا بھی یہی حال ہوا وہاں بھی اسلام نے صرف اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ سے اقتدار حاصل کیا۔ ایک بار آپ نے عرب کے کسی قبیلہ کے پاس ایک آدمی کو بھیجا، وہ لوگ اس کے ساتھ سختی سے پیش آئے اور اس کو زد وکوب کیا، اس نے آکر آپ ﷺ سے یہ واقعہ بیان کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر اہلِ عمان

[1] مستدرك حاكم، كتاب النكاح، ج ٢، ص ١٩٥.

ہوتے تو تم کو نہ گالیاں دیتے نہ مارتے۔'' ❶

یمامہ کے رئیس ثمامہ رضی اللہ عنہ قید ہو کر مدینہ آئے، یہاں آزاد کر دیے گئے مگر مدینہ کی مسجد میں جو جلوہ انہوں نے دیکھا اپنی ظاہری مادی آزادی کے بعد بھی اس کی نورانی زنجیر سے انہوں نے رہائی نہ پائی، خود بخود مسلمان ہو گئے اور اپنے قبیلہ میں جا کر اسلام کے داعی بن گئے اور آخر خون کا ایک قطرہ گرے بغیر اسلام نے وہاں اکثریت حاصل کر لی۔

دیہاتوں میں سب سے پہلے قریہ جواثی نے صدائے توحید پر لبیک کہا جو مضافات بحرین میں تھا، اسی قریہ جواثی کے باشندے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، چنانچہ مسجد نبوی کے بعد عرب کے دیہاتوں میں سب سے پہلا جمعہ اسی گاؤں میں پڑھا گیا ❷ بارگاہِ نبوت میں عرب کے وفود اگرچہ فتح مکہ کے بعد حاضر ہوئے، لیکن بحرین کے لوگوں نے اس میں تمام قبائل عرب پر پیش دستی کی، چنانچہ ۵ھ میں سب سے پہلا وفد جو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ قبیلہ عبدالقیس کا تھا جو بحرین میں سکونت گزین تھا۔ ❸

اہلِ یمن کا شمار اگرچہ مہاجرینِ اولین میں نہیں کیا جاتا لیکن جب آنحضرت ﷺ کی ہجرت کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بھی یمن سے ۵۲ آدمیوں کو لے کر مدینہ کی طرف ہجرت کی غرض سے روانہ ہو گئے، بحری سفر تھا وہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو بادِ مخالف کے جھونکوں نے ان کو حبشہ میں پہنچا دیا جو مسلمانوں کا سب سے پہلا دارالہجرۃ تھا، وہاں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے ہم کو یہیں اقامت کا حکم دیا ہے تم لوگوں کو بھی یہیں ٹھہر جانا چاہیے، چنانچہ وہ لوگ وہیں مقیم ہو گئے اور فتح خیبر کے زمانے میں مہاجرینِ حبشہ کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ❹

یہ حقیقت ہے کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جہالت اور وحشت تھی اور اس کی اشاعت کی سب سے بڑی محرک چیز تمدن، معاشرت اور اخلاق کی بلندی اور کتب آسمانی اور دیگر مذاہب سے واقفیت تھی، خود قرآن مجید نے اس کو ظاہر کیا ہے:

﴿ اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۹۷)

''دیہاتی بدوی کفر اور نفاق میں سب سے زیادہ سخت ہیں اور زیادہ اس کے اہل ہیں کہ وہ ان احکام کو نہ جانیں جو خدا نے اپنے رسول پر اتارا ہے اور اللہ جانتا اور حکمت والا ہے۔''

---

❶ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضل اھل عمان: ٦٤٩٥۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الجمعۃ، باب الجمعۃ فی القری والمدن: ٨٩٢۔

❸ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الامر بالایمان باللہ: ١١٥، ١١٦۔

❹ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب من فضائل جعفر بن ابی طالب: ٦٤١٠۔

اور بھی اس قسم کی آیتیں ہیں، جو لوگ بادیہ سے آ کر اسلام لائے تھے اور کچھ مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے تھے ان سے جو بیعت لی جاتی تھی اس کا نام ''بیعتِ اعرابی'' تھا جو کم درجہ سمجھی جاتی تھی اس بنا پر بادیہ میں الگ تھلگ رہنا صحابہ کے زمانہ میں معیوب سمجھا جاتا تھا بلکہ بعض لوگ اس کو ارتداد کی علامت سمجھتے تھے۔ [1]

اشاعتِ اسلام کے اسباب وذرائع

گزشتہ مباحث پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد خود بخود یہ عقدہ کھل جاتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے دینِ حق کو عربوں میں کس طرح پھیلایا اور آپ کو کیونکر کامیابی حاصل ہوئی تاہم اگر واقعات کی روشنی میں ایک ایک صحابی کے قبولِ اسلام کے اسباب کی تلاش کی جائے تو حسبِ ذیل اسباب سامنے آئیں گے:

① اسلام کے نشر واشاعت کا سب سے مقدم اور اصلی سبب معجزۂ قرآنی تھا، قرآنِ مجید جس مؤثر اور دل کپکپا دینے والے طریقہ سے عقائد ومعارف واخلاق کی تلقین کرتا تھا اس کے سامنے وہ تمام عوائق اور موانع جن کا اوپر ذکر ہو چکا فنا ہو جاتے تھے۔ جو لوگ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے قرآن مجید ان کے سامنے عالم کی بوقلمونی، مظاہرِ قدرت کی بوالعجبی، کائنات کی نیرنگی، اجرامِ فلکی کی جلوہ گری اور عناصر کی نگار آرائی سے اس طرح استدلال کرتا تھا:

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸)

''تم خدا کا انکار کس طرح کرتے ہو حالانکہ تم کبھی بے جان تھے تو اس نے تم کو زندگی بخشی، پھر ایک دن تم کو مردہ بنا دے گا پھر زندہ کرے گا اور پھر اس کے پاس واپس کیے جاؤ گے۔''

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱٦٤)

''آسمان وزمین کی پیدائش میں، شب وروز کے اختلاف میں، ان کشتیوں میں جو سمندر میں انسانوں کے لیے سودمند چیزوں کو لے کر چلتی ہیں، بادلوں سے پانی برساتے میں، اس پانی سے مردہ زمین کو زندہ کرنے میں اور اس زمین میں ہر قسم کے جانداروں کو پھیلانے میں، ہواؤں کے چلانے میں، ان بادلوں میں جو فضائے آسمانی سے مسخر ہیں دانشمندوں کے لیے یقیناً بڑی نشانیاں ہیں۔''

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب تحریم رجوع المهاجر إلی استیطان وطنه:٤٨٢٥؛ سنن نسائی، کتاب البیعة، باب المرتد اعرابیا بعد الهجرۃ:٤١٩١۔

﴿ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۸۳)

’’آسمان وزمین میں جو بھی ہے، برضا یا مجبوراً اسی کا اطاعت گزار ہے، اور اسی کی طرف ایک دن سب لوٹائے جائیں گے۔‘‘

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۰، ۱۹۱)

’’آسمان وزمین کی خلقت، اور شب وروز کے الٹ پھیر میں، ان ارباب عقل کے لیے بے شبہ بڑی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھے، لیٹتے (ہر حال میں) خدا کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے ہیں، کہ خدایا تو نے یہ بیکار پیدا نہیں کیا۔‘‘

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰۤى اِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۲)

’’وہ وہ ہے جو تم کو خشکی اور دریا میں سفر کراتا ہے، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور موافق ہوا کشتی والوں کو خوب لیے جا رہی ہے اور لوگ خوش ہو رہے ہیں کہ (دفعۃً) زور کا جھکڑ آیا اور ہر طرف سے موجیں آ گئیں اور لوگوں کو یقین ہو چلا کہ اب وہ گھر گئے اس وقت وہ خالص خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔‘‘

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۲۱ـ۲۳)

’’اور خدا کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ تمہارے لیے تم ہی سے جوڑے بنائے کہ تم کو ان سے تسلی ہو اور تم میں باہمی محبت اور ہمدردی پیدا کی، اس بات میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمان اور زمین کا پیدا کرنا ہے اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا مختلف ہونا ہے، اس بات میں جاننے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خدا کی نشانیوں میں سے تمہارا رات اور دن میں سونا اور خدا کے فضل (روزی) کو ڈھونڈنا ہے اس میں سننے والوں کے

لیے نشانیاں ہیں۔‘‘

خدا، یا ایک قوتِ اعظم کا اعتراف خود انسان کی فطرت ہے، لیکن غفلت شعاری اور آبائی اثر اور دیگر اسباب سے یہ فطرت کبھی کبھی مردہ اور بے حس ہو جاتی ہے۔ قرآن مجید اسی خفتہ حس کو بیدار کرتا ہے:

﴿ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۱۰)

’’کیا خدا میں شک ہے، جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔‘‘

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۸)

’’اور کیسے تم خدا کا انکار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے اور اس نے تم کو زندگی دی اور پھر وہ تم کو موت دے گا، پھر وہ تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔‘‘

عرب میں ملحد کم تھے زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر مشرکین تھے جو خدا کو اگرچہ مانتے تھے، لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا اور بھی خدا ہیں جو خدا کے شریک ہیں اور نظامِ عالم انہی کے ہاتھ سے انجام پاتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے براہِ راست اس کو کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے، اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے، چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش، غلہ کی پیداوار، نباتات کی روئیدگی، سب اجرامِ فلکی یا اصنام کا کام ہے، اس لیے ان کو عبدیت کا جو کچھ تعلق تھا انہیں معبودوں سے تھا، وہ انہی کی عبادت کرتے تھے، انہیں سے محبت رکھتے تھے، انہیں پر نذر چڑھاتے تھے، انہی کے سامنے قربانیاں کرتے تھے، معرکوں میں انہیں کے نام کی جے پکارتے تھے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اصلی وجودِ باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے، زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر اور تہجین ہے۔

قرآن مجید طرح طرح سے نہایت موثر پیرایوں میں شرک کی لغویت کا اظہار کرتا ہے:

﴿ اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْۗءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاۗءَ الْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۭ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ۭ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (۲۷/ النمل:۶۱۔۶۴)

’’کیا وہ جس نے زمین کو قرارگاہ بنایا اور اس کے بیچ میں نہریں بہائیں اور اس کے لیے

پہاڑوں کی میخیں گاڑیں اور دونوں دریاؤں میں اوٹ رکھا، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ جانتے نہیں، کیا وہ جو پریشان خاطروں کی سنتا ہے، جب وہ اس کو پکارتے ہیں اور بلا کو ہٹا دیتا ہے اور تم کو دنیا کا حکمران بناتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے تم بہت کم سوچتے ہو، کیا وہ جو تم کو خشکی اور تری کی اندھیریوں میں راستہ دکھاتا ہے اور وہ جو کہ اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو بھیجتا ہے، کیا خدا کے ساتھ کوئی اور بھی خدا ہے، مشرکین جن کو خدا کا شریک کہتے ہیں خدا ان سے برتر ہے۔ آیا کون ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے؟ پھر اس کو لوٹا لاتا ہے اور وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے کیا خدا کے سوا کوئی اور ہے تو کہہ دے کہ اگر سچے ہو تو دلیل لاؤ۔"

کفار اور مشرک عموماً قیامت کے منکر تھے اور کہتے تھے کہ ﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝﴾ (۳٦/ یٰس: ۷۸) یعنی "ہڈیاں گل سڑ چکیں تو اب کون ان کو جلائے گا۔" قرآن مجید ان سے خطاب کرتا تھا:

﴿ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝﴾ (۷۵/ القیامۃ: ۳۷۔۴۰)

"کیا انسان پہلے منی نہیں تھا، پھر گوشت کا لوتھڑا بنا، پھر خدا نے اس کو ٹھیک کیا اور اس سے دو جوڑ مرد اور عورت بنائے، کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مردے کو زندہ کر دے؟"

غرض عقائد، عبادات، اخلاق، اعمال ہر چیز کو قرآن اس مؤثر اور دل نشین طریقہ سے ادا کرتا تھا کہ دل میں گھر کر جاتا تھا اور رسم و عادات کا بند اس سیلاب کو کسی طرح روک نہیں سکتا تھا، اس پر بھی جو کفر پر ثابت قدم رہے وہ ذاتی اغراض کا اثر تھا حقیقی جحود و انکار نہ تھا۔

تمام بڑے بڑے صحابہ، بڑے بڑے رؤسائے قبائل، بڑے بڑے شعرا اور خطبا قرآن ہی سن کر ایمان لائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس ارادہ سے چلے تھے، لیکن جب قرآن مجید کی آیتیں سنیں تو کانپ اٹھے اور اسلام قبول کر لیا، عتبہ جو رئیس قریش اور علوم عرب کا ماہر تھا جب اس نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ تم نبوت کی دعوت سے باز آؤ ہم تمہارے لیے سب کچھ مہیا کر دیتے ہیں، آپ نے حٰمٓ کی ابتدائی آیتیں پڑھیں، جب یہ آیت آئی:

﴿ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ۝﴾

(۴۱/ حٰمٓ السجدۃ: ۱۳)

"تو اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دے کہ میں تم کو اس کڑک سے ڈراتا ہوں جو عاد و ثمود کی کڑک کی طرح ہے۔"

تو عتبہ نے بیتاب ہو کر آنحضرت ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا کہ خدا کے لیے بس، تم کو قرابت کی قسم دلاتا ہوں، پھر واپس جا کر قریش سے کہہ دیا محمد ﷺ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شعر ہے نہ جادو، نہ کہانت ہے [1] (بلکہ کوئی اور چیز ہے) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے سے پہلے اپنے بھائی انیس کو جو شعرائے عرب میں تھے، آنحضرت ﷺ کی خدمت میں تحقیق حال کے لیے بھیجا تھا، وہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قرآن مجید سنا تو جا کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ لوگ ان کو کاہن اور شاعر کہتے ہیں، لیکن میں کاہنوں اور شعرا دونوں کے کلام سے واقف ہوں اور ان کا کلام دونوں سے الگ ہے، انیس کے بعد حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ خود گئے اور واپس آئے تو ان کا آدھا قبیلہ اسی وقت مسلمان ہو گیا۔ [2]

ولید بن مغیرہ (حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا باپ) جو اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا، جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ ﷺ نے یہ آیتیں پڑھیں:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴾ (١٦/ النحل: ٩٠)

''خدا عدل کا، احسان کا اور رشتہ داروں کو عطا کرنے کا حکم دیتا ہے اور فحش سے، بری بات سے اور ظلم سے منع کرتا ہے، وہ تم کو سمجھاتا ہے کہ شاید تم سمجھ جاؤ۔''

ولید نے کہا پھر پڑھنا، آپ نے دوبارہ پڑھا، وہ واپس گیا اور قریش سے جا کر کہا کہ یہ انسان کا کلام نہیں۔ [3]

عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ بڑے پایہ کے صحابی اور سابقین اسلام میں ہیں، یہی آیتیں ہیں جن کو سن کر ان کے دل نے سب سے پہلے اسلام کا جلوہ دیکھا، وہ خانہ کعبہ کو جا رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے راستہ میں اپنے پاس بٹھا لیا، پھر فرمایا: ''ابھی مجھ پر یہ کلام اترا ہے۔'' یہ کہہ کر آپ نے اوپر والی آیتیں پڑھیں عثمان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ پہلا موقع تھا کہ اسلام نے میرے دل میں گھر کیا۔ [4]

جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے کفر کے زمانہ میں آنحضرت ﷺ کو سورۂ طور پڑھتے سنا جب اس آیت پر پہنچے:

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝ ﴾ (٥٢/ الطور: ٣٥۔٣٧)

''کیا یہ لوگ از خود پیدا ہو گئے یا خود خالق ہیں، کیا آسمان اور زمین کو انہیں لوگوں نے پیدا کیا بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) ان میں ایمان نہیں، کیا ان کے پاس خدا کے خزانے ہیں۔ کیا یہی لوگ

---

[1] علامہ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح، ج ٤، ص: ٤٤ میں مسند ابو یعلی وغیرہ سے یہ روایت نقل کی ہے نیز یہ روایت مستدرک حاکم میں بھی ہے۔ سیرۃ سوم، میں مصنف نے اس کے لیے کتاب التفسیر ابن مردویہ، مسند ابی یعلی و سیرۃ اسحاق کا حوالہ دیا ہے اور لکھا ہے کہ اخیر فقرہ صرف سیرۃ ابن اسحاق میں ہے۔ دیکھیے سیرت ابن ہشام، ج ۱، ص ۱۸۰۔ [2] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی ذر: ٦٣٥٩۔ [3] الجواب الصحیح، ج ٤، ص: ٤٦ بحوالہ عبدالرزاق۔

[4] مسند احمد، ج ١، ص ٣١٨ وادب المفرد امام بخاری باب البغی: ٨٩٣۔

سربراہ کار ہیں۔"

تو خود جبیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل اڑنے لگا۔ [1]

طفیل بن عمرو رضی اللہ عنہ الدوسی مشہور شاعر اور شرفائے عرب میں تھے، ہجرت سے پہلے وہ مکہ گئے لوگوں کو ان کے آنے کی خبر ہوئی تو ان کے پاس گئے اور آنحضرت ﷺ کی نسبت کہا کہ ان کے پاس نہ جانا، وہ لوگوں پر جادو کر دیتے ہیں لیکن جب حرم میں اتفاقیہ آنحضرت ﷺ کی زبان سے قرآن سنا تو ضبط نہ کر سکے اور مسلمان ہو گئے۔ [2]

ہجرت سے پہلے آنحضرت ﷺ نے جب طائف کا سفر کیا اور مشرکین کو اسلام کی دعوت دی تو اگرچہ ادھر سے جواب ڈھیلا اور پتھر تھا، تاہم خالد العدوانی نے جو طائف کے رہنے والے تھے آپ کو ﴿وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ﴾ (٨٦/ الطارق:١) "قسم ہے آسمان کی اور رات کے چلنے والے ستارہ کی۔" پڑھتے سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی حالت کفر میں پوری سورہ یاد کر لی [3] اور آخر اسلام لائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو قیام مکہ کے زمانہ میں بعض مشرکین نے اپنی پناہ میں لے لیا تھا اس زمانہ میں حضرت موصوف نے ایک مسجد بنوالی تھی اور اس میں نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن نماز بآواز بلند پڑھتے تھے آواز سن کر محلہ کے نوجوان اور عورتیں جمع ہو جاتیں اور قرآن سنتیں تو ان کا دل خود بخود اسلام کی طرف کھنچتا، چنانچہ اسی بنا پر کفار نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی قرآن پکار کر نہ پڑھا کرو، اس سے ہمارے بچے اور عورتیں مفتون ہوتی جاتی ہیں [4] انصار اول اول جب مقام عقبہ میں اسلام لائے تو قرآن ہی سن کر لائے تھے، جو لوگ داعی بنا کر بھیجے جاتے ان کو قرآن یاد کرایا جاتا اور وہ جہاں جاتے یہی کارگر آلہ تسخیر لے کر جاتے، نجاشی کے دربار میں کفار قریش جب سفیر بن کر گئے اور ان کی شکایت پر نجاشی نے مسلمانوں کو بلا کر باز پرس کی تو حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھیں، نجاشی بے اختیار رو پڑا اور کہا کہ خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل ایک ہی چشمہ سے نکلے ہیں۔ [5]

حبش میں جب آپ ﷺ کی بعثت کا چرچا ہوا تو بیس شخص جو مذہباً عیسائی تھے، تحقیق حال کے لیے مکہ میں آئے اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے ان کے سامنے قرآن مجید کی آیتیں پڑھیں، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اسی وقت اسلام لائے، آنحضرت ﷺ کے پاس سے یہ لوگ اٹھے تو ابوجہل نے ان سے مل کر کہا کہ تم سخت احمق ہو اتنے دور سے سفر کر کے آئے اور دم بھر میں اپنا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة والطور: ٤٨٥٤۔ [2] ان کے اسلام کا حال ابن القیم (زاد المعاد) نے بہ تفصیل لکھا ہے اور ابن اسحاق، ج ۲، ص: ۳۴ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ طبقات ابن سعد، ج ٤، ص: ٢٣٧؛ الاصابة، ج ۳، ص: ٤٢٢؛ تاریخ دمشق، ج ٢٧، ص: ٩۔ [3] مسند احمد، ج ٤، ص: ٣٣٥۔

[4] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ٣٩٠٥۔

[5] مسند احمد، ج ٥، ص: ٢٩١ مسند کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ان هذا والذی جاء به موسی لیخرج من مشکاة واحدة، لیکن سیرت ابن ہشام میں وہ الفاظ ہیں جن کا ترجمہ مصنف نے کیا ہے۔ "ض"

مذہب بدل لیا۔انہوں نے کہا: ہم تم سے لڑنا نہیں چاہتے۔لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلَنَا دِيْنُنَا۔ ❶

قرآن کی پیشین گوئیوں کی صداقت نے بھی لوگوں کے دلوں کو کھینچا، چنانچہ اہل ایران کے مقابلہ میں رومیوں کی فتح کی جو پیشین گوئی کی تھی جس دن یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی صدہا کافر مسلمان تھے۔ ❷

ایک ضروری نکتہ

عام خیال یہ ہے کہ اہلِ عرب جو قرآنِ مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے، وہ صرف فصاحت و بلاغت کی بنا پر، یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لیے جب وہ دیکھتے تھے کہ اور کسی شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح و بلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔ بے شبہ قرآنِ مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت و انشا میں ہے اس سے کہیں زیادہ معنی و مطالب میں ہے۔

فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجز ہوتا جیسا اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی اور کوئی بات ہوتی تو کیا یہی اثر پیدا ہو سکتا تھا قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت و بلاغت کے بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا۔ دوسری طرف جو مطالب اور مقاصد ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے وہ خدا کی عظمت و جلالت اصنام کی تحقیر و تذلیل، انسان کا عجز و تعبد، سزا و جزا، بعث و نشر، جور و ظلم کی تقبیح، اخلاقِ حسنہ کی تحسین، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ خود بخود وہ دل میں گھر کرتے جاتے تھے ان کو یہ نظر نہیں آتا تھا کہ وہ ان باتوں کو اس لیے مان رہے ہیں کہ مسلمان ہو چکے ہیں بلکہ یہ باتیں براہ راست ان کے دل میں اتر جاتی تھیں اور وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

موانع کا ازالہ

عرب کو جو چیزیں اسلام سے روکتی تھیں ان میں سب سے اہم (جیسا کہ اوپر لکھ آئے ہیں) ان کے اوہام و اعتقادات باطلہ تھے جو سینکڑوں ہزاروں برس سے چلے آتے تھے یا سیاسی و معاشی ضرورتیں تھیں۔ مقدم الذکر باتوں کا قرآن مجید اور اعجاز نبوی ﷺ نے استیصال کر دیا، عرب میں جو لوگ صاحب فہم اور ذی اثر تھے اور سیاسی اسباب سے مجبور نہ تھے یہ ناممکن تھا کہ وہ قرآن سنتے اور ان کے تمام عقائد اور اوہام دفعتہً فنا نہ ہو جاتے یہ اربابِ اثر جب خود متاثر ہو جاتے تھے تو ان میں سے ایک ایک شخص کے اثر سے ہزاروں اشخاص مسلمان ہو جاتے تھے کیونکہ قبائل پرستی کی بنا پر قبیلہ کا ایک معزز اور رئیس اپنے پورے قبیلہ کے دل و دماغ کا مالک ہوتا تھا۔

البتہ جو لوگ سیاسی اسباب سے مطلقاً دعوتِ اسلام کی طرف متوجہ ہی ہونا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے

❶ ابن هشام حديث نقض الصحيفة، ج١، ص: ٢٣٧۔

❷ جامع ترمذی، ابواب التفسير، تفسير سورة الروم: ٣١٩٤۔

بار بار دار النبوۃ (مدینہ منورہ) پر چڑھائیاں کیں، لیکن نصرت ایزدی نے ان کو اس قدر شکستیں دیں کہ بالآخر مجبور ہو کر بیٹھ گئے، ان میں سے کچھ فنا ہو گئے کچھ چار و ناچار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوئے جن میں سے اکثر رفتہ رفتہ بالآخر دل سے مسلمان بن گئے۔

① قبائل کی ریاست سیاسی حیثیت سے گو اسلام کے مخالف تھی لیکن بعض وجوہ سے اسلام کو تائید بھی پہنچاتی تھی، اسلام کی جمہوریت جس قدر ریاست کی مخالف تھی اسی قدر عام جماعت کی حامی تھی، اسلام سے اگر ایک رئیس کی شان، ریاست وخودسری کو نقصان پہنچتا تھا تو ہزاروں آدمیوں کو نظر آتا تھا کہ اسلام قبول کر لینے سے ہر شخص رئیس کا ہمسر ہو جاتا ہے، غرض اسلام اگر ایک رئیس کو مٹاتا تھا تو سینکڑوں کو رئیس بنا دیتا تھا۔

اس کے ساتھ رؤسا کی ریاست بالکل زائل نہیں ہو جاتی تھی بلکہ اسلام قبول کرنے پر وہ اپنے قبیلہ کے رئیس باقی رہتے تھے صرف اتنا ہوتا تھا کہ ان کی بے قید مطلق العنانی قائم نہیں رہتی تھی اور اسلامی احکام کا پابند رہنا پڑتا تھا، اس لیے اگر کوئی خود غرضی کرنا بھی چاہتا تھا تو اس کو بھی یہ سودا گراں نہیں پڑتا تھا، مؤلفۃ القلوب کا گروہ اس کی ایک صریح نظیر تھا۔

اب صرف معاشی ضرورت سدراہ ہو سکتی تھی لیکن لوگوں کو نظر آتا تھا کہ جن حدود میں اسلام کی حکومت قائم ہو جاتی ہے وہاں امن و امان قائم ہونے کی وجہ سے تجارت اور دیگر ذرائع معاش کثرت سے ترقی کر جاتے ہیں۔

② نبوت کے متعلق ان کو جو شکوک تھے مشاہدہ اور تجربہ نے ان کا پردہ چاک کر دیا، بڑی سے بڑی انسانیت اور پاک سے پاک زندگی کا جو تخیل ایک انسان کے ذہن میں آ سکتا تھا، محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس سے بھی بدرجہا بالاتر اور ارفع تھی، ان کو نظر آتا تھا کہ گو مدعی نبوت بظاہر جامۂ بشریت میں تھے لیکن اپنی معنوی زندگی، اپنے معجزانہ اخلاق اور اپنے مافوق الفطرت علم ومعرفت اور اپنے ربانی کرشموں کی بنا پر بشریت سے کوئی بالاتر مخلوق ہے۔ ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا ۖ إِنْ هٰذَآ إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ﴾ (۱۲/ یوسف:۳۱) قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کے صدق نبوت پر اسی مقدس ومعصوم زندگی سے استدلال کیا ہے:

﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ (۱۰/ یونس:۱۶)

''اے قریش! نبوت سے پہلے بھی میں نے تم میں ایک مدت دراز تک زندگی بسر کی ہے کیا تم نہیں سمجھتے۔''

زندگی کا یہی اعجاز تھا جس سے ظہور نبوت سے پہلے ہی ''امین'' کا خطاب آپ نے حاصل کر لیا تھا، بیوی کے برابر انسان کے اصلی حالات واخلاق کا واقف کار کوئی اور نہیں، نبوتِ محمدی کا معتقدِ اولین دنیا میں کون تھا، ام المومنین خدیجہ ؓ بنت خویلد، لیکن ان کی اس زود اعتقادی کا راز کیا تھا، ۴۰ برس کے معجزانہ

اخلاق اور مافوق الفطرت اوصاف وحالات کا تجربہ، وہ خود پیغمبر کو خطاب کر کے نبوت کی تسکین ان الفاظ میں دیتی ہیں ''محمد ﷺ! خدا کبھی تمہیں رسوا نہ کرے گا، تم رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرتے ہو، ناداروں کی طرف سے قرض ادا کرتے ہو، محتاجوں کی خبر لیتے ہو، مہمانوں کے ساتھ بہ مدارات پیش آتے ہو، جو لوگ حقیقت میں مبتلائے آلام ہیں ان کی اعانت کرتے ہو۔'' ❶

سن چکے ہو کہ عرب میں آپ کی نبوت کا جب چرچا پھیلا تو ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے انیس اپنے بھائی کو تحقیقِ حال کے لیے بھیجا، انہوں نے واپس آ کر پیکرِ نبوت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا، میں ایک ایسے شخص کو دیکھ کر آیا ہوں جو بھلائیوں کا حکم دیتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ ❷

نبوت کے بعد قریش نے ذات نبوی ﷺ کے ساتھ گو عداوت اور کینہ پروری کا کوئی پہلو اٹھا نہیں رکھا تاہم کوئی ادنیٰ اخلاقی جرم بھی اس کے ساتھ منسوب نہ کر سکے۔ اسلام کے سب سے اول اعلانِ دعوت کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر قریش کے مجمع کو طلب کیا اور پوچھا: ''اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کی پشت پر ایک فوج گراں تم پر حملہ آور ہونے کو تیار ہے تو کیا سچ مانو گے؟'' سب نے بیک آواز کہا: محمد ﷺ! تیری بات آج تک ہم نے کبھی جھوٹ نہ پائی ❸ ابوسفیان جو ہجرت کے آٹھویں سال تک اسلام کے سخت ترین دشمن تھے، ۶ھ میں ہرقل قیصرِ روم کے دربار میں کفارِ قریش کی ایک جماعت کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و اوصاف کے متعلق شہادتیں پیش کر رہے تھے، تاہم وہ ایک حرف بھی صداقت کے خلاف نہ کہہ سکے، انہوں نے شہادت دی کہ ''محمد ﷺ کبھی جھوٹ نہیں بولتے، انہوں نے کبھی بدعہدی نہ کی، شرک سے روکتے ہیں، توحید کی تعلیم دیتے ہیں، عبادت، صدق، عفت صلہ رحمی کی تاکید کرتے ہیں۔'' ہرقل ہر فقرہ پر کہتا جاتا تھا کہ ''نبوت کے یہی آثار و دلائل ہیں'' یہ سب سے پہلا دن تھا کہ ابوسفیان کے دل نے آنحضرت ﷺ کی کامیابی کا یقین کیا۔ ❹

کتاب کی دوسری جلد میں آپ کے تمام محاسن اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، حسن معاملت، جود وسخا، عدم تشدد، عفوو درگزر وغیرہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ درحقیقت آنحضرت ﷺ کا ایک معجزہ تھا اور یہ معجزہ تسخیر قلوب ہی کے لیے عطا ہوا تھا۔ قرآن مجید اس نکتہ کو خود بتاتا ہے:

﴿ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

''اور محمد (ﷺ) اگر تم درشت خو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔''

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی:۳۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ تبت:۴۹۷۱؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ﴿ وانذرعشيرتك الاقربين ﴾: ۵۰۸۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی:۷۔

آپ کی یہی معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ شکوک واوہام کو دم کی دم میں مٹا دیتی تھی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک شخص نے آپ سے بہت سی بکریاں مانگیں آپ نے دے دیں اس پر آپ کی فیاضی کا اس قدر اثر پڑا کہ اپنے قبیلہ میں آ کر اس نے کہا: "لوگو مسلمان ہو جاؤ کیونکہ محمد ﷺ اس قدر دیتے ہیں کہ خود ان کو اپنے تنگ دست ہونے کا مطلق خوف نہیں ہوتا۔" [1]

فتح مکہ میں جب صفوان بن اُمیہ رضی اللہ عنہ مجبورًا اسلام لایا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو تین سو اونٹ دے دیے۔ خود صفوان کا بیان ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مجھ کو اس قدر دے دیا کہ آپ پہلے میرے نزدیک مبغوض ترین خلق تھے لیکن اس فیاضی سے محبوب ترین شخص بن گئے۔ [2] ہندہ خاندان نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی، جنگِ احد میں قوتِ بازوئے اسلام حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جسم ٹکڑے ٹکڑے کر کے اسی نے آپ کے دل کو چاک کیا تھا، اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا لیکن اس کو نگل نہ سکی اور پھر اگل دیا تھا اور اسی نے ان کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا، فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئی، تب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی، لیکن دربارِ رسالت میں پہنچ کر آپ کے حسن خلق سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول پڑی، یارسول اللہ ﷺ! سطح زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھرانا محبوب نہیں، آپ نے یہ سن کر فرمایا: "خدا کی قسم! ہمارا بھی یہی حال تھا۔" [3]

آپ پر ایک یہودی عالم کا قرض آتا تھا اس نے تقاضا کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں۔" اس نے کہا کہ میں تو لے کے ہی ٹلوں گا۔ آپ نے کہا: "تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھتا ہوں۔" چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر کی نماز تک اس کے ساتھ بیٹھ رہے صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضگی ظاہر کی اور خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یارسول اللہ! آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں۔" دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ "میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے میں نے یہ گستاخی صرف اس لیے کی کہ توراۃ میں پیغمبر کے جو اوصاف مذکور ہیں ان کا تجربہ کروں۔" [4]

ثمامہ بن اثال یمامہ کا ایک رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف میں بھیجا گیا حسن اتفاق سے وہ راہ میں مل گیا گرفتار ہو کر مدینہ آیا اور مسجد نبوی کے ایک ستون میں باندھ دیا گیا، آنحضرت ﷺ نماز کے لیے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی آپ ﷺ نے دریافت کیا کہ "ثمامہ تمہارے

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب فی سخائہ ﷺ: ۶۰۲۰، ۶۰۲۱۔

[2] صحیح مسلم، باب مذکور: ۶۰۲۲۔ [3] مسلم، کتاب الأقضیة، باب قضیة هند: ۴۴۸۰۔

[4] رواہ البیہقی فی دلائل النبوۃ، ج ۶، ص: ۲۸۰؛ مشکوۃ کتاب الفضائل، باب فی اخلاقہ ﷺ: ۵۸۳۲۔

ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔'' اس نے کہا کہ اگر مجھے قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر عفو فرمائیں گے تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا، اگر مال کی خواہش ہے تو فرمایئے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سن کر آپ اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا، تیسرے دن پھر یہی گفتگو کی، آنحضرت ﷺ نے اپنے دست مبارک سے اس کے بند گرہ کھول دیے اور رہا کر دیا۔ اس پر اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا اور غسل کر کے مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر آنحضرت ﷺ کو مخاطب ہوا: ''محمد ﷺ! زمین پر آپ کے چہرے سے زیادہ کوئی چیز مجھ کو مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لیے تمام مذاہب سے عزیز تر ہو گیا ہے مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے دشمنی نہ تھی لیکن وہ آج مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ خوش نما نظر آتا ہے۔'' [1]

ایک بار آپ ﷺ کسی سفر میں تھے اور ساتھ میں مطلق پانی نہ تھا۔ صحابہ نے پیاس کی شکایت کی آپ نے ایک صحابی کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پانی کی جستجو میں روانہ فرمایا، راہ میں ایک عورت اونٹ پر پانی کی دو مشکیں بھرے ہوئے لیے جا رہی تھی دونوں صاحب اس کو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے آپ ﷺ نے برتن منگوائے اور مشکوں کے منہ کھول دیے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے باری باری سے پینا شروع کر دیا، وہ کھڑی تماشا دیکھتی رہی، فراغت کے بعد اس کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے کھجور، آٹا اور ستو تھوڑا تھوڑا لوگوں سے جمع کر کے ایک کپڑے میں باندھ کر اس کے اونٹ پر رکھوا دیا وہ گھر پہنچی تو لوگوں نے تاخیر کا سبب پوچھا اس نے کہا، راہ میں مجھ کو دو آدمی ملے اور وہ مجھ کو اس شخص کے پاس لے گئے جس کو لوگ بددین کہا کرتے ہیں، خدا کی قسم! وہ یا تو اس آسمان وزمین کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے یا وہ واقعی خدا کا رسول ہے۔

لیکن اسلام کا یہ اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ رہا بلکہ تربیت یافتگان نبوت کے فیض اثر سے اس کے تمام قبیلے تک وسیع ہو گیا۔ [2]

نبوت کے امتیاز وشناخت کا ذریعہ صرف اخلاق ہی کا اعجاز نہیں، اس کی زبان کا ایک ایک حرف اس کی معصوم شکل وصورت کی ایک ایک ادا، اعجاز اور سرتاپا اعجاز ہوتی ہے۔

روئے و آوازِ پیمبر معجزہ است (رومیؒ)

آپ کی صداقت سے لبریز تقریر کا ایک ایک حرف دل میں اتر جاتا تھا اور نبوت کا اصلی معیار سامع کے سامنے روشن ہو جاتا تھا۔

جب آپ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو تمام مدینہ میں غل ہو گیا، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسير، باب ربط الاسير وحبسه : ٤٥٨٩۔

[2] بخاری، کتاب التيمم، باب الصعيد الطيب وضوء المسلم يكفيه عن الماء: ٣٤٤۔

سلام جو مدینہ کے مشہور یہودی عالم تھے، اپنے نخلستان میں کھجور توڑ رہے تھے، آمد آمد کی خبران کے کان میں پہنچی تو فوراً آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ ﷺ فرما رہے تھے: ((افشوا السلام واطعموا الطعام وصلوا الارحام وصلوا والناس نیام تدخلوا الجنة بسلام)) [1] واپس گئے تو اس قدر متاثر تھے کہ آنحضرت ﷺ اٹھ کر ابوایوب انصاری کے مکان میں جونہی پہنچے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بھی آئے اور کہا کہ میں آپ کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں اور نیز یہ شہادت دیتا ہوں کہ آپ ایک حق مذہب لے کر آئے ہیں۔ [2]

ضماد ایک شخص تھے جن کے ساتھ زمانہ جاہلیت میں آپ کے دوستانہ تعلقات رہ چکے تھے، وہ جنون کا علاج کرتے تھے، اتفاق سے وہ مکہ میں آئے تو کفار سے سنا کہ آپ (نعوذ باللہ) مجنون ہو گئے ہیں، وہ آپ کے پاس گئے اور کہا "محمد ﷺ! میں جنون کا علاج کرتا ہوں" اس کے جواب میں آپ ﷺ نے ایک تقریر کی اور اس کو ان الفاظ سے شروع کیا:

((الحمد لله نحمده ونستعينه من يهده الله فلا مضل له ومن يضلل فلا هادى له واشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله))

"تمام تعریفیں خدا کے لیے ہیں، میں اس کی حمد کرتا ہوں اس سے مدد چاہتا ہوں، خدا جس کو ہدایت دیتا ہے اس کو کوئی شخص گمراہ نہیں کرسکتا، جس کو گمراہ کرتا ہے اس کو کوئی ہدایت نہیں کرسکتا، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں، وہ تنہا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اس کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔"

ان پر ان فقروں کا یہ اثر پڑا کہ وہ مکرر سننے کے مشتاق ہوئے، آپ ﷺ نے تین بار یہ کلمات اعادہ فرمائے تو انہوں نے کہا کہ میں نے کاہنوں جادوگروں اور شاعروں کا کلام سنا ہے، لیکن آپ کے اس کلام کی طرح مؤثر کبھی نہیں سنا، وہ سمندر تک پہنچ جائے گا، ہاتھ لائیے، میں اسلام پر بیعت کرتا ہوں۔ [3]

حضرت حلیمہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حارث رضی اللہ عنہ یعنی آپ کے رضاعی باپ جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا کچھ سنا ہے کہ تمہارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگ مر کر پھر زندہ ہوں گے، انہوں نے آپ سے کہا کہ بیٹا یہ کیا کہتے ہو؟ آپ نے نہایت زوردار لہجہ میں فرمایا: "ہاں اگر وہ دن آیا تو آپ کا ہاتھ پکڑ کر بتادوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا۔" ان پر اس کا یہ اثر پڑا کہ فوراً مسلمان ہو گئے اور یہ اثر اس قدر دیرپا ہوا کہ وہ کہا کرتے

[1] مسند احمد، ج ۵، ص: ۴۵۱۔
[2] بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الی المدینة: ۳۹۱۱۔
[3] مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلوة والخطبة: ۲۰۰۸۔

تھے کہ اگر میرا بیٹا ہاتھ پکڑے گا تو جنت میں پہنچا کر ہی چھوڑے گا۔ ❶

انسان کا چہرہ حقیقت کا آئینہ ہے، آپ کی ایک ایک ادا صداقت اور معصومیت کا پیکر تھی، آپ کی شکل نہایت پر جلال تھی، چہرہ پرنور تھا، آواز موقر اور پر رعب تھی اور ان تمام چیزوں کا مجموعی اثر پیغمبرانہ اعجاز کے ساتھ دلوں کو اپنی طرف جذب کر لیتا تھا اسی اثر سے متاثر ہو کر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نومسلم یہودی عالم آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کو دیکھ کر بے اختیار بول اٹھے تھے:

وجهه ليس بوجه كذاب. ❷

''جھوٹے آدمی کا یہ چہرہ نہیں ہو سکتا۔''

اور یہی کشش تھی جس کا اظہار حجۃ الوداع میں اعرابِ بادیہ کی زبان سے ان الفاظ میں ہوتا تھا:

هذا وجه مبارك ❸ ''یہ مبارک چہرہ ہے۔''

بارگاہِ نبوت میں پہنچنے کے ساتھ ہی یہ اثر آنکھوں کی راہ سے دل میں پہنچ جاتا تھا ابو رافع نام ایک شخص قریش کی طرف سے قاصد بن کر آپ ﷺ کی خدمت میں آئے تھے جوں ہی چہرۂ اقدس پر نظر پڑی وہ بہزار جان شیدا تھے، اسلام قبول کیا ❹ اور آپ ﷺ کی غلامی کو فخر سمجھا۔ ❺

---

❶ اصابہ، ج۱، ص: ۲۹٦ تذکرۃ حارث ابن عبد العزی۔

❷ جامع ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب حديث: أفشوا السلام... :۲٤۸۵۔

❸ ابوداود، كتاب المناسك، باب المواقيت:۱۷٤۲۔

❹ ابوداود، كتاب الجهاد، باب في الامام يستجن به في العهود: ۲۷۵۸۔

❺ اصابه:٦٥، ٦٦ واستيعاب، ج۲، ص:٦٦۸۔

اسلام
یا
محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغمبرانہ کام

آنحضرت ﷺ جس عظیم الشان پیغام کو لے کر آئے تھے اور جس مہتم بالشان کام کو انجام دینے کے لیے دنیا میں بھیجے گئے تھے، نیک دل اور حقیقت شناس لوگ تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ اس کے قبول کرنے پر آمادہ ہوگئے وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے، پیغام کی سچائی، وحی کی تاثیر، پیغمبر کی پُر اثر دعوت، اعجازِ معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف وشفاف ہوتے گئے اور عوائق، موانع، شبہات اور شکوک کی تو برتو ظلمتیں اور تاریکیاں رفتہ رفتہ چھٹتی چلی گئیں اور اسلام کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں وتاباں ہوتا گیا یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام، ایک کامل قانون اور ایک کامل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت خدا پرستی، اخلاص، ایثار، دین، تقویٰ، ایمانداری، اخلاق اور سچائی کا ایک مجسم عہد یعنی ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان پیدا ہوگیا وہ گویہی حقیقت تھی جس کی طرف آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع (حجۃ الوداع) میں اپنی وفات سے تقریباً دو ماہ پیشتر یہ ارشاد فرمایا:

((الا ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللّٰہ السموات والارض)) [1]

''ہاں اب زمانہ کا دور اپنی اسی حالت پر آ گیا جس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان وزمین کو پیدا کیا۔''

اور یہی حقیقت تھی جس کی نسبت آپ ﷺ نے اپنی وفات سے کچھ دنوں پیشتر ایک نہایت پُر درد الوداعی تقریر کے آخر میں یہ الفاظ فرمائے: [2]

((قد ترکتکم علی مثل البیضاء لیلھا ونھارھا سواء))

''میں تم کو ایک روشن راستہ پر چھوڑے جاتا ہوں جس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ اس کی رات بھی دن کے مانند ہے۔''

اور آخر حجۃ الوداع کے مجمع عام میں تکمیل کی بشارت آئی کہ

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر ختم کر دی۔''

پروفیسر مارگولیتھ، جن کی تائیدی شہادت بہت کم مل سکتی ہے، لکھتے ہیں:

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع:۴۴۰۶۔ [2] سنن ابن ماجہ، کتاب السنۃ، باب اتباع السنۃ:۵؛ مستدرک حاکم، ج ۱، ص ۹۶؛ مسند احمد، ج ۴، ص:۱۲۶۔

"محمد ﷺ کی وفات کے وقت ان کا سیاسی کام غیر مکمل نہیں رہا، آپ ایک سلطنت کی جس کا ایک سیاسی و مذہبی دارالسلطنت مقرر کیا گیا تھا، بنیاد ڈال چکے تھے، آپ ﷺ نے عرب کے منتشر قبائل کو ایک قوم بنا دیا تھا، آپ ﷺ نے عرب کو ایک مشترک مذہب عطا کیا اور ان میں ایک ایسا رشتہ قائم کیا جو خاندانی رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مستقل تھا۔" ❶

ایک (دور) یورپ کے بیگانہ مستشرق کی نسبت جس کا علم، عرب اور اسلام کے متعلق صرف چند کتابوں سے مستعار ہے، خود ایک عرب عیسائی اہل قلم کو فیصلہ کا زیادہ حق ہے، بیروت کے مسیحی اخبار الوطن نے ۱۹۱۱ء میں لاکھوں عرب عیسائیوں کے سامنے یہ سوال پیش کیا تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا انسان کون ہے، اس کے جواب میں ایک عیسائی عالم (داور مجاعص) نے لکھا:

"دنیا کا سب سے بڑا انسان وہ ہے جس نے دس برس ❷ کے مختصر زمانہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے فلسفہ، ایک نئی شریعت اور ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھی، جنگ کا قانون بدل دیا اور ایک نئی قوم پیدا اور ایک نئی طویل العمر سلطنت قائم کر دی لیکن ان تمام کارناموں کے باوجود وہ اُمی اور ناخواندہ تھا وہ کون؟ محمد بن عبداللہ قریشی عرب اور اسلام کا پیغمبر۔ اس پیغمبر نے اپنی عظیم الشان تحریک کی ہر ضرورت کو خود ہی پورا کر دیا اور اپنی قوم اور اپنے پیروؤں کے لیے اور اس سلطنت کے لیے جس کو اس نے قائم کیا ترقی اور دوام کے اسباب بھی خود مہیا کر دیے اس طرح کہ قرآن اور احادیث کے اندر وہ تمام ہدایات موجود ہیں جن کی ضرورت ایک مسلمان کو اس کے دینی یا دنیاوی معاملات میں پیش آ سکتی ہیں۔ حج کا ایک سالانہ اجتماع فرض قرار دیا، تاکہ اقوام اسلامی میں اہل استطاعت ایک مرکز پر جمع ہو کر اپنے دینی و قومی معاملات میں باہم مشورے کر سکیں، اپنی امت پر زکوۃ فرض کر کے قوم کے غریب طبقہ کی حاجت پوری کی۔ قرآن کی زبان کو دنیا کی دائمی اور عالم گیر زبان بنا دیا کہ وہ مسلمان اقوام کے باہمی تعارف کا ذریعہ بن جائے۔ قوم کے ہر فرد کو ترقی کا موقع اس طرح عنایت کیا کہ یہ کہہ دیا کہ ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر صرف تقویٰ کی بنا پر بزرگی حاصل ہے اس بنا پر اسلام ایک حقیقی جمہوریت بن گیا جس کا رئیس قوم کی پسند سے منتخب ہوتا ہے مسلمانوں نے ایک مدت تک اس اصول پر عمل کیا، یہ کہہ کر عرب کو عجم پر اور عجم کو عرب پر کوئی فوقیت نہیں، اسلام میں داخل ہونا ہر شخص کے لیے آسان کر دیا، نامسلموں کے لیے اسلامی ملکوں میں عیش و آرام اور امن و اطمینان سے سکونت کی ذمہ داری یہ کہہ کر اپنے اوپر لے لی کہ تمام مخلوق خدا کی اولاد ہے تو خدا کا سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اس کی اولاد کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے، خاندانی ازدواجی اصلاحات بھی اس کی

❶ لائف آف محمد مارگولیتھ صفحہ ۴۷۱۔ ❷ مدینہ منورہ میں آپ دس برس زندہ رہے تھے۔

نظر سے پوشیدہ نہ رہیں اس نے نکاح و وراثت کے احکام مقرر کیے، عورت کا مرتبہ بلند کیا، نزاعات اور مقدمات کے فیصلہ کے قوانین بنائے۔ بیت المال کا نظام قائم کر کے قومی دولت کو بیکار نہ ہونے دیا، علم کی اشاعت اور تعلیم اس کی کوششوں کا بڑا حصہ رہی، اس نے حکمت کو ایک مومن کا گم شدہ مال قرار دیا اسی سبب سے مسلمانوں نے اپنی ترقی کے زمانہ میں ہر دروازہ سے علم حاصل کیا، کیا ان کارناموں کا انسان دنیا کی سب سے بڑی ہستی قرار نہ پائے گا۔''

انگلستان کا مشہور انشا پرداز کارلائل نے اپنے ''ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ'' میں لاکھوں پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں میں صرف محمد عربی ﷺ ہی کے وجود گرامی کو اس قابل سمجھا کہ وہ آپ کو نبوت کا ہیرو قرار دے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار ''محمد'' آپ ﷺ کی نسبت کہتا ہے:

''قرآن سے اس شخص کے روحانی ارتقا کا پتہ چلتا ہے جو تمام نبیوں اور مذہبی لوگوں میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔'' [1]

الغرض دوست و دشمن سب کو اس کا اعتراف ہے کہ انبیا میں یہی برگزیدہ ہستی ہے جس نے کم سے کم مدت میں اپنی بعثت اور رسالت کے زیادہ سے زیادہ فرائض ادا کیے اور اصلاحاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑا، جس کی تکمیل اس کی تعلیم اور عمل سے نہ ہوگئی ہو اور یہ اس لیے کہ تمام انبیا علیہم السلام میں خاتم نبوت، تکمیل دین اور آخری معلم کی حیثیت آپ ہی کو عطا ہوئی تھی اگر انسان کی عملی و اخلاقی و دینی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہ جاتی حالانکہ آپ ﷺ نے فرمادیا کہ ''میرے بعد کوئی نبی نہیں میں نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ ہوں۔'' [2]

آپ کی تعلیمات کی یہی ہمہ گیری ہے جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں بھی تعجب آتا تھا، بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مذاقاً کہا کہ تمہارے پیغمبر تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں یہاں تک کہ اس کی بھی کہ تم کو قضائے حاجت کیونکر کرنی چاہیے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں یہ سچ ہے آپ ﷺ نے ہم کو یہ حکم دیا ہے کہ ہم ایسی حالت میں قبلہ رخ نہ بیٹھیں اور اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت نہ کریں اور نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں، ان میں کوئی ہڈی اور گوبر نہ ہو۔ [3] نبوت محمدی ﷺ کی تعلیمات کی یہ ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لیے یکساں تعلیمات اور ہدایات رکھتا ہے، عرب کے بدوؤں اور قریش کے رئیسوں دونوں کے لیے آپ کی بعثت تھی، اس لیے آپ کی

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدھم مضمون قرآن، ج ۱۵، صفحہ: ۵۹۸۔ [2] صحیح بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین: ۳۵۳۵ وجامع ترمذی، کتاب الامثال، باب ما جاء فی مثل النبی والانبیاء: ۲۸۶۲۔

[3] جامع ترمذی، ابواب الطھارۃ، باب الاستنجاء بالحجارۃ: ۱۶؛ سنن ابن ماجہ کتاب الطھارۃ، باب الاستنجاء بالحجارۃ والنھی عن الروث: ۳۱۶۔

تعلیمات میں پست کو بلند اور بلند کو بلند تر بنانے کی برابر ہدایات ہیں، آج یہی چیز ہے کہ افریقہ کے وحشیوں میں اسلام اپنی تعلیمات کے ساتھ تنہا جاتا ہے اور ان کو متمدن اور مہذب بنانے کے لیے مذہب سے باہر کسی تعلیم کی اس کو ضرورت پیش نہیں آتی لیکن عیسوی مذہب کو چند اخلاقیات چھوڑ کر جن کا ماخذ انجیل ہے، عقائد پادریوں کی کونسلوں سے، دعائیں اور عبادات کلیساؤں کے حکمرانوں سے اور تہذیب وتمدن کی تعلیمات یورپ کے بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کرنی پڑتی ہیں لیکن اسلام میں محمد رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کچھ نہیں، عقائد ہوں کہ عبادات اور دعائیں، اخلاق ہوں کہ آدابِ تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کا کاروبار، انسانوں کے ساتھ، معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ، سب کا ماخذ صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ گیر تعلیمات ہیں۔

آپ ﷺ کی ان ہمہ گیر تعلیمات کی کتاب جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے چار ابواب پر منقسم ہے اور انہیں کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

آپ ﷺ نے بتایا کہ ہر انسان کا ایک تعلق تو اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ۔ اسی مفہوم کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ اس کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مالک کے غلاموں کے ساتھ، یا یوں کہو کہ اس کا ایک رخ تو آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت اس کو ایک لگاؤ تو عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالمِ شہود سے، پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برادری اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندہ کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے، باہم انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و رابطہ ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور اگر ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور برادرانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔

قرآن پاک کی اصطلاح میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرے اور چوتھے کی بجا آوری کا نام عمل صالح ہے اور انہیں دونوں کے مجموعہ پر کامل نجات کا انحصار ہے۔ عمل صالح کی تین قسمیں ہیں: خدا کے سامنے اپنی عبودیت کا اظہار اور اس کے احکام کی تعمیل، بندوں کے ساتھ کاروبار اور معاملہ میں قانون الٰہی کی پابندی اور ان کے ساتھ محبت، الفت نیکی اور بھلائی کا برتاؤ اور گو اس لحاظ سے کہ ان میں سے ہر ایک عمل کو جس میں خدا کی خوشنودی اور رضامندی مقصود ہو اسلام عبادت کہتا ہے، لیکن اصطلاح میں پہلے کا نام عبادات اور دوسرے کا نام معاملات اور تیسرے کا نام اخلاق ہے۔ الغرض محمد رسول اللہ ﷺ جو عالمگیر شریعت اور دائمی ہدایت لے کر آئے، وہ انہیں چاروں عنوانوں کا مجموعہ ہے، یعنی عقائد، عبادات، معاملات اور اخلاق، انہیں کی اصلاح، تعلیم اور تکمیل کے لیے آپ کی بعثت ہوئی اور یہی آپ کے پیغمبرانہ فرائض کے اصلی کارنامے ہیں۔

عقائد

عقائد کی حقیقت اور اہمیت

انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں، یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں، یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں، ان ہی اصولی خیالات کو عقائد کہتے ہیں، یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادہ کے تابع ہیں، ہمارے ارادہ کا محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں، عام بول چال میں انہیں چیزوں کی تعبیر ہم ''دل'' کے لفظ سے کرتے ہیں، اسلام کے معلّم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے، فرمایا:

((الا وان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله واذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب)) [1]

''انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، خبردار کہ وہ ٹکڑا دل ہے۔''

قرآنِ پاک نے دل (قلب) کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں، سب سے پہلے ''قَلْبٌ سَلِيْمٌ'' [2] (سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے، دوسرا اس کے مقابل ''قَلْبٌ اٰثِمٌ'' ﴿فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۳) (گنہگار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا ''قَلْبٌ مُّنِيْبٌ'' (رجوع ہونے والا دل) یہ وہ ہے جو اگر کبھی بھٹکتا ہے اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہوتا ہے، غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ ہستی کی ہیں جس کا نام دل ہے، ہمارے اعمال کا ہر محرک ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے، اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا:

((انما الاعمال بالنیات)) [2]

''تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔''

اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں آپ ﷺ نے یوں ادا فرمایا:

((انما لکل امریء ما نوی فمن کانت ھجرته الی دنیا یصیبھا او الی امرأة ینکحھا فھجرته الی ما ھاجر الیه)) [3]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه: ۵۲۔

[2] قرآن پاک کی آیت میں یہ ہے ﴿فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ﴾ (بقرۃ: ۲۸۳)

[2] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ: ۱۔ [3] ایضاً۔

''ہر شخص کے کام کا ثمرہ وہی ہے جس کی وہ نیت کرے تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے اس کو ثواب حاصل نہ ہوگا)۔''

آج کل علم نفسیات نے بھی اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادہ پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ اب صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائے اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدہ کے تحت میں ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔ جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہوسکتی ہے اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح و درست نہیں ہوسکتا ہے جب تک اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو راہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے، اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عملِ صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کرنے کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادہ اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسنِ عمل کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا جس نے جاہلیت میں بہت سے نیکی کے کام کیے تھے مگر بایں ہمہ مشرک تھا اس کی نسبت آنحضرت ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کیے ان کا ثواب اس کو ملے گا؟ فرمایا: ''نہیں اے عائشہ! کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ ''بارِالٰہا! میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے۔'' [1]

بدر کی لڑائی کے موقع پر ایک مشرک نے جس کی بہادری کی دھوم تھی حاضر ہو کر کہا کہ ''اے محمد ﷺ! میں بھی تمہاری طرف سے لڑنے کے لیے چلنا چاہتا ہوں کہ مجھے بھی مال غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے'' فرمایا: ''کیا تم اللہ عزوجل اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہو؟'' اس نے جواب دیا، نہیں۔ فرمایا: ''واپس جاؤ کہ میں اہل شرک سے مدد کا خواستگار نہیں۔'' دوسری دفعہ وہ پھر آیا اور وہی پہلی درخواست پیش کی مسلمانوں کو اس کی شجاعت و بہادری کی وجہ سے اس کی اس درخواست سے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ ان

[1] أحمد، ج ٦، ص: ٩٣، ١٢٠۔

کی فوج میں شریک ہو جائے لیکن آنحضرت ﷺ نے اس سے پھر وہی سوال کیا کہ ''کیا تم کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ہے؟'' اس نے پھر نفی میں جواب دیا، آنحضرت ﷺ نے پھر وہی فرمایا: ''میں کسی مشرک سے مدد نہ لوں گا۔'' غالباً مسلمانوں کی تعداد کی کمی اور اس کی بہادری کے باوجود اس سے آپ کی بے نیازی کی کیفیت نے اس کے دل پر اثر کیا تیسری دفعہ جب اس نے اپنی درخواست پیش کی اور آپ نے دریافت فرمایا: ''تم کو خدا اور رسول پر ایمان ہے؟'' تو اس نے اثبات میں جواب دیا اور نورِ اسلام سے منور ہو کر لڑائی کی صف میں داخل ہوا۔ [1]

قرآنِ پاک نے ان لوگوں کے کارناموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں، اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں:

﴿ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ﹰاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰي شَيْءٍ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴾ (١٤/ ابراهيم:١٨)

''جنہوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا، ان کے کاموں کی مثال اس راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور سے ہوا چلی، وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔''

سورۂ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَاۗءً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْـــــًٔا ﴾ (٢٤/ النور:٣٩)

''جنہوں نے خدا کا انکار کیا ان کے کام اس سراب کی طرح ہیں، جو میدان میں ہو، جس کو پیاسا پانی سمجھتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو وہاں کسی چیز کا وجود اس کو نظر نہ آئے۔''

اس کی ایک اور مثال ایسی سخت تاریکی سے دی گئی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا اور جس میں ہوش و حواس اور اعضاء کی سلامتی کے باوجود ان سے فائدہ اٹھانا ناممکن ہے:

﴿ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰـىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ۭ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ۭ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ﴾

(٢٤/ النور:٤٠)

[1] صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب كراهة الاستعانة فى الغزو بكافر: ٤٧٠٠۔

''یا ان کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گہرے سمندر میں سخت اندھیرا ہو، اس کے اوپر موج اور موج پر پھر موج ہے اور اس کے اوپر بادل گھرا ہو یہ تو اندھیرا ہے کہ اس میں ہاتھ نکالے تو وہ بھی سوجھائی نہ دے، جس کو خدا نے نور نہ دیا اس کے لیے نور نہیں۔''

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں ہو سکتی، اس لیے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی، وہ کام گو بظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہوتا ہے، اخلاقی نقطہ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا اور فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرة: ۲٦٤)

''اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو احسان رکھ کر اور دکھ دے کر اس طرح نہ برباد کرو جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھانے کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہے اور خدا پر (جو نیکیوں کی جزا دیتا ہے) اور قیامت پر (جس میں نیکیوں کی جزا ملے گی) یقین نہیں کرتا پس اس کی خیرات کی مثال اس چٹان جیسی ہے جس پر کچھ مٹی پڑی ہو اور اس پر پانی برسا تو مٹی دھل گئی اور پتھر رہ گیا جس پر جو کچھ بویا جائے گا وہ اگے گا نہیں۔''

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ، خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے، یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں، وہ ہمارے دل کا نور ہے، وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے، اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے۔

توراۃ میں بعض عقیدوں کا ذکر ہے، مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے۔ انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے، مگر اخلاق کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں، بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لیے اور خوارقِ عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لیے [1] اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے مذہبوں نے محض ذہنی جولانی،

[1] متی: ۱۷۔۲۰

مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ عیسائیوں زردشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو یہ وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے، جس سے تصوریت ان کی عملیت پر غالب آ گئی اور انسانوں کے قوائے عمل سرد ہو گئے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے علم و عمل، تصور اور فعل، عقلیت اور عملیت میں لزوم ثابت کیا، مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا، جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد اور اخلاق و عبادات کی اساس قرار پاسکے، عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ، اور تصورات اور نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا، آپ نے صریح الفاظ میں عقائد کے صرف پانچ اصول تلقین کیے، خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال جزا و سزا کے دن پر ایمان۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے، ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے، تاکہ وہی ہمارے تمام کاموں کا قبلہ مقصود قرار پاسکے اور اسی کی رضا جوئی اور اس کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں اور نیکی کو اس لیے کریں اور ہر برائی سے اس لیے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے، اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس کے پیغمبر کی سچائی پر ایسا دل سے یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات ہمارے غلط استدلالات ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کرسکیں۔ خدا کے رسولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم انہیں کے واسطہ سے انسانوں کو پہنچا ہے اگر ان کی صداقت، سچائی اور راستبازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغامِ ربانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی اور نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے، جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے، پھر اچھے اور برے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری راہنمائی کے لیے نہیں ہوگی۔

خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں اور جو مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں اور مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں اور

ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ محفوظ کرتے جاتے ہیں، تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا بُرا معاوضہ مل سکے۔ خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعہ انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکل اور کتابوں اور صحیفوں کی صورت میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہو اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لیے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے، جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

اعمال کی باز پرس اور جواب دہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیائے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے، یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں ان کی ذمہ داری کو محسوس کراتا ہے اس لیے روزِ جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے اور اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ مکی وحی کی تلقین کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے فرشتوں پر اور روزِ جزا پر ایمان لانا، یہ عقائدِ خمسہ یک جا طور پر سورۂ بقرہ میں متعدد دفعہ کہیں مجمل اور کہیں مفصل بیان ہوئے ہیں:

﴿ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳، ٤)

”جو لوگ غیب (خدا) خدا کی صفات اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر اے محمد ﷺ اترا اور تم سے پہلے پیغمبروں پر اترا اس پر یقین رکھتے ہیں (یعنی انبیا علیہم السلام اور ان کی کتابوں پر)۔“

﴿ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:٤)

”اور آخرت (روزِ) جزا پر یقین رکھتے ہیں۔“

یہ تو سورہ کے آغاز کی آیتیں ہیں، سورہ کے بیچ میں پھر ارشاد ہوا:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۷۷)

”لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر، آخری دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لائے۔“

سورہ کے آخر میں ہے:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۸۵)

''پیغمبر پر جو کچھ اتارا گیا اور تمام مومن اس پر ایمان لائے سب خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لائے۔''

سورۂ نساء میں انہیں عقائد کی تعلیم ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء: ١٣٦)

''اے وہ لوگو جو ایمان لا چکے ہو! ایمان لاؤ خدا پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر، جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے اتاری اور جو شخص خدا کا اور اس کے فرشتوں کا، اس کی کتابوں کا، اس کے پیغمبروں کا اور روزِ آخرت کا انکار کرے گا وہ سخت گمراہ ہوا۔''

اللہ تعالیٰ پر ایمان

﴿ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ﴾ (٢/ البقرة: ٢٨٥)

ایک قادر مطلق اور بہمہ صفت موصوف ہستی پر یقین اور اس کو ایک جاننا تعلیم محمدی ﷺ کی پہلی ابجد ہے، اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے باوجود اس کے کہ خدا کی توحید اور صفات پر ایمان رکھنا ان کے اصول میں بھی داخل تھا مگر ان کی تعلیمات میں ترتیب مفقود تھی اور یہ نہیں معلوم ہوتا، کہ ان کی نگاہ میں توحید کا مسئلہ اہمیت کے کس درجہ پر ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس مسئلہ کی اصلی اہمیت محسوس کی اور اس کو اپنے نصاب درس کا پہلا سبق اور معارف وحقائق اور جسمانی اعمال و اخلاق کا سر بنیاد قرار دیا۔ خدا اگر چاہے تو انسان کے تمام گناہوں سے درگزر کر سکتا ہے، مگر اسی ایک حقیقت سے انکار وہ جرم ہے جس کو وہ کبھی معاف نہ فرمائے گا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (٤/ النسآء:١١٦)

''یقیناً خدا شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔''

پھر اس کے ساتھ خالص توحید کا بیان، اسما و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل، تعلیم محمدی ﷺ کی امتیازی شان ہے۔ معلوم ہو چکا ہے کہ نبوتِ محمدیہ ﷺ کی غرض و غایت صرف تخیل پر نظریہ آرائی اور الٰہیاتی فلسفہ نہ تھا، بلکہ ایک زندہ قوم، جدو جہد اور عمل والی قوم، اخلاص و ایثار اور نیکی اور تقویٰ والی قوم کو پیدا کرنا تھا اس کو تمام دنیا کی پیشوائی کے لیے نمونہ عمل بنانا تھا اس لیے سب سے پہلے اہلِ عرب کو جو اس کے مخاطبِ اول تھے رموز اور اسرارِ توحید کا اس طرح حامل بنانا تھا کہ ان کے رگ و ریشہ میں ولولہ اور جوش کا ایک نشہ پیدا ہو جائے، اس کے لیے ضرورت تھی کہ سب سے پہلے زمین کو ہموار کیا جائے، شرک کے وہ تمام عقائد جو عربوں میں پھیلے ہوئے تھے ان کو مٹا دیا جائے اور جن وجوہ اور اسباب سے شرک کے یہ عقائد پیدا ہوتے ہیں ان کی بیخ کنی کی جائے۔

اصلاحِ عقائد

معلوم ہو چکا ہے کہ عرب میں جہالت اور وحشت کی وجہ سے سینکڑوں غلط عقائد اور توہمات پھیل گئے تھے اور دنیا کے دوسرے مذاہب کے عقائد میں بھی بہت سی غلطیاں داخل ہو گئی تھیں ان میں سب سے زیادہ بدتر اور تمام برائیوں کا اصلی محور شرک تھا، اس لیے سب سے پہلے آنحضرت ﷺ نے اس کی اصلاح سے آغاز کیا۔

شرک اور بت پرستی کا اصلی زینہ اسباب و مؤثرات کا وجود ہے، خدا نے عالم میں ایک سلسلہ اسباب قائم کر دیا ہے اور عالم کے تمام واقعات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں، لیکن یہ تمام سلسلہ ایک قادرِ مطلق کے دستِ قدرت میں ہے اور اس سلسلہ کی ایک کڑی بھی اس کے اشارہ کے بغیر جنبش نہیں کر سکتی، شرک اس طرح شروع ہوتا

ہے کہ پہلے انسان ان اسباب وعلل میں سے بعض نمایاں اور قوی الاثر اسباب سے متاثر ہوتا ہے، اجرام فلکی کی عظمت، آفتاب و ماہتاب کی نور افشانی، سمندر کا پرزور تلاطم، عناصر کی نیرنگ آرائیاں، انسان کو مبہوت کر دیتی ہیں، وہ ان کی عظمت و تاثیر سے متاثر، پھر منفعل اور بالآخر ان کا غلام بن جاتا ہے، اعتقاد کے پہلے مرحلہ میں انسان، غور رسی کے دعویٰ سے اس قدر امتیاز اور تفریق کرتا ہے کہ یہ چیزیں خود خدا یا معبود نہیں ہیں، لیکن یہ تمیز آخر تک قائم نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ خوش اعتقادی کا اثر غالب آتا جاتا ہے اور یہ چیزیں خدا کی شریک بنتی جاتی ہیں، یہاں تک کہ اصلی مسبب الاسباب نظر سے بالکل اوجھل ہو جاتا ہے۔ شرک کی جو گوناگوں صورتیں دنیا میں موجود تھیں اور جس طرح آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال کیا اور ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

تعدد خدا کا ابطال

① دنیا کی مشہور قوموں میں سے عیسائی اور مجوسی علانیہ مشرک تھے یعنی تین اور دو خدا مانتے تھے، ہندو بھی اسی کے قریب تھے، ان مذہبوں کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خدا کے جو مختلف نمایاں اور اہم اوصاف ہیں، ان کا مستقل اور مجسم وجود قائم ہو گیا، مثلاً: صفتِ خلق اور احیا و اماتت، برہما، بشن، مہیش کے نام سے موسوم ہیں، مجوسیوں نے دیکھا کہ دنیا میں جس قدر اشیاء اور افعال و حرکات ہیں سب باہم متضاد ہیں، نور و ظلمت، پستی و بلندی یمین و شمال، نرم و سخت، رات و دن، خیر و شر، حلم و غضب، غرور و خاکساری، فسق و صلاح، کوئی چیز مقابلہ اور تضادات سے خالی نہیں، اس لیے ایسے دو متضاد عالم کا خالق ایک نہیں ہو سکتا، اس بنا پر انہوں نے دو خدا تسلیم کیے اور ان کا نام یزداں اور اہرمن یا نور و ظلمت رکھا۔

قرآن مجید میں تمام احکام نہایت تدریج کے ساتھ نازل ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ۱۳ برس کی وسیع مدت تک، روزہ، زکوٰۃ اور حج کچھ فرض نہیں ہوتا تھا لیکن شرک کا استیصالِ کلی نبوت کا پہلا سبق تھا۔

سورۂ زمر مکہ میں نازل ہوئی اور اسی سورہ میں شرک کی تمام صورتیں مٹا دی گئیں، تمام دیگر سورتوں میں نہایت کثرت سے اس قسم کے شرک کا ابطال اور رد کیا ہے، اس لیے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

مجوسیوں کے شرک کی بنیاد اس پر تھی کہ افعالِ خیر و شر کا ایک خالق نہیں ہو سکتا ورنہ لازم آئے گا کہ خدا شر کو پیدا کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کے پیدا ہونے کو جائز رکھتا ہے وہ خود اچھا نہیں ہو سکتا، اس لیے قرآن مجید میں نہایت کثرت سے تصریحات آئیں کہ جن کو ہم خیر و شر کہتے ہیں سب کا فاعل خدا ہے، آنحضرت ﷺ نے نہایت تصریح و تاکید کے ساتھ تعلیم کی کہ جو کچھ ہوتا ہے، سب خدا کے حکم سے ہوتا ہے، باقی یہ مسئلہ کہ بری چیز کا خالق اچھا نہیں ہو سکتا، اولاً تو یہ مغالطہ آمیز غلطی ہے، ایک صناع مصور اگر ایک نہایت بدصورت جانور کی تصویر نہایت اچھی کھینچے تو اس کے کمالِ مصوری میں اس سے کچھ داغ نہیں آئے گا کہ جانور خود برا ہے، دوسرے یہ کہ اسلام نے اس مسئلہ کی جس اصلی گرہ کو کھولا ہے وہ یہ ہے کہ اشیاء بذاتہٖ خیر و شر نہیں ہیں بلکہ وہ

اپنے صحیح یا غلط طریقہ استعمال سے خیر یا شر ہو جاتی ہیں، آگ بجائے خود نہ خیر ہے نہ شر، اگر اس سے اچھا کام لیا جائے تو خیر ہے اور برا لیا جائے تو شر ہے، زہر نہ اچھا ہے نہ برا، اگر اس کو بیماریوں کے استیصال میں استعمال کیا جائے تو خیر ہے اور کسی بے گناہ کے قتل میں استعمال کرو تو شر ہے، اسی طرح دوسری اشیاء کے بھی خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، نہ کوئی شے دنیا میں خیرِ مطلق ہے، نہ کوئی شرِ محض، اسی لیے قرآن نے شر کی نسبت خدا کی طرف نہیں کی ہے، بلکہ خود انسان کی طرف کی ہے:

﴿ أَشَرٌّ أُرِيدَ بِمَن فِي الْأَرْضِ أَمْ أَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ﴾ (۷۲/ الجن:۱۰)

''آیا اہل زمین کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے یا ان کے پروردگار نے ان کو راہ پر لانا چاہا ہے۔''

﴿ مَّا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ۖ وَمَا أَصَابَكَ مِن سَيِّئَةٍ فَمِن نَّفْسِكَ ۚ ﴾

(٤/ النسآء:۷۹)

''تجھ کو جو نیکی پہنچی تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو مصیبت پہنچی وہ خود تیری طرف سے ہے۔''

﴿ أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۵)

''کیا جب تم کو کوئی مصیبت پہنچی، جس کے برابر تم ان کو پہنچا چکے ہو تو تم نے کہا یہ کہاں سے آئی کہہ دے کہ خود تمہاری طرف سے ہے خدا ہر بات پر قدرت رکھتا ہے۔''

الغرض کسی شے کا ایسا پیدا کرنا جس میں خیر و شر کے دونوں پہلو ہیں، شر نہیں ہے ان میں سے اس کے شر کے پہلو کو استعمال کرنا اور کام میں لانا شر ہے، ڈاکٹر بہت سی بیماریوں کے لیے زہریلی دوائیں بناتے ہیں مگر یہ شر نہیں البتہ جو کوئی شریر ان داؤں سے ان امراض کے ازالہ کے بجائے کسی کی جان لے لیتا ہے تو وہ شر ہے حاصل یہ کہ اس دنیا میں جب خیر و شر اشیاء میں بذاتہ نہیں ہے تو اچھی چیزوں کے لیے الگ اور بُری چیزوں کے لیے الگ خالق تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ خالق ایک ہی ہے دو نہیں:

﴿ وَقَالَ اللَّهُ لَا تَتَّخِذُوا إِلَٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۖ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ فَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۝ وَلَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ﴾ (۱٦/ النحل:۵۱، ۵۲)

''اور خدا نے کہا کہ دو خدا نہ بناؤ، وہ ایک ہی خدا ہے، تو مجھی سے ڈرو، اور اسی کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔''

② بزرگوں کی مشرکانہ تعظیم سے روکنا

شرک کا بہت بڑا ذریعہ کسی خاص شخص یا کسی شے کی تعظیم مفرط ہے جس کو شخص پرستی یا یادگار پرستی سے تعبیر کر سکتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، رام چندر، کرشن، کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا، اس بنا پر

قرآن مجید میں نہایت پرزور اور پرُرعب الفاظ میں شخص پرستی کی تحقیر کی گئی:

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ (٤/ النسآء:١٧١)

''اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے زیادہ نہ بڑھ جاؤ اور خدا کی نسبت وہی کہو جو حق ہے، مسیح یعنی عیسیٰ ابن مریم صرف خدا کے پیغمبر ہیں۔''

﴿ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٧٢)

''مسیح کو خدا کا بندہ ہونے سے ہرگز عار نہیں اور نہ مقرب فرشتوں کو (عار ہے) اور جس شخص کو خدا کی بندگی سے عار ہوگا اور بڑائی کی لے گا تو خدا سب کو عنقریب اپنے حضور میں بلائے گا۔''

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْــــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١٧)

''وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ عیسیٰ بن مریم خدا ہیں کہہ دو کہ اگر خدا یہ چاہے کہ مسیح ابن مریم کو اس کی ماں کو اور دنیا میں جو کچھ ہے سب کو برباد کر دے تو کون ہے جو خدا کو روک لے خدا ہی کے لیے آسمان وزمین اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں ان کی حکومت ہے اور خدا تمام چیزوں پر قادر ہے۔''

﴿ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰــهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١١٦، ١١٧)

''اور جب خدا کہے گا کہ کیوں عیسیٰ (علیہ السلام)! تم نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا کہو عیسیٰ عرض کریں گے کہ سبحان اللہ! میری یہ مجال ہے کہ میں کوئی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھ کو حق نہیں اگر میں نے کہا ہوگا تو، تو جانتا ہوگا تو میرے دل کی بات جانتا ہے اور میں تیرے دل کی بات نہیں جانتا، تو بڑا غیب دان ہے میں نے لوگوں سے صرف وہی کہا تھا جس کا حکم تو نے مجھ کو دیا تھا یعنی یہ کہ خدا کی عبادت جو میرا بھی خدا ہے اور تمہارا بھی۔''

آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ حاصلِ کون ومکاں تھے لیکن بار بار قرآن مجید میں تاکید آتی تھی:

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ (۱۸/ الکھف:۱۱۰)

''کہہ دے اے پیغمبر کہ میں تو تمہاری ہی طرح آدمی ہوں، لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔''

ایک خاص نکتہ غور کے قابل ہے، جس قدر جلیل القدر انبیا علیہم السلام گزرے ہیں، ان کے خاص خاص لقب ہیں، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب خلیل اللہ تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ تھے لیکن آنحضرت ﷺ باوجود اس کے کہ اشرف انبیا تھے آپ نے کیا لقب پسند کیا؟ اور کلمۂ توحید میں، نماز میں، درود میں آنحضرت ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ کیا امتیازی وصف شامل کیا گیا؟ صرف رسالت اور عبدیت کا

(اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ)

''میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد خدا کے بندے اور رسول ہیں۔''

اس میں بھی عبدیت کا وصف رسالت پر مقدم ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ بعض کفار کے حق میں دعائے بد کی اس پر یہ آیت اتری: [1]

﴿ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۲۸)

''تم کو کچھ اختیار نہیں ہے خدا چاہے گا تو ان پر توجہ کرے گا یا ان کو عذاب دے گا کہ وہ ظالم ہیں۔''

آنحضرت ﷺ بعض کفار کی ہدایت پانے اور اسلام کے قبول کرنے کے نہایت خواہش مند تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ ﴾ (۲۸/ القصص:۵۶) [2]

''تم جس کو چاہتے ہو اس کو ہدایت نہیں دے سکتے۔''

آنحضرت ﷺ نے عبداللہ بن ابی کے لیے دعائے مغفرت کی، اس پر قرآن مجید میں آیا: [3]

﴿ اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ ﴾

(۹/ التوبۃ:۸۰)

''تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو اگر تم ان کے لیے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔''

آنحضرت ﷺ ہمیشہ ہر موقع پر اس امر کی تاکید اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ لوگ آپ کی زائد از

---

[1] صحیح بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ احد، باب لیس لك من الامر شيء: ۴۰۶۹، ۴۰۷۰ یہ حدیث صحیح بخاری کے مختلف ابواب میں مذکور ہے۔ [2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ القصص: ۴۷۷۲۔

[3] صحیح بخاری کتاب التفسیر، سورۃ التوبۃ: ۴۶۷۰، ۴۶۷۱۔

اعتدال مدح نہ کریں جو منجر ہو کر شرک تک پہنچ جائے، بار بار فرماتے تھے:

((لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ ابن مریم)) ❶

''میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا۔''

ایک دفعہ آپ ﷺ راستہ میں جا رہے تھے ایک شخص نے دفعۃً آپ کو دیکھا اور اس پر اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا آپ ﷺ نے فرمایا: ''ڈرو نہیں میں ایک قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو گوشت کو خشک کر کے کھایا کرتی تھی۔'' ❷

بنو عامر کا وفد جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''سید خدا ہے۔'' لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہم سب سے افضل اور سب سے برتر ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''اچھا یہ کہو، لیکن دیکھو تم کو شیطان اپنا وکیل نہ بنا لے۔'' ❸ اصلی الفاظ یہ ہیں: ((قولوا بقولکم ولا یستجرینکم الشیطان))

ایک دفعہ ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو مخاطب کیا اے ہمارے آقا! اور ہمارے آقا کے فرزند! اور اے ہم میں سب سے بہتر اور سب سے بہتر کے فرزند! آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! پرہیز گاری اختیار کرو شیطان تمہیں گرا نہ دے میں عبداللہ کا بیٹا محمد ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔'' ❹

غور کرو کہ رسول کی شان میں یہ الفاظ ناجائز نہیں مگر توحید کو شرک کے ہر شائبہ سے بچانے کا خیال ہر خیال پر غالب تھا۔

③ درمیانی واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد

شرک کا اصلی ضرر یہ ہے کہ خدا سے انسان کو جس درجہ کا تعلق، جس قسم کا عجز و نیاز، جس مرتبہ کی محبت، جس درجہ کی التجا درکار ہے اس کا رخ دوسری طرف بدل جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں، تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں انہیں دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں، انہیں کو حاجت روا جانتے ہیں، اٹھتے بیٹھتے انہیں کا نام لیتے ہیں، انہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں، غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے انہیں معبودوں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں

❶ صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب واذکر فی الکتاب مریم: ۳٤٤٥۔
❷ مستدرك حاکم، ج۳، ص: ٤٨ علی شرط الشیخین؛ ابن ماجه، ابواب الاطعمة، باب القدید: ۳۳۱۲۔
❸ ادب المفرد امام بخاری، باب هل یقول سیدی: ۲۱۱ وابوداود، کتاب الادب، باب فی کراهة التماد، ح: ٤٨٠٦۔ ❹ مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۵۳۔

ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیا وصلحا بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔ اس بنا پر مقدم ترین امر یہ ہے کہ معبودین کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے اور صاف بتا دیا جائے کہ خدا کے آگے کسی کی کچھ نہیں چل سکتی، اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کرسکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے طلب مغفرت کا وعدہ کیا تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا:

﴿ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِن شَيْءٍ ﴾ (٦٠/ الممتحنة:٤)

''میں آپ کے لیے مغفرت کی درخواست ضرور کروں گا لیکن مجھ کو خدا کے سامنے آپ کی نسبت کوئی اختیار نہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نے اپنی والدہ کے لیے استغفار کی درخواست کی تھی وہ نہیں قبول ہوئی، البتہ یہ درخواست ضرور قبول ہوئی کہ میں ان کی قبر کی زیارت کرلوں۔'' [1]

قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری کہ ﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴾ (٢٦/ الشعراء:٢١٤) تو آپ نے خاندان کے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: ''اے قریشیو! اے اولادِ عبدالمطلب! اے عباس! اے صفیہ! اے فاطمہ! میرے مال میں سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے ہاں میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔'' [2]

قرآن مجید میں نہایت کثرت اور نہایت تشدد کے ساتھ اس مضمون کو ادا کیا گیا کہ تم لوگ جن کو حاجت روا سمجھتے ہو اور جن سے حاجتیں مانگتے ہو، ان کو کارخانۂ ہستی میں کسی قسم کا اختیار نہیں:

﴿ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَدْعُونَ يَبْتَغُونَ إِلَىٰ رَبِّهِمُ الْوَسِيلَةَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ وَيَرْجُونَ رَحْمَتَهُ وَيَخَافُونَ عَذَابَهُ ۚ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُورًا ۝ ﴾ (١٧/ بنی اسرآئیل: ٥٦، ٥٧)

''کہہ دو کہ خدا کے علاوہ تم جن کو پکارتے ہو وہ تمہاری مصیبت کے ہٹانے یا بدلنے کا کچھ اختیار نہیں رکھتے جن کو تم پکارتے ہو ان میں جو خدا کے مقرب ترین ہیں وہ خود خدا کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں بے شبہ تیرے خدا کا عذاب ڈرنے ہی کے قابل ہے۔''

④ خوارق خدا کے حکم سے ہوتے ہیں

شرک کا ایک بڑا ذریعہ خوارقِ عادات کی نسبت غلط فہمی ہے، جن اشخاص سے خوارق عادات سرزد ہوتے ہیں ان کی نسبت لوگوں کو پہلے یہ خیال آتا ہے کہ یہ خود خدا نہیں ہیں، لیکن ان میں خدائی کا شائبہ ضرور ہے ورنہ ایسے افعال کیونکر سرزد ہوتے جو قدرتِ انسانی سے بالاتر ہیں، یہی خیال رفتہ رفتہ دیوتاؤں اور اوتار

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنائز، باب استئذان النبی ﷺ ربه فی زیارة قبر امه:٢٢٥٨، ٢٢٥٩۔

[2] یہ روایت اس آیت کی تفسیر میں تمام تفسیروں اور حدیث کی کتابوں میں منقول ہے۔

تک ترقی کرتا ہے اور بالآخر خدائی تک پہنچا دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی بنا پر آج چالیس کروڑ آدمیوں کے خدا یا خدا کے بیٹے ہیں۔

لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور یہ امر خصائص نبوت میں ہے کہ یہ مسئلہ اسلام کے زمانہ تک مشتبہ اور مجمل رہا۔ قرآن مجید میں خرقِ عادات کے متعلق حسب ذیل امور بیان کیے گئے:

① معجزات صادر ہو سکتے ہیں اور خدا اپنے مقبول بندوں کو معجزات عطا کرتا ہے:

﴿ وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٣٧)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ان (آنحضرت ﷺ) پر کوئی معجزہ خدا کے یہاں سے کیوں نہیں اترا کہہ دو کہ خدا اس پر قادر ہے کہ معجزہ نازل کرے لیکن لوگ نہیں جانتے۔''

② باوجود اس کے کفار کو معجزہ طلبی سے روکا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ نبوت اور رسالت معجزہ پر موقوف نہیں:

﴿ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ ﴾

(١٣/ رعد: ٧)

''اور کفار کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ پر کوئی معجزہ خدا کے ہاں سے کیوں نہیں اترا، بے شک آپ ﷺ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے راہ دکھانے والے ہیں۔''

﴿ وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ۝ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ؕ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ ﴾

(١٧/ بنی اسرائیل: ٩٠۔٩٣)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ہم تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک تم زمین سے چشمہ نہ نکال دو یا تمہارے پاس کھجوروں یا انگوروں کا باغ نہ ہو کہ جس کے بیچ میں تم نہریں جاری کر دو یا آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر نہ گرا دو جیسا کہ تمہارا گمان تھا یا خدا اور فرشتوں کو ہمارے سامنے نہ لے آؤ، یا تمہارا گھر سونے کا نہ بن جائے یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور ہم تو اس چڑھنے پر بھی یقین نہ لائیں گے جب تک ہم پر کوئی کتاب نہ اتارو جس کو ہم خود پڑھیں، کہہ دو کہ سبحان اللہ! میں تو صرف بشر ہوں اور رسول ہوں۔''

③ جو معجزے اس آیت میں کفار نے طلب کیے وہ ناممکن باتیں نہ تھیں، تاہم خدا نے آنحضرت ﷺ کو جو جواب تلقین کیا وہ یہ تھا کہ میں بشر ہوں، دوسری جگہ اس کا جواب یہ دیا کہ معجزے تو خدا کے پاس ہیں یعنی معجزے صادر ہوں گے تو یہ میرا فعل نہ ہوگا بلکہ خدا کا ہوگا:

﴿ وَقَالُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَاتٌ مِّن رَّبِّهِ ۖ قُلْ إِنَّمَا الْآيَاتُ عِندَ اللَّهِ وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ ﴾ (۲۹/ العنکبوت: ۵۰، ۵۱)

''اور کفار کہتے ہیں کہ ان پر خدا کے یہاں سے معجزے کیوں نہیں اترے کہہ دو کہ معجزے تو خدا کے ہاں ہیں اور میں تو صرف صاف صاف ڈرانے والا ہوں، کیا ان کفار کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تمہارے اوپر کتاب (قرآن) اتاری جو ان پر تلاوت کی جاتی ہے، اس میں بے شبہ ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور یاد رکھنے کی چیز ہے۔''

اسی لیے معجزات کے ذکر میں ہمیشہ باذن اللہ (خدا کی اجازت) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

⑤ حرام و حلال کرنا خدا کا کام ہے

شرک کی ایک قسم یہ تھی کہ انبیا علیہم السلام یا پیشوایانِ مذہبی کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرا دیں، قرآن مجید میں جب یہ آیت اتری:

﴿ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا ﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۱)

''ان لوگوں نے اپنے علما اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے۔''

تو حضرت عدی رضی اللہ عنہ نے جو حاتم طائی کے فرزند اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے، آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ ہم لوگ اپنے پیشوایانِ مذہبی کو اپنا رب تو نہیں سمجھتے تھے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہ تھا کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حلال اور جس کو چاہیں حرام کر دیں؟'' عرض کی کہ ''ہاں'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہی رب بنانا ہے۔''[1] عموماً اہل مذاہب پیغمبروں کو شارعِ مستقل سمجھتے تھے لیکن یہ بھی ایک قسم کا شرک ہے، شریعت کی تاسیس، حلال و حرام کی تعیین، جائز و ناجائز کی تفریق، امر و نہی کے احکام یہ سب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں، پیغمبر صرف مبلغ اور پیغام رساں اور تعلیمِ الٰہی سے ان احکام کے شارح اور بیان کرنے والے ہیں، اسی بنا پر قرآن مجید میں ذاتِ نبوی ﷺ کی صفتِ رسالت کو بار بار تاکید اور اصرار کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے:

﴿ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۴۴)

---

[1] جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ التوبۃ: ۳۰۹۵ وابن کثیر تفسیر آیت مذکور، ج۲، ص: ۳۴۸۔

”محمد (ﷺ) تو صرف ایک رسول ہے اس سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔“

﴿ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﴾ (٤/ النسآء:١٧١)

”مریم کا بیٹا عیسیٰ، اللہ کا صرف رسول تھا۔“

اس حصر سے یہ مقصود تھا کہ انبیا میں خدائی کی کوئی صفت نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ ان میں ہے وہ رسالت و نبوت کے اوصاف ہیں۔

⑥ غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم

شرک کا ایک بڑا ذریعہ یہ تھا کہ جو اعمال اور آداب خدا کے ساتھ مخصوص ہیں وہ اوروں کے ساتھ بھی برتے جاتے تھے، یہ اگرچہ شرک فی العبادۃ یا شرک فی الصفات تھا لیکن رفتہ رفتہ شرک فی الذات تک منجر ہوتا ہے۔ سجدۂ عبادت خدا کے ساتھ مخصوص ہے لیکن کفار اور دیگر اہل مذاہب بتوں اور مقتدایانِ دینی کو بھی سجدہ کرتے تھے اور سلاطین و امرا کو سجدہ کرنا عام طور سے رائج تھا۔ آنحضرت ﷺ نے نہایت سختی سے اس کو روکا، بنو اسرائیل میں سجدۂ تعظیمی یا سجدۂ محبت جائز تھا چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین نے سجدہ کیا تھا لیکن چونکہ اسلام میں توحید کو انتہائے کمال تک پہنچانا تھا سجدۂ تعظیمی بھی منع کر دیا گیا۔ ایک دفعہ ایک صحابی خدمتِ اقدس میں آئے اور عرض کی کہ میں نے اہلِ عجم کو دیکھا ہے، وہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں آپ اجازت دیں تو ہم آپ کو سجدہ کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”تو کیا میری قبر پر گزرو گے تو اس کو سجدہ کرو گے؟“ عرض کی کہ نہیں، فرمایا: ”تو اب بھی نہ کرو اگر میں کسی کو دوسرے کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دے سکتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“ [1] اسی طرح ایک اور صحابی ملک شام سے آئے تو آپ کو سجدہ کیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: ”یہ تم نے کیا کیا؟“ عرض کی کہ میں نے شام میں رومیوں کو دیکھا وہ اپنے مذہبی افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کو سجدہ کروں، فرمایا: ”ایسا نہ کرو اگر میں کسی کو خدا کے سوا سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو میں بیوی کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔“ [2]

⑦ صفات الٰہی کی توحید

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیے جائیں جس کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ شرکت وصف کی بنا پر، خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں ان میں سے ایک وصف علمِ غیب ہے۔ اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیا اور اولیا کو علمِ غیب ہوتا ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کیا کرتے تھے۔ عرب میں بھی کاہن

---

[1] ابو داود، کتاب النکاح، حق الزوج علی المرأۃ:٢١٤٠۔

[2] ابن ماجہ، ابواب النکاح، حق الزوج علی المرأۃ:١٨٥٣۔

یہی پیشہ کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے پیشین گوئی کرتے تھے۔ کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر، کبھی یہ ظاہر کرتے تھے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے نہایت تاکید اور استقصا کے ساتھ اس اعتقاد کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل کیں۔ خود قرآن مجید میں نہایت کثرت سے اس کے متعلق آیتیں نازل ہوئیں:

﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ﴾ (٦/ الانعام:٥٩)

''اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

آنحضرت ﷺ نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی اور فرمایا: ''مفاتیح غیب پانچ ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ [1]

① حمل یعنی لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ ② کل کیا ہوگا۔

③ بارش کب ہوگی۔ ④ کس جگہ موت آئے گی۔

⑤ قیامت کب آئے گی۔''

اگرچہ علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں، لیکن زیادہ تر انہیں امور کی نسبت لوگ علم غیب کے مدعی تھے اور ان ہی باتوں کو لوگ پہلے سے جاننے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ خود اپنی ذات سے بھی علم غیب کی نفی کی، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر آنحضرت ﷺ تشریف فرما تھے انصار کی چند لڑکیاں گا رہی تھیں گاتے گاتے انہوں نے یہ گانا شروع کیا:

((وفينا رسول يعلم ما في غد)) [2]

''اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا: ''یہ نہ کہو وہی کہو جو پہلے گا رہی تھیں۔'' اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو خاص حکم دیا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں:

﴿ قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ ﴾ (٦/ الانعام:٥٠)

''کہہ دو کہ اے پیغمبر کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔''

اور غیب کا علم صرف خدا کی صفت ہے:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ ﴾ (٢٧/ النمل:٦٥)

[1] صحيح بخارى، كتاب التوحيد، باب قول الله: عالم الغيب فلا يظهر على غيبه احدا: ٧٣٧٩، میں یہ تفصیل مذکور ہے۔ [2] صحيح بخارى، كتاب النكاح، باب ضرب الدف في النكاح والوليمة: ٥١٤٧؛ ابوداود، كتاب الادب: ٤٩٢٢؛ ترمذى، ابواب النكاح: ١٠٩٠۔

''کہہ دو اے پیغمبر کہ خدا کے سوا آسمانوں میں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔''

غیب دانی کے مدعی کاہن جو عرب کی گلی گلی میں خدع و فریب کا جال پھیلائے بیٹھے رہتے تھے اور بت خانوں میں خدائی کرتے تھے، ان کی سطوت خاک میں مل گئی، بت خانے ویران ہو گئے تو ان کے یہ پجاری بھی فنا ہو گئے۔ صحابہ نے آ کر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ! ہم جاہلیت میں کاہنوں کے پاس جایا کرتے تھے فرمایا: ''اب نہ جایا کرو۔'' عرض کی: ہم پرندوں سے فال لیا کرتے تھے فرمایا: ''یہ تمہارا وہم تھا اس کے سبب سے اپنے ارادہ سے باز نہ رہا کرو۔'' بعض لوگوں کے سوال کے جواب میں فرمایا: ''کاہن کچھ نہیں۔'' انہوں نے کہا: یارسول اللہ! ان کی بعض باتیں سچی بھی نکل آتی ہیں، فرمایا: ''شیطان ایک آدھ بات سن لیتا ہے اور مرغی کی طرح قرقر کر کے اپنے دوست کے کانوں میں ڈالتا ہے اور وہ اس میں سو جھوٹ ملا دیتا ہے۔'' کبھی فرمایا کہ ''فرشتوں کی زبان سے شیاطین فضائے آسمانی میں چوری چھپے کچھ سن لیتے ہیں اور کاہن اس میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر بیان کرتے ہیں۔'' جاہلوں میں کچھ ایسے مکار ہوتے ہیں جو چوری کا غائبانہ پتہ بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں عرب ان کو عراف کہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی کسی مال کا پتہ پوچھنے کے لیے کسی عراف کے پاس جائے گا اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہ ہوگی۔'' علم نجوم جس کے زور سے لوگ غیب کا حال دریافت کر لینے کے مدعی بنتے تھے اس کا سیکھنا بھی جادو کی طرح گناہ قرار دیا اور فرمایا:

''جو کسی کاہن کے پاس جا کر اس کی باتوں کو سچ سمجھے وہ محمد پر جو کچھ اترا ہے اس کا انکار کرتا ہے۔'' [1]

ان تعلیمات نے خدا کے علاوہ دوسروں کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ کہانت کی گرم بازاری سرد ہو گئی، فال، شگونِ بد، نجوم اور غیب دانی کے دوسرے خدّاعانہ طریقے مٹ گئے، پرندوں اور پانسوں کے ذریعہ سے غیب کا حال دریافت کرنا وہم و وسوسہ قرار پایا اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔

⑧ مخفی قوتوں کا ابطال

کائنات میں خدا کے سوا جن غیبی اسباب و علل یعنی سحر و طلسم، جنات و شیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت و تصرف کا اعتقاد تھا اور ان سے بچنے کے لیے ان کی دہائی پکاری جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی تھی۔ آنحضرت ﷺ کی تعلیم اور وحی نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی و پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسان کے سینوں سے ہمیشہ کے لیے نکال کر پھینک دیا اور دعا و کلماتِ الٰہی کے سوا ہر نوع کے جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے، جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استعداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار پایا اسی قسم کے فاسد خیالات کے استیصال کے لیے ہر نماز میں اور نماز کی ہر

[1] مشکوۃ باب الکھانۃ میں صحیحین سے یہ حدیثیں نقل کی ہیں، علم نجوم کی حرمت والی حدیث، ابوداود، کتاب الکھانۃ، باب فی الکھان: ۳۹۰۴؛ ابن ماجہ، کتاب الطھارۃ، باب النھی عن اتیان الحائض: ٦٣٩؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۴۲۹، ۴۷٦ سے لی ہیں۔

رکعت میں سورۂ فاتحہ کے ضمن میں اس آیت کے پڑھنے کا حکم دیا گیا:

﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾ (۱/ الفاتحۃ:۵)

''(اے عالم کے پروردگار) ہم تیرے ہی آگے سر جھکاتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔''

سحر و طلسم و جادو اور ٹوٹکے کے متعلق ارشاد خداوندی ہوا:

﴿ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۟ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰۲)

''یہ جادو اور ٹوٹکے کرنے والے کسی کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن خدا کے حکم سے اور یہ یہود وہ (جادو اور ٹوٹکے) سیکھتے ہیں جو ان کو نقصان رساں ہیں نفع بخش نہیں اور یقیناً ان کو علم ہے کہ جو ان کو حاصل کرتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔''

یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ سحر و جادو کی حقیقت وہم و تخیل سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

﴿ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۶۶)

''مصری جادوگروں کے جادو سے اس کو یہ خیال ہوتا تھا کہ وہ دوڑ رہی ہیں۔''

بلکہ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لیے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا [1] تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف و ہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ ثابت ہو کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں بالکل وہ بے بس ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ ارشاد فرمایا: ''تم اپنے جھاڑ منتر ہمارے سامنے پیش کرو اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔'' [2] ایک اور صحابی نے ایک بیمار یا پاگل کو سورۂ فاتحہ پڑھ کر چند روز پھونکا وہ اچھا ہو گیا اس نے ان کو انعام دیا، انہوں نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے واقعہ عرض کیا تو فرمایا ''میری عمر کی قسم! ہر جھاڑ پھونک باطل ہے لیکن تم نے سچے جھاڑ کی روزی کھائی۔'' [3]

ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان الرقى والتمائم والتولة شرك)) [4]

''بے شک جھاڑ پھونک گنڈے اور میاں بیوی کے چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔''

---

[1] جامع ترمذی، ابواب الحدود، ماجاء فی حد الساحر:۱۴۶۰ وابوداود، کتاب الخراج، باب فی اخذ الجزیۃ من المجوس:۳۰۴۳۔ [2] ابوداود، کتاب الطب، باب فی الرقی:۳۸۸۶۔

[3] ابوداود، کتاب الطب، باب کیف الرقی:۳۸۹۶۔

[4] ابوداود، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم:۳۸۸۳؛ ابن ماجه، ابواب الطب:۳۵۳۰۔

انہیں صحابی کے گھر میں ایک بڑھیا آیا کرتی تھی گھر والوں نے اس سے کسی بیماری کا کوئی ٹوٹکا کرایا، ایک دھاگا پڑھ کر اس نے باندھ دیا تھا وہ گھر آئے تو اس دھاگے پر ان کی نظر پڑی انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کو توڑ کر پھینک دیا اور فرمایا کہ عبداللہ کا خاندان شرک کی باتوں سے مستغنی ہے۔ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ ''جھاڑ، پھونک گنڈے اور میاں بیوی کو چھڑانے کے تعویذ شرک ہیں۔'' ان کی بیوی نے کہا: کیا وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا، جب میں جھاڑتی تھی تو پانی رک جاتا تھا اور جب چھوڑ دیتی تھی تو پانی بھر آتا تھا، انہوں نے جواب دیا یہ شیطانی بات ہے تم نے کیوں نہ وہ کیا جو رسول اللہ ﷺ کرتے تھے آنکھوں میں پانی ڈالتیں اور یہ دعا پڑھتیں: ''اے لوگوں کے پروردگار! اس بیماری کو دور کر، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیری شفا بخشی کے سوا کوئی شفا نہیں ایسی شفا دے کہ پھر کوئی بیماری نہ رہے۔'' ❶

⑩ اوہام وخرافات کا ابطال

وہ تمام اوہام وخرافات جن سے شرک پرست اہل عرب لرزہ براندام رہتے تھے اور جن کو وہ بالذات مؤثر اور متصرف سمجھتے تھے آنحضرت ﷺ نے ان کا طلسم توڑ دیا اور اعلان فرمادیا کہ ان کی کوئی اصل نہیں۔ فرمایا:

((لا عدوی ولا طیرۃ ولا صفر ولا ھامۃ)) ❷

''نہ چھوت ہے، نہ بدفالی ہے، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے، نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے۔''

ایک اور صحابی کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((العیافۃ والطیرۃ والطرق من الجبت)) ❸

''پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے۔''

ایک اور صحابی آپ ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ ''فال نکالنا شرک ہے۔'' پھر ان صحابی نے کہا کہ ہم صحابہ میں کوئی نہیں جو اس کو برا نہ جانتا ہو بلکہ خدا پر بھروسہ ❹ رکھنا چاہیے یہ بھی آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''پچھتر'' (نو) کچھ نہیں ❺ یعنی ان کی بر شگونی اس کو بالذات کوئی دخل نہیں۔ اسی طرح غول بیابانی کے متعلق عربوں کے جو [illegible] تھے ان کو آپ ﷺ نے ایک لفظ سے باطل کر دیا۔ فرمایا:

((لاغول)) ❻ ''غول بیابانی کچھ نہیں۔''

---

❶ ابوداود، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم: ۳۸۸۳؛ ابن ماجه، کتاب الطب، باب فی تعلیق التمائم: ۳۵۳۰۔ ❷ ابوداود، کتاب الطب، باب فی الطیرة: ۳۹۱۱؛ ابن ماجه، کتاب الطب، باب من کان یعجبه الفال ویکره الطیرة: ۳۵۳۹۔ ❸ ابوداود، کتاب الکهانة والتطیر، باب فی الخط وزجر الطیر: ۳۹۰۷۔

❹ ابن ماجه، کتاب الطب، باب من کان یعجبه الفال ویکره الطیرة: ۳۵۳۸۔

❺ ابوداود، کتاب الکهانة والتطیر، باب فی الطیرة: ۳۹۱۲۔

❻ ابوداود، کتاب الکهانة والتطیر، باب فی الطیرة: ۳۹۱۳۔

اسی طرح بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جانوروں کے متعلق ان کے خیالات فاسدہ کا قرآن نے ابطال کیا، سورۂ انعام میں ان کے ان مشرکانہ عقائد اور اعمال کی بتصریح تردید کی گئی اور سورۂ مائدہ میں فرمایا گیا:

﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ ﴾ (٥/ المآئدۃ:١٠٣)

''خدا نے بحیرہ، اور سائبہ اور وصیلہ اور حام نہیں ٹھہرایا۔''

بحیرہ، اس بچہ کو کہتے تھے جس کا کان پھاڑ کر بتوں کی نذر کرتے تھے۔

سائبہ، اس جانور کو کہتے تھے جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے تھے۔

وصیلہ، بعض لوگ نذر مانتے تھے کہ اگر بچہ نر ہو تو اس کو بت پر چڑھائیں گے اور اگر مادہ ہوئی تو ہم رکھیں گے پھر اگر نر و مادہ ملے ہوتے تو مادہ کے ساتھ نر بھی رکھ لیتے تھے یہ وصیلہ تھا۔

حام، وہ اونٹ جس کے دس بچے بوجھ اٹھانے اور سواری کے لائق ہو چکتے تو دیوتا کے نام پر آزاد کر دیا جاتا۔

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اوہام جو عرب میں پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کا استیصال فرمایا: یہ اوہام پرستی حقیقت میں قوموں کی تباہی کا ایک بڑا سبب ہوتی ہے۔ یہ اوہام حقیقت کے خلاف ہونے کے علاوہ بہت سے کاموں میں خلل انداز ہوتے ہیں اور غور سے دیکھو تو ان کا سلسلہ بالآخر کسی نہ کسی شرک پر منجر ہوتا ہے اور انسان کو صحیح طریق عمل سے روک دیتے ہیں، مثلاً: بیماری میں طب کے قاعدہ کے موافق علاج کیا جائے تو مفید ہوگا لیکن بہت سے لوگ وہم پرستی کی بنا پر ٹونے ٹوٹکے کو دافع مرض سمجھتے ہیں اس قسم کے اوہام عرب میں نہایت کثرت سے پھیلے ہوئے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان تمام اوہام کو تصریح اور تعیین کے ساتھ باطل قرار دیا، مثلاً:

① عرب کا خیال تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا ہے تو چاند یا سورج میں گرہن لگتا ہے، آپ کے صاحب زادہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب انتقال کیا تو سورج میں گرہن لگا ہوا تھا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ انہی کے مرنے کا اثر ہے، آنحضرت ﷺ نے جب سنا تو مسجد میں جا کر خطبہ دیا کہ ''چاند اور سورج خدا کی قدرت کے مظاہر ہیں کسی کے مرنے سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔''[1]

② یہ خیال تھا کہ سانپ اگر مارا جائے تو اس کا جوڑا آتا ہے اور انسان کو ہلاک کرتا ہے۔

③ ایک دفعہ آپ مسجد میں تشریف رکھتے تھے ایک ستارہ ٹوٹا آپ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''جاہلیت میں تم لوگ اس کی نسبت کیا اعتقاد رکھتے تھے۔'' لوگوں نے عرض کی کہ ہمارا یہ اعتقاد تھا کہ جب کوئی بڑا شخص مرجاتا یا کوئی بڑا شخص پیدا ہوتا ہے تو ستارے ٹوٹتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا: ''کسی کے مرنے یا پیدا ہونے سے ستارے نہیں ٹوٹتے۔''[2]

[1] صحیح بخاری، کتاب الکسوف، باب صلوٰۃ الکسوف جماعۃ: ١٠٥٢۔

[2] مسند احمد بن حنبل، ج١، ص: ٢١٨۔

④ شیر خوار بچوں کے سرہانے استرا رکھ دیا کرتے تھے کہ جن ان کو نہ ستانے آئیں ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو اٹھا کر پھینک دیا اور کہا کہ آنحضرت ﷺ ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ [1]

⑤ نظر بد سے بچنے کے لیے اونٹوں کے گلے میں قلادہ لٹکاتے تھے آنحضرت ﷺ نے حکم دیا کہ کسی اونٹ کے گلے میں قلادہ نہ رہنے پائے۔ [2]

الغرض توحید کامل کی تعلیم نے عربوں کے تمام مشرکانہ اوہام وخرافات کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیا۔ اسلام کی اس اصلاح کی اہمیت کا اندازہ عیسائیت کی ان مقدس روایات وحکایات سے کرو، جنہوں نے صدیوں تک دنیا کو دیووں، بھوتوں، چڑیلوں کے تسلط اور عذاب کے شکنجہ میں مبتلا رکھا اور ان کو نکالنا اور بھگانا عیسائیت کا کمال اور اعجاز سمجھا جاتا رہا۔

⑩ کفارہ اور شفاعت کے غلط معنی کی تردید

شرک کے اسباب میں ایک بڑا سبب کفارہ اور شفاعت کے وہ غلط معنی تھے، جو عربوں اور عیسائیوں وغیرہ میں رائج تھے، عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنی سمجھ لیے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا، وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے، اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے بھی خوش رکھنے کی ضرورت کے معتقد تھے، چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے:

﴿هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (۱۰/ یونس:۱۸)

''یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے جب ان کی اس بت پرستی پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا:

﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ (۳۹/ الزمر:۳)

''ہم ان کو اسی لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔''

یہودیوں میں بھی اسی قسم کی دوسری غلط فہمی تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانا خدا کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لیے ان کی اولاد اور نسل بھی دنیا اور آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے، اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی تو ان کے خاندان کے

---

[1] ادب المفرد، باب الطیرۃ من الجن: ۹۱۲۔ [2] مؤطا امام مالك، كتاب صفة النبی ﷺ، باب ما جاء فی نزع المعالیق والجرس من العنق: ۷٤۲؛ بخاری: ۳۰۰۵، مسلم: ۲۱۱۵۔

بزرگ جو خدا کے مقرب اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچالیں گے ان کا دعویٰ تھا کہ

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''ہم خدا کی اولاد اور اس کے پیارے ہیں۔''

قرآن نے کہا:

﴿ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہو، یہ اسی کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے بخشے اور جس کو چاہے سزا دے۔''

اور اسی بنا پر ان کا دعویٰ تھا:

﴿ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ (۳/ آل عمران:۲٤)

''ہم کو دوزخ صرف چند گنتی کے دن چھو کر چھوڑ دے گی۔''

قرآن نے کہا:

﴿ وَّغَرَّهُمْ فِیْ دِیْنِهِمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۲٤)

''اور یہ جھوٹ اپنے دل سے بنا کر جو عقیدہ گھڑ چکے ہیں، وہ ان کے مذہب میں ان کو دھوکا دے رہا ہے۔''

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا اور ہے کہ باپ (خدا) نے تمام انسانوں کی طرف سے جو موروثی وطبعی طور سے گناہگار ہیں اپنے اکلوتے بیٹے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو قربانی دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ دے دیا اور وہ گناہوں سے پاک وصاف ہو گئے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے بعد ان کے جانشین پوپوں کو گناہوں کے معاف کرنے کا اختیار دیا گیا ہے کہ جو وہ زمین پر کھولیں گے وہ آسمان پر کھولا جائے گا، اسی لیے پوپوں کے سامنے اعترافِ گناہ کا عقیدہ عیسائیوں میں پیدا ہوا اور ان کو بندوں کے گناہوں کے معاف کرنے کا دنیا میں حق ملا۔

پیغام محمدی ﷺ نے ان کو ملزم قرار دیا اور کہا:

﴿ اِتَّخَذُوْۤا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۳۱)

''انہوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو، خدا کو چھوڑ کر اپنا خدا بنا رکھا ہے۔''

اور اصولی طور سے اس نے یہ بتا دیا کہ

﴿ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۳۵)

''خدا کے سوا کون گناہوں کو معاف کر سکتا ہے۔''

ان کا عقیدہ تھا کہ بیٹا قیامت کے دن باپ کے داہنے بازو پر، برابر بیٹھ کر خلق کا عدل وانصاف کرے گا

قرآن پاک نے ایک بڑے مؤثر طرز میں اس کی تردید کی ہے۔ قیامت کے دن خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھے گا:

﴿ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۶)

''اے عیسیٰ علیہ السلام! کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا بناؤ۔''

وہ کہیں گے بارِ الٰہا! میں نے تو ان سے وہی کہا، جو تو نے کہا: میں نے ان کو یہ تعلیم نہیں دی، میں نے ان سے یہی کہا کہ صرف ایک خدا کو پوجو، اب

﴿ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۸)

''اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو بخش دے تو، تو سب کچھ کر سکتا ہے کہ تو غالب اور حکمت والا ہے۔''

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ گناہوں کی مغفرت اور معافی یا گناہوں پر سزا اور عذاب دینا صرف خدا کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ بت پرست عربوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں، وہ یہاں دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں اور اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا اور یہ دیوتا ان کے شفیع تھے، قرآن مجید نے کفارہ، غیر خدا کے اختیار مغفرت اور بت پرستانہ طریقۂ اشاعت کے عقائدِ باطلہ کی ہر طرح تردید کی اور بتایا کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی اور کو نہیں، سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے عاجز اور درماندہ ہیں:

﴿ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۸۶)

''یہ کافر خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جس نے حق کی شہادت دی اور وہ جانتے بھی ہوں۔''

﴿ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴾ (۱۹/ مریم:۸۷)

''یہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن جس نے رحم والے خدا سے اقرار لے لیا۔''

﴿ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ﴾

(۳۶/ یٰسٓ:۲۳)

''کیا خدائے برحق کو چھوڑ کر جھوٹے معبودوں کو خدا بناؤں، اگر رحمٰن مجھے نقصان پہنچانا چاہے تو ان کی شفاعت مجھے ذرا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور نہ وہ مجھے چھڑا سکتے ہیں۔''

کفار فرشتوں کو بھی اسی غرض سے پوجتے تھے، حکم ہوا:

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۲۶)

''اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی ،لیکن اس کے بعد کہ اللہ اجازت دے جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔''

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ۭ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ۝ ﴾

(۳۹/ الزمر:۴۳)

''کیا ان کافروں نے خدا کے سوا کسی کو شفیع بنایا ہے، کہہ دے کہ اگر چہ یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی؟ (شفیع بننے کے قابل ہیں)''

خدا قیامت میں ان سے کہے گا:

﴿ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ ﴾

(۶/ الانعام:۹۴)

''اور ہم دیکھتے نہیں کہ تمہارے ساتھ ان شفیعوں کو جن کو تم سمجھتے تھے کہ وہ تمہاری ملکیت میں خدا کے ساتھ شریک ہیں۔''

﴿ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَاۗىِٕهِمْ شُفَعٰۗؤُا ﴾

(۳۰/ الروم:۱۲۔۱۳)

''اور جب قیامت قائم ہوگی ،تو مشرکین ناامید ہوں گے، جن کو وہ خدا کا شریک کار بتاتے تھے ان میں سے کوئی ان کا شفیع نہ ہوا۔''

خاص یہود کو مخاطب کر کے ان کے عقیدہ کی تردید میں کہا گیا:

﴿ يٰبَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۷، ۴۸)

''اے فرزندانِ اسرائیل......! اور ڈرو اس دن سے ،جس میں کوئی ایک دوسرے کے ذرا کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ کچھ اس کے بدلہ میں لیا جائے گا اور نہ کوئی ان کو مدد پہنچائی جائے گی۔''

پھر اسی معنی کی آیت اسی سورۃ میں دوسری جگہ ہے:

﴿ يٰبَنِىْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ۝ وَاتَّقُوْا

يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۲۔۱۲۳)

''اے فرزندانِ اسرائیل......!اورڈرواس دن سے جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئے گا اور نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی۔''

اوراسی معنی میں مسلمانوں سے بھی کہا گیا کہ وہ عمل پیش کریں، شفاعت کے بھروسے میں نہ رہیں:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵٤)

''اے مسلمانو! جو کچھ ہم نے تم کو روزی دے رکھی ہے اس میں سے کچھ خرچ کردیا کرو، اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ لین دین ہے نہ دوستی ہے، نہ شفاعت ہے۔''

غرض آپ ﷺ کے پیغام نے ان معنوں میں شفاعت کے عقیدہ باطل کی ہر جگہ تردید کی ہے اور اعلان کیا ہے کہ اس شفاعت کا اختیار صرف خدا کے ہاتھ میں ہے:

﴿ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

(۳۹/ الزمر:٤۳، ٤٤)

''کیا انہوں نے خدا کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے کہہ دے کہ اگرچہ ان کو کسی چیز کا اختیار نہیں اور نہ ان کو سمجھ ہے تو بھی کہہ دے کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔''

اس آیتِ پاک نے کفار و مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی قطعی طور سے تردید کی، دوسری آیت میں یہود و نصاریٰ کے عقیدہ شفاعت کا اتنا حصہ صرف تسلیم کیا کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے بھائیوں کے حق میں شفاعت کریں گے:

﴿ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(٤۳/ الزخرف:۸٦)

''اور یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں، وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، لیکن وہ جنہوں نے حق کی گواہی دی اور وہ دانش رکھتے ہیں۔''

دوسری جگہ اسی شہادت کو اقرار لینا کہا گیا ہے:

﴿ لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۸۷)

''یہ لوگ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے لیکن وہ جو خدا کے نزدیک (دنیا میں اپنے عمل کے ذریعے سے) اقرار لے چکا ہے۔''

لیکن اس شہادتِ حق اور عہد الٰہی کے باوجود اس اختیار کے استعمال کے لیے اللہ تعالیٰ کی اجازت اور رضامندی شرط ہے:

﴿ مَا مِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ ۭ ﴾ (۱۰/ یونس:۳)

''(خدا کی بارگاہ میں) کوئی شفیع نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔''

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۵)

''وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے لیکن اسکی اجازت سے۔''

﴿ وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْــــًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَرْضٰى ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۲۶)

''اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت ذرا بھی کام نہیں آ سکتی البتہ اس کے بعد کہ خدا اجازت دے جس کو چاہے اور پسند کرے۔''

﴿ لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۳۷)

''یہ فرشتے اور روح کوئی خدا سے اس دن بات نہ کر سکے گا لیکن جس کو وہ رحم والا اجازت دے اور ٹھیک کہے۔''

پھر یہ شفاعت بھی ان ہی لوگوں کے حق میں ہو سکے گی، جس کے حق میں اللہ تعالیٰ انبیا اور صالحین کو شفاعت کی اجازت دے گا، فرمایا:

﴿ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ ۭ ﴾ (۳۴/ سبا:۲۳)

''اور شفاعت خدا کے نزدیک نفع نہ دے گی، لیکن اس کے لیے جس کے لیے وہ شفاعت کی اجازت دے۔''

﴿ يَوْمَىِٕذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ۝ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۰۹)

''اس دن شفاعت نفع نہ دے گی لیکن اس کو جس کے لیے خدا اجازت دے اور اس کے لیے بات کرنا پسند کرے۔''

بلکہ خود انبیا علیہم السلام بھی سفارش انہیں کی کریں گے جن کی خود خدا چاہے گا، فرمایا:

﴿ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۲۸)

''اور وہ شفاعت نہیں کریں گے، لیکن اس کی جس کے لیے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور ان

کے خوف سے ترساں ہوں گے۔''

پھر ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کے افراد کے لیے ازل ہی سے یہ اعلان عام ہو چکا ہے کہ ان کے لیے مغفرت اور شفاعت کا دروازہ بند ہے اور یہ وہ مجرم ہیں جن کے دل حق کی شہادت سے محروم رہ گئے:

﴿ فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ؕ﴾ (۷۴/ المدثر:۴۸)

''تو ان کو شفاعت کرنے والوں کی شفاعت فائدہ نہ دے گی۔''

﴿ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ ؕ﴾ (۴۰/ المؤمن:۱۸)

''اور ظالموں (مشرکوں کا) ❶ نہ کوئی دوست اس دن ہوگا اور نہ کوئی شفیع جس کی بات مانی جائے۔''

اور وہ بدنصیب گروہ جس کے حق میں رحمت کا یہ دروازہ بند رہے گا مشرکین ہیں جیسا کہ ذیل کی آیت سے ظاہر ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾

(۴/ النسآء:۱۱۶)

''اللہ اس گناہ کو کہ اس کے ساتھ کوئی شریک ٹھہرایا جائے نہیں بخشتا اور اس سے نیچے کے گناہ جس کو چاہے بخش دے۔''

لیکن اب ایسی حالت میں جب کہ وہی شفاعت کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ بھی انہیں کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود خدا کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ ہی اپنے دربار میں اپنا آپ شفیع ہوگا، صوفیانہ اصطلاح میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ میں اس کی صفتِ کریمی اور رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہوگی، اس لیے ارشاد ہوا:

﴿ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (۶/ الانعام:۵۱)

''اور اس قرآن کے ذریعہ (اے پیغمبر!) ان لوگوں کو ہشیار کردے جو اس سے ڈرتے ہیں کہ وہ اپنے رب کے پاس جمع کیے جائیں گے ان کے لیے ان کے رب کے سوا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں شاید وہ بچتے رہیں۔''

﴿ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝﴾ (۳۲/ السجدہ:۴)

''خدا کے سوا تمہارا کوئی حمایتی اور شفیع نہیں پھر کیا تم سوچتے نہیں۔''

---

❶ ﴿ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴾ (۳۱/ لقمان:۱۳) ''بے شک شرک بڑا ظلم ہے۔'' صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: ۳۴۲۸، ۳۴۲۹۔

خدا کی اس صفت کریمی ورحیمی کے مظہر اس دنیا میں بھی وہی ہوں گے جو اس دنیا میں اس کے مظہر بن کر آئے تھے اور وہ انبیائے کرام ہیں کہ خدا کے رحم وکرم ہی کے سبب سے جو اس کو اس دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ ہے ان کی بعثت ہوئی اور وہ اپنی اپنی امت پر شاہد قرار پائے اسی طرح خدا کی اجازت کے بعد اس دنیا میں بھی وہی خدا کے اس رحم وکرم اور فضل عمیم کے مظہر قرار پائیں گے، نیز رحمت کے فرشتے اور امت کے نیکو کار اور صالح افراد بھی جن کو رحمت الٰہی نے چنا ہو، اس منصب پر ممتاز ہوسکیں گے، خصوصاً وہ سراپا رحمت نبی جو دنیا میں رحمۃ للعلمین اور خدا کی صفت رحیمی کا مظہر بن کر آیا۔

⑪ اجرام سماوی کی قدرت کا انکار

بظاہر اس دنیا میں بہت سی باتیں آفتاب و ماہتاب کی گردش اور ان کے سبب سے اختلاف موسم کے اثرات سے ہوتی ہیں، اس لیے ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہوگیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش کے اثر سے ہوتا ہے، یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پھیلا تھا، وہ سورج اور چاند کو سجدے کرتے تھے، اسلام نے ان کو اس شرک سے روکا اور کہا:

﴿ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ ﴾ (٤١/ فصلت:٣٧)

''سورج اور چاند کو سجدے نہ کیا کرو۔''

اسی طرح وہ زمانہ کو دنیا کے کاروبار میں حقیقی مؤثر جانتے تھے اور یہ کہتے تھے:

﴿ وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ﴾ (٤٥/ الجاثية:٢٤) ''ہم کو تو زمانہ مارتا ہے۔''

اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں ''فلک کج رفتار'' اور ''دہر ناہنجار'' کی شکایت اب تک چلی آتی ہے، عرب کے مشرکین بھی اسی طرح بولا کرتے تھے، ان کو جب کوئی خلاف توقع تکلیف پہنچتی تھی تو زمانہ کی شکایت کرتے تھے اور اس کو برا کہتے تھے ❶ آنحضرت ﷺ نے اس سے منع کیا اور فرمایا کہ ''زمانہ کو گالی نہ دیا کرو کہ زمانہ خود خدا ہے۔'' ❷ اور فرمایا ''خدا ارشاد فرماتا ہے کہ آدم کا بیٹا مجھے تکلیف پہنچاتا ہے، وہ زمانہ کو برا کہتا ہے، زمانہ میں ہوں، میرے ہاتھ میں وہ تمام کام ہیں، میں شب و روز کا انقلاب کرتا ہوں۔'' ❸ یعنی جن تکلیفوں اور مصیبتوں کا خالق سمجھ کر لوگ اس زمانہ کو برا کہتے ہیں، حقیقت میں ان کا پیدا کرنے والا خدا ہی ہے اس لیے یہ گالی حقیقت میں خدا کو دی جاتی ہے۔

اس خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو نچھتر کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ فلاں نچھتر کے سبب سے ہم پر پانی برسایا گیا۔ حدیبیہ کے موقع پر اتفاق سے رات کو بارش ہوئی اور صبح کو نماز

❶ فتح الباري شرح بخاري، ج ٨، ص: ٤٤١ وكتاب الاسماء والصفات بيهقي، ص: ١١٥۔

❷ صحيح مسلم، كتاب الالفاظ من الادب، باب النهي عن سب الدهر: ٥٨٦٦۔

❸ صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير سورة الجاثية: ٤٨٢٦ وكتاب التوحيد: ٧٤٩١۔

کے بعد حضور صحابہ کی طرف مخاطب ہوئے اور فرمایا: ''تم جانتے ہو تمہارے رب نے کیا کہا۔'' صحابہ نے عرض کی، خدا اور اس کا رسول زیادہ جانتا ہے۔ ارشاد ہوا: ''اس نے فرمایا: آج صبح کو میرے بندوں میں سے کچھ مومن ہو کر اٹھے کچھ کافر ہو کر، جنہوں نے یہ کہا کہ خدا کے فضل و رحمت سے ہم پر پانی برسا وہ تو خدا پر ایمان لانے والے اور ستارہ کے انکار کرنے والے ہیں اور جنہوں نے یہ کہا کہ فلاں نچھتر سے پانی ہم پر برسا تو وہ خدا کے انکار کرنے والے اور ستارہ پر ایمان لانے والے ہیں۔'' [1]

سورج گرہن اور چاند گرہن کو بھی لوگ عظیم الشان واقعات اور انقلابات کی علامت سمجھتے تھے۔ کم و بیش دنیا کی تمام قوموں میں وہ آسمانی دیوتاؤں کے غیظ و غضب کے مظہر یقین کیے جاتے تھے۔ ۹ھ میں اتفاق سے ایک دن سورج میں گرہن لگا اور اسی دن آپ کے صاحب زادے ابراہیم نے وفات پائی۔ صحابہ نے خیال کیا کہ یہ سورج میں گرہن لگنے کا سبب حضرت ابراہیم کی موت ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہ سنا تو تمام مسلمانوں کو مسجد میں جمع ہونے کا حکم دیا اور ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس خیال کی تردید کی، فرمایا: ''کسوف و خسوف اور گرہن کو کسی کے جینے مرنے سے کوئی تعلق نہیں یہ بھی خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔'' [2]

⑫ غیر خدا کی قسم سے روکنا

شرک کی ایک نہایت ہی باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر خدا کی قسمیں کھاتے تھے۔ قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کے باعث بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا قریش اپنے دیوتا لات اور عزیٰ کی قسمیں کھایا کرتے تھے، آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا [3] لیکن رواج اور عادت کے باعث مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کی زبان سے لات اور عزیٰ کی قسم نکل جائے تو وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ دے یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے۔'' قریش میں باپ کی قسم کھانے کا بھی رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ نے باپ کی قسم کھاتے ہوئے سنا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے تم کو اس سے منع کیا ہے کہ اپنے باپ کی قسم کھایا کرو جس کو قسم کھانی ہو یا تو خدا کی قسم کھائے ورنہ چپ رہے۔'' حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور کے ارشاد کا یہ اثر ہوا کہ اس وقت سے آج تک میں نے نہ تو خود اور نہ کسی کی بات دہرانے میں کبھی باپ کی قسم کھائی [4] ماں کی قسم بھی لوگ کھایا کرتے تھے اس سے بھی آپ نے منع فرمایا۔ اسی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء: ١٠٣٨ وکتاب الاذان: ٨٤٦؛ وصحیح مسلم، کتاب الایمان: ٢٣١۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الکسوف: ١٠٤٦۔ [3] سنن نسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف باللات والعزی: ٣٨٠٧۔ [4] یہ تمام واقعات صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب لا تحلفوا بآبائکم: ٦٦٤٧؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب من حلف باللات والعزی: ٤٢٦٠، ٤٢٥٤؛ سنن النسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف بالآباء: ٣٧٩٧، ٣٨٠٦ میں مذکور ہیں۔

طرح کعبہ کی بھی قسم لوگ کھایا کرتے تھے اس پر ایک یہودی نے آ کر مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ تم بھی شرک کرتے ہو کعبہ کی قسم کھاتے ہو۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا: ''کعبہ کی نہیں بلکہ کعبہ والے (خدا) کی قسم کھایا کرو'' [1] ایک دفعہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور کہا کہ غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے میں نے رسول خدا ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے کہ جس نے غیر خدا کی قسم کھائی اس نے کفر کیا یا شرک کیا [2] دوسری روایت میں ہے کہ ''ہر وہ قسم جو غیر خدا کی کھائی جائے شرک ہے۔'' [3]

⑬ خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں

اکثر لوگوں کی نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے انسانوں کو اس دقیق غلطی سے بھی آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے اسی کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے ماتحت ہیں خدا کے ساتھ اور کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں لیکن لوگوں نے خدا کی مشیّت کے ساتھ اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا توحیدِ کامل کے معلم ﷺ نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور قرآن مجید نے جا بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیت الٰہی کے علاوہ کوئی اور حقیقی مشیت نہیں، تمام دیگر مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں۔ عقیدہ کی یہ غلطی اس قدر عام تھی کہ جو لوگ یہ عقیدہ نہیں رکھتے تھے وہ بھی سلاطین، حکام اور بزرگوں کے ساتھ گفتگو میں یہ کہنا حسن ادب سمجھتے تھے کہ جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس طرز کلام سے منع فرمایا، یہاں تک کہ خدا کی مشیت کے ساتھ برابری سے خود اپنی مشیت کے ذکر سے بھی صحابہ کو روکا۔ اس قسم کا طرزِ کلام لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گیا تھا اس میں یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واوٗ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ نکلے بلکہ پھر کا لفظ بولا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

نسائی میں ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ نبوی میں آ کر مسلمانوں سے کہا کہ ''تم لوگ شرک کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور جو محمد ﷺ چاہیں۔'' آپ نے صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یوں کہو کہ ''وہ ایک ہے جو چاہے پھر جو آپ چاہیں۔'' [4] یہی واقعہ ابن ماجہ میں اس طرح ہے کہ ایک صحابی نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک یہودی یا عیسائی ان سے کہہ رہا ہے کہ تم مسلمان بڑے اچھے لوگ ہوتے اگر شرک نہ کیا کرتے تم کہا کرتے ہو کہ جو خدا چاہے اور محمد ﷺ چاہیں ان صحابی نے خدمت اقدس میں آ کر اپنا یہ خواب بیان کیا آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں اس فقرہ کی برائی جانتا تھا یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو محمد چاہیں۔'' [5] ابوداوٗد میں یہی تعلیم اس

[1] نسائی، کتاب الایمان والنذور، الحلف بالکعبۃ:۳۸۰۴۔ [2] جامع ترمذی، ابواب النذور والایمان:۱۵۳۵ ومستدرک حاکم، ج ۱، ص ۱۸ کتاب الایمان۔ [3] مستدرک حاکم بحوالہ مذکور۔ [4] نسائی، کتاب الایمان والنذور، باب الحلف بالکعبۃ:۳۸۰۴۔ [5] ابن ماجہ، کتاب الکفارات، باب النھی ان یقال ماشاء اللہ وشئت:۲۱۱۸۔

واقعہ کی تقریب کے بغیر اس طرح مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ "یہ نہ کہا کرو کہ جو خدا چاہے اور جو فلاں چاہے بلکہ یوں کہو کہ جو خدا چاہے پھر جو فلاں چاہے۔" ❶ لیکن امام بخاری نے ادب المفرد میں اور بیہقی نے کتاب الاسماء میں جو روایت کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے ساتھ کسی اور کی مشیت کا نام بھی نہ لینا چاہیے ایک شخص نے خدمت والا میں حاضر ہو کر سلسلۂ کلام میں کہا کہ "جو خدا چاہے اور جو آپ چاہیں" ارشاد ہوا کہ "تم نے خدا کا ہمسر اور مقابل ٹھہرایا جو خدا تنہا چاہے" ❷ ((مَا شَآءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ))

اس سلسلہ میں یہاں تک اہتمام مدنظر تھا کہ اس سے بھی منع فرمایا کہ خدا اور رسول کی طرف ایک ضمیر پھیر کر ایک فعل لایا جائے، تاکہ یہ سمجھا جائے کہ خدا اور رسول کا درجہ برابر ہے، ایک دفعہ آپ کے سامنے کسی شخص نے خطبہ کے اثنا میں یہ فقرہ کہا جس نے خدا اور رسول کی اطاعت کی اس نے ہدایت پائی اور جس نے ان دونوں کی نافرمانی کی ...... یہاں تک اس نے کہا تھا کہ آپ نے اس کو روک دیا اور فرمایا: "اٹھ جاؤ تم برے خطیب ہو۔" ❸ آپ ﷺ نے آزردگی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ "ان دونوں" کو ساتھ کہنے سے سامعین پر یہ اثر پڑتا ہے کہ خدا کی اور رسول کی نافرمانی کا حکم برابر ہے اور اس میں شرک کا شائبہ ہے، اس لیے خطیب کو یوں کہنا چاہیے تھا کہ اور جو خدا اور رسول کی نافرمانی کرے گا وہ...... جیسا کہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے اور ماثورہ خطبوں میں منقول ہے۔

⑭ مشبہاتِ شرک کی ممانعت

جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا تھا ان سے بالکل منع کر دیا۔ لوگ اولاد کا نام آفتاب ماہتاب وغیرہ کی عبدیت کے ساتھ رکھتے تھے مثلاً: عبدالشمس، عبدمناف ان ناموں سے سخت منع فرمایا اور فرمایا: "بہترین نام عبداللہ اور عبدالرحمٰن ہیں۔" ❹ اہل عجم اپنے سلاطین کو شاہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہتے تھے چونکہ اس میں شرک کا احتمال تھا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "یہ نام خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔" ❺ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "اس شخص پر اللہ کا بے حد غضب ہوا جس نے اپنے کو شہنشاہ کہا خدا کے سوا کوئی بادشاہ نہیں۔" ❻

غلاموں کو لوگ عبد یعنی بندہ کہتے تھے، حالانکہ انسان خدا کا بندہ ہے آدمیوں کا نہیں، اسی طرح غلام اپنے مالک کو رب کہتے تھے حالانکہ رب خدا ہے اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے قطعاً منع فرمایا: "کوئی شخص

---

❶ ابوداود، کتاب الادب، ۴۹۸۰۔ ❷ ادب المفرد امام بخاری، باب قول الرجل: ماشاء الله وشئت: ۷۸۳ وکتاب الاسماء والصفات امام بیهقی، ص: ۱۱۰ مطبوعه الٰه آباد۔

❸ ابوداود، کتاب الادب، باب لا یقال خبثت نفسی: ۴۹۸۱۔

❹ ابوداود، کتاب الادب، باب فی تغییر الاسماء: ۴۹۴۹۔ ❺ ابوداود، کتاب الادب، ۴۹۶۰۔

❻ مستدرك حاکم، کتاب الادب، باب النهی عن التسمیة بملك الاملاك، ج ۴، ص: ۲۷۵۔

غلاموں کو عبد یعنی بندہ نہ کہنے پائے بلکہ یوں کہے کہ میرا ''بچہ یا بچی'' اور اسی طرح غلام اور باندیاں اپنے آقا کو رب نہ کہیں مالک کہیں کہ تم سب غلام ہو اور رب، اللہ ہے۔'' [1] ہانی ایک صحابی تھے جن کی کنیت ابوالحکم تھی وہ جب خدمت اقدس میں اپنی قوم کے ساتھ آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''حکم خدا ہے اور خدا ہی حکم دینے والا ہے تم کو لوگ ابوالحکم کیوں کہتے ہیں۔'' عرض کی کہ میرے قبیلہ میں جب کوئی نزاع ہوتی ہے تو لوگ مجھ کو حکم یعنی ثالث بناتے ہیں اور میں جو فیصلہ کرتا ہوں اس کو سب تسلیم کر لیتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے بچوں کے کیا نام ہیں۔'' بولے: شریح، مسلم، عبداللہ۔ آپ نے پوچھا: ''سب میں بڑا کون ہے؟'' عرض کی: شریح۔ فرمایا: ''تو تمہاری کنیت ابوشریح ہے۔'' [2]

اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی برا کام کرتے ہیں تو شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں گویا اس نے برائی کرائی۔ ایک دفعہ ایک صاحب آنحضرت ﷺ کے ساتھ گھوڑے پر سوار تھے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی انہوں نے کہا، شیطان کا برا ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یوں نہ کہو ورنہ شیطان غرور سے پھول جائے گا اور کہے گا میری قوت سے یہ ہوا، خدا کا نام لو تو شیطان دب کر مکھی کے برابر ہو جائے گا۔'' [3]

تصویر بنانے سے سخت منع کیا اس کی وجہ تھی کہ اوّل اوّل لوگ کسی بزرگ اور مقتدا کی تصویر گھر میں رکھتے تھے تو محبت یا یادگار کے طور پر رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہی تصویروں کی پرستش ہونے لگی تھی چنانچہ ہندوؤں اور رومن کیتھولک عیسائیوں میں اسی طرح تصویر پرستی اور اس سے بڑھ کر بت پرستی کا رواج ہوا۔ اس بنا پر آنحضرت ﷺ نے سرے سے تصویر کھینچنے سے منع فرمایا۔

⑮ قبر پرستی اور یادگار پرستی سے روکنا

شرک کا بڑا ذریعہ قبر پرستی اور یادگار پرستی ہے۔ قبروں اور یادگاروں کو لوگ عبادت گاہ بنا لیتے ہیں، سالانہ مجمع کرتے ہیں، دور دور سے سفر کر کے آتے ہیں، قبروں پر مسجدیں بناتے ہیں، منتیں مانتے ہیں، نذریں چڑھاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے ان تمام افعال سے منع کیا۔ وفات سے پانچ دن پہلے آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنا لیتے تھے دیکھو میں تم کو منع کرتا ہوں کہ قبروں کو مسجد نہ بنانا۔'' [4] عین وفات کے وقت چہرہ سے چادر الٹ دی اور فرمایا: ''خدا یہود اور نصاریٰ پر لعنت کرے ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنا لیا۔'' [5]

---

[1] ابو داود، كتاب الادب، باب لايقول المملوك ربي وربتي: ٤٩٧٥۔
[2] ابو داود، كتاب الادب، باب في تغيير الاسم القبيح: ٤٩٥٥۔
[3] ابو داود، كتاب الادب، باب لايقول خبثت نفسي: ٤٩٨٢۔
[4] صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب النهي عن بناء المساجد على القبور: ١١٨٨۔
[5] صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب النهي عن بناء المساجد على القبور: ١١٨٤۔

⑯ ریا اور عدم اخلاص بھی معنوی شرک ہے

یہ توحید کے متعلق وہ اصلاحات تھیں جن کا تعلق زیادہ تر اعمال اور روزمرہ کی بول چال سے تھا لیکن حقیقی اصلاح جس سے توحید کی تکمیل ہوتی ہے، وہ قلب وروح کی توحید ہے، انسان کے تمام کاموں کا کوئی نہ کوئی نفسیاتی محرک ہوتا ہے۔ کوئی طلبِ شہرت کے لیے کام کرتا ہے، کوئی دنیاوی معاوضہ کے لیے کرتا ہے، کوئی نمائش اور دکھاوے کے لیے کرتا ہے، کوئی غیر کی محبت یا عداوت میں کرتا ہے۔ ان تمام کاموں کا محرک درحقیقت غیر خدا ہے جس نے خدا کی جگہ لے لی ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے کہا:

﴿ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۴۳)

''تم نے اس کو دیکھا جس نے اپنا خدا خود اپنی نفسانی خواہش کو بنالیا۔''

اسی لیے بڑا بت وہی ہے جس کو انسان نے خود اپنے دل کے بت خانے میں چھپا رکھا ہے اس بت کو توڑنا توحید کی اصلی تکمیل ہے۔ آپ ﷺ نے بتایا کہ انسان کے تمام کاموں کا دارومدار خود اس کے دل کے عمل پر ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ)) ❶

اسی لیے ایک مسلمان کے ہر قسم کے کاموں کا اصلی محرک صرف خدا کا حکم، خدا کا خوف، خدا کی اطاعت، خدا کی خوشنودی، خدا کی محبت، غرض صرف خدا ہونا چاہیے، جس درجہ تک ایک مومن کی اس قلبی کیفیت میں ترقی ہوگی اس کے ایمان وتوحید کی تکمیل بھی پایہ کمال کو پہنچتی جائے گی، اسی بنا پر وحی محمدی ﷺ نے ہر جگہ اور ہر موقع پر انسان کو اس کے عمل کی غرض وغایت مرضاۃ اللہ اللہ کی خوشنودی ﴿مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ مخلص اور ﴿وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى﴾ ذاتِ خدا قرار دینے کی تعلیم دی ہے، اس بنا پر انسان جو کام خدا کے علاوہ کسی اور غرض ونیت سے کرے درحقیقت اس کام کے لیے اس نے ایک موقت خدا الگ بنالیا اور وہ گو اس وقت لفظی اور قانونی نہیں، لیکن معنوی ونفسی شرک کے ارتکاب کا یقیناً مجرم ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے خدا کے لیے دیا اور خدا ہی کے لیے رد کیا، خدا کے لیے چاہا اور خدا ہی کے لیے عداوت کی اور خدا ہی کے لیے بیاہ کیا اس نے اپنے ایمان کو کامل کرلیا۔'' ❷

متعدد صحابیوں ❸ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''ریا چھپا ہوا شرک ہے۔'' حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''چھپا ہوا شرک یہ ہے کہ انسان کوئی کام دوسرے

---

❶ صحيح بخاری، کتاب بدء الوحی:۱۔

❷ ترمذی، ابواب صفة القيامة: ۲۵۲۱، ترمذی کے دو نسخوں میں اس حدیث کے متعلق دو تنقیدیں درج ہیں، ایک میں منکر لکھا ہے اور دوسرے میں حسن اور اس کے ایک راوی اجلح کی نسبت لوگوں نے کلام کیا ہے مگر حدیث کا نفس مضمون تمام اسلامی روایات اور احکام کے عین مطابق ہے۔ ❸ حضرت ابوسعید خدری، معاذ بن جبل، ابو ہریرہ، شداد بن اوس، محمود بن لبید، ابوسعید بن ابی فضالہ رضی اللہ عنہم ان صحابیوں کی روایتیں، مسند احمد، ابن ماجہ مستدرک وغیرہ میں ہیں۔

کی موجودگی کے سبب سے کرے۔'' ❶ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا۔'' ❷ یہی صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں آپ ﷺ فرما رہے تھے ''مجھے اپنی امت کے لوگوں پر سب سے زیادہ جس کا خوف ہے وہ شرک کا ہے ہاں میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ چاند یا سورج کو سجدہ کریں گے یا بتوں کو پوجیں گے بلکہ یہ ہے کہ وہ غیر خدا کے لیے عمل نہ کرنے لگیں اور چھپی نفسانی خواہش میں نہ مبتلا ہوں۔'' ❸ حضرت محمود بن لبید انصاری رضی اللہ عنہ آپ کا قول نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرکِ اصغر ہے۔'' صحابہ نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: ''ریا'' قیامت کے دن جب لوگوں کے اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا خدا ریا کار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لیے ہمارے ہاں کچھ نہیں تم انہیں کے پاس جاؤ جن کے دکھانے کو دنیا میں یہ کام کیا کرتے تھے۔'' ❹ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ''ایک موقعہ پر ہم لوگ دجال کے متعلق آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں آنحضرت ﷺ تشریف لے آئے اور فرمایا: ''کیا دجال سے بڑھ کر جو خوفناک چیز میرے نزدیک ہے میں تم کو اس سے آگاہ نہ کروں؟'' ہم سب نے عرض کی، ہاں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''وہ شرکِ خفی ہے یعنی یہ کہ مثلاً: کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے تو وہ نماز کو محض اس لیے درست کر کے پڑھے کہ کوئی دوسرا شخص اس کو دیکھ رہا ہے۔'' ❺ ابوسعید بن ابی فضالہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''قیامت میں جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو یکجا کرے گا، تو ایک منادی آ کر پکارے گا کہ جس کسی نے اپنے عمل میں خدا کے ساتھ کسی غیر کو بھی شریک بنا لیا ہو تو وہ اپنا ثواب اس غیر سے مانگے، کہ خدا سا جھے سے بے نیاز ہے۔'' ❻ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشاد کیا ''خدا فرماتا ہے کہ میں تمام شریکوں میں سب سے زیادہ شرکت سے بے نیاز ہوں تو جس نے اپنے کسی کام میں میرے ساتھ کسی اور کو شریک کر لیا تو میں اس سے الگ ہوں اور وہ اسی کا ہے جس کو اس نے میرا شریک بنایا۔'' ❼

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ صحابہ اپنے ہر عمل میں اس شرک خفی سے ڈرتے تھے۔ شداد بن اوس کہتے ہیں کہ ہم لوگ آنحضرت ﷺ کے زمانہ حیات میں ریا کو شرکِ اصغر گنا کرتے تھے۔ ❽ ایک دفعہ حضرت عمر

❶ مستدرك حاكم، كتاب الرقاق، ج ٤، ص: ٣٢٩ (صحيح) ❷ مستدرك، ج ٤، ص: ٣٣٠؛ مسند احمد مسند شداد بن اوس، ج ٤، ص: ١٢٦۔ ❸ سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٥۔
❹ مسند احمد حديث محمود بن لبيد انصاری، ج ٥، ص: ٤٢٧۔ ❺ سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٤۔ ❻ سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٣ ومسند احمد، ج ٤، ص: ٢١٥۔ ❼ ابن ماجه، ابواب الزهد، باب الرياء والسمعة: ٤٢٠٢۔
❽ مستدرك حاكم، كتاب الرقاق، ج ٤، ص: ٣٢٩ (صحيح)

فاروق رضی اللہ عنہ جا رہے تھے دیکھا کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صحابی آنحضرت ﷺ کی قبر مبارک کے پاس بیٹھے رو رہے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس قبر میں مدفون ہستی نے کہا تھا کہ ''ریا کا ادنیٰ شائبہ بھی شرک ہے۔'' [1] اسی طرح ایک دفعہ عبادہ تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ صحابی اپنی جائے نماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں رونے کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے بیان کیا کہ ایک دن میں نے رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر غم و ملال کے آثار دیکھے، عرض کی، میرے ماں باپ حضور پر فدا ہوں! اس حزن و ملال کا سبب کیا ہے؟ ارشاد ہوا: ''میں اپنے بعد اپنی امت پر ایک چیز سے ڈرتا ہوں۔'' عرض کیا، یا رسول اللہ! وہ کیا ہے؟ فرمایا: ''شرک اور چھپی نفسانی خواہش۔'' میں نے دوبارہ گزارش کی، یا رسول اللہ! کیا آپ کی اُمت آپ کے بعد شرک میں مبتلا ہوگی؟ فرمایا: ''اے شداد! میری امت یقیناً سورج یا چاند یا بت اور پتھر کی پرستش نہیں کرے گی لیکن وہ اپنے عمل کی نمائش اور ریا کرے گی۔'' عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا ریا شرک ہے؟ فرمایا: ''ہاں۔'' [2]

ان واقعات اور تعلیمات کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کس طرح ہر پہلو سے شرک کی تردید اور توحید کی تکمیل فرمائی ہے وہی عرب جو پہلے خدا کے سوا ہر چیز کی پرستش کرتے تھے انہوں نے آپ کی تعلیم کے اثر سے خدا پرستی اور توحید کی انتہائی معراج حاصل کر لی۔

---

[1] مستدرك حاكم، ج ٤، ص: ٣٢٨ (صحيح) [2] مسند حاکم، ج ۳، ص: ۳۳۰، حاکم نے اس حدیث کو صحیح الاسناد لکھا ہے، مگر ذہبی نے تصریح کی ہے کہ ''اس کا ایک راوی عبدالواحد بن زید متروک ہے'' تاہم چونکہ حدیث کا نفس مضمون مسند احمد، (ج ٤، ص: ١٢٦) اور سنن ابن ماجه، (باب الرياء: ٤٢٠٥) میں ایسے سلسلوں سے مذکور ہے، جن میں یہ عبدالواحد نہیں پڑتا، اس لیے ہم نے اس حدیث کو یہاں درج کیا ہے۔

توحید

اور

اس کے ایجابی اصول وارکان

یہ تو توحید کے سلبی اجزا تھے، یعنی توحید کے مخالف عقائد اور خیالات کی نفی اور تردید، لیکن نبوتِ محمدی کا کارنامہ اس سے بالاتر ہے اور وہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری، اس کے اصول کی تعیین، امور ایمان کی تفصیل اور اس کے اجزا کی تکمیل ہے۔ عرب میں شرک و بت پرستی بھی تھی اور کہیں کہیں آسمانی مذاہب کی محرف صورتیں بھی موجود تھیں مگر ایک صحیح مذہب کا تخیل ان کے سامنے مطلق نہ تھا، اس بنا پر عقائد اور ایمان کی کوئی صحیح اور مرتب صورت بھی ان کے ذہن میں نہیں ہو سکتی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے ان کے تمام پچھلے خرافات اور اوہام کو، جن کو دین کا درجہ دیا گیا تھا، یک قلم محو کر دیا بت پرستی، فرشتہ پرستی، ستارہ پرستی، فطرت پرستی، انسان پرستی غرض شرک کی تمام صورتیں قطعاً مٹا دیں اور ان کی جگہ مرتب متیقن، سنجیدہ عقائد اور سچائیوں سے معمور چند حقائق کی تعلیم دی جو انسان کے تمام اعمال اور اخلاق کے لیے بنیادی پتھر ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلیل

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز خدا کی ہستی کا یقین اور پھر اس کی توحید پر ایمان ہے، دنیا میں جتنے پیغمبر آئے ان میں سے ہر ایک نے اس قادر مطلق کی طرف لوگوں کو دعوت دی مگر یہ دعوت ان کے ایک مسلّم دعویٰ کی حیثیت سے تھی، انہوں نے اس دعویٰ کو دلائل کا محتاج نہ سمجھا اور حقیقت میں جن محدود زمانوں میں قوموں کے لیے ان کی بعثت ہوئی ان کے لیے دلیل اور برہان کی ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ ان کے زمانوں میں بت پرستی، ستارہ پرستی اور فطرت پرستی کا رواج تھا، الحاد کا وجود نہ تھا لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت عمومی تھی جو آخری زمانہ تک کے لیے اور تمام قوموں کے لیے تھی اور علم الٰہی میں یہ تھا کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد عقل انسانی تحقیق و تلاش کے آخری مراحل طے کرنا چاہے گی اور قدرت کے سربمہر خزانے وقفِ عام ہوں گے اور عقلیت کا دور دورہ ہوگا اور ہر شے دلیل و ثبوت کی محتاج قرار پائے گی، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کو دلائل و براہین ثبوت اور شواہد کی بھی تلقین کی گئی۔

ایک اور سبب یہ ہے کہ انبیائے سابقین صرف اپنی قوموں کی دعوت پر مامور ہوئے تھے جن میں مشرکین کا وجود تھا، ملحدین کا نہ تھا، لیکن خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت تمام قوموں اور طبقوں کے لیے ہوئی اس لیے آپ کی دعوت میں یہ صاف نظر آتا ہے کہ آپ انسانی عقل کی ہر صنف کو مخاطب کر رہے ہیں اور ان کے معیار اور سطح کے مطابق اس قادر مطلق کی ہستی اور وجود پر دلیلیں بھی پیش کر رہے ہیں اس لیے آپ نے دوسرے پیغمبروں کی طرح صرف مشرکوں کو مخاطب نہیں فرمایا بلکہ مشرکوں، کافروں، ملحدوں، مشککوں، دہریوں،

ہر ایک کو مخاطب فرمایا اور ان میں سے ہر ایک کی تسکین وتشفی کا سامان بہم پہنچایا۔ ایک قادر مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات کی ہستی کے ثبوت اور انکار پر جب سے فلسفہ کا وجود ہے، ہمیشہ بحثیں پیدا ہوتی رہی ہیں اور دلیلیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ مصر، یونان، ہندوستان اسلامی ممالک اور آج یورپ میں بھی اس مسئلہ پر عقلائے زمانہ نے اپنی جودتِ ذہن، نکتہ رسی اور دقیقہ فہمی کا بہترین ثبوت پیش کیا ہے مگر غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ دلائل کی زبان اور طرزِ تعبیر میں گو تبدیلی ہوتی رہی ہے، مگر اصل مغزِ سخن صرف ایک ہے اس بنا پر وحی محمدی ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ہستی اور وجود پر جو دلیل قائم کی اس میں اسی ایک مغزِ سخن کو لے لیا ہے اور نہایت مؤثر طرزِ ادا میں اس کو بار بار دہرایا ہے اور انسانوں کو متنبہ کیا ہے۔

وحی محمدی ﷺ کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق، خالق عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے، آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جن میں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہے مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی ان میں نظر نہیں آتی ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اسی لیے وحی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

﴿فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۰)

''اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر دین کی طرف کر، یہ خدا کی وہ فطرت ہے، جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا، خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں، یہی سیدھا اور ٹھیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ)) [1] ''ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔''

اسی لیے خدا کا اعتراف روزِ ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق میں ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے اس واقعہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے:

[1] صحيح بخاري، كتاب الجنائز، باب ما قيل في اولاد المشركين: ۱۳۸۵۔

﴿ وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۷۲)

''اور جبکہ تیرے خدا نے بنی آدم کی پیٹھ سے ان کی نسل کو لیا اور خود ان کو ان ہی پر گواہ کیا کہ کیا میں تمہارا خدا نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا، ہاں ہم گواہ ہیں۔''

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے اور اسی خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے۔ وہ انسانوں سے پوچھتا ہے:

﴿ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ (۱٤/ ابراهيم:۱۰)

''کیا آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے خدا میں شک ہے؟''

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

﴿ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۭ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۭ ﴾

(۵۲/ الطور:۳۵، ۳٦)

''کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے آپ خالق ہیں یا انہی نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں۔''

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہر حال موجود ہے اور اس کے اس وجود میں کوئی شک نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ بن گئی یا خود اس نے اپنے آپ کو بنالیا ہے ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو سلسلۂ توالد و تناسل کا آغاز کیونکر ہوا اور اولین نر و مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گونا گوں عالم، یہ رنگا رنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ لاکھوں جاندار اور بے جان اشیاء، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظام اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار خواص و قویٰ کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، یہ نیلگوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے:

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۹۰)

’’آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں۔‘‘

یہ شب و روز کا نور و ظلمت اور سورج اور چاند کی روشنی اس کی مقررہ رفتار با قاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلقِ ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ﴾ (٤١/ فصلت: ٣٧)

’’اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور سورج اور چاند ہیں۔‘‘

آسمان اور زمین کی پیدائش، دن اور رات کا الٹ پھیر تو ہے، دیکھو کہ خطرناک سمندروں میں کس طرح لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک کو تجارت کا سامان لے کر دوڑے پھرتے ہیں، اگر پانی میں مٹی اور لوہے کا ایک ذرہ بھی ڈالو تو فوراً ڈوب جائے گا مگر لاکھوں من کے لدے ہوئے جہاز کیسے پھول کی طرح پانی پر تیر رہے ہیں جس فطری قاعدہ کے بموجب یہ عمل ظہور میں آ رہا ہے، وہ جس کے حکم سے بنا ہے، اس کا کتنا احسان ہے پھر ان سمندروں سے بخارات اٹھتے ہیں وہ اوپر جا کر بادل بنتے ہیں اور وہ وہیں جا کر برستے ہیں جہاں پیداوار اور زمین کی نشو و نما کی حاجت ہو اور پھر وہ بادل ہواؤں کے تخت پر بیٹھ کر کیسے ادھر ادھر ضرورت کے مطابق اڑتے پھرتے ہیں:

﴿ اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴾ (٢/ البقرة: ١٦٤)

’’بے شبہ آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے الٹ پھیر میں اور ان جہازوں میں جو انسانوں کے لیے فائدہ رساں سامان لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور آسمان سے اس کے پانی برسانے میں اور پھر اس پانی کے ذریعہ مردے پیچھے زمین کو زندگی بخشنے میں اور زمین میں ہر طرح کے چلنے والوں پھیلانے میں اور ہواؤں کے کبھی اِدھر اُدھر بدلنے میں اور آسمان اور زمین کے بیچ میں جو بادل کام میں لگے ہیں، ان سب میں سمجھ بوجھ والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔‘‘

آسمان اور زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے:

﴿ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ ﴾ (٤٥/ الجاثية: ٣، ٤)

’’بیشک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری پیدائش میں اور جو چلنے والے پھیلائے ان میں یقین کرنے والے کے لیے دلیلیں ہیں۔‘‘

- سورۂ انعام میں نباتات اور اس کی نیرنگیوں کو اپنی ہستی کی دلیل میں پیش کیا، یہ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے، جس میں سے وہ اُگتے ہیں، ایک پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول میوے اور درخت لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ۭ اُنْظُرُوْٓا اِلٰى ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٩٩)

’’اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس سے اُگنے والی ہر چیز نکالی، پھر اس سے سبز خوشے نکالے، جن سے ہم جڑے ہوئے دانے نکالتے ہیں اور کھجور کے گابھے میں سے لٹکتے گچھے اور انگور کے باغ اور زیتون اور انار ہم شکل اور جدی جدی شکل کے، جب وہ پھلیں تو ان کے پھل اور پکنے کو دیکھو، ان میں ایمان والے لوگوں کے لیے دلیلیں ہیں۔‘‘

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو، اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے۔ پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں ایک ایک کر کے پیش کیا ہے۔ اول تو خود انسان کی پیدائش پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھ کہ ایک ایک سے الگ ہے پھر خود انسانوں کے اندر کے اعمال دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے:

﴿ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاۗؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ

يَعْقِلُونَ ۝ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ﴾

(۳۰/ الروم:۲۱۔۲۵)

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تم کو مٹی سے بنایا، پھر تم آدمی بن کر چلتے پھرتے ہو اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہارے جوڑے بنائے کہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تم سب کے درمیان پیار اور مہر رکھا، اس میں ان لوگوں کے لیے جو سوچتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں کی اور زمین کی بناوٹ اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کی بوقلمونی ہے، اس میں جاننے والوں کے لیے یقیناً دلیلیں ہیں اور اس کی عجیب قدرتوں میں سے تمہاری رات اور دن میں نیند ہے اور تمہاری اس کی مہربانیوں کی تلاش ہے، اس میں ان کے لیے جو سنتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کے عجائبِ قدرت میں سے یہ ہے کہ تمہیں وہ بجلی کی چمک دکھاتا ہے جس سے تم کبھی ڈرتے ہو اور کبھی رحمت کی بارش کی امید باندھتے ہو اور وہ آسمان سے پانی برساتا ہے، پھر اس سے زمین کو اس کے مرے پیچھے زندہ کرتا ہے، اس میں ان کے لیے جو سمجھ رکھتے ہیں، دلیلیں ہیں اور اس کی دلیلوں میں سے یہ ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔''

اس اخیر آیت میں آسمان وزمین کے اس کے حکم سے قائم رہنے کا ذکر ہے۔تم کہتے ہو کہ یہ باہمی جذب وکشش سے قائم ہیں۔لیکن خود یہ جذب وکشش کس کی کشش کا نتیجہ ہے؟ یہ خود حیرت انگیز ہے، سورۂ لقمان میں آسمانوں کے کسی نظر نہ آنے والے کے سہارے کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھہرے ہونے کا ذکر ہے۔یہ نظر نہ آنے والا سہارا قوتِ کشش ہی سہی وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔اس کے بعد ایک جان دار اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع واقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے:

﴿ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۭ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ۝ ﴾

(۳۱/ لقمان:۱۰)

''اس نے آسمانوں کی چھت کو کسی ایسے ستونوں کے بغیر کھڑا کیا ہے، جو تم کو نظر آتے ہوں اور زمین میں ایسے کھونٹے ڈال دیے کہ وہ تم کو لے کر ہل نہ جائے اور اس نے اس زمین پر ہر قسم کے چلنے پھرنے والے پھیلائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اسی زمین سے ہر اچھے جوڑے پیدا کیے۔''

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرہ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالدوتناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے مردہ قالب میں دفعتہً کہیں سے زندگی آ جانا اور اس میں روح پھک جانا اور اس میں علم وحواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا، ان سب کو اپنی صفت میں پیش کیا ہے:

﴿ الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۷۔۹)

''وہ جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی اور انسان کی پیدائش مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل ذلیل سے نچڑے پانی سے بنائی، پھر اس کو سڈول کیا اور اُس میں اپنی جان سے کچھ پھونک دیا، اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنادیے تم ان احسانوں کا بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔''

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں اور خود انسانوں کے جسم وجان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے لیکن کوئی صاحب نظر ادھر نہیں دیکھتا، انسان کی زندگی اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات ان میں سے ہر شے معمہ ہے:

﴿ وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۝ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ ﴾

(۵۱/ الذاریات:۲۰۔۲۱)

''اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہاری جانوں کے اندر کیا تم نظر نہیں کرتے۔''

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب وغریب نظام ہے وہ بھی غور کے قابل ہے ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے۔ پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص، سپید، شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے!

﴿ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ ﴾ (۱٦/ النحل:٦٦)

''اور تمہارے لیے جانوروں میں عبرت ہے، ہم تمہیں ان کے پیٹوں کے اندر سے لید اور خون کے بیچ سے خالص اور پینے والوں کے لیے خوشگوار دودھ پلاتے ہیں۔''

ایک ہی قسم کے پھل ہیں اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں اور دوسرے طرح کھاؤ تو وہ ان کو ضائع کردیں۔

﴿ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (۱۶/ النحل:۶۷)

''اور چھوہاروں اور انگوروں کے پھلوں کو دیکھو کہ ان میں سے تم نشہ اور اچھی روزی حاصل کرتے ہو، اس میں سمجھ والوں کے لیے دلیل ہے۔''

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر اوپر آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوشنما قندیل کتنی عجیب ہے۔ پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برجوں کو طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسم اور زمانے کو نمایاں کرتا ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَاۗءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۶۱)

''بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور ان میں ایک چراغ اور چمکانے والا چاند بنایا۔''

انہیں چند چیزوں میں اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں، بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:

﴿ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ۭ ﴾ (۲۷/ النمل:۸۸)

''اس ہستی کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو مضبوط نظام پر بنایا۔''

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے، اس میں مستحکم نظم ونسق کی بندش نظر آتی ہے:

﴿ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ ﴾ (۶۷/ الملک:۳۔۴)

''تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا، کوئی فتور دکھائی پڑتا ہے، پھر دہرا کر، دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہو کر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی، (مگر کوئی نقص نہ پائے گی)۔''

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا استقصا بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں:

① قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

② عالم کا نظم ونسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

③ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل واسباب، خود بخود بخت واتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم ودانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان

کو بنایا ہے۔

اہلِ فلسفہ اور متکلمین عالم کے وجود پر عموماً یہ دلیل پیش کیا کرتے ہیں کہ ہم بداہۃً دیکھتے ہیں کہ عالم میں ہر چیز کے لیے علل واسباب ہے، یہ سلسلہ یا تو کہیں جا کر ختم ہوگا یا یوں ہی مسلسل چلا جائے گا۔ اگر یہ یوں ہی مسلسل چلا جائے گا تو لازم آتا ہے کہ ہر چیز کے پیدا ہونے پر غیر متناہی علل گزر جائیں اور غیر متناہی علل کا خاتمہ نہیں ہوسکتا اور نہ کہیں اس کا آغاز ہوسکتا ہے۔ اس لیے کوئی چیز پیدا بھی نہیں ہوسکتی۔ تسلسل عقلاً بھی محال ہے بلکہ انسان اس کے تخیل سے بھی عاجز ہے اس بنا پر لامحالہ سلسلہ علل کا کہیں خاتمہ ہونا ضروری ہے۔ جس علتِ کل پر تمام علتیں ختم ہوجاتی ہیں وہی خلق وپیدائش اور وجود وکون کی اصلی علت العلل ہے۔

یہ دلیل گو بہت کچھ پیچیدہ اور اصلاحات سے لبریز اور بہت سے محذوف مقدمات پر مبنی ہے، تاہم وہ انسانی عقل میں آتی ہے اور بہتوں کے لیے تسکین کا باعث ہے۔ قرآن پاک کی ایک دو آیتوں میں بھی اس دلیل کا ماخذ مذکورہ ہے۔ سورۂ ہود کے آخر میں ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾

(۱۱ ھود:۱۲۳)

''اور خدا ہی کے پاس ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی بات اور اسی کی طرف ہر بات لوٹائی جاتی ہے تو اس کو پوجو اور اس پر بھروسہ رکھو۔''

﴿ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴾ (۵۳/ النجم:۴۲)

''اور یہ کہ تیرے رب کی طرف ہے سب کی انتہا۔''

آنحضرت ﷺ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ چند صحابیوں نے آ کر عرض کیا، یارسول اللہ ﷺ! کبھی کبھی ہمارے دلوں میں ایسے خیالات اور وسوسے آتے ہیں جن کو ہم زبان سے ادا نہیں کر سکتے۔ فرمایا: ''کیا تم کو یہ کیفیت حاصل ہوگئی؟'' گزارش کی، ہاں یارسول اللہ ﷺ! فرمایا: ''یہ تو خالص ایمان ہے۔'' [1] مقصود یہ ہے دل میں وسوسوں کا آنا اور پھر ان وسوسوں کا اتنا بدتر جاننا کہ ان کا زبان پر لانا بھی وہ گناہ سمجھے یہ کیفیت ایمانی کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگ علم ودانش کا سوال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ خیر اس کو تو خدا نے پیدا کیا اور پھر اس خدا کو کس نے پیدا کیا؟ آسمان کو خدا نے بنایا زمین کو خدا نے بنایا یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے پھر پوچھتے ہیں اچھا تو پھر خدا کو کس نے پیدا کیا؟'' فرمایا: ''یہ شیطانی وسوسہ ہے جب یہ حالت کسی کو پیش آئے تو کہہ دے ((اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ)) میں اللہ پر ایمان لایا۔'' [2]

یہ تعلیم درحقیقت اسی مسئلہ کی ہے کہ خدا پر تمام علتوں کی انتہا ہے اور اس کے بعد کوئی علت نہیں اس لیے

---

[1] یہ دونوں حدیثیں صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسة فی الایمان: ۳۴۰ میں متعدد روایتوں سے مذکور ہیں۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب ایضا: ۳۴۳۔

یہ وسوسہ لائق جواب نہیں یہ جہالت اور نادانی کا سوال ہے۔

توحید پر عقلی دلیلیں

اگر کوئی عالم کا خالق وصانع ہے تو وہ یقیناً ایک ہے دو نہیں، تاہم دنیا میں ایسے عقلمند بھی ہیں، جو دو تین بلکہ متعدد خداؤں کے قائل ہیں اور عالم کی ایک مملکت کو سینکڑوں حصوں میں تقسیم کر کے ان کو مختلف خداؤں کی حکومتیں قرار دیتے ہیں۔ وحی محمدی ﷺ نے اس شرک کے ابطال پر سب سے زیادہ جس دلیل کو پیش کیا ہے وہ نظام عالم کی یکسانی اور وحدت اور کائنات کے علل واسباب کا باہم توافق، تعاون، اشتراک اور اتحاد ہے۔ دنیا میں ایک ذرہ بھی اس وقت تک پیدا ہو نہیں سکتا جب تک آسمان سے لے کر زمین تک کی تمام کارکن قوتیں اور اسباب ایک دوسرے سے موافق ومناسب نہ ہوں اور باہم ان میں اشتراکِ عمل پیدا نہ ہو، ایک دانہ زمین سے اس وقت تک اگ نہیں سکتا جب تک دانہ اگنے کے لائق نہ ہو۔ زمین میں اگانے کی صلاحیت نہ ہو، موسم اس کے مناسب نہ ہو، بارش موافق نہ ہو، آفتاب سے اس کو گرمی اور روشنی اس کے مزاج کے مطابق بہم نہ پہنچے پھر اس کے اگنے کے موانع اور عوائق ایک ایک کر کے دفع نہ ہوں، ان سب کے بعد وہ دانہ اگے گا اور پھل لائے گا، قرآن پاک نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ ءَالِهَةٌ إِلَّا ٱللَّهُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحَـٰنَ ٱللَّهِ رَبِّ ٱلْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴾

(۲۱/ الانبیآء:۲۲)

''اگر زمین وآسمان میں اس ایک خدائے برحق کے سوا چند اور خدا بھی ہوتے، تو زمین وآسمان برباد ہو جاتے، تو پاک ہے عرش والا خدا ان باتوں سے جو یہ مشرک کہتے ہیں۔''

آسمان وزمین کا یہ تمام کاروبار، یہ تمام قوانین قدرت اگر ایک کے بجائے دو طاقتوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو یہ باہمی تصادم میں ایک لمحہ کے لیے بھی قائم نہ رہتے۔ فلسفیانہ اصطلاحات میں اس مطلب کو ادا کرو تو یوں ہوگا کہ عالِم کائنات معلول ہے۔ اس کی کوئی علتِ تامہ ہوگی۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک معلول کی دو علت تامہ نہیں ہوسکتیں۔ کیونکہ علتِ تامہ اس کو کہتے ہیں جس کے وجود کے بعد معلول کے وجود میں کسی اور چیز کا انتظار نہ ہو اب عالم کے علت تامہ اگر ایک نہ ہو بلکہ دو ہوں تو سوال یہ ہے کہ ایک علت تامہ کے وجود کے بعد عالم کے وجود میں دوسری علت تامہ کا انتظار رہے گا یا نہیں، اگر رہے گا تو پہلی شے علتِ تامہ نہیں رہے گی اور اگر انتظار نہ رہے گا، تو دوسرے شے علتِ تامہ نہ ہوگی۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کی علت تامہ ایک ہی ہوسکتی ہے۔

توحید کے ثبوت اور شرک کے ابطال کی دوسری دلیل نظام عالم کی وحدت ہے، سورج چاند اور تاروں سے لے کر انسان حیوان، ہوا، پانی، درخت گھاس پات تک دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقررہ نظام اور بندھے اصول کے ماتحت ہیں جن میں کبھی سرِمو فرق نہیں ہوتا۔ ہر شے اپنے ایک اصول کی پابند اور ایک

عادتِ جاریہ کے مطابق چل رہی ہے، گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت قائم ہے اور وہ سب کسی ایک ہستی کے اشارے پر چل رہے ہیں:

﴿ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ اِلٰهٍ اِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ اِلٰهٍۭ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۹۱)

''اور نہ اس خدائے برحق کے ساتھ کوئی اور خدا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کو الگ لے جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھ جاتا۔''

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِـهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِي الْعَرْشِ سَبِيْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا كَبِيْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۭ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (۱۷/ بنی اسراء یل:۴۲۔۴۴)

''کہہ اگر خدائے برحق کے ساتھ اور خدا ہوتے جیسا کہ یہ مشرکین کہتے ہیں، تو ایسی حالت میں وہ تخت والے (حکمران) خدا سے حکومت چھیننے کا راستہ ڈھونڈ ھتے، پاک اور بلند ہے (خدا) اس بات سے، جس کو یہ (مشرک) کہتے ہیں، اس خدائے برحق کی پاکی ساتوں آسمان اور زمین اور جوان کے اندر ہے بیان کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی پاکی کی گواہی نہ دیتی ہو۔''

اسی وحدت نظام کے استدلال کو ایک اور آیت میں خدا نے بیان فرمایا ہے:

﴿ مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۭ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝ ﴾ (۶۷/ الملک:۳۔۴)

''تو خدا کے بنائے میں کوئی فرق نہیں دیکھتا، پھر نگاہ کر، کیا کوئی فتور تجھ کو دکھائی دیتا ہے؟ پھر دوبارہ نظر دوڑا، تیری نظر تھک کر واپس آجائے گی۔''

اس واقعاتی استدلال سے بڑھ کر جو بالکل نظمِ فطرت پر مبنی ہے کوئی دوسری دلیل نہیں ہوسکتی اسی لیے قرآن پاک نے اس کو اختیار کیا ہے۔ یہ دنیا وحدتِ نظام ہی کے ماتحت چل رہی ہے ورنہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی چل نہ سکے۔ اسی سے اس دنیا کے حاکم و فرمانروائے مطلق کی وحدت بخوبی ثابت ہے۔

توحید کی تکمیل

توحید خواہ کسی قدر محرف، شرک آمیز اور ناقص شکل میں ہو، دنیا کے تمام مذاہب اور ادیان کی مشترک اور اولین تعلیم ہے۔ لیکن ان مذاہب میں وہ کسی بنیادی اصل پر مبنی نہ تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس عمارت کو چند بنیادی اصول کے پتھروں پر قائم کیا، یہ پتھر کیا ہیں یہ پتھر خدا کی حقیقی عظمت کی شناخت اور اس عالم کائنات میں انسان کی اصلی حیثیت اور مرتبہ کی تعیین ہے۔

خدا کی حقیقی عظمت

اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے مگر اس کو قدرت کے کارخانہ کا تنہا مالک نہیں سمجھتے تھے۔ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا، جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن وہ تھک کر بیٹھ گیا۔ وہ انسانوں سے کشتی لڑتا تھا۔ اس کی اولادیں تھیں۔ عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح ابن مریم کو دے کر خود معطل ہو گیا تھا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی و بدی کی دو مملکتوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کا خدا اوتاروں کا بھیس بدل کر لاکھوں خدا بن گیا تھا اور برہما، مہیش اور بشن تینوں نے مل کر خدائی کے کاروبار کی باہم تقسیم کر لی تھی۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا، جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ شجر، حجر، جنگل، دریا، پہاڑ، صحرا، سورج، چاند، زمین و آسمان، انسان، حیوان، زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے، سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے، غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ، اوصافِ کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے متصف ہے، اس کے مانند کوئی نہیں، کوئی اس کی شبیہ و مثال نہیں، وہ تشبیہ و تمثیل سے بالاتر اور انسانی رشتے ناتے سے پاک ہے:

﴿ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ (۳۹/ الزمر:٦)

''وہ ہے اللہ تمہارا رب، اسی کی بادشاہی ہے، اس کے سوا اور کوئی خدا نہیں ہے۔''

﴿ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ ﴾ (۳۹/ الزمر:٤٤)

''آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔''

﴿ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (٦/ الانعام:١٤)

''آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا۔''

﴿ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۭ ﴾ (٦/ الانعام:٧٣) ''چھپی اور کھلی کا جاننے والا۔''

﴿ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ ۭ لَهُ الْحُكْمُ ﴾ (۲۸/ القصص:۸۸)

''اس کی ذات کے سوا، ہر چیز فانی ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کی طاقت ہے۔''

﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:١١)

''اس کے مانند کوئی چیز نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

﴿ هُوَ الْحَيُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٦٥)

''وہی زندہ ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔''

﴿ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۭ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ ﴾ (٦/ الانعام:٥٩)

''غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس کو جانتا ہے۔ درخت کا کوئی پتا نہیں گرتا اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے لیکن وہ اس کے علم میں ہے۔''

﴿ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاۗءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاۗءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاۗءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:٢٦)

''اے اللہ! اے بادشاہی کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت نصیب کرے، تیرے ہاتھ میں بھلائی ہے تو ہر بات پر قادر ہے۔''

﴿ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (١٠/ يونس:١٠٧)

''اور اگر اللہ تجھے مصیبت پہنچائے تو اس کے سوا کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل و کرم کا کوئی روکنے والا نہیں، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اپنے فضل سے ممتاز کرے اور وہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْـحَيُّ الْقَيُّوْمُ ڬ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِـيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔــوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَھُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝ ﴾ (٢/ البقرة:٢٥٥)

''اس اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہیں، وہی جیتا ہے اور سب اس کے سہارے جیتے ہیں، اس کو نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند، آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے کون ایسا ہے جو اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے، جو خلق کے روبرو ہے اور جو ان کے پیچھے ہے سب کو جانتا ہے

اور وہ اس کے علم کے کسی حصہ کا احاطہ نہیں کر سکتے ، مگر وہ جو چاہے اس کا تخت آسمانوں کو اور زمین کو سمائے ہے، ان آسمانوں کی اور زمین کی نگرانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی او پر اور بڑا ہے ۔''

﴿ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا ۗ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ لَهُ مُلْكُ السَّمَٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ ﴾ (٥٧/ الحديد: ٤، ٥)

''جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے وہ سب جانتا ہے اور تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو، اللہ اس کو دیکھتا ہے، آسمان اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔''

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (١/ الفاتحہ: ٢)

''سب تعریف اسی کے لیے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔''

﴿ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (٣/ آل عمران: ٨٣)

''اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کے زیر فرمان ہے۔''

﴿ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۝ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۝ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ﴾

(٨٥/ البروج: ١٤۔١٦)

''وہی گناہوں کا بخشنے والا ہے، بندوں سے محبت کرنے والا ہے، تخت کا مالک ہے، بڑی شان والا ہے، جو چاہتا ہے کر دیتا ہے۔''

﴿ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ﴾ (٦٢/ الجمعة: ١)

''آسمانوں میں اور زمین میں جو ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں۔''

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (١٧/ بنیٓ اسرآئیل: ٤٤)

''اور کوئی چیز نہیں جو اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو۔''

ان معنوں کی ہزاروں آیتیں قرآنِ پاک میں ہیں، ان تعلیمات نے خدا کی عظمت، جلالت اور کبریائی کا وہ جلوہ پیش کیا جس کے سامنے معبودانِ باطل کی عزت خاک میں مل گی، بتوں کی بڑائی کا طلسم ٹوٹ گیا، سورج، چاند، تاروں کی خدائی کا چراغ ہمیشہ کے لیے بجھ گیا، جن وانس، شجر و حجر، بحر و بر، سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سربسجود نظر آئے، پھر اس کے سوا کون تھا جو نیرنگِ وجود کے ساز سے ﴿ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴾ (میں ہوں خدا جس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں) کی صدا بلند کر سکتا۔

انسان کا مرتبہ

توحیدِ محمدی کا دوسرا بنیادی اصول اس عالمِ خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ ہے جو لوگ بتوں کو سجدہ

کرتے ہیں، پتھروں کو پوجتے ہیں، درختوں کے آگے جھکتے ہیں، جانوروں کو دیوتا جانتے ہیں، جنات اور ارواح خبیثہ کے نام کی دہائی پکارتے ہیں۔انسانی مخلوقات کو ارباب جانتے ہیں، انسانوں کو خدا سمجھتے ہیں۔وہ حقیقت میں انسان کے مرتبہ سے ناواقف ہیں، وہ دراصل اس طرح انسان کو پتھروں سے، درختوں سے، جانوروں سے، دریاؤں سے، پہاڑوں سے اور چاند تاروں سے کم تر جانتے ہیں۔انہوں نے درحقیقت انسان کے اصلی رتبہ اور حیثیت کو نہیں پہچانا۔آنحضرت ﷺ نے اپنی وحی کی زبان سے جاہل عربوں کو یہ نکتہ سوجھایا کہ انسان اس عالمِ خلق میں تمام مخلوقات سے اشرف ہے۔وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔قرآن کی ابتدائی سورہ میں آدم علیہ السلام کی خلافت کا قصہ محض داستان نہیں، بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے۔اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا۔اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیاء کو اس کے تصرف میں دینا تھا وہ ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ کے فرمان کی رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافتِ الٰہی کے تاج سے ممتاز ہے، کروڑوں مخلوقاتِ الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل وہی منتخب ہوا۔یہ منصبِ اعلیٰ نہ فرشتوں کو ملا، نہ آسمان کو، نہ زمین کو، نہ پہاڑ کو، صرف انسان ہی کا سینہ اس امانت کا خزانہ قرار پایا اور اسی کی گردن اس بوجھ کے قابل نظر آئی۔فرمایا:

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۷۲)

”ہم نے اپنی امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی۔سب نے اس بارِ(امانت) کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھالیا۔“

وحی محمدی ﷺ نے انسان کا رتبہ یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بزرگیوں سے سرفراز فرمایا، عالم مخلوقات میں برتر بنایا اور انعام واکرام سے معزز کیا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْۤ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۷۰)

”ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے خشکی اور تری میں ان کو سواری دی اور ستھری چیزوں کی ان کو روزی بخشی اور اپنی بہت سی پیدا کی ہوئی چیزوں پر ان کو فضیلت عطا کی۔“

انسان ہی وہ ہستی ہے جو سب سے معتدل قویٰ اور بہترین اندازہ کے ساتھ دنیا میں مخلوق ہوئی:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ (۹۵/ التین:۴)

”البتہ ہم نے انسان کو بہتر اندازہ پر پیدا کیا۔“

یہاں تک کہ انسان خدا کی صورت کا عکس قرار پایا متعدد حدیثوں میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔'' ❶ اسی بنا پر آپ نے تعلیم دی کہ غلام کو سزا دو تو اس کے چہرہ پر نہ مارو ❷ کہ وہ صورتِ الٰہی کا عکس ہے۔ عین میدان جنگ میں اگر تلواریں برس رہی ہوں تو حریف کے چہرہ پر وار نہ کرنا چاہیے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا ہے۔ ❸ غصہ میں یہ بھی نہ کہنا چاہیے کہ خدا تیرے چہرہ کو اور تیرے جیسے چہرہ کو بگاڑ دے کہ خدا نے آدم کو اپنی صورت پر خلق کیا۔ ❹ ان حدیثوں کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کی طرح خدا کی کوئی خاص جسمانی شکل ہے اور آدم کی شکل اس کی نقل ہے کہ ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ:١١) بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسان میں خدا کی صفاتِ کاملہ کی ایک دھندلی سی جھلک موجود ہے۔ علم، قدرت، حیات، سمع، بصر، ارادہ، غضب، رحم، سخاو غیرہ تمام صفاتِ رحمانی کی ناقص مثالیں اس کے اندر اللہ نے ودیعت کر رکھی ہیں اور چونکہ انسان کے تمام اعضاء میں اس کا چہرہ ہی اس کی شخصیت کا آئینہ دار اور اس کے اکثر حواس کا مصدر ہے جن سے اس کے تمام اوصاف کا ظہور ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے انسان کے اعضاء میں اسی کو فیضِ رحمانی کا مورد ظاہر کیا۔ ❺ اب غور کرو کہ وہ چہرہ جس کو خدا سے نسبت ہو اس لائق ہے کہ وہ غیر خدا کے آگے زمین پر رکھا جائے اور اس کی زبان سے غیر خدا کی حمد کا ترانہ نکلے۔

انسان تو کائنات میں خلیفۃ اللہ بن کر آیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَٰئِفَ الْأَرْضِ ﴾ (٦/ الانعام:١٦٥)

''اور اسی نے تم کو زمین کا نائب بنایا۔''

تو اب وہ عالمِ کائنات میں خدا کے سوا کس کو سجدہ کرے۔

روئے زمین کی تمام چیزیں اس کی خاطر بنیں وہ روئے زمین کی خاطر نہیں بنا ہے:

﴿ خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٩)

''جو کچھ زمین میں ہے خدا نے (اے انسانو!) تمہارے لیے بنایا۔''

﴿ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ ﴾ (٢٢/ الحج:٦٥).

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام:٦٢٢٧؛ مسند احمد، ٢/ ٢٥١؛ ادب المفرد بخاری لا تقل قبح اللّٰه وجهه ١٧٢ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة. ٦٦٥٥ نیز تورات میں بھی یہ فقرہ ان الفاظ میں ہے: ''جس دن خدا نے آدم کو پیدا کیا خدا کی صورت پر اسے بنایا۔'' (پیدائش ٥-٢)

❷ صحیح بخاری، کتاب العتق، باب اذا ضرب العبد فلیجتنب الوجه:٢٥٥٩ وصحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب النهی عن ضرب الوجه:٦٦٥١ تا ٦٦٥٦۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب البر والصلة: ٦٦٥٥ آخری ٹکڑا صرف مسلم میں ہے۔ ❹ الادب المفرد امام بخاری، باب لا تقل قبح اللّٰه وجهه:١٧٣۔

❺ اس حدیث کی شرح میں فتح الباری شرح بخاری، ج ٥، ص:١٣٢ میں یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

"زمین میں جو کچھ ہے، خدا نے اس کو تمہارے بس میں دے دیا ہے۔"

تو اب وہ روئے زمین کی کس ہستی کے سامنے سر جھکائے۔

مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، فطرت پرست، حقیقت میں غیروں کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ یہ ان کے لیے نہیں بلکہ وہ ان کے لیے بنے ہیں۔ جو چاند اور سورج کو پوجتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ چاند اور سورج ان کے لیے نہیں بلکہ وہ چاند اور سورج کے لیے بنے ہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی وحی اور تعلیم کے ذریعہ سے یہ بتایا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنی ہے اور انسان خدا کے لیے، اس لیے کائنات کا ہر ذرہ انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہے تو انسان کو بھی خدا ہی کی خدمت گزاری میں لگنا چاہیے۔

ابروباد ومہ وخورشید وفلک درکارند

تاتو نانے بکف آری وبہ غفلت نہ خوری

انسانوں نے آسمانی مخلوقات کو اپنا معبود بنایا تو وحی محمدی ﷺ نے انسانوں سے کہا:

﴿ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ۭ ﴾

(١٦/ النحل:١٢)

"اور خدا نے رات دن اور چاند اور سورج کو تمہارے لیے کام میں لگایا اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں۔"

انسانوں نے جانوروں کو پوجا تو پیغامِ محمدی ﷺ نے ان انجانوں کو بتایا کہ یہ تمہارے ہیں، تم ان کے نہیں ہو:

﴿ وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ ﴾ (١٦/ النحل:٥)

"اور جانوروں کو اس نے پیدا کیا، تمہارے لیے اس میں اون کی گرمی اور دوسرے فائدے ہیں۔"

انسانوں نے دریا اور سمندر کو دیوی اور دیوتا بنایا، حالانکہ وہ بھی انہی کی خاطر عدم سے وجود میں آئے ہیں:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ ﴾ (١٦/ النحل:١٤)

"اور وہی خدا ہے جس نے دریا کو کام میں لگایا، تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور، تاکہ تم اس میں سے آرائش کے موتی پہننے کو نکالو اور دیکھتے ہو کہ جہاز سمندر کو پھاڑتے پھرتے ہیں، تاکہ تم خدا کے فضل وکرم (روزی) کی تلاش کرو۔"

آگ بھی انسانوں کی مسجود بنی حالانکہ وہ خود انہی کی محبت میں جل رہی ہے:

﴿ اِلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝ ﴾

(٣٦/ یٰسٓ:٨٠)

''جس نے تمہارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کی، پس اس وقت تم اس سے اور آگ روشن کرتے ہو۔''

الغرض زمین سے لے کر آسمان تک جو بھی مخلوق ہے انسان اس سے اشرف اور بلند تر ہے اور سب اسی کے لیے ہے پھر اس انسان سے بڑھ کر اور کون نادان ہے جو مخلوقات میں سے کسی کو اپنا معبود اور مسجود بنائے، اس حقیقت کے آشکارا ہونے کے بعد شرک کا کوئی پہلو بھی ایسا ہے جس میں کوئی سچا مسلمان گرفتار ہو سکے اور ایک آستانہ کو چھوڑ کر وہ کسی اور چوکھٹ پر اپنا سر جھکا سکے؟

الغرض محمد رسول اللہ ﷺ نے جس توحید کی تلقین کی۔ وہ انہیں دو اصولوں پر قائم ہے ایک یہ کہ انسان تمام مخلوقات میں اشرف ہے۔ اس لیے کسی مخلوق کے سامنے اس کا سر نہ جھکنا چاہیے اور دوسرا یہ کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیے ہیں جو ماورائے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرہ پر حکمران ہے اس کی اطاعت کے دائرہ سے کوئی نقطہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت، ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں اور ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔ وہ بزرگ و برتر ہستی کیا ہے؟ اور اس کی نسبت ہمارا کیا تخیل ہو؟ تعلیم محمدی نے اس کا بھی جواب دیا ہے۔

خدا کا جامع اور مانع تخیل

قرآن پاک کی آیات، جاہلیت کے اشعار، اسلام سے پہلے عربوں کے واقعات بلکہ عرب کے آثار قدیمہ کے کتبات سے یہ واضح طور پر ثابت ہے کہ عربوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا تخیل ضرور موجود تھا۔ جس کا نام ان کے ہاں اللہ تھا مگر وہ کیا ہے؟ اور کیسا ہے؟ اس کے صفات کیا ہیں؟ اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جاسکتی ہیں؟ کن کن باتوں سے پاک ہے؟ اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے اور اس سے کیا کیا مانگنا چاہیے اور کیونکر مانگنا چاہیے، اس کے حضور میں دعائیں کیونکر کی جائیں؟ ہم اس سے کیوں ڈریں اور کیونکر ڈریں؟ اور اس سے ڈرنے کی کیا حقیقت ہے؟ اور اس سے محبت بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں اور اگر کی جاسکتی ہے تو کیونکر؟ اس سے محبت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کے علم کی کیا حیثیت ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا بالکل قریب؟ اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں؟ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ کیا اس کے احکام واجب الاطاعۃ بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کن سے ناخوش؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک

ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے، اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے، کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں، کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی معبوث کرتا ہے کیا ہم اس کے نزدیک اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مؤاخذہ کرے گا؟ یہ وہ باتیں ہیں، جن سے عرب جاہلیت کا دل و دماغ بالکل عاری اور خالی تھا اور ان چیزوں کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی تخیل نہ تھا۔ جاہلیت کا ایک ایک شعر پڑھ جاؤ، ان کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرلو، اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ وہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اس کو پکارنا چاہیے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی ربانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اسکی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا اسکی مشیت وارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا، ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرہ میں نافذ، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو، اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار، اس کے مؤاخذہ کا خوف اور اسکی رحمت کی امید ہے، وہ محبوب ازل ہے اور اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہشیاری ہے، اس کے فضل و کرم اور محبت کی نیرنگیاں اوپر سے نیچے تک پھیلی ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادہ پر نافذ، اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر، اسکی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی اطاعت ہر مکلّف پر واجب ہے، وہ ہر عیب سے پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ اور اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کا قرار اور بے کسوں کا سہارا ہے، وہ ہم سے ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے، ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے، وہ جب چاہے آسمان و زمین کو فنا کردے اور جب چاہے ان کو پھر رچا دے، اس کی محبت دنیا کا حاصل ہے، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے:

﴿ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۸)

''ہاں خدا کی یاد سے دلوں کو اطمینان کی دولت ملتی ہے۔''

ان تعلیمات کا اثر یہ ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے بھی خدا کا نام یاد نہ آتا تھا وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے، وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر

حال میں اس کی یاد میں سرمست وسرشار ہو گئے:

﴿ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۱)

''وہ خدا کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے یاد کرتے ہیں۔''

اس سرمستی وسرشاری میں بھی انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولتمندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دنیا کی کشمکشوں سے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا، بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی وکوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور خدا کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لائے، اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ دل کا معاملہ دلدارِ ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا، خدا نے ان کی مدح کی کہ

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (۲٤/ النور:۳۷)

''وہ لوگ جن کو تجارت اور خرید وفروخت، خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔''

ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آ گیا۔ خدا نے ان کی توصیف کی کہ

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱٦۵)

''ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت کرتے ہیں۔''

ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقلال، ان کی استقامت، ان کی بہادری، ان کی بے خوفی وصداقت، ان کی راستبازی، ان کی اطاعت، غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی جذبہ ایمان کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیش نظر یہ تعلیم رہتی تھی کہ

﴿ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ (٦۵/ الطلاق:۳)

''جو خدا پر بھروسہ کرتا ہے، تو خدا اس کو بس کرتا ہے۔''

﴿ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳٦)

''کیا خدا اپنے بندہ کو کافی نہیں۔''

﴿ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۷)

''اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے، حالانکہ سب سے زیادہ خدا سے ڈرنا چاہیے۔''

ان میں یہ تمام روحانی واخلاقی جوہر اسی ایمان باللہ کے بدولت پیدا ہوئے۔

اسماء وصفات

دنیا کے آغاز میں خدا نے کہا تھا کہ ہم نے آدم کو سب نام سکھائے، دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی اور علم کی وسعت کہاں سے کہاں پہنچ گئی، مگر غور کیجئے تو ناموں کے ہیر پھیر سے ہم اب تک آگے نہیں بڑھے یہی ہماری حقیقت رسی ہے اور یہی ہمارا فلسفہ ہے، ہم اپنے مفروضہ اصولِ منطقی کی بنا پر ذاتیات اور حقائق کے ذریعہ سے

اشیاء کی تعریف کے مدعی بن گئے لیکن ہزاروں صدیاں گزرنے پر بھی ذاتی اور حقیقی تعریف (حدِ منطقی) کی ایک بھی مثال پیش نہ کر سکے، جو کچھ کر سکے وہ یہ کہ صفات، عوارض اور خواص کے مختلف رنگوں سے نئی نئی طفلانہ شکلیں بناتے اور بگاڑتے ہیں، جب مادیت کا یہ علم ہے تو وراء الورا ہستی میں ہماری بشری طاقت اس سے زیادہ کا تحمل کیونکر کر سکتی، تجلی گاہِ طور اسی رمز کی آتشیں تصویر ہے۔

ہم خدا کو بھی اس کے ناموں، اس کے کاموں اور اس کی صفتوں ہی سے جان سکتے ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ نے عرب کے جاہلوں کو اسی نصاب انسانی کے مطابق تعلیم دی عرب کا جاہل اللہ نام کی ایک اعلیٰ ہستی سے واقف تھا لیکن اس کے ناموں اور کاموں کے تخیل سے بڑی حد تک ناآشنا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی وہ قطعی بیگانہ تھا۔ دیوان عرب یعنی ان کی شاعری کے دفتر میں کہیں کہیں اللہ کا نام آتا ہے مگر کہیں اس کی صفت کا ذکر نہیں آتا۔ قرآن پاک میں ان کے خیالات کا پورا عکس اتارا گیا ہے لیکن کہیں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات سے بھی آگاہ تھے۔ بعض عیسائی عربوں میں اللہ کے ساتھ ساتھ ''الرحمٰن'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا تھا۔ جس کے معنی رحم کرنے والے کے ہیں۔ اصحاب الفیل کے رئیس عیسائی ابرہہ کے نام سے سدِ عرم (یمن) پر جو کتبہ لگا ہے اور جس کو جرمن فاضل گلازر نے شائع کیا ہے، اس میں بھی دو جگہ ''رحمٰن'' کا لفظ آیا ہے۔ عرب عیسائی شعراء کے کلام میں بھی یہ لفظ ملتا ہے۔ عیسائیوں میں اس کے استعمال کا نتیجہ یہ تھا کہ عرب مشرکین کو اس لفظ سے چڑ ہوگئی تھی، اسی لیے جب اسلام نے اس لفظ کو اختیار کیا تو مشرکین نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آنحضرت ﷺ نے معاہدہ کے کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھوائی تو قریش کے نمائندہ نے کہا کہ ''قسم ہے اللہ کی مجھے نہیں معلوم کہ رحمٰن کیا ہے؟'' [1]

محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے اور قرآن مجید میں بار بار خدا کے لیے رحمٰن کے لفظ کے استعمال سے مشرکوں کو برہمی ہوتی تھی اور کہتے تھے کہ ہم کبھی رحمٰن کے آگے سرنگوں نہیں ہو سکتے، قرآن نے ان کی اسی حالت کا ذکر اس آیت میں کیا ہے:

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمَٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمَٰنُ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُورًا ۩ ﴾
(۲۵/ الفرقان:۶۰)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا ہے، کیا تم جس کو کہو اس کو ہم سجدہ کریں، رحمٰن کا نام ان کی نفرت اور بڑھا دیتا ہے۔''

مشرکین کو یہ برا لگتا تھا کہ محمد ﷺ ایک طرف تو ان کے بتوں اور دیوتاؤں کی مذمت کرتے ہیں اور دوسری طرف عیسائیوں کے رحمٰن کی مدح وستائش کرتے ہیں:

[1] صحیح بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد و المصالحة مع اهل الحرب وكتابة الشروط ۲۷۳۱، ۲۷۳۲۔

﴿ اَهٰذَا الَّذِیْ یَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَ هُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۳۶)

''(مشرک آپ کو مذاق سے کہتے ہیں کہ) یہی وہ ہے جو تمہارے دیوتاؤں کو برا کہتا ہے اور وہی مشرک رحمان کے ذکر سے انکار کرتے ہیں۔''

تعلیم محمدی نے عرب کے ناآشنایانِ حقیقت کو بالآخر آگاہ کیا کہ خدا کے اسماء وصفات کی کوئی حد نہیں اس کو سب ہی اچھے ناموں سے پکارا جاسکتا ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۱۱۰)

''کہہ دو (اے پیغمبر کہ) خدا کو اللہ کہہ کر پکارو، یا رحمٰن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا مسئلہ اسلام کی ان اہم مذہبی اصلاحات میں سے ہے جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے، بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذہبوں کے پیرو بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام ''یہوا'' تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی دوسرا عام نام ''ایلیم'' ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے، ان کے علاوہ اس کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور اعمال ربانی کے ترجمان ہیں۔ تورات کا دفتر ان سے خالی ہے۔ صفات الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فوجوں والے خداوند یعنی رب الافواج کا لفظ ہے جو اس کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے۔

عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں ''باپ'' کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس لفظ کے اطلاق سے مقصود کیا ہے اور گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازی استعمال بھی کہاں تک جائز ہے؟ اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں۔ ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ خدا کی صرف جمالی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردہ میں چھپالیا اور یہ تاویل کی گئی کہ تثلیث کے اقانیم ثلثہ باپ (خدا) بیٹا (حضرت عیسیٰ) اور روح القدس، حیات، خلق اور علم تین صفتوں سے عبارت ہیں۔ باپ، حیات، بیٹا خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور یہ تینوں وجود میں الگ الگ ہیں، اس تشریح سے صفاتِ الٰہی کے تجسم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدائی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی نیرنگی نظر آتی ہے، لیکن ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کرلیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد رہ گیا ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے

تمام مذاہب اسی تجسم صفات کے جلوہ گاہ ہو کر رہ گئے ہیں، برہما، مہیش، وشنو، تین صفات خالق، ممیت (مارنے والا) اور قیوم کے مجسمے ہیں، غلط تعبیر نے وحدت کی جگہ یہاں بھی تثلیث پیدا کر دی، شنکر آچار یہ نے خدا کے صرف تین اصلی صفات تسلیم کیے، حیات، علم اور سرور یا آنند، جین مذہب اور بعض ہندو فرقوں میں ایک خالقیت کی صفت کے تجسم نے اعضائے تناسل کی پرستش کی گمراہی پیدا کی، عام ہندوؤں میں ۳۳ کروڑ عجیب الخلقت دیوتاؤں کی عظیم الشان بھیڑ بھی صفات و اسمائے الٰہی کی تجسیم اور مستقل وجود کے غلط فلسفہ نے پیدا کی اور اسی نے بت پرستیوں کی نت نئی صورتیں نمایاں کیں، مجوسیوں میں یزدان اور اہرمن کی ثنویت اور دوئی بھی، خدا کی دو صفتوں، ہادی اور مضل کو دو مستقل ہستیوں میں منقسم کر دینے کا نتیجہ ہے، اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے ان تمام فاسد تخیلات کو باطل ٹھہرایا، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی، اور ربانی ہدایت کے نور سے سراج منیر بن کر جس طرح اس حقیقت کو روشن کیا وہ نبوت محمدی کے عظیم الشان کارناموں میں ہے۔ آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کاملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں، آپ ﷺ نے یہ دعا سکھائی: ''اے خداوند! تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے، جو تو نے اپنا رکھا، یا اپنی کتاب میں اتارا، یا کسی مخلوق کو سکھایا، یا اپنے لیے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا رکھا، میں تجھ سے مانگتا ہوں۔'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ الہامی دعا تعلیم ہوئی: ''خداوندا! میں تیرے سب اچھے ناموں کے وسیلہ سے جن میں سے کچھ کو ہم نے جانا اور جن کو نہیں جانا تجھ سے درخواست کرتا ہوں۔'' [1] قرآن پاک کے ذریعہ بتایا گیا:

﴿ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۝ ﴾ (۱۸/ الکھف:۱۰۹)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کے لیے سیاہی بن جائے تو سمندر ختم ہو جائے لیکن میرے پروردگار کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگر چہ ہم ایسا ایک اور سمندر بھی کیوں نہ لے آئیں۔''

دوسری جگہ کہا گیا:

﴿ وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ﴾ (۳۱/ لقمان:۲۷)

''اور اگر زمین میں جتنے درخت ہیں وہ قلم ہو جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔''

---

[1] یہ تینوں دعائیں امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات، باب البیان ان للہ جل ثناء ہ اسماء اخر، ص:٤۔٥ میں نقل کی ہیں اور پہلی روایت مسند احمد، ج ۱، ص: ۳۹۱ میں بھی (بسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ) ہے۔

الغرض تمام اچھے اور کمالی نام اسی کے لیے ہیں اور اسی کو زیبا ہیں:

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۸)

''نہیں ہے کوئی معبود، لیکن وہی اللہ، اسی کے لیے ہیں سب اچھے نام۔''

بڑائی کا ہر نام اور خوبی کا ہر وصف اسی ذات بے ہمتا کے لیے ہے خواہ اس کو خدا کہو یا اللہ کہو لغت اور زبان کا کوئی فرق اس میں خلل انداز نہیں:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل:۱۱۰)

''کہہ دے (اے پیغمبر!) اس کو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جو چاہے کہہ کر پکارو کہ سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

لیکن مشرکوں کی طرح اس کو ایسے ناموں سے نہ پکارو، جو اس کے کمال اور بڑائی کے منافی ہیں اور بتوں اور دیوتاؤں کے ناموں سے بھی اسکو یاد نہ کرو:

﴿ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۠ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَاۗىِٕهٖ ۭ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۸۰)

''اور اللہ ہی کے لیے ہیں سب اچھے نام، اس کو ان ناموں سے پکارو اور ان لوگوں سے علیحدہ رہو، جو اس کے ناموں میں کجی کرتے ہیں۔''

تعلیم محمدی کا صحیفہ وحی اللہ تعالیٰ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ اس کے اسماء وصفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن پاک کا کم کوئی ایسا رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق ومحبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوبِ ازل اور نورِ عالم کے ساتھ قرآن کے ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے:

﴿ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ۭ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ۭ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْۗءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ۭ نُوْرٌ عَلٰي نُوْرٍ ۭ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ۙ ﴾ (۲۴/ النور:۳۵)

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے، اس کے نور کی مثال یہ ہے کہ ایک طاق ہو جس میں چراغ ہو، چراغ ایک شیشہ کے اندر ہو، شیشہ اتنا صاف ہو کہ گویا ایک چمکتا ستارہ ہے، وہ چراغ زیتون کے مبارک درخت کے تیل سے جلایا گیا ہو، نہ وہ پورب ہے نہ وہ پچھم ہے، اس کا تیل

اتنا صاف ہے کہ آگ کے چھوئے بغیر وہ آپ سے آپ جلنے کو ہو، روشنی پر روشنی، خدا اپنی روشنی تک جس کو چاہے پہنچادے اور خدا لوگوں کے سمجھانے کے لیے یہ مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ کو ہر چیز کا علم ہے۔''

﴿ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵۵)

''اللہ نہیں ہے اس کے سوا کوئی اور معبود، وہ ہمیشہ زندہ تمام دنیا کو سنبھالے ہے، اس کو اونگھ اور نیند نہیں آتی آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی مرضی کے بغیر اس کے سامنے سفارش کرنے کو کھڑا ہو، انسانوں کے سامنے اور پیچھے جو کچھ ہے اس کو جانتا ہے اور وہ لوگ اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے لیکن جتنے کا وہ چاہے، اس کا تخت آسمانوں اور زمین کو سمائے ہوئے ہے، اس آسمان اور زمین کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی اونچا اور بڑا ہے۔''

﴿ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ ﴾ (۵۹/ الحشر:۲۲۔۲۴)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، چھپے اور کھلے کا علم رکھنے والا، وہی رحم کرنے والا اور مہربانی والا ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی اللہ نہیں، سب کا بادشاہ، پاک، پوری سلامتی امن والا، ہر شے پر گواہ، غالب، سب پر قابو والا، بڑائی والا، ہر اس چیز سے پاک ہے جس کو یہ مشرک خدا کا شریک بناتے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا، بنانے والا، ہر چیز کی صورت کھینچنے والا، اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔''

﴿ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ

مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝ يُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ ﴾

(٥٧/ الحديد: ١-٦)

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں، وہی غالب اور دانا ہے، آسمانوں کی اور زمین کی حکومت اسی کی ہے، وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر بات پر قادر ہے، وہی پہلا اور وہی پچھلا ہے، وہی کھلا ہے اور وہی چھپا ہے اور ہر بات کو جانتا ہے، وہی ہے جس نے آسمان کو اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، پھر تخت پر برابر ہوا، وہ جانتا ہے جو زمین میں گھستا ہے، اور جو زمین میں سے نکلتا ہے اور جو آسمان سے اترتا ہے اور جو آسمان میں چڑھتا ہے اور جہاں بھی تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور اللہ تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے اسی کی آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہی تمام چیزوں کا مرجع ہے وہ رات کو دن میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، وہ سینوں کے سب بھیدوں سے واقف ہے۔''

خدا کے متعلق اہل عرب کا جو پست تخیل تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو مٹا کر ان کے سامنے جو بلند تخیل پیش کیا اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ آپ نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا تو مشرکین جو اپنے دیوتاؤں کے آل واولاد اور بیویوں اور گوپیوں کی حمد کے ترانے گاتے تھے، آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمائش کی کہ ذرا اپنے خدا کا نسب تو ہمارے سامنے بیان کرو یعنی گویا وہ اپنے دیوتاؤں سے اسلام کے خدا کا مقابلہ کر کے بتانا چاہتے تھے کہ اس حیثیت سے اسلام کا خدا ہمارے دیوتاؤں کی ہمسری نہیں کر سکتا، اس کے جواب میں وحی محمدی نے اپنے خدا کی حقیقت قرآن پاک کی اس سب سے مختصر سورہ میں پیش کی: [1]

﴿ قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۝ ﴾

(١١٢/ الاخلاص ١-٤)

''کہہ دے (اے پیغمبر) وہ اللہ ایک ہے، وہ تنہا اور بزرگ اور بے نیاز اور عالم کا مرجع اور جاپناہ ہے، نہ اس کے کوئی اولاد ہے اور نہ اسکے کوئی ماں باپ ہیں، (جنہوں نے اس کو جنا ہو) اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے (جو اس کی بیوی ہو)۔''

یہ روایت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے تھے، وہ اس کے بعد اس سورہ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ ''صمد'' وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا ہو کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنے وارث و جانشین بھی ضرور چھوڑتا

[1] مستدرك حاكم، تفسير سورة اخلاص (صحيح) ج ٢، ص: ٥٤٠ وجامع ترمذی، ابواب التفسير: ٣٣٦٤ وكتاب الاسماء بيهقي ابواب ذكر الاسماء التي تتبع نفي التشبيه، ص: ٢٣ (اله آباد)

ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اسکا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے۔'' غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے پہلے اہلِ عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا جس کا اندازہ تم ان کے سوال سے کر سکتے ہو اور آپ کی تعلیم کے بعد وہ تخیل کتنا پاک، اعلیٰ اور بلند ہو گیا، جس کا اندازہ حضرت ابی رضی اللہ عنہ کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک فرد ہیں لیکن ان کا دل اب محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ آپ سے سن کر کہتے ہیں کہ ''خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھ کو جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھ کو گالی دی اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا، حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا زیادہ آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں ایک اور صمد ہوں جس نے نہ کسی کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا ہے اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔'' [1] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ یمنی عرب ہیں یعنی اس عرب کے ایک فرد جو تعلیم محمدی سے پہلے ان حقائق سے بے بہرہ تھا اور اب وہ اس تنزیہ وتقدیس کے موتی اپنے منہ سے اگل رہے ہیں۔

اس مختصر سورہ میں سب سے چھوٹا لفظ ''صمد'' کا ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں صفات الٰہی کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے۔ ''صمد'' کے معنی لغت میں اونچی پتھریلی زمین یا چٹان کے ہیں جو کسی ایسی وادی میں ہو جہاں سیلاب آتا ہو تو اس پر نہ چڑھتا ہو اور لوگ اس وقت دوڑ دوڑ کر اسی پر چڑھ کر اپنے کو بچائیں، پھر صمد کے اس لغوی معنی سے اس سردار کے معنی پیدا ہوئے جو بزرگی اور شرافت میں انتہائی معراجِ کمال پر ہو اور اس سردار کو بھی کہنے لگے جس کی موجودگی کے بغیر مجلس میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اور اس سردار کو کہتے ہیں جس کے اوپر کوئی سردار نہ ہو اور اس جائے پناہ کے معنی میں بھی مستعمل ہوا جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے سکے اور اس مرجع و مرکز کے معنی میں بھی آیا ہے جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے، صمد ٹھوس کو بھی کہتے ہیں جس کے اندر خول نہ ہو، اس لیے اس کو بھی کہتے ہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو اور جس کے آل اولاد نہ ہو، اس کو بھی کہتے ہیں جس سے کوئی بے نیاز نہ ہو، اس بہادر کو بھی کہتے ہیں جس کو لڑائی میں بھوک اور پیاس نہ لگتی ہو ''صَمَدَةٌ'' اس اونٹنی کو کہتے ہیں جس کے حمل نہ رہا ہو۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ صمد وہ سردار ہے جو اپنی بزرگی اور سرداری میں کمال درجہ پر ہو وہ شریف جس کی شرافت کمال ہو، وہ بڑا جس کی بڑائی میں کوئی نقص نہ ہو، وہ بردبار جس کی بردباری بدرجہ اتم ہو، وہ بے پروا و بے نیاز جس کی بے پروائی و بے نیازی کی کوئی حد نہ ہو، وہ زبردست جس کے جبروت کی انتہا نہ ہو، وہ علم والا جس کا علم بدرجۂ اتم ہو، وہ حکیم جس کی دانائی کامل کے درجہ تک ہو یعنی وہ جو بڑائی اور بزرگی کی ہر صنف میں کامل ہو۔'' [2]

---

[1] صحيح بخاري، كتاب التفسير، سورة اخلاص: ٤٩٧٥۔

[2] كتاب الاسماء والصفات، امام بيهقي ص: ٤٣۔

ان معنوں کے علاوہ صحابہ اور تابعین نے اس کی تفسیر میں حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں:

ابن عباس رضی اللہ عنہما: وہ جس کی طرف مصیبت کے وقت لوگ رجوع کریں۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ: وہ حی وقیوم جس کو زوال نہ ہو اور جو باقی ہو۔

ربیع بن انس رحمۃ اللہ علیہ: جس کے نہ اولاد ہو، نہ ماں باپ۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: جس کے اندر معدہ وغیرہ جسمانی اعضا نہ ہوں۔

بریدہ رضی اللہ عنہ: جس میں خوف نہ ہو۔

عکرمہ و شعبی: جو کھاتا نہ ہو۔

عکرمہ رضی اللہ عنہ: جس میں سے کوئی دوسری چیز نہ نکلے۔

قتادہ رضی اللہ عنہ: باقی، غیر فانی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معنی [1] اس ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں اور یہ سب صرف ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں، تاہم اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کے اصلی معنی چٹان کے ہیں جو لڑائی اور مصیبتوں کے وقت جائے پناہ کا کام دے۔ اسرائیلی الٰہیات میں بھی یہ لفظ یہی اہمیت رکھتا ہے اور بنی اسرائیل کے صحیفوں میں جائے پناہ کے لیے چٹان کا لفظ آیا ہے استثناء (۳۲۔۳۱۔۳۰) میں ہے۔

''اگر ان کی چٹان ان کو بیچ نہ ڈالتی اور خداوند ان کو اسیر نہ کرواتا کیونکہ ان کی چٹان ایسی نہیں جیسی ہماری چٹان۔''

''یہ چٹان'' اس موقع پر حقیقت میں خدا کی مدد و نصرت سے کنایہ ہے۔ سموال کے پہلے صحیفہ میں یہ کنایہ تصریح سے بدل جاتا ہے ''خداوند کے مانند کوئی قدوس نہیں تیرے سوا کوئی نہیں، کوئی چٹان ہمارے خدا کے مانند نہیں۔'' (۲۔۲)

اس سورہ میں خدا کی صفت میں دو (۲) لفظ ہیں احد (ایک) اور صمد (جائے پناہ) یہ دونوں خدا کے دو متضاد کمالی اوصاف کو حاوی ہیں، اس کی یکتائی کا نتیجہ تو یہ ہے کہ اس جیسا کوئی نہیں، نہ اس کو کسی کی حاجت، نہ اس کو کسی سے غرض۔ وہ یکتا و تنہا، اکیلا بے ہمتا، بے نیاز، بے پروا، سب سے مستغنی اور سب سے الگ ہے لیکن اسی کمال یکتائی کے ساتھ وہ سب کے ساتھ، سب کا دستگیر، سب کی جائے پناہ، سب کا محتاج الیہ، سب کا مرکز، سب کا مرجع، سب کا ماویٰ، سب کا ملجا یعنی سب کی چٹان، مصیبتوں میں سہارا، بلاؤں میں تسلی اور اضطرابوں میں تشفی ہے۔

﴿ فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ﴾ (۵۱/ الذاریات: ۵۰)

''ہر جگہ سے بھاگ کر اللہ کے ہاں پناہ لو۔''

[1] ان معانی کے لیے دیکھو کتاب الاسماء بیہقی، ص: ٤٣؛ مفردات القرآن راغب اصفہانی، ص: ٢٨٨ ابن جریر طبری، جز ٣٠، ص: ١٩٦، ١٩٧؛ ابن کثیر، ج ٤، ص: ٥٧٠ اور تفسیر سورۃ اخلاص لابن تیمیۃ، ص: ٣۔

یہ سورۂ پاک توحیدِ اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے اور اسی لیے اس کو ثلث القرآن (تہائی قرآن) کا درجہ دیا گیا ہے، ایک صحابی تھے جو نماز کی ہر دو رکعت میں قراءت کے آخر میں اس سورہ کو پڑھا کرتے تھے لوگوں نے یہ واقعہ آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کرائی، انہوں نے کہا، اس میں میرے رب کی صفتیں بیان کی گئی ہیں جو مجھ کو بہت محبوب ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: ''بشارت ہو کہ خدا بھی تم سے محبت کرتا ہے۔'' [1] ایک اور انصاری تھے جو قبا کی مسجد میں امامت کرتے تھے ان کا یہ حال تھا کہ ہر رکعت میں فاتحہ کے بعد اس سورہ کو پڑھ لیتے تھے، تب کوئی دوسری سورہ پڑھتے تھے ان کے مقتدی صحابہ نے اس پر اعتراض کیا تو انہوں نے کہا، مجھے امامت چھوڑنی منظور ہے مگر اپنی روش چھوڑنی منظور نہیں۔ لوگوں نے اس واقعہ کا تذکرہ آنحضرت ﷺ سے کیا۔ آپ نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی تو گزارش کی کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے یہ سورہ بہت محبوب ہے۔ ارشاد ہوا: ''یہ محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔'' [2] قتادہ بن نعمان رضی اللہ عنہ صحابی تھے، جو رات بھر اسی ایک سورہ کو دہراتے تھے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ لوگوں نے آپ ﷺ سے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا: ''یہ سورہ قرآن کا تہائی حصہ ہے۔'' [3] اس گمراہی اور تاریکی کا اندازہ جو آنحضرت ﷺ سے پہلے عرب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس روحانی لطف اور نورانی فیض سے کرو جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس کے حصہ میں آیا۔

قرآن مجید اور حدیث میں اللہ تعالیٰ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آتے ہیں۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے۔ وہ جنت میں داخل ہوگا۔ خدا طاق ہے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔'' [4] آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں رکھے گئے۔ پورے سو کیوں نہ مقرر کیے۔ یہ اس لیے کہ اگر پورے سو ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کا رمز آشکارا نہ ہوتا۔ صحیح احادیث میں اسی قدر ہے یعنی ان ۹۹ ناموں کی تصریح نہیں ہے۔ مگر ترمذی ابواب الدعوات میں اور بعض کم درجہ حدیثوں میں ان ناموں کو گنایا بھی ہے۔ لیکن محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ ''یہ روایتیں ضعیف اور کمزور ہیں۔'' پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا ادل بدل اور الٹ پھیر بھی ہے اور بعض ایسے نام بھی ان میں ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں اور بعض ایسے نام جو قرآن میں ہیں ان میں نہیں ہیں اسی لیے علما کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ان ناموں کا انتخاب

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی دعاء النبی ﷺ امته الی التوحید: ۷۳۷۵۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الجمع بین السورتین فی رکعة: ۷۷٤۔

[3] مسند احمد، ج۳، ص: ۱۵، ۲۳۔

[4] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب مقلب القلوب: ۷۳۹۲ وصحیح مسلم، کتاب الذکر، باب اسماء الله تعالیٰ وفضل من احصاها: ٦٨٠٩ ومسند احمد، ج۲، ص: ۲۵۸ وجامع ترمذی: ۳۵۰٦؛ نسائی: ١٦٧٦۔

راویوں نے خود اپنی تلاش وتفحص سے کیا ہے، اس لیے ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہو کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محدود ہے۔ بلکہ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً: عبدالعزیز بن یحییٰ، ابوبکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، امام خطابی، ابن تیمیہ اور قرطبی رحمہم اللہ وغیرہ نے تصریح کی ہے کہ اسمائے الٰہی ان ننانوے میں محصور نہیں اور یہ بھی تصریحات ملتی ہیں کہ اسماء اور صفات الٰہی کی کوئی حد وپایاں نہیں ہے [1] اور اس پر محدثین نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایتوں سے جو آغاز مضمون میں اوپر گزر چکی ہیں استدلال کیا ہے۔

بہر حال قرآن پاک اور احادیث صحیحہ کے تتبع سے علما نے ننانوے ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کر کے گنایا ہے۔ یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت کے قرآن پاک میں آئے ہیں یا وہ افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں یا آنحضرت ﷺ نے دعاؤں میں ان کی تعلیم کی ہے ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ آنحضرت ﷺ نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ اپنے پیروؤں کو سکھایا وہ کتنا وسیع، کتنا بلند، کتنا منزہ اور پاکیزہ ہے۔ علما نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے۔ لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں۔ ایک وہ جن سے اس کے رحم وکرم، عفو ودرگزر یعنی صفات جمالی ظاہر ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اس کی شاہنشاہی، جلال وجبروت اور حکومت واستیلا کا اظہار ہوتا ہے ہم ان کو صفات جلالی کہتے ہیں۔ تیسرے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ہوتا ہے ان کو ہم صفات کمالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ الغرض خدا کے تمام اسماء وصفات انہیں تین عنوانوں کی تشریح ہیں یعنی یا تو ان سے خدا کی رحیمی وکریمی ظاہر ہوتی ہے یا اس کے جاہ وجلال کا اظہار ہوتا ہے یا اس کی تنزیہہ وکمال کا اثبات ہوتا ہے۔

صفاتِ جمالی: یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کے رحم وکرم اور شفقت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے:

اللّٰــه: یہ خدا کا نام ہے جو قرآنِ پاک میں بطورِ خاص علم کے ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں ''خدائے برحق'' کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس لفظ کی لغوی تحقیق میں بہت کچھ اختلاف کیا گیا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ بعضوں نے کہا ہے کہ وہ جس کی حقیقت ومعرفت میں عقل انسانی حیران وسرگرداں ہو۔ دوسروں کی تحقیق ہے کہ اس کے معنی ہیں وہ جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت اور محبت رکھے جو ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس اخیر تعبیر کی بنا پر اللہ کے معنی پیار کرنے والے یا پیارے کے ہیں۔

الرَّحْمٰنُ: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے۔ جس کو علم کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی رحم والے کے ہیں۔

---

[1] تمہید ابی شکور سالمی الباب الخامس القول الثالث فی عدد الاسماء، ص: ٦١ یہ ماتریدیہ کی مشہور مستند کتاب ہے۔

یہ گزر چکا ہے کہ رحمٰن کا لفظ اسلام سے پہلے صرف عیسائی عربوں میں مستعمل تھا۔ عام اہلِ عرب میں اللہ کا لفظ مستعمل تھا۔ قرآن مجید نے ہر سورہ کے شروع میں نیز اور مقامات میں اللہ کو الرحمٰن کہہ کر سینکڑوں جگہ استعمال کیا ہے۔ بظاہر تو یہ وصف موصوف کی معمولی ترکیب ہے۔ مگر درحقیقت یہ بدل ومبدل منہ ہیں اور اس سے اس رمز کی طرف اشارہ ہے کہ عام عربوں کا اللہ اور عرب عیسائیوں کا رحمٰن دو اجنبی صفتیں اور دو بیگانہ ہستیاں نہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں اور ایک ہی ہستی کے دو نام ہیں اور اس طرح ان دو مختلف قوموں کو وحدتِ الٰہی کی دعوت دی گئی جو ناموں کے تعدد کو حقیقت کے تعدد کا مرادف سمجھتی تھیں اور کہا گیا:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۱۱۰)

''اللہ کہو یا رحمٰن کہو، جو چاہے کہو اسی کے لیے سب اچھے نام ہیں۔''

اَلرَّحِیْمُ: رحم کرنے والا، رحم کا لفظ اس رحم سے نکلا ہے۔ جس سے بچہ کی پیدائش ہوتی ہے۔ اس لیے اصل لغت کے لحاظ سے اس لفظ میں بھی مربیانہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔

الرحمٰن اور الرحیم خدا کی وہ دو صفتیں ہیں۔ جن سے قرآن کا صفحہ صفحہ منور ہے۔ کائنات میں جو کچھ ہوا، جو کچھ ہے، جو کچھ ہوگا وہ اس کی رحمانی اور رحیمی انہیں دو صفتوں کا ظہور ہے۔ اس عالم اور اُس عالم دونوں میں اس کی انہیں دونوں شانوں کا ظہور ہے اور ہوگا۔

اَلـــرَّبُّ: پرورش کرنے والا، یعنی ہستی کے اول نقطہ سے لے کر آخر منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور وترقی کا ذمہ دار۔

اَللَّطِیْفُ: لطف والا مہربان۔

اَلْعَفُوُّ: معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْوَدُوْدُ: محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

اَلسَّلَامُ: امن وسلامتی، صلح وآشتی، ہر عیب سے پاک وصاف۔

اَلْمُحِبُّ: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

اَلْمُؤْمِنُ: امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

اَلشَّکُوْرُ: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

اَلْغَفُوْرُ وَالْغَفَّارُ: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

اَلْحَفِیْظُ وَالْحَافِظُ: حفاظت کرنے والا، نگہبان، نگہبانی کرنے والا، بچانے والا۔

اَلْوَهَّابُ: دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

اَلرَّازِقُ وَالرَّزَّاقُ: روزی دینے والا، نشو و نما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

اَلْوَلِیُّ: دوست، حمایتی، طرفدار۔

اَلرَّءُوْفُ: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

اَلْمُقْسِطُ: انصاف والا، عادل۔

اَلْهَادِيْ: راہ دکھانے والا، رہنما۔

اَلْكَافِيْ: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی۔

اَلْمُجِيْبُ: قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا۔

اَلْحَلِيْمُ: بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

اَلتَّوَّابُ وَقَابِلِ التَّوْبِ: توبہ قبول کرنے والا، گناہگار کے گناہوں سے درگزر کر کے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

اَلْحَنَّانُ: ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

اَلْمَنَّانُ: احسان کرنے والا۔

اَلنَّصِيْرُ: مدد کرنے والا۔

ذُو الطَّوْلِ: کرم والا۔

ذُو الْفَضْلِ: فضل والا۔

اَلْكَفِيْلُ: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

اَلْوَكِيْلُ: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

اَلْمُقِيْتُ: روزی پہنچانے والا۔

اَلْمُغِيْثُ: فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

اَلْمُجِيْرُ: پناہ دینے والا۔

اَلْمُغْنِيْ: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

صفاتِ جلالی:

یعنی وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی اور قدرت کا اظہار ہوتا ہے:

اَلْمَلِكُ وَالْمَلِيْكُ: بادشاہ، فرمانروا۔

اَلْعَزِيْزُ: غالب، جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

اَلْقَاهِرُ وَالْقَهَّارُ: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جا سکتا۔ سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

اَلْمُنْتَقِمُ : سزا دینے والا، برائیوں کی جزا دینے والا۔

اَلْجَبَّارُ: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے۔ جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

اَلْمُهَيْمِنُ : سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

اَلْمُتَكَبِّرُ: اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا، سخت سزا دینے والا۔

شَدِيْدُ الْعِقَابِ: سخت سزا والا۔

شَدِيْدُالْبَطْشِ : بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

نکتہ: خدا کے صفاتِ جلالی کا ذکر زیادہ تر تورات میں ہے۔لیکن صحیفہ محمدی میں جہاں کہیں خدا کی ان جلالی صفتوں کا ذکر آتا ہے۔ ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ خدا کے عادل حکیم اور علیم ہونے کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ جس سے انسان کی اس غلط فہمی کا مٹانا مقصود ہے کہ خدا کی ان جلالی صفتوں کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ نعوذ باللہ ایک لا ابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر گزرتا ہے۔ بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کا انتقام اور اس کی گرفت، عدل وانصاف اور حکمت ومصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور اس طرح ان جلالی ناموں سے بے رحمی اور ظالمانہ سخت گیری کا جو شبہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جاتا ہے:

﴿ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۲)

''بے شک خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔''

اس لیے اللہ تعالیٰ کے وصف میں عَزِيْزٌ (غالب) کے ساتھ حَكِيْمٌ (حکمت والا) ہمیشہ قرآن میں آیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ خدا کے عذاب کے ذکر کے ساتھ اس کی رحمت کا تذکرہ بھی ہمیشہ قرآن میں کیا جاتا ہے اور دوزخ کے بیان کے ساتھ جنت کا سماں بھی لازمی طور پر دکھایا جاتا ہے۔

جہاں یہ کہا گیا کہ ﴿ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴾ ساتھ ہی کہا گیا ﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴾ (۳۸/ ص:۶۵۔۶۶) قوموں کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا گیا تو فرما دیا گیا:

﴿ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۳۱)

''اور اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔''

اس کی صفت ﴿ ذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ دردناک عذاب دینے والا جہاں بیان کی گئی تو اس سے معاً پہلے ﴿ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ ﴾ (۴۱/ حمٓ السجدۃ:۴۳) یقیناً بخشش والا بھی فرما دیا گیا۔غرض صفاتِ جلالی کے بیان میں یہ رعایت پیش نظر رکھی گئی ہے کہ اس کے ساتھ یا آگے پیچھے اس کی صفات جمالی کا بھی ذکر ہو، تا کہ خوف و خشیت کے ساتھ اس کی محبت اور لطف وکرم کے جذبات بھی نمایاں ہوں۔

صفاتِ کمالی: وہ اسماء وصفات جن سے اس کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر

ہوتا ہے۔اس طرح کے اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں۔ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں۔دوسرے وہ جو اس کے وجود سے تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے۔

☆ صفاتِ وحدانیت: یعنی وہ صفتیں جو اس کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں:

اَلْوَاحِدُ: ایک۔

اَلْاَحَدُ: ایک۔

اَلْوِتْرُ: طاق جس کا کوئی جوڑا نہیں۔

☆ صفات وجودی: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

اَلْمَوْجُوْدُ: وجود والا، ہست۔

اَلْحَيُّ: ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

اَلْقَدِيْمُ: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہ ہو، جو ہمیشہ سے ہے۔

اَلْقَيُّوْمُ: جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

اَلْبَاقِيْ: جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

اَلدَّآئِمُ: ہمیشہ رہنے والا۔

اَلْاَوَّلُ: وہ پہلا جس سے پہلے کوئی نہیں۔

اَلْاٰخِرُ: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

اَلْمُقَدِّمُ: جو سب کے آگے سے ہے۔

اَلْمُؤَخِّرُ: جو سب پیچھے رہ جائے۔

اَلظَّاهِرُ: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)

اَلْبَاطِنُ: جو چھپا اور مخفی ہے۔(یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)

☆ علم: وہ صفتیں جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں:

اَلْخَبِيْرُ: خبر رکھنے والا۔

اَلْعَلِيْمُ: جاننے والا۔

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

اَلسَّمِيْعُ: سننے والا۔

اَلْبَصِیْرُ : دیکھنے والا۔

اَلْمُتَکَلِّمُ: بولنے والا ، اپنے علم اور ارادہ کا ظاہر کرنے والا۔

اَلْوَاجِدُ: پانے والا ، جس کے علم کے سامنے کوئی چیز گم نہ ہو۔

اَلشَّهِیْدُ: حاضر ، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہ ہو۔

اَلْحَسِیْبُ: حساب کرنے والا یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا۔

اَلْمُحْصِی: گننے والا یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے۔ یعنی اعداد کا بھی جاننے والا۔

اَلْمُدَبِّرُ: تدبیر کرنے والا ، انتظام کرنے والا۔

اَلْحَکِیْمُ : حکمت والا ، عقل والا ، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔

اَلْمُرِیْدُ: ارادہ کرنے والا ، مشیت والا۔

اَلْقَرِیْبُ : نزدیک ، جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

☆ قدرت: یعنی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے:

اَلْفَاتِحُ وَالْفَتَّاحُ: ہر مشکل کو کھولنے والا۔

اَلْقَدِیْرُ وَالْقَادِرُ: قادر ، قدرت والا۔

اَلْمُقْتَدِرُ: اقتدار والا ، جس کے سامنے کوئی چوں و چراں نہیں کر سکتا۔

اَلْقَوِیُّ: زبردست ، جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔

اَلْمَتِیْنُ : مضبوط ، جس میں کوئی کمزوری نہیں۔

اَلْجَامِعُ: جمع کرنے والا ، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔

اَلْبَاعِثُ : اٹھانے والا ، مردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یا دنیا میں ہر واقعہ اور ہر حادثہ کا محرکِ اول۔

مَالِكُ الْمُلْكِ: سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔

اَلْبَدِیْعُ: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔

اَلْوَاسِعُ : سمانے والا جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔

اَلْمُحِیْطُ: جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں۔

اَلْمُحْیِي وَالْمُمِیْتُ: جلانے والا اور مارنے والا۔

اَلْقَابِضُ وَالْبَاسِطُ: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔

اَلْمُعِزُّ وَالْمُذِلُّ: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔

اَلْخَافِضُ وَالرَّافِعُ : نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔

اَلْمُعْطِي وَالْمَانِعُ : دینے والا اور روک لینے والا۔

اَلنَّافِعُ وَالضَّارُّ: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا یعنی نفع وضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

اَلْمُبْدِئُ وَالْمُعِيدُ: جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا کر دی گئی ہو اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا۔

نکتہ: اس قسم کی صفتیں جن میں بظاہر قبح نظر آتا ہے۔ جیسے اَلضَّارُّ (نقصان پہنچانے والا) اَلْمُذِلُّ (ذلت دینے والا) اَلْخَافِضُ (پست کرنے والا) اَلْمَانِعُ (روکنے والا) وغیرہ ان کا تنہا استعمال چونکہ غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اس لیے جب تک ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت نہ بولی جائے۔ ان کا استعمال جائز نہیں رکھا گیا۔ یعنی خدا کو صرف اَلضَّارُّ، اَلْخَافِضُ، اَلْمَانِعُ اور اَلْمُذِلُّ کہنا درست نہیں۔ جب تک اس کے ساتھ اس کے دوسرے پہلو کو بھی نہ ملا لیا جائے۔ یعنی اَلضَّارُّ کے ساتھ اَلنَّافِعُ، اَلْخَافِضُ کے ساتھ اَلرَّافِعُ، اَلْمَانِعُ کے ساتھ اَلْمُعْطِي اور اَلْمُذِلُّ کے ساتھ اَلْمُعِزُّ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ قرآن پاک اور احادیث دونوں میں ان صفات کے استعمال میں یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کیونکہ تنہا نقصان پہنچانے والا، ذلت دینے والا اور روکنے والا کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک طرح کی برائی ہے۔ ہاں نقصان ونفع پہنچانے والا، عزت وذلت دینے والا اور دینے والا اور روکنے والا، دونوں کو ملا کر کہا جائے تو جائز ہوگا کہ اس سے مقصود اس کی قدرت کی وسعت ہے کہ اگر کوئی ایسا نفع پہنچانے والا ہے جس میں نقصان پہنچانے کی قدرت ہی نہیں یا ایسا عزت دینے والا ہے جس میں ذلیل کرنے کی استطاعت ہی نہیں تو اس کے اس عزت دینے اور نفع پہنچانے پر اس کا مجبور ومضطر ہونا لازم آتا ہے اور اس کی قدرت کا یہ کمال نمایاں نہیں ہوتا البتہ جو نقصان پہنچانے کی طاقت رکھنے کے باوجود نفع پہنچاتا اور ذلت دے سکنے کے باوصف عزت دیتا ہے، اس کا کمال ہر شخص کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

تنزیہہ: وہ صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب اور نقصان سے اس کی براءت کو ظاہر کرتی ہیں:

اَلْغَنِيُّ :	بے نیاز	اَلصَّادِقُ :	سچا، راست باز
اَلْعَلِيُّ :	مرتبہ والا	اَلْمَاجِدُ :	عزت والا
اَلْعَظِيمُ :	عظمت والا	اَلْحَمِيدُ :	تعریف والا
اَلْكَبِيرُ :	بڑا	اَلْقُدُّوسُ :	پاک
اَلرَّفِيعُ :	بلند	اَلْحَقُّ :	سچا اور اصل، یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں۔
اَلْجَلِيلُ :	بزرگ	اَلْجَمِيلُ :	اچھا

اَلْعَدْلُ: عادل اَلْبَرُّ: نیک
اَلْکَرِیْمُ: شریف سُبُّوْحٌ: ہر عیب سے پاک
اَلصَّمَدُ: جو بزرگی کی ہر صفت میں کامل ہے۔ اَلرَّشِیْدُ: سیدھی راہ چلنے والا، نہ بہکنے والا

ان تعلیمات کا اثر اخلاقِ انسانی پر

اللہ تعالیٰ کے ان اسماء وصفات کا عقیدہ دینِ محمدی میں محض نظری نہیں بلکہ عملی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ محامد واوصاف، اخلاقِ انسانی کا معیار ہیں۔ ان اوصاف کو چھوڑ کر جو اس ذوالجلال کے لیے خاص ہیں کہ وہ بندہ کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں۔ بقیہ اوصاف ومحامد انسان کے لیے قابل نقل ہیں کہ وہ خدا کے محامد واوصاف سے دور کی نسبت رکھتے ہیں اس لیے انسان پر فرض ہے کہ اگر وہ خدا سے نسبت پیدا کرنا چاہتا ہے تو اپنے اندر اس کے محامد واوصاف سے نسبت پیدا کرے اور خدا کے ان اسماء وصفات کو محامد ومحاسن اور خوبیوں کا انتہائی معیار جان کر ان کی نقل اور پیروی کی کوشش کرے۔ محامد الٰہی گویا استاد اعلیٰ کی وصلی ہے جس کو دیکھ کر شاگرد کو اپنے خط کی خوبی میں ترقی کرنی چاہیے، اس لیے انسان کو بھی اپنے اور ہر حرف کے لکھنے (محامدِ الٰہی کی نقل اتارنے) میں ایک نظر اس استادِ ازل کی وصلی پر بھی ڈال لینی چاہیے، تا کہ معلوم ہو کہ اس کی ذاتی مشق کہاں تک اصلی وصلی کے مطابق ہے۔

گزر چکا کہ قرآن کا پہلا سبق یہ ہے کہ بحکم:

﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ (۲/ البقرۃ: ۳۰)

''آدم کا بیٹا زمین میں خدا کا خلیفہ اور نائب بنایا گیا ہے۔''

خلیفہ اور نائب میں اصل کے اوصاف ومحامد کا پرتو جتنا زیادہ نمایاں ہوگا۔ اتنا ہی وہ اپنے اندر اس منصب کا استحقاق زیادہ ثابت کرے گا اور اتنا ہی وہ اصل سے زیادہ قریب ہوگا اور نیابت کے فرائض زیادہ بہتر ادا کرے گا۔ یہاں تک کہ اس میں وہ جلوہ بھی نمایاں ہوگا۔ جب وہ سرتاپا خدائی رنگ میں رنگ کر نکھر جائے گا:

﴿ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۳۸)

''خدا کا رنگ اور خدا کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے؟''

تمام اہل تفسیر متفق ہیں کہ اس ''خدائی رنگ'' سے مقصود خدا کا ''دینِ فطرت'' ہے۔

یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے کہ ((اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِهٖ)) [1] ''خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا۔'' اور ساتھ ہی اس کی تشریح بھی گزری کہ اس صورت سے مقصود جسمانی نہیں معنوی شکل و صورت ہے۔ یعنی یہ کہ خدا نے انسان میں اپنے صفات کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے اور ان کے قبول کرنے کی

[1] صحیح بخاری، کتاب الاستئذان، باب بدء السلام: ٦٢٢٧۔

صلاحیت عطا کی ہے اور ان میں انسانی حد تک ترقی کی استعداد بخشی ہے اور اخلاق وصفات میں ملائے اعلیٰ سے تشبہ اور ہم شکلی کا جو ہر مرحمت فرمایا ہے اور یہی صوفیہ اور خاصان خدا کے اس مقولہ کا کہ

"تخلقوا باخلاق اللّٰه۔" "خدا کے اخلاق اپنے اندر پیدا کرو۔"

مطلب ہے حدیث میں یہی مفہوم بروایتِ طبرانی ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے کہ

((حسن الخلق خلق اللّٰه الاعظم)) "حسنِ خلق خدا تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔" [1]

اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کی چار قسمیں اوپر بیان ہوئی ہیں۔جلالی،تنزیہی،کمالی اور جمالی،صفات جلالی جن میں کبریائی،عظمت،شہنشاہی اور بڑائی کے اوصاف ہیں،خالقِ تعالیٰ کے سوا مخلوقات ان کی مستحق نہیں اور نہ یہ اوصاف بندگی اور عبودیت کے رتبہ کے سزاوار ہیں۔ان کا انعکاس یہ ہے کہ بندوں میں ان کے مقابل کے صفات پیدا ہوں،یعنی عاجزی،تواضع،فروتنی اور خاکساری،اسی لیے ترفع،تکبر اور بڑائی کا اظہار منع ہے اور اسی لیے آدمی جس نے فروتنی اختیار کی اور عجز وقصور کا اعتراف کیا،وہ مغفرت کی خلعت سے سرفراز ہوا اور شیطان جس نے ترفع اور غرور کیا،دائمی لعنت کا مستحق ٹھہرا:

﴿ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (۲/ البقرة:۳٤)

"اس نے (آدم کے سجدہ سے) انکار کیا اور غرور کیا،اور کافروں میں سے ہو گیا۔"

قرآن پاک میں ہے کہ بڑائی اور کبریائی صرف خدا کے لیے ہے،اس کے سوا کوئی اور اس کا مستحق نہیں:

﴿ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ﴾ (٤٥/ الجاثية:۳۷)

"اور آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے بڑائی ہے۔"

صحیح مسلم [2] میں ابوسعید خدری اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہما دو صحابیوں سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "عزت اس کا لباس اور کبریائی اس کی چادر ہے،(خدا فرماتا ہے) تو جو کوئی عزت اور کبریائی میں میرا حریف بنے گا میں اسے سزا دوں گا۔" دوسری جگہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "خدا کے نزدیک سب سے براوہ ہے جو اپنا نام بادشاہوں کا بادشاہ اور شہنشاہ رکھتا ہے،خدا کے سوا کوئی بادشاہ اور مالک نہیں۔" [3]

﴿ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ﴾ (٥٩/ الحشر:۲۳) اسی کی شان ہے،البتہ اللہ تعالیٰ اپنی عزت جلال اور قوت و جبروت کا فیضان بعض بندوں اور امتوں پر نازل کرتا ہے اور ان کو طاقت اور قوت اور بادشاہی عطا کرتا ہے مگر اس نوازش پر بھی نیک بندوں اور صالح امتوں کا فرض یہی ہے کہ عین اس وقت جب ان کے دست وبازو سے قوتِ حق اور ربانی جاہ وجلال کا اظہار ہو رہا ہو،ان کی پیشانیاں فرطِ عبودیت سے اس کے آگے جھکی ہوں اور سر

---

[1] كنز العمال، ج ۲، ص: ٤ بروايت عمار بن ياسر۔

[2] كتاب البر والصلة، باب تحريم الكبر: ٦٦٨٠۔ [3] صحيح بخاری، كتاب الادب، باب ابغض الاسماء الى الله تبارك وتعالى: ٦٢٠٥ ومسلم، كتاب الآداب، باب تحريم التسمی بملك الاملاك: ٥٦١٠، ٥٦١١۔

نیاز اظہارِ بندگی کے لیے اس کے سامنے خم ہوں کہ عزت وجلال خاص خدا کی شان تھی جس کا فیضان رسول اللہ پر ہوا اور رسول کی وساطت سے مومنوں پر ہوا۔ یہ ترتیب خود قرآن میں ملحوظ رکھی گئی ہے:

﴿ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴾ (٦٣/ المنافقون:٨)

''اور عزت خدا کے لیے ہے اور اس کے رسول کے لیے اور مومنوں کے لیے ہے۔''

حاکم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے تین کپڑے ہیں وہ اپنی عزت وجلال کا ازار باندھتا ہے اور اپنی رحمت کا جامہ پہنتا ہے اور اپنی کبریائی کی چادر اوڑھتا ہے تو جو شخص اس عزت کے سوا جو خدا کی طرف سے اس کو عنایت ہوئی ہو معزز بننا چاہتا ہے تو وہی شخص ہے جس کو قیامت میں یہ کہا جائے گا ''اس کا مزہ چکھ تو معزز اور شریف بنتا تھا۔'' (۴۴/ الدخان:۴۹) ''اور جو انسانوں پر رحم کرتا ہے خدا اس پر رحم کرتا ہے۔'' کہ اس نے وہ جامہ پہنا جس کا پہننا اس کو روا تھا اور جو کبریائی کرتا ہے تو اس نے خدا کی اس چادر کو اتارنا چاہا جو خدا ہی کے لیے تھی۔'' [1]

خدا کے صفات کمالی میں سے وحدانیت اور بقائے ازلی وابدی کے سوا کہ ان سے تمام مخلوقات اور ممکنات طبعاً محروم ہیں، بقیہ اوصاف کے فیضان سے انسان مشرف ہوتا ہے صفات تنزیہی، مثلاً: قدرت، علم، سمع، بصر، کلام وغیرہ سے بھی مخلوقات تمام تر محروم ہیں ان کی تنزیہہ یہی ہے کہ وہ خدا کے عصیان، نافرمانی اور گناہگاری کے عیب سے بری اور پاک ہوں۔ صفات جمالی وہ اصلی اوصاف ہیں جن کے فیضان کا دروازہ ہر صاحبِ توفیق کے لیے حسب استعداد کھلا ہوا ہے، ان صفات جمالی کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر ہے۔ عیسائیوں کی عام دعا میں ایک فقرہ ہے کہ ''خداوند! تو ہمارے گناہوں کو معاف کر جس طرح ہم اپنے قرضداروں کو معاف کرتے ہیں۔'' اسلام نے اس الٹی تشبیہ کو جائز نہیں رکھا ہے۔ اس کے ہاں یہ ہے کہ اے انسان! تو اپنے مجرموں کو معاف کر کہ خدا تیرے گناہوں کو معاف کرے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو کوئی اپنے بھائی کے گناہ پر پردہ ڈال دے گا، خدا اس کے گناہوں پر پردہ ڈالے گا۔'' [2] قرآن کہتا ہے کہ ''تم دوسروں کو معاف کرو کہ خدا تم کو معاف کرتا ہے۔''

﴿ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴾

(٤/ النسآء:١٤٩)

''اگر تم کوئی نیکی دکھا کر یا چھپا کر کرو یا کسی کی برائی کو معاف کرو تو اللہ (بھی) معاف کرنے والا، قدرت والا ہے۔''

ایک دفعہ عہد نبوت میں بارگاہِ عدالت قائم تھی۔ ایک مجرم کو سزا دی جا رہی تھی۔ مگر اس منظر کو دیکھ کر حضور ﷺ کے چہرہ کا، رنگ متغیر تھا ادا شناسوں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا: ''امام تک معاملہ پہنچنے سے

[1] کنز العمال، ج ۲، ص: ۱۰۹؛ مستدرك حاکم، کتاب التفسیر، سورة دخان، ج ۲، ص: ٤٥١۔

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم:٦٥٧٨۔

پہلے اپنے بھائیوں کو معاف کر دیا کرو۔ خدا معاف کرنے والا ہے اور عفو و درگزر کو پسند کرتا ہے تو تم بھی معاف اور درگزر کیا کرو، کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ خدا تمہیں بھی معاف کرے۔ وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' ❶

آنحضرت ﷺ ایک دفعہ صحابہ کے مجمع میں فرما رہے تھے کہ ''جس کے دل میں غرور کا ایک ذرہ بھی ہو گا وہ بہشت میں داخل نہ ہو گا۔'' ایک صحابی نے عرض کی، یا رسول اللہ! انسان چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو کیا یہ بھی غرور ہے؟ فرمایا:

((ان اللّٰہ عزو جل جمیل یحب الجمال)) ❷

''اللہ تعالیٰ اچھا ہے اور جمال والا ہے اچھائی اور جمال کو پسند کرتا ہے۔''

یہ غرور نہیں، غرور حق کو پامال کرنا اور انسانوں کو دبانا ہے۔ یہی روایت حدیث کی دوسری کتابوں میں ان الفاظ کے ساتھ ہے: ''خدا جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے بندہ پر اس کی نعمت کا اثر ظاہر ہو۔'' ❸ یہ روایت بھی ہے: ''خدا جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، وہ سخی ہے سخاوت کو پسند کرتا ہے، وہ صاف ستھرا ہے صفائی اور ستھرے پن کو پسند کرتا ہے۔'' ❹ روایت کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: ''وہ جمیل ہے جمال کو پسند کرتا ہے، اخلاق عالیہ سے محبت اور بد اخلاقیوں سے نفرت رکھتا ہے۔'' ❺ ایک موقع پر آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو نصیحت فرماتے ہیں: ''اے عائشہ! خدا نرمی والا ہے وہ ہر بات میں نرمی کو پسند کرتا ہے۔'' ❻ ایک مرتبہ آپ ﷺ نے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''لوگو! خدا پاک ہے اور پاک ہی کو قبول کرتا ہے۔'' ❼ عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے قرآن کے ماننے والو! وتر نماز پڑھا کرو کہ خدا یکتا (وتر) ہے، وہ یکتا (وتر) کو پسند کرتا ہے۔'' ❽

رحمت و شفقت اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔ مگر خدا کی رحمت و شفقت کے وہی مستحق ہیں جو دوسروں پر رحمت و شفقت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''رحم کرنے والوں پر وہ رحم کرنے والا بھی رحم کرتا ہے۔ لوگو! تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'' ❾ رشتہ داری اور قرابت کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا

---

❶ مستدرك حاكم، ج ٤، ص:٣٨٢، كتاب الحدود۔ ❷ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب تحريم الكبر و بيانه:٢٦٥؛ ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی الكبر:١٩٩٩۔

❸ كنز العمال كتاب الزينة، ج٣، ص:٣٢٦ بحواله شعب الايمان بيهقی۔ ❹ كنز العمال كتاب الزينة، ج٣، ص:٣٢٦، بحواله كامل لابن عدی۔ ❺ ايضًا بحواله معجم اوسط طبرانی۔

❻ صحيح مسلم، كتاب السلام، باب النهی عن ابتداء اهل الكتاب بالسلام:٥٦٥٦؛ ابوداود، كتاب الادب، باب فی الرفق:٤٨٠٨؛ ابن ماجه، ابواب الادب، باب الرفق:٣٦٨٩۔ ❼ صحيح مسلم، كتاب الزكوٰة، باب قبول الصدقة من الكسب الطيب:٢٣٤٦؛ ترمذی، ابواب التفسير، تفسير سورة البقرة:٢٩٨٩۔

❽ ابوداود، كتاب الوتر:١٤١٦۔ ❾ ابوداود، كتاب الادب، باب فی الرحمة:٤٩٤١۔

گیا ہے تمام رشتہ داریاں اور قرابتیں رحم کے تعلق پر قائم ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''رحم کی جڑ رحمٰن سے ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اے رحم! جو تجھ کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کروں گا۔ جو تجھ کو ملائے گا اس کو میں بھی ملاؤں گا۔'' [1] ترمذی میں یہی تعلیم ان الفاظ میں ہے: ''میں خدا ہوں، میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام (رحمٰن) سے اس کا نام (رحم) مشتق کیا ہے تو جو اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا۔ جو اس کو قطع کرے گا میں اس کو قطع کرونگا۔'' [2] پھر فرمایا: ''جو انسان پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔'' [3] بخاری میں اس روایت کے یہ الفاظ ہیں: ''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' [4] آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا نے رحم کے سو حصے کیے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھے اور ایک حصہ زمین والوں کو عنایت کیا۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ باہم لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رحم وشفقت سے پیش آتے ہیں۔ یہاں تک کہ گھوڑی بھی اپنے بچہ کے لیے اس خوف سے پاؤں اٹھا لیتی ہے کہ اس کو صدمہ نہ پہنچے۔'' [5]

بخل خدا کی صفت نہیں مگر آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم اپنی تھیلی کے منہ نہ بند کرو ورنہ تم پر بھی تھیلی کا منہ بند کیا جائے گا۔'' [6] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ''جو بندہ دوسرے بندے کی پردہ پوشی کرے گا، قیامت میں اس کی پردہ پوشی خدا کرے گا۔'' [7] یہ نصیحت بھی فرمائی کہ ''جب تک تم اپنے بھائی کی مدد میں ہو خدا تمہاری مدد میں ہے۔'' [8]

ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''خدا سے بڑھ کر کوئی غیرت مند نہیں۔ اسی لیے اس نے فحش باتوں کو حرام کیا ہے۔'' [9]

اسی کی تفسیر دوسری حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا ''کہ خدا بھی غیرت کرتا ہے اور مومن بھی غیرت کرتا ہے اور خدا کی غیرت یہی ہے کہ اس نے اپنے مومن پر جس بات کو حرام کیا ہے اگر کوئی اس کا ارتکاب کرے تو وہ اس پر خفا ہو۔'' [10] اللہ تعالیٰ ظلم سے پاک ہے:

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۲)

''اور خدا بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔''

اس لیے اس کے بندوں کا فرض ہے کہ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کریں۔ محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اللہ تعالیٰ کی اس عملی تعلیم کو ان الفاظ میں ادا فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من وصل وصله الله: ۵۹۸۸، ۵۹۸۹۔

[2] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی قطیعة الرحم: ۱۹۰۷۔ [3] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الولد: ۱۹۱۱۔ [4] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب رحمة الولد: ۵۹۹۷۔

[5] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب جعل الله الرحمة فی مائة جزء: ۶۰۰۰۔ [6] جامع ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی السخاء: ۱۹۶۰۔ [7] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ۶۵۷۸۔

[8] ابو داود، کتاب الادب باب فی المعونة للمسلم: ۴۹۴۶۔

[9] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب الغیرة: ۵۲۲۰۔

[10] جامع ترمذی، ابواب الرضاع باب ماجاء فی الغیرة: ۱۱۶۸۔

((یا عبادی انی حرمت الظلم علی نفسی وجعلتہ بینکم محرما فلا تظالموا)) ❶

''اے میرے بندو! میں نے ظلم کو اپنے اوپر حرام کیا ہے اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام کیا ہے، ہاں تو تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا۔''

پاکیزگی اور لطافت خدا کی صفتیں ہیں، اس لیے خدا کے ہر بندہ کو بھی پاک وصاف رہنا چاہیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان اللّٰہ طیب یحب الطیب ونظیف یحب النظافۃ فتنظفوا ولا تشبھوا الیھود)) ❷

''خدا پاکیزہ ہے، پاکیزگی کو پسند کرتا ہے اور پاک وصاف ہے پاکی اور صفائی کو پسند کرتا ہے، تم پاک وصاف رہا کرو اور یہودیوں کی طرح گندے نہ بنو۔''

یہ توحید کا ایک رخ تھا۔ اب اس کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کے قابل ہے۔

وہ قومیں جو توحید سے آشنا نہ تھیں انہوں نے انسانیت کا مرتبہ بھی نہیں پہچانا تھا۔ وہ انسان کو فطرت کے ہر مظہر کا غلام سمجھتی تھیں۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم توحید ہی تھی جس نے خدا کے سوا ہر شے کا خوف انسانوں کے دلوں سے نکال دیا۔ سورج سے لے کر زمین کے دریا اور تالاب تک ہر چیز آقا ہونے کے بجائے انسانوں کی غلام بن کر ان کے سامنے آئی۔ بادشاہوں کے جلال و جبروت کا طلسم ٹوٹ گیا اور وہ بابل (ومصر) ہندوایران کے خدا اور ''ربکم الاعلی'' ہونے کے بجائے انسانوں کے خادم، راعی اور چوکیدار کی صورت میں نظر آئے۔ جن کا عزل ونصب دیوتاؤں اور فرشتوں کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ انسانوں کے ہاتھ میں تھا۔

تمام انسانی برادری جس کو دیوتاؤں کی حکومتوں نے اونچے نیچے، بلند و پست، شریف وذلیل مختلف طبقوں اور ذاتوں میں منقسم کر دیا تھا اور جن میں سے کچھ کی پیدائش پرمیشور کے منہ، کچھ کی اس کے ہاتھ، اور کچھ کی اس کے پاؤں سے تسلیم کی جاتی تھی، اس عقیدے کی وجہ سے ایسی مختلف جنسوں میں بٹ گئی تھی، جن کو کسی طرح متفق نہیں کر سکتے تھے اور اس طرح مساوات انسانی کی دولت دنیا سے گم تھی اور زمین قوموں اور ذاتوں کے ظلم وجبر اور غرور وفخر کا دنگل بن گئی تھی۔ توحید نے آ کر اس اونچائی، نیچائی، بلندی و پستی اور نشیب وفراز کو برابر کیا۔ سب انسان خدا کے بندے، سب اس کے سامنے برابر، سب باہم بھائی

---

❶ صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٢؛ مسند احمد، ج ٥، ص: ١٦٠ وادب المفرد امام بخاری باب الظلم ظلمات: ٤٩٠۔

❷ جامع ترمذی، ابواب الادب، باب ماجاء فی النظافۃ: ٢٧٩٩۔

بھائی اور سب حقوق کے لحاظ سے یکساں قرار پائے۔ ان تعلیمات نے دنیا کی معاشرتی اخلاقی اور سیاسی اصلاحات میں جو کام کیا اس کے نتائج تاریخ کے صفحوں میں ثبت ہیں اور بالآخر اس اصول کی صداقت کو انہوں نے بھی تسلیم کرلیا۔ جو حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں اور اسی لیے وہ مساواتِ انسانی کے حقیقی جوہر سے بھی اب تک آشنا ہیں اور انتہا یہ ہے کہ خدا کے گھر میں جا کر بھی تفاوت درجہ کا خیال ان کے دل سے دور نہیں ہوتا۔ دولت وفقر اور رنگ وقومیت کے امتیازات خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر بھی وہ نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو تیرہ سو برس سے اس مساوات کی دولت اسی توحید کامل کی بدولت حاصل ہے اور وہ ہر قسم کے ان مصنوعی امتیازات سے پاک ہیں، اسلام کی نظر میں سب ایک خدا کے بندے ہیں اور سب یکساں اس کے سامنے سرافگندہ ہیں، دولت وفقر، رنگ روپ اور نسل وقومیت کا کوئی امتیاز ان کو منقسم نہیں کرتا۔ اگر کوئی امتیاز ہے تو صرف تقویٰ اور خدا کی فرمانبرداری کا ہے:

﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۳)

''تم میں خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے تقویٰ کرتا ہو۔''

خدا کا ڈر اور پیار

اس سلسلہ میں ایک اور اہم مسئلہ خدا سے ڈرنے اور اس سے محبت کرنے کا ہے۔ عام طور سے مخالفوں نے یہ سمجھا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے جس خدا کی تعلیم دی ہے وہ فقط قہار، جبار اور مہیب شہنشاہ مطلق ہے۔ جس کی ہیبت وجلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے اور کانپتے رہنا چاہیے۔ اس کے گوشۂ چشم میں لطف وعنایت کا گزر نہیں۔ محبت اور پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں۔ نہ وہ اپنے کمزور بندوں پر خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ وہ اپنے بندوں سے اپنے لیے محبت کا تقاضا کرتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تعلیم محمدی ﷺ کی بالکل غلط تصویر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اور صفات اوپر گزر چکے ہیں ان پر ایک ایک کر کے نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند پُر جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرتِ تامہ اور مالکیتِ عام کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام تر نام صرف محبت اور پیار، لطف اور کرم، رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں۔ مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجوہات کے سبب مغالطہ ہوا:

① آنحضرت ﷺ نے اللہ سے خوف اور خشیت کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

② دوسرے مذہبوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کے اظہار کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں، آپ ﷺ نے شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔

محبت کے ساتھ خوف وخشیت کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت اور پیار کے ساتھ خدا کے خوف وخشیت کو بھی جگہ دی ہے۔ غور کرو کہ انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہیں۔ خوف اور محبت، یہ دونوں

جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی اور ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز و تبختر اور کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد خوف ہی کے جذبہ سے ہوسکتا ہے اس لیے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل کا تعلق نہ تنہا خوف سے ہوسکتا ہے اور نہ تنہا محبت سے انجام پاسکتا ہے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے اور یہی نبوتِ محمدی ﷺ کی تعلیم ہے۔

اسلام سے پہلے جو آسمانی مذاہب قائم تھے ان میں اس مسئلہ میں بھی افراط و تفریط پیدا ہوگئی تھی اور صراطِ مستقیم سے وہ تمام تر ہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سرتاپا خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار [1] اور باپ کا بدلہ پشت ہا پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔ [2] حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے۔ [3] اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور تھی تو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہیں۔ بلکہ اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید ہے۔ [4] مگر ان دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان اعتدال ملحوظ نہیں رکھا تھا۔ اسلام نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش نظر رکھا ہے وہ نہ تو خدا کو محض جبار، قہار، رب الافواج اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسمٰعیل کا خدا مانتا ہے، نہ اس کو مجسم انسان، انسانوں کا باپ، یا محمد ﷺ کا باپ سمجھتا ہے اور نہ تنہا رحم و کرم اور محبت و شفقت کی صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یہ یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی۔ وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی، وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے۔ خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے۔ اس سے ڈرنا چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۵۵، ۵۶)

''(لوگو)! اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر چپکے چپکے پکارا کرو۔ وہ حد سے بڑھ جانے والوں کو پیار نہیں کرتا اور زمین کی درستی کے بعد اس میں فساد نہ پھیلاؤ اور اس کو اس کے عذاب سے ڈرتے ہوئے اور اس کے فضل و کرم کی لو لگاتے ہوئے پکارا کرو، بے شک خدا کی رحمت اچھے کام

[1] یرمیاہ ۳۲، ۱۴، ۱۵ وغیرہ۔ [2] خروج ۲۰، ۵، ص: ۱۱۹ و ۳۴، ۷ و استثناء ۴، ۳۴، ۷: ۱۴۴ استثناء: ۴، ۳۲: ص ۲۸۵، ۶، ۱۵ ص: ۲۸۹، ۲۹۰ وغیرہ۔ [3] خروج ۲۰، ۷: ص: ۱۱۹ و ۳۴، وزبور ۵۶۔۱ ص: ۱۰، ۳، ۱، ۸، ص: ۴، ۱۵۰ و ۱۰۳، ۸، وغیرہ میں خدا کے پیار اور رحم و کرم کا ذکر ہے۔

[4] لوقا کی انجیل ۱۲، ۵ ص: ۱۱۷ اول پطرس ۱۷، ص: ۷۷ ۳ دوم قرنیتون ۷۔۱۔ افسیون ۵، ۲۱ ص: ۱۳۱۷ الغرض خدا سے ڈرنے کی تعلیم عیسائیت میں بھی دی گئی ہے۔

کرنے والوں کے قریب رہتی ہے۔‘‘

چند نیک بندوں کی مدح میں فرمایا:

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۹۰)

’’وہ نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو امید اور ڈر کے ساتھ پکارتے تھے۔‘‘

اس سے زیادہ پُرلطف بات یہ ہے کہ اسلام خدا سے لوگوں کو ڈراتا ہے۔ مگر اس کو جبار اور قہار کہہ کر نہیں بلکہ مہربان اور رحیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے سعید بندوں کی صفت یہ ہے کہ

﴿ وَخَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (۳۶/ یٰسٓ:۱۱)

’’اور رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔‘‘

﴿ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ﴾ (۵۰/ قٓ:۳۳)

’’اور جو رحم کرنے والے سے بن دیکھے ڈرا۔‘‘

نہ صرف انسان بلکہ تمام کائنات کی زبانیں اس مہربان کے جلال کے سامنے گنگ ہیں:

﴿ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۰۸)

’’اور رحم والے کے ادب سے تمام آوازیں پست ہوگئیں۔‘‘

دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، وہ دو قسم کے تھے، ایک وہ جن کی آنکھوں کے سامنے صرف خدا کے جلال و کبریائی کا جلوہ تھا۔ اس لیے وہ صرف خدا کے خوف وخشیت کی تعلیم دیتے تھے۔ مثلاً: حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام دوسرے وہ جو محبتِ الٰہی میں سرشار تھے اور وہ لوگوں کو اسی خم خانہ عشق کی طرف بلاتے تھے۔ مثلاً: حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام۔

لیکن پیغمبروں میں ایک ایسی ہستی بھی آئی۔ جو ان دونوں صفتوں کی برزخ کبریٰ، جلال و جمال دونوں کا مظہر اور پیار اور ادب و لحاظ دونوں کی جامع تھی۔ یعنی محمد رسول اللہ ﷺ۔ ایک طرف آپ کی آنکھیں خوفِ الٰہی سے اشک بار رہتی تھیں دوسری طرف آپ کا دل خدا کی محبت اور رحم وکرم کے سرور سے سرشار رہتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ ایک ہی وقت میں یہ دونوں منظر آپ ﷺ کے چہرہ انور پر لوگوں کو نظر آجاتے۔ چنانچہ جب راتوں کو آپ شوق وولولہ کے عالم میں نماز کے لیے کھڑے ہوتے۔ قرآن مجید کی لمبی لمبی سورتیں زبانِ مبارک پر ہوتیں اور ہر معنی کی آیتیں گزرتی جاتیں جب کوئی خوف وخشیت کی آیت آتی پناہ مانگتے اور جب کوئی مہر ومحبت اور رحم وبشارت کی آیت آتی تو اس کے حصول کی دعا کرتے تھے۔ [1]

الغرض اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ خوف اور محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے

[1] مسند احمد، ج ۶، ص: ۹۳۔

گرنے کا خطرہ ہے۔ خوف وخشیت اور رحم ومحبت کے بیچ کے شاہراہ میں وہ انسانوں کو کھڑا کرے۔ اس لیے کہا گیا ہے کہ ((الایمان بین الخوف والرجاء)) ''ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے۔'' کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم وکرم سے ناامید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ لوگوں کو خودسر اور گستاخ بنا دیتا ہے۔ جیسا کہ اس عملی دنیا کے روزانہ کے کاروبار میں نظر آتا ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے نتائج کا مشاہدہ عملاً یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا جا سکتا ہے، اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنی تعلیم میں ان دونوں متضاد کیفیتوں کو ایمان اور عقیدہ کی رو سے برابر کا درجہ دیا۔ لیکن ساتھ ہی عاجز و درماندہ انسانوں کو یہ بھی بشارت سنائی کہ خدا کی رحمت کا دائرہ اس کے غضب کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ فرمایا:

﴿ وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ ؕ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۶)

''اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔''

اور اس کی تفسیر خود صاحب قرآن ﷺ نے ان الفاظ میں کی:

((رحمتی سبقت غضبی)) [1]

''میرے غضب سے میری رحمت آگے بڑھ گئی۔''

عیسائیوں نے خدا سے اپنا رشتہ جوڑا اور اپنے کو فرزند الٰہی کا لقب دیا، بعض یہودی فرقوں نے بنی اسرائیل کو خدا کا خانوادہ اور محبوب ٹھہرایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جوڑ پر حضرت عزیر علیہ السلام کو فرزند الٰہی کا رتبہ دیا، لیکن اسلام یہ شرف کسی مخصوص خاندان یا خاص قوم کو عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ تمام انسانوں کو بندگی اور اطاعت کی ایک سطح پر لا کر کھڑا کرتا ہے، مسلمانوں کے مقابلہ میں یہودیوں اور عیسائیوں دونوں کو دعویٰ تھا:

﴿ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔''

قرآن مجید نے اس کے جواب میں کہا:

﴿ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے گناہوں کے بدلہ تم کو عذاب کیوں دیتا ہے، (اس لیے تمہارا دعویٰ صحیح نہیں) بلکہ تم بھی انہیں انسانوں میں سے ہو جس کو اس نے پیدا کیا۔''

دوسری جگہ قرآن نے تنہا یہودیوں کے جواب میں کہا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۶)

---

[1] بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ: بل ھو قرآن مجید: ۷۵۵۴۔

"اے وہ جو یہودی ہو، اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ تمام انسانوں کو چھوڑ کر تم ہی خدا کے خاص چہیتے ہو، تو موت (یعنی خدا کی ملاقات) کی تمنا کیوں نہیں کرتے۔"

اسلام رحمتِ الٰہی کے دائرہ کو کسی خاندان اور قوم تک محدود نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کی وسعت میں انسانوں کی ہر برادری کو داخل کرتا ہے۔ ایک شخص نے مسجد نبوی میں آ کر دعا کی کہ "خدایا مجھ کو اور محمد ﷺ کو مغفرت عطا کر، آپ نے فرمایا: "خدا کی وسیع رحمت کو تم نے تنگ کر دیا۔" [1] ایک اور اعرابی نے مسجد میں دعا مانگی کہ خدایا مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحمت بھیج اور ہماری رحمت میں کسی کو شریک نہ کر، آپ نے صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرمایا: "یہ زیادہ گمراہ ہے یا اس کا اونٹ۔" [2]

محبت کی جسمانی اصطلاحات کی ممانعت

اس سلسلہ میں تعلیمِ محمدی ﷺ کے متعلق غلط فہمی کا دوسرا سبب جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے یہ ہے کہ بعض مذاہب نے خدا کی محبت و کرم کی تعبیر کے لیے جو مادی اور جسمانی اصطلاحیں قائم کی تھیں اسلام نے ان کی مخالفت کی اور ان کو شرک قرار دیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اسلام کا خدا رحم و کرم اور محبت اور پیار کے اوصاف سے معرا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح خدا اور بندہ کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعہ سے نمایاں ہوتے ہیں، اس بنا پر بعض مذاہب نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے بھی بہترین اسلوب سمجھا، چنانچہ کسی نے خالق اور مخلوق کے درمیان باپ اور بیٹے کا تعلق پیدا کیا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے دوسرے نے ماں کی محبت کا بڑا درجہ سمجھا۔ اس لیے اس تعلق کو ماں اور بیٹے کی اصطلاح سے واضح کیا اور دیویاں انسانوں کی ماتائیں بنیں۔ جیسا کہ ہندوؤں کا عام مذہبی تخیل ہے۔ خاص ہندوستان کی خاک میں زن و شو کی باہمی محبت کا امتیازی خاصہ ہے جس کی نظیر دوسرے ملکوں میں نہیں مل سکتی ہے، اس کی نگاہ میں محبت کا اس سے زیادہ پر اثر منظر اور ناقابل شکست پیمان کوئی دوسرا نہیں۔ اس لیے یہاں کے بعض فرقوں میں خالق و مخلوق کی باہمی محبت کے تعلق کو زن و شو کی اصطلاح سے ادا کیا گیا، "سدا سہاگ"، فقرا اس تخیل کی مضحکہ انگیز تصویر ہیں۔

یہ تمام فرقے جنہوں نے خدا اور بندہ کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعہ ادا کرنا چاہا وہ راہ سے بے راہ ہو گئے اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام کو بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا اور لفظ کی

---

[1] صحيح بخاري، كتاب الادب، باب رحمة الناس والبهائم: ٦٠١٠؛ ابوداود، كتاب الصلوة، باب الدعاء في الصلوٰة: ٨٨٢؛ مسند امام احمد، ج ٢، ص: ١٧٠، ١٧١۔

[2] ابوداود، كتاب الادب، باب من ليست له غيبة: ٤٨٨٥؛ مستدرك حاكم، ج ٤، ص: ٢٤٨۔

اصلی روح کو چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں گرفتار ہو گئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا سمجھ لیا۔ ہندوستان کے بیٹوں نے ماتاؤں کی پوجا شروع کر دی۔ سدا سہاگ فقیروں نے چوڑیاں اور ساڑیاں پہن لیں اور خدائے قادر سے شوخیاں کرنے لگے۔ اسی لیے اسلام نے جو توحید خالص کا مبلغ تھا۔ ان جسمانی اصطلاحات کی سخت مخالفت کی اور خدا کے لیے ان الفاظ کا استعمال اس نے ضلالت اور گمراہی قرار دیا۔ لیکن وہ ان الفاظ کے اصلی معنی اور منشا کو اس مجاز کے پردہ میں جو حقیقت مستور ہے اس کا انکار نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ان جسمانی معنوں کو خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے ناکافی اور غیر مکمل سمجھتا ہے اور وہ ان سے بھی زیادہ وسیع و کامل معنی کا طالب ہے:

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۰۰)

''تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔''

دیکھو کہ باپ کی طرح محبت کو وہ اپنے پروردگار کی محبت کے لیے ناکافی قرار دیتا ہے اور عبد و معبود کے درمیان محبت کے رشتہ کو اس سے اور زیادہ مضبوط کرنا چاہتا ہے۔

الغرض رحمت و محبت کے اس جسمانی طریقہ تعبیر کی مخالفت سے یہ لازم نہیں آتا، کہ اسلام سرے سے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے درمیان محبت اور پیار کے جذبات سے خالی ہے، اتنا کون نہیں سمجھتا کہ مذہب کی تعلیمات انسانوں کی بولی میں اتری ہیں۔ ان کے تمام خیالات و تصورات اسی مادی اور جسمانی ماحول کا عکس ہیں اس لیے ان کے ذہن میں کوئی غیر مادی اور غیر جسمانی تصور کسی مادی اور جسمانی تصور کی وساطت کے بغیر براہِ راست پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے لیے ان کے لغت میں کوئی ایسا لفظ مل سکتا ہے جو غیر کسی مادی اور غیر جسمانی مفہوم کو اس قدر منزہ اور بلند طریقہ سے بیان کرے، جس میں مادیت اور جسمانیت کا مطلق شائبہ نہ ہو، انسان ان دیکھی چیزوں کا تصور صرف دیکھی ہوئی چیزوں کی تشبیہ سے کرتا ہے اور اس طرح ان دیکھی چیزوں کا ایک دھندلا سا عکس ذہن کے آئینہ میں اتر جاتا ہے۔

اس ''ان دیکھی ہستی'' کی ذات و صفات کے متعلق جس کو تم خدا کہتے ہو ہر مذہب میں ایک تخیل ہے غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ تخیل بھی اس مذہب کے پیروؤں کے گرد و پیش کی اشیاء سے ماخوذ ہے لیکن ایک بلند تر اور کامل تر مذہب کا کام یہ ہے کہ وہ اس تخیل کو مادیت، جسمانیت اور انسانیت کی آلائشوں سے اس حد تک پاک و منزہ کر دے جہاں تک بنی نوع انسان کے لیے ممکن ہے خدا کے متعلق باپ، ماں اور شوہر کا تخیل اس درجہ مادی، جسمانی اور انسانی ہے کہ اس تخیل کے معتقد کے لیے ناممکن ہے کہ وہ خالص توحید کے صراط مستقیم پر قائم رہ سکے، اس لیے نبوتِ محمدی ﷺ نے ان مادی تعلقات اور جسمانی رشتوں کے ظاہر کرنے والے الفاظ کو خالق و مخلوق کے اظہار ربط و تعلق کے باب میں یک قلم ترک کر دیا بلکہ ان کا استعمال بھی شرک

قرار دیا، تاہم چونکہ روحانی حقائق کا اظہار بھی انسانوں ہی کی مادی بولی میں کرنا ہے۔ اس لیے اس نے جسمانی و مادی رشتہ کے بجائے جس کو دوسرے مذاہب نے منتخب کیا تھا اس رشتہ کے محض جذبات، احساسات اور عواطف کو خالق ومخلوق کے تعلقات باہمی کے اظہار کے لیے اسلام نے مستعار لے لیا اس طرح خالق ومخلوق کے درمیان کوئی جسمانی رشتہ قائم کیے بغیر اس نے ربط وتعلق کا اظہار کیا اور انسانوں کے استعمالات کی لفظی غلطی سے جو گمراہیاں پہلے پیش آچکی تھیں ان سے ان کو محفوظ رکھا۔ ہر زبان میں اس خالق ہستی کی ذات کی تعبیر کے لیے کچھ نہ کچھ الفاظ ہیں جن کو کسی خاص تخیل اور نصب العین کی بنا پر مختلف قوموں نے اختیار کیا ہے۔ اور گو ان کی حیثیت اب علم اور نام کی ہے، تاہم وہ درحقیقت پہلے پہل کسی نہ کسی وصف کو پیش نظر رکھ کر استعمال کیے گئے ہیں ہر قوم نے اس علم اور نام کے لیے اسی وصف کو پسند کیا ہے جو اس کے نزدیک اس خالق ہستی کی سب سے بڑی اور سب سے ممتاز صفت ہوسکتی ہے۔

اسلام نے خالق کے لیے جو نام اور عَلَم اختیار کیا ہے وہ لفظ اللہ ہے اللہ کا لفظ اصل میں کس لفظ سے نکلا ہے اس میں اہل لغت کا یقیناً اختلاف ہے۔ مگر ایک گروہ کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہ وَلَاہٌ سے نکلا ہے اور وَلَہٌ کے اصل معنی عربی میں اس ''غم محبت'' اور ''تعلق خاطر'' کے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے، اسی سے بعد میں مطلق ''عشق ومحبت'' کے معنی پیدا ہوگئے، اور اسی سے ہماری زبان میں لفظ والہ (شیدا) مستعمل ہے۔ اس لیے اللہ کے معنی محبوب اور پیارے کے ہیں جس کے عشق ومحبت میں نہ صرف انسان بلکہ ساری کائنات کے دل سرگرداں متحیر اور پریشان ہیں۔ حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ گنج مراد آبادی قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے اکثر ہندی میں فرمایا کرتے تھے، اللہ کا ترجمہ ہندی میں وہ (من موہن) یعنی ''دلوں کا محبوب'' کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید کھولنے کے ساتھ ہی خدا کی جن صفتوں پر سب سے پہلے نگاہ پڑتی ہے وہ رحمٰن اور رحیم ہیں۔ ان دونوں لفظوں کے تقریباً ایک ہی معنی ہیں یعنی ''رحم والا'' ''مہربان'' لطف وکرم والا'' ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' (یعنی مہربان محبوب رحم والا) کے ضمن میں قرآن مجید کے ہر سورہ کے آغاز میں انہیں صفات ربانی کے بار بار دہرانے کی تاکید کی گئی ہے، ہر نماز میں کئی کئی دفعہ ان کی تکرار ہوتی ہے کیا اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے متعلق اسلام کے تخیل کو واضح کرنے کے لیے کوئی دلیل مطلوب ہے۔ لفظ اللہ کے بعد اسلام کی زبان میں دوسرا علم یہی لفظ رحمٰن ہے جو رحم وکرم اور لطف ومہر کے معنی میں صفت مبالغہ کا صیغہ ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ۚ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآئیل: ۱۱۰)

''اس کو ''محبوب'' (اللہ) کہو یا ''مہربان'' (رحمٰن) کہو جو کہہ کر اس کو پکارو سب اچھے نام اسی

کے ہیں۔''

قرآن مجید نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی صد ہا بار کی تکرار کو چھوڑ کر ۵۳ موقعوں پر خدا کو اس رحمٰن کے نام سے یاد کیا ہے۔

ابھی اس سے پہلے باب میں اسمائے الٰہی کا ایک ایک حرف ہماری نظر کے سامنے سے گزر چکا ہے۔ان ناموں میں اللہ تعالیٰ کے ہر قسم کے جلالی و جمالی اوصاف آ گئے ہیں، استقصا کرو تو معلوم ہوگا کہ ان میں بڑی تعداد انہی ناموں کی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مہر و محبت کا اظہار ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ایک نام یا ایک وصف الودود (سورۂ ذات البروج میں) آیا ہے، جس کے معنی ''محبوب'' اور ''پیارے'' کے ہیں کہ وہ سرتاپا مہر و محبت اور عشق اور پیار ہے۔اس کے سوا خدا کا ایک اور نام الولی ہے جس کے لفظی معنی ''یار'' اور ''دوست'' کے ہیں، خدا کا ایک اور نام قرآن مجید میں بار بار استعمال ہوا ہے، وہ ''الرؤف'' ہے ''رؤف'' کا لفظ ''رافت'' سے نکلا ہے ''رافت'' کے معنی اس محبت اور تعلقِ خاطر کے ہیں جو باپ کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے، اسی طرح خدا کا ایک اور نام حنان ''حن'' سے مشتق ہے ''حن'' اور ''حنین'' اس سوزِ دل اور محبت کو کہتے ہیں جو ماں کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، یہ الفاظ ان مجازی اور ان مستعار معانی کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام نے خالق و مخلوق اور عبد و معبود کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے اختیار کیے ہیں، دیکھو کہ وہ ان رشتوں کا نام نہیں لیتا لیکن ان رشتوں کے درمیان محبت اور پیار کے جو خاص جذبات ہیں ان کو خدا کے لیے بے تکلف استعمال کرتا ہے۔ اس طرح مادیت اور جسمانیات کا تخیل آئے بغیر وہ ان روحانی معنوں کی تلقین کر رہا ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ نے بتایا کہ وہ غفار (بخشش کرنے والا) اور غفور (بخشنے والا) ہے۔یعنی بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے والا، وہ سلام (امن و سلامتی) ہے کہ وہ سرتاپا اپنے بے پناہ بندوں کے لیے امن اور سلامتی ہے، پھر وہ مؤمن (امن دینے والا) ہے۔وہ العدل یعنی سرتاپا انصاف ہے، وہ **العفو** (معاف کرنیوالا) ہے۔**الوھاب** (عطا کرنے والا) **الحلیم** (بردبار) **الصبور** (بندوں کی گستاخیوں پر صبر کرنے والا) **التواب** (بندوں کے حال پر رجوع کرنیوالا) **البر** (نیک اور مجسم خیر) اور **المقسط** (منصف اور عادل ہے) ان میں ہر لفظ پر ٹھہر کر ذرا غور کرو کہ اسلام کا تخیل کس قدر بلند اور برتر ہے۔

تورات کے اسفار، انجیل کے صحیفوں اور ہندوؤں کے ویدوں کے حصص کا ایک ایک ورق پڑھ جاؤ، کیا اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے پر محبت اور سراپا مہر و کرم اسماء و صفات کی یہ کثرت تم کو وہاں ملے گی؟ یہ سچ ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ کے لیے ماں اور باپ کا لفظ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی طرح استعمال کرنا جائز نہیں سمجھتا، مگر اس سے یہ قیاس کرنا غلطی ہے کہ وہ اس لطفِ احساس اور مہر و کرم کے جذبات و عواطف سے خالی ہے جن کو یہ فرقے اپنا مخصوص سرمایہ سمجھتے ہیں مگر بات یہ ہے کہ ان روحانی جذبات اور معنوی احساسات کے ساتھ وہ شرک و کفر کی اس ضلالت اور گمراہی سے بھی انسانوں کو بچانا چاہتا ہے جو ذرا سی لفظی غلط فہمی سے مجاز کو حقیقت اور استعارہ کو

اصلیت سمجھ کر پاک اور سرتاپا روحانی معنوں کو مادی اور مجسم یقین کر لیتے ہیں اور اس لیے وہ اس بلند تر توحید کی سطح سے بہت نیچے گر کر سر رشتہ حقیقت کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ متکلم ازل کا آخری پیغام لے کر آئے تھے، اس لیے ضرورت تھی کہ آپ کی تعلیم اس قسم کی لغزشوں سے پاک و مبرا ہو، روحانی حقائق کی تعبیر کے لیے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا یقیناً مادی اور جسمانی استعارات اور مجازات سے چارہ نہیں، تاہم ایک دائمی تعلیم کا یہ فرض تھا کہ وہ اپنی تعلیم کو استعمالات کی غلطیوں اور مجازات کی غلط فہمیوں سے محفوظ رکھے، چنانچہ اسلام نے اسی بنا پر ان استعارات اور مجازات کے استعمال میں بڑی احتیاط برتی ہے اور خدا کے مہر و کرم اور عشق و محبت کے تذکروں کے ساتھ ادب و لحاظ کے قواعد کو فراموش نہیں کیا ہے، قرآن مجید اور احادیث، روحانی عشق و محبت کے ان دلآویز اور ولولہ انگیز حکایات سے معمور ہیں، بااں ہمہ اسلام انسان کو بیٹا اور خدا کو (باپ) نہیں کہتا کہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لیے اس کے نزدیک یہ کوئی بلند تر تعبیر نہیں، وہ خدا کو اب باپ کی بجائے ''رب'' کہہ کر پکارتا ہے وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

''اَبٌ اور رَبٌّ'' ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل اسلام کے مطمح نظر سے کس درجہ پست ہے، اَبٌ یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے، اور پھر اس کی حیثیت بدل کر، پرورش اور حفاظت کی صورت میں وہ بچپن کے ایک محدود عرصے تک قائم رہتا ہے، اس طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے، مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص، محدود، اور فانی ہوتا ہے، بیٹے کے وجود، قیام و بقا، ضروریاتِ زندگی، سامانِ حیات، نشو و نما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ اپنے باپ سے الگ، مستقل، اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے، مگر ذرا غور کرو، کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے؟ کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بھی، بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے؟ کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے؟

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک اور پیدائش سے وفات تک، بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا، جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے، وہ گہوارہ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے انسان ذرہ ہو، یا بصورت غذا، قطرہ آب ہو، یا قطرہ خون، مضغہ گوشت ہو یا مشتِ استخوان، شکمِ مادر میں ہو یا اس سے باہر، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ عمر ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ، رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے،

اس سے لفظ ''رب'' یک قلم پاک ہے، اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

ان آیتوں اور حدیثوں کو دیکھو جن سے یہ روشن ہوتا ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے، اور وہ خمخانہ اَلَسْتُ کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے، اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے، ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت ''حب الٰہی'' ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی، زبانِ الٰہی نے شہادت دی:

﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۗ ﴾ (۲/ البقرة:١٦٥)

''جو ایمان لائے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھتے ہیں۔''

اس نشہ محبت کے سامنے باپ، ماں، اولاد، بھائی، بیوی، جان و مال، خاندان سب قربان اور نثار ہو جانا چاہیے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ ﴾ (۹/ التوبة:٢٤)

''اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ دولت جو تم نے کمائی ہے اور وہ سوداگری جس کے مندا پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جن کو تم پسند کرتے ہو خدا اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے تم کو زیادہ محبوب اور پیارے ہیں تو اس وقت تک انتظار کرو کہ خدا اپنا فیصلہ لے آئے۔''

ایمان کے بعد بھی اگر نشہ محبت کی سرشاری نہیں ملی تو وہ بھی جادۂ حق سے دوری ہے۔ چنانچہ جو لوگ کہ راہ حق سے بھٹکنا چاہتے تھے ان کو پکار کر سنا دیا گیا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ ۙ ﴾ (۵/ المآئدة:٥٤)

''مسلمانو! اگر تم میں سے کوئی اپنے دین اسلام سے پھر جائے گا تو خدا کو اس کی کچھ پروا نہیں، وہ ایسے لوگوں کو لا کھڑا کرے گا، جن کو وہ پیار کرے گا اور وہ اس کو پیار کریں گے۔''

حضرت مسیح علیہ السلام نے کہا: ''درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔'' ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تم کو زید کی محبت کا دعویٰ ہے۔ مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے، نہ تمہارے سینہ میں صدمہ فراق کی جلن ہے اور نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں، تو

کون تمہارے دعویٰ کی تصدیق کرے گا، اسی طرح خدا کی محبت اور پیار کے دعوے دار تو بہتیرے ہو سکتے ہیں۔ مگر اس غیر محسوس کیفیت کی مادی نشانیاں اور ظاہری علامتیں، اس کے احکام کی پیروی اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ خدا کے رسول کو اس اعلان کا حکم ہے:

﴿ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳/ آل عمران:۳۱)

''اگر تم کو خدا سے محبت ہے تو میری پیروی کرو کہ خدا بھی تم کو پیار کرے گا۔''

محبت کیونکر حاصل ہو، وحی محمدی نے اس رتبہ بلند کے حصول کی تدبیر بھی بتادی۔ فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ۝ ﴾

(۱۹/ مریم:۹۶)

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے رحمت والا خدا، ان کے لیے محبت پیدا کرے گا۔''

اس آیت میں محبت کے حصول کے ذریعے دو بتائے گئے ہیں ایمان اور عملِ صالح، یعنی نیک کام۔ چنانچہ طبقات انسانی میں متعدد ایسے گروہ ہیں جن کو ان ذریعوں سے خدا کی محبت اور پیار کی دولت ملی ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۳)

''خدا نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۲)

''خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

''خدا توکل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۲۔۴۹/ الحجرات:۹)

''خدا منصف مزاجوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۴)

''خدا پرہیزگاروں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ ﴾ (۶۱/ الصف:۴)

''خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کے راستہ میں لڑتے ہیں۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِينَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۶)

''اور خدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۸)

''اور خدا پاک صاف لوگوں کو پیار کرتا ہے۔''

مسند احمد میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں کو پیار نہیں کرتا، محبت ان سے کرتا ہے، جو خدا کی راہ میں خلوص نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں اور ان کو جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لیے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے محروم یہ تین ہیں۔ اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر مال بیچنے والا سوداگر۔'' [1]

دنیا کے عیش و مسرت میں اگر کوئی خیال کا کانٹا سا چبھتا ہے اور ہمیشہ انسان کے عیش و سرور کو مکدر اور مبغض بنا کر بے فکری کی بہشت کو فکر و غم کی جہنم بنا دیتا ہے تو وہ ماضی اور حال کی ناکامیوں کی یاد اور مستقبل کی بے اطمینانی ہے۔ پہلے کا نام حزن و غم ہے اور دوسرے کا نام خوف و دہشت ہے۔ غرض غم اور خوف یہی دو کانٹے ہیں جو عاجز و درماندہ انسانیت کے پہلو میں ہمیشہ چبھتے رہے ہیں، لیکن جو محبوب حقیقی کے طلب گار اور اس کے والہ و شیدا ہیں ان کو بشارت ہے کہ ان کے عیش کا چمن زار ان کانٹوں سے پاک و صاف ہوگا:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۶۲)

''ہاں خدا کے دوستوں کو نہ کوئی خوف ہے، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

محبت کا جو جذبہ بڑے کو چھوٹے کے ساتھ احسان، نیکی، درگزر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے۔ اس کا نام ''رحم'' اور ''رحمت'' ہے اسلام کا خدا تمام تر رحم ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصۂ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمٰن و رحیم ہے، جو کچھ یہاں ہے سب اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہ ہو تو کچھ نہ ہو۔ اسی لیے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گناہگار سے گناہگار کو وہ نوازنے کے لیے ہمہ وقت آمادہ و تیار ہے۔ گناہگاروں اور مجرموں کو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے میرے بندے کہہ کر تسلی کا یہ پیام بھیجتا ہے:

﴿ قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۵۳)

''اے پیغمبر! میرے ان بندوں کو پیام پہنچا دے جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ یقیناً تمام گناہوں کو بخش سکتا ہے کہ بے شک وہی بخشش کرنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔''

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت سناتے ہیں تو کہتے ہیں:

[1] مسند احمد، ج ۵، ص: ۱۷۶؛ جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة: ۲۵۶۸۔

﴿ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۵۵) ''ناامیدوں میں سے نہ ہو۔''

خلیل اللہ اس رمز سے ناآشنا نہ تھے کہ مرتبہ خلت، محبت سے مافوق ہے، جواب دیا:

﴿ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴾ (۱۵/ الحجر:۵۶)

''اپنے پروردگار کی رحمت سے گمراہ لوگوں کے سوا اور کوئی مایوس نہیں ہوتا۔''

بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی عائد نہیں مگر اس نے خود اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں، من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، وہ گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے، وہ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے، وہ قاہر ہے، وہ جبار ہے، وہ منتقم ہے، لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور بھی ہے۔ رحمان و رحیم بھی ہے، رؤف و عفو ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود بخود عائد کر لی ہے اور اپنے اوپر اس کو فرض گردان لیا ہے۔

﴿ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ﴾ (۶/ الانعام:۵۴)

''اللہ نے از خود اپنے اوپر رحمت کو لازم کر لیا ہے۔''

قاصدِ خاص کو حکم ہوتا ہے کہ ہمارے گناہ گار بندوں کو ہماری طرف سے سلام پہنچاؤ اور تسلی کا یہ پیام دو کہ اس کا بابِ رحمت ہر وقت کھلا ہے:

﴿ وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾

(۶/ الانعام:۵۴)

''اے پیغمبر! جب تیرے پاس وہ آئیں جو میری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ان کو کہہ، کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر از خود اپنے بندوں پر مہربان ہونا لازم کر لیا ہے، کہ جو کوئی تم میں سے براہِ نادانی برائی کر بیٹھے، پھر اس کے بعد بارگاہِ الٰہی کی طرف رجوع کرے اور نیک بنے، تو بے شک وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔''

قرآن کی تعلیم کے مطابق اس وسیع عرصہ کائنات کا کوئی ذرہ اس سایہ رحمت سے محروم نہیں:

﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (۷/ الاعرف:۱۵۶)

''اور میری رحمت ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔''

بخاری و ترمذی وغیرہ کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو اس نے اپنے دستِ خاص سے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کر لی۔'' [1] جامع ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آپ ﷺ

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ماجاء فی قوله: ((وهو الذی یبدء الخلق: ۳۱۹۴؛ صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة الله: ۶۹۷۱؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ۳۵۴۳۔

نے فرمایا: ''کہ اگر مومن کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کے پاس کتنا عتاب ہے تو وہ جنت کی طمع نہ کرتا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہوتا کہ خدا کی رحمت کس قدر بے حساب ہے، تو وہ جنت سے مایوس نہ ہوتا۔'' [1] یہ اسلام کے تخیل کی صحیح تعبیر ہے بارگاہ احدیت کا آخری قاصد اپنے دربار کی جانب سے گناہگاروں کو بشارت سناتا ہے کہ اے آدم کے بیٹو! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رہو گے میں تمہیں بخشتا رہوں گا خواہ تم میں کتنے ہی عیب ہوں، مجھے پروانہیں، اے آدم کے بیٹو! اگر تمہارے گناہ آسمان کے بادلوں تک بھی پہنچ جائیں اور پھر تم مجھ سے معافی مانگو تو میں معاف کردوں خواہ تم میں کتنے ہی عیب کیوں نہ ہوں مجھے پروانہیں۔ اے آدم کے بیٹو! اگر پوری سطح زمین بھی تمہارے گناہوں سے بھری ہو، پھر تم میرے پاس آؤ اس حال میں کہ کسی کو میرا شریک نہ بناتے ہو، تو میں بھی تمہارے پاس پوری سطح زمین بھر مغفرت لے کر تمہارے پاس آؤں، [2] کیا انسانوں کے کانوں نے اس رحمت، اس محبت، اس عفو عام کی بشارت کسی اور قاصد کی زبان سے بھی سنی ہے؟

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے لوگوں سے کہا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اگر تم گناہ نہ کرتے تو خدا اور مخلوق پیدا کرتا جو گناہ کرتی اور وہ اس کو بخشتا۔'' [3] یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رحم و کرم کے اظہار کے لیے گناہگاروں ہی کی تلاش ہے کہ نیکوکاروں کو تو سب ڈھونڈتے ہیں، مگر گناہگاروں کو صرف وہی ڈھونڈتا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے درمیان جو رحم و کرم اور مہر و محبت کے عناصر پائے جاتے ہیں، جن کی بنا پر دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں اور اولادوں میں میل ملاپ اور رسم و محبت ہے اور جس کی بنا پر دنیا میں عشق و محبت کے یہ شاندار مناظر نظر آتے ہیں، تم کو معلوم ہے کہ یہ اس شاہد حقیقی کے سرمایہ محبت کا کون سا حصہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصے کیے ان میں سے ایک حصہ اپنی مخلوقات کو عطا کیا، جس کے اثر سے وہ ایک دوسرے پر باہم رحم کیا کرتے ہیں باقی ننانوے حصے خدا کے پاس ہیں۔'' [4] اس لطف و کرم اور مہر و محبت کی بشارتیں کس مذہب نے انسانوں کو سنائی ہیں اور کس نے گناہ گار انسانوں کے مضطرب قلوب کو اس طرح تسلی دی ہے؟ صحیح بخاری میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ ایک شخص شراب خواری کے جرم میں بار بار گرفتار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، صحابہ نے تنگ آکر کہا، یا اللہ! تو اپنی لعنت اس پر نازل کر کہ یہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے۔ رحمۃ للعالمین کو لوگوں کی یہ بات ناپسند آئی۔ فرمایا: ''اس پر لعنت نہ کرو کہ اس کو خدا اور رسول سے محبت ہے۔'' [5] تم نے دیکھا کہ اسلام نے گناہگاروں کے لیے بھی خدا کی محبت کا دروازہ کھول رکھا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللّٰه: ٦٩٧٩؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٤٢ دیگر کتب احادیث (صحیح) [2] جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٤٠۔ [3] مسند احمد، ج ٥، ص: ٤١٤۔

[4] بخاری، کتاب الادب، باب جعل اللّٰه الرحمة فی مائة جزء: ٦٠٠٠۔

[5] بخاری، کتاب الحدود، باب مایکره من لعن شارب الخمر: ٦٧٨٠۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے ان عربوں کو جو خدا کی محبت کیا، خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا تھے۔ کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا، اور اس ذات الٰہی کے ساتھ اپنی وابستگی، محبت اور سرشاری کے لطف سے ان کو کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا۔ بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھو ٹھیک دوپہر کو عرب کی جلتی ہوئی ریت میں ان کو لٹایا جاتا ہے۔ ایک گرم پتھر ان کے سینہ پر رکھا جاتا ہے اور خدائے واحد سے انحراف کے لیے ان کو مجبور کیا جاتا ہے اور وہ یہ سب تکلیفیں اٹھا رہے ہیں مگر زبان پر صرف احد احد وہی ایک وہی ایک کا ترانہ ہے۔ [1] مکہ کا ذرہ ذرہ صدائے حق کا دشمن ہے۔ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ یہ جان کر بھی صحنِ مکہ میں جوش وحدت سے سرشار ہو کر کلمۂ توحید کا با آواز بلند اعلان کرتے ہیں، ہر طرف سے پتھروں اور ہڈیوں کی بارش ہوتی ہے۔ بعض لوگ آ کر چھڑا دیتے ہیں، دوسری صبح نمودار ہوتی ہے تو پھر وہی سرشاری ہوتی ہے اور مشرکین کی طرف سے وہی سزا ملتی ہے۔ [2]

ایک صحابی جورات کو میدان جنگ میں ایک پہاڑ پر پہرہ دینے پر متعین تھے۔ وہ اپنی نیند ٹالنے کے لیے خدا کی یاد کے لیے کھڑے ہوتے ہیں، دشمن پے در پے تین دفعہ تیر مارتا ہے جو بدن میں پیوست ہو جاتا ہے اور وہ بدستور محو نماز ہیں۔ ان کے ساتھی پوچھتے ہیں کہ تم نے نماز کیوں نہیں توڑی کہتے ہیں کہ ''جو سورہ شروع کی تھی جی نہ چاہا کہ اس کو تمام کیے بغیر چھوڑ دوں۔'' [3]

محمد رسول اللہ ﷺ کے دو جانشین عین نماز میں زخم کھا کر گرتے ہیں، مگر مقتدیوں کی صف اس حیّ و باقی کے سامنے کھڑی ہو کر ہر فانی و میت ہستی کی محبت سے بے نیاز رہتی ہے۔ اسی لیے خدا نے بشارت دی کہ ان کا محبوب خدا اور وہ خود خدا کے محبوب تھے۔ یعنی رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔ مدینہ میں ایک اللہ والے مسلمان نے وفات پائی، اس کا جنازہ اٹھا تو فرمایا: ''اس کے ساتھ نرمی کرو کہ اللہ نے بھی اس کے ساتھ نرمی کی ہے، کیونکہ اس کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی۔'' قبر کھودی جانے لگی۔ فرمایا: ''اس کی قبر کشادہ رکھو کہ خدا نے اس کے ساتھ کشادگی فرمائی۔'' اس بار بار کے اہتمام کو دیکھ کر صحابہ نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! آپ کو اس مرنے والے کی موت کا غم ہے؟ فرمایا: ''ہاں اس کو خدا اور رسول سے پیار تھا۔'' [4]

ایک دفعہ آپ نے ایک صحابی کو کسی جماعت کا افسر بنا کر بھیجا وہ جب نماز پڑھاتے تو ہر نماز میں ہر سورہ کے آخر میں قل ھو اللہ ضرور پڑھتے جب یہ جماعت سفر سے لوٹ کر آئی تو خدمت اقدس ﷺ میں یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا: ''ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟'' لوگوں نے پوچھا تو جواب دیا کہ یہ میں اس لیے کرتا ہوں کہ اس سورہ میں رحم والے خدا کی صفت کا بیان ہے تو مجھ کو اس کے پڑھنے سے محبت ہے۔ فرمایا: ''ان کو

---

[1] سیرة ابن هشام ذكر عدوان المشركين، ج۱، ص: ۱۹۵؛ اسد الغابة، ج۱، ص:۲۰۶، مصر۔

[2] طبقات ابن سعد جزء رابع، ص:۱۶۵؛ تذكرة ابی ذر غفاری وصحیح بخاری، قصة اسلام ابی ذر: ۳۸۶۱۔

[3] سنن ابی داود، كتاب الطهارة، باب الوضوء من الدم:۱۹۸؛ احمد، ۳/ ۳۴۴؛ صحیح ابن خزیمه. ۳۶؛ حاکم، ۱/ /۱۵۶۔

[4] ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ماجاء فی حفر القبر:۱۵۵۹۔

بشارت دو کہ وہ رحم والا خدا بھی ان سے محبت کرتا ہے۔'' [1] یہ بشارت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک کے سوا کسی اور نے بھی سنائی ہے؟

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت کب آئے گی؟ فرمایا: ''تم نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے؟'' نادم ہو کر شکستہ دلی سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! میرے پاس نہ تو نمازوں کا نہ روزوں کا اور نہ صدقات وخیرات کا بڑا ذخیرہ ہے جو کچھ سرمایہ ہے وہ خدا اور رسول کی محبت کا ہے اور بس۔ فرمایا: ''تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔ [2]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب خدا کسی بندہ کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریل علیہ السلام سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندہ کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو تو جبریل علیہ السلام بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔'' [3]

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے راوی ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندہ اپنی اطاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے۔ تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، وراس کی وہ آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے وہ ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور وہ پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔'' [4] یہ دولت، یہ نعمت، یہ سعادت آستانہ محمدی ﷺ کے سوا کہیں اور نہیں بٹتی۔

امام بزار نے مسند میں حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں ان لوگوں کو پہچانتا ہوں جو نبی ہیں اور نہ شہید ہیں۔ لیکن قیامت میں ان کے مرتبہ کی بلندی پر انبیا اور شہدا بھی رشک کریں گے یہ وہ لوگ ہیں جن کو خدا سے محبت ہے اور جن کو خدا پیار کرتا ہے اور اچھی باتیں بتاتے اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔'' [5] یہ قابل رشک رتبہ محمد رسول اللہ ﷺ کے سوا اور کس کے ذریعہ عطا ہوا۔

امام مالک نے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کہ خداوند تعالیٰ یہ ارشاد فرماتا ہے کہ ان کا پیار کرنا مجھ پر لازم ہے جو آپس میں ایک دوسرے کو میری محبت کے سبب سے پیار کرتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور میری محبت میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور میری محبت میں ایک

---

[1] مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین باب فضل قراءۃ قل ھو اللہ احد، :١٨٩٠ یہ واقعہ بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب الجمع بین السورتین فی رکعۃ: ٧٧٤ میں دوسری طرح مروی ہے اور اس میں رسول اللہ ﷺ کے الفاظ بھی دوسرے ہیں۔

[2] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب المرء مع من احب: ٦٧١٦؛ بخاری، کتاب الادب، باب ماجاء فی قول الرجل ویلك: ٦١٦٧۔ [3] مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب اذا احب اللہ عبدا...... : ٦٧٠٥۔

[4] بخاری، کتاب الرقاق باب التواضع: ٦٥٠٢۔ [5] اس کے ہم معنی حدیثیں ترمذی، مالک اور شعب الایمان بیہقی میں بھی ہیں؛ دیکھو مشکوۃ، کتاب الادب، باب الحب فی اللہ، فصل ثانی: ٥٠١٢؛ شرح السنۃ: ٣٤٦٤۔

دوسرے کے لیے اپنی جان و مال وقف کرتے ہیں۔" [1]

یہ محبت الٰہی کی نیرنگیاں اسلام ہی کے پردہ میں نظر آتی ہیں۔

ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: "لوگو! خدا سے محبت کرو کہ وہ تمہیں اپنی نعمتیں عطا کرتا ہے اور خدا کی محبت کے سبب مجھ سے محبت کرو اور میری محبت کے سبب میرے اہل بیت سے محبت کرو۔" [2] یہ عشق و محبت کی دعوت محبوب ازل کے سوا اور کون دے سکتا ہے؟

عام مسلمانوں میں پیغمبر اسلام کا لقب حبیب خدا ہے، دیکھو کہ حبیب و محبوب میں خلت و محبت کے کیا کیا ناز و نیاز ہیں۔ آپ خشوع و خضوع کی دعاؤں میں اور خلوت و تنہائی کی روحانی ملاقاتوں میں کیا ڈھونڈتے اور کیا مانگتے تھے۔ کیا چاہتے اور کیا سوال کرتے تھے؟ امام احمد اور بزار نے اپنی اپنی مسندوں میں، ترمذی نے جامع میں، حاکم نے مستدرک میں اور طبرانی نے معجم میں متعدد صحابیوں سے نقل کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی دعاؤں میں محبت الٰہی کی دولت مانگا کرتے تھے۔ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ محبوب اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان ہے۔ لیکن محبوب خدا کی نگاہ میں یہ چیزیں ہیچ تھیں۔ دعا فرماتے تھے: "خداوندا!

((اسئل حبك وحب من يحبك وحب عمل يقرب الى حبك)) [3]

"میں تیری محبت مانگتا ہوں اور جو تجھ سے محبت کرتا ہے اس کی محبت اور اس کام کی محبت جو تیری محبت سے قریب کردے۔"

((اللّٰهم اجعل حبك احب الى من نفسى و اهلى ومن الماء البارد)) [4]

"الٰہی تو اپنی محبت کو میری جان سے، اہل و عیال سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ میری نظر میں محبوب بنا۔"

عرب میں ٹھنڈا پانی دنیا کی تمام دولتوں اور نعمتوں سے زیادہ گراں اور قیمتی ہے۔ لیکن حضور کی پیاس اس مادی پانی کی خنکی سے نہیں سیر ہوتی تھی۔ وہ صرف محبت الٰہی کا زلال خالص تھا جو اس تشنگی کو تسکین دے سکتا تھا۔ عام انسان روٹی سے جیتے ہیں مگر ایک عاشق الٰہی (مسیح علیہ السلام) کا قول ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا" پھر وہ کون سی روٹی ہے جس کو کھا کر انسان پھر کبھی بھوکا نہیں ہوتا حضور ﷺ دعا فرماتے ہیں:

((اللّٰهم ارزقنى حبك وحب من ينفعنى فى حبك)) [5]

"خداوندا! تو اپنی محبت اور اس کی محبت جو تیری محبت کی راہ میں نافع ہے مجھے روزی کر۔"

---

[1] مستدرك حاكم، ج٤، ص: ١٦٨، ١٦٩۔

[2] ترمذى، ابواب المناقب، باب فى مناقب اهل بيت النبى ﷺ: ٣٧٨٩۔

[3] ترمذى، ابواب الدعوات: ٣٤٩٠؛ مستدرك حاكم، ١/ ٥٢٧۔ [4] ایضًا۔

[5] ترمذى، ابواب الدعوات: ٣٤٩١۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرنا ہے۔ مگر جانتے ہو کہ اس راہ کی آخری منزل کیا ہے؟ صحیحین میں ہے:

((من كان الله ورسوله احب اليه مما سواهما)) [1]

''یہ کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام ماسوا کی محبتیں ہیچ ہو جائیں۔''

بعض مذاہب کو اپنی اس تعلیم پر ناز ہے کہ وہ انسانوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ وہ اپنے خدا کو ماں باپ سمجھیں اور اس سے اسی طرح محبت کریں جس طرح وہ اپنے والدین سے کرتے ہیں اور چونکہ اسلام نے اس طریقۂ تعبیر کو اس بنا پر کہ وہ شرک کا راستہ ہے ممنوع قرار دیا ہے اس لیے ان مذاہب کے بہت سے پیرو یہ سمجھتے ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم محبت الٰہی کے مقدس جذبات سے محروم ہے۔ لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ یہ دعویٰ سرتاپا بے بنیاد ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تعلیم محمدی کی بلندی نظر اور محبت کا علوئے معیار دونوں ان مذاہب کے پیش کردہ نظر و معیار سے بہت بالاتر ہیں قرآن مجید کی یہ آیت پاک بھی اس دعویٰ کے ثبوت میں پہلے پیش کی جا چکی ہے:

﴿ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (۲/ البقرة: ۲۰۰)

''تم خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو بلکہ اس سے بہت زیادہ یاد کرو۔''

لیکن احادیث سے ہمارا یہ دعویٰ اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے، لڑائی کا میدان ہے، دشمنوں میں بھاگ دوڑ مچی ہے، جس کو جہاں امن کا گوشہ نظر آتا ہے اپنی جان بچا رہا ہے۔ بھائی بھائی سے، ماں بچہ سے، بچہ ماں سے الگ ہے۔ اسی حال میں ایک عورت آتی ہے۔ جس کا بچہ میدان حشر میں گم ہو گیا ہے۔ محبت کی دیوانگی کا یہ عالم ہے کہ جو بچہ بھی اس کے سامنے آ جاتا ہے۔ اپنے بچہ کے جوشِ محبت میں اس کو چھاتی سے لگا لیتی ہے اور اس کو دودھ پلا دیتی ہے۔ رحمۃ للعالمین کی نظر پڑتی ہے۔ صحابہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں: ''کیا یہ ممکن ہے کہ یہ عورت خود اپنے بچہ کو اپنے ہاتھ سے دہکتی آگ میں ڈال دے۔'' لوگوں نے عرض کی، ہرگز نہیں۔'' فرمایا: ''تو جتنی محبت ماں کو اپنے بچہ سے ہے خدا کو اپنے بندوں سے اس سے بہت زیادہ محبت ہے۔'' [2]

ایک دفعہ ایک غزوہ سے آپ واپس تشریف لا رہے ہیں۔ ایک عورت اپنے بچہ کو گود میں لے کر سامنے آتی ہے اور عرض کرتی ہے۔ یا رسول اللہ ﷺ! ایک ماں کو اپنی اولاد سے جتنی محبت ہوتی ہے۔ کیا خدا کو اپنے بندوں سے اس سے زیادہ نہیں ہے؟ فرمایا: ''ہاں بے شک اس سے زیادہ ہے۔'' بولی، تو کوئی ماں تو اپنی اولاد کو خود آگ میں ڈالنا گوارا نہ کرے گی۔ یہ سن کر فرط اثر سے آپ پر گریہ طاری ہو گیا، پھر سر اٹھا کر فرمایا: ''خدا صرف اس بندہ کو عذاب دیتا ہے جو سرکشی سے ایک کو دو کہتا ہے۔'' [3]

---

[1] مسلم، كتاب الايمان، باب بيان خصال من اتصف بهن وجد حلاوة الايمان: ١٦٥، ١٦٦؛ بخاري، كتاب الايمان، باب حلاوة الايمان: ١٦۔ [2] صحيح بخاري، كتاب الادب، باب رحمة الولد: ٥٩٩٩۔

[3] ابن ماجه، ابواب الزهد، باب مايرجى من رحمة الله: ٤٢٩٧۔

آپ ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما ہیں، ایک صحابی چادر میں ایک پرند کو مع اس کے بچوں کے باندھ کر لاتے ہیں اور واقعہ عرض کرتے ہیں، کہ ''یا رسول اللہ! میں نے ایک جھاڑی سے اٹھا کر کپڑے میں لپیٹ لیا، ماں نے یہ دیکھا تو میرے سر پر منڈلانے لگی، میں نے ذرا سا کپڑے کو کھول دیا تو وہ فوراً آ کر میرے ہاتھ پر بچوں پر گر پڑی'' ارشاد ہوا: ''کیا بچوں کے ساتھ ماں کی اس محبت پر تم کو تعجب ہے، قسم ہے، اس ذات کی جس نے مجھ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، جو محبت اس ماں کو اپنے بچوں کے ساتھ ہے، خدا کو اپنے بندوں کے ساتھ اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔'' [1]

ایک صاحب ایک چھوٹے بچہ کو لے کر خدمت اقدس میں حاضر ہوتے ہیں، محبت کا یہ حال تھا کہ وہ بار بار اس کو گلے سے لگائے جاتے تھے، آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا: ''کیا تم کو اس بچہ سے محبت ہے؟'' انہوں نے کہا، ہاں، فرمایا: ''تو اللہ کو تم سے اس سے زیادہ محبت ہے، جتنی تم کو اس بچہ سے ہے، وہ سب رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والے ہے۔'' [2]

جمالِ حقیقت کا پہلا مشتاق، اور مستورِ ازل کے زیرِ نقاب چہرہ کا پہلا بند کشا، زندگی کے آخری مرحلوں میں ہے، مرض کی شدت ہے، بدن بخار سے تپ رہا ہے، اٹھ کر چل نہیں سکتا، لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے، مسجد نبوی میں جان نثار حاضر ہوتے ہیں، سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کا آخری پیغام سننے کی آرزو ہے، دفعتہً لب مبارک ہلتے ہیں تو یہ آواز آتی ہے۔ ''لوگو! میں خدا کے سامنے اس بات کی براءت کرتا ہوں کہ انسانوں میں میرا کوئی دوست ہے، مجھ کو خدا نے اپنا پیارا بنایا ہے، جیسے ابراہیم کو اس نے اپنا پیارا بنایا تھا۔'' [3] یہ تو وفات سے پہلے کا اعلان تھا، عین حالتِ نزع میں زبانِ مبارک پر یہ کلمہ تھا: ''خداوندا! بہترین رفیق۔'' [4]

اللہ تعالیٰ کی کریمی و رحیمی، اس کی بیچارہ نوازی، عاجزوں اور درماندوں کی دستگیری اور اپنے گناہگار بندوں کے ساتھ اس کی شانِ بخشش کا ترانہ خود محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے کانوں سے سنا اور نادم و متاسف سیہ کاروں تک اس مژدہ کو پہنچا کر ان کے شکستہ اور زخمی دلوں پر مرہم رکھا، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت رحمۃ للعالمین نے یہ پیامِ ربانی ہم کو سنایا:

''میرے بندو! میں نے اپنے اوپر بھی اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام کیا ہے، تو ایک دوسرے پر تم ظلم نہ کیا کرو، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک گمراہ تھا، لیکن جس کو میں نے راہ دکھائی، تو مجھ سے راستہ پوچھو، میں بتاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک بھوکا تھا، لیکن

---

[1] أبوداود، کتاب الجنائز، باب الامراض المکفرة للذنوب: ۳۰۸۹۔ [2] ادب المفرد امام بخاری، باب رحمة العيال: ۳۷۷۔ [3] صحيح مسلم، كتاب المساجد، باب النهي عن بناء المساجد على القبور: ۱۱۸۸۔
[4] صحيح بخاری، كتاب المغازی، باب آخر ما تكلم به النبي ﷺ: ٤٤٦٣۔

جس کو میں نے کھلایا، تو مجھ سے کھانا مانگو میں تم کو کھلاؤں گا، اے میرے بندو! تم میں ہر ایک پیاسا تھا، لیکن جس کو میں نے پلایا، تو مجھ سے پانی مانگو، میں تم کو پلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم میں ہر ایک ننگا تھا، لیکن جس کو میں نے پہنایا، تو مجھ سے کپڑا مانگو، میں تم کو پہناؤں گا، اے میرے بندو! تم دن رات گناہ کرتے ہو اور میں سب گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے معافی مانگو، میں تم کو معاف کروں گا، اے میرے بندو! مجھے نقصان پہنچانا تمہاری طاقت میں نہیں اور نہ مجھے نفع پہنچانا تمہاری قدرت میں ہے، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے پچھلے، جن اور انس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، دنیا کے سب سے بڑے پرہیزگار کے دل کے برابر ہو جائیں تو میری شہنشاہی میں ایک ذرہ اضافہ نہ ہوگا۔ اور اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جن وانس، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت سب دنیا کے سب سے بڑے گناہگاروں کے برابر ہو جائیں، تو بھی میری شہنشاہی میں ایک ذرہ کمی نہ ہوگی، اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جن وانس، سب کسی ایک زمین میں کھڑے ہو کر مجھ سے مانگیں اور میں سب کے سوال کو پورا کروں، تو میرے خزانہ میں کچھ کمی نہ ہوگی، لیکن اتنی جتنی ایک سوئی سمندر کے پانی میں ڈال کر نکالی جائے، اے میرے بندو! تمہارے ہی عمل ہوں گے جن کو میں گن گن کر تم کو واپس کروں گا اور پورا کروں گا، تو جس کو بھلائی ملے وہ خدا کا شکر ادا کرے، اور جس کو برائی ملے وہ اپنے ہی کو ملامت کرے۔'' [1]

محبت کا یہ پُر کیف نغمہ دنیا نے محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی زبان مبارک سے سنا، یہ تسلی وتشفی کا پیام انہیں کے مبارک لبوں سے ادا ہوا، یہ عفو وکرم کے بحر بیکراں کا ساحلِ امید انہیں کے دکھانے سے ہم کو نظر آیا، اور گناہگاروں کو ''میرے بندو'' کہہ کر پکارے جانے کی عزت آپ ہی کے وسیلہ سے میسر آئی۔ (ﷺ)

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٢؛ ترمذی ابواب الزهد: ٢٤٩٥؛ مسند احمد بن حنبل، ج ٥، ص ١٦٠ و ١٧٧؛ ادب المفرد امام بخاری، باب الظلم: ٤٩٠ میں نے صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھی ہے، لیکن بعض الفاظ مسند سے لے کر بڑھا دیے ہیں، اس کے بعض بعض ٹکڑے انجیل میں بھی ملتے ہیں، (دیکھو متی ۲۵: ۲۵ تا ۴۵ ص: ۴۷، ۴۸) مگر دونوں کے ملانے سے ناقص وکامل کا فرق نمایاں ہوتا ہے جو ناقص اور کامل میں ہونا چاہیے۔

فرشتوں پر ایمان

﴿وَمَلٰٓئِکَتِہٖ﴾

ملائکہ کا لفظ جمع ہے، اس کا واحد۔ ملک، ملاک اور مالک تین طرح سے مستعمل ہے اس کے لغوی معنی قاصد اور رسول کے ہیں اسی لیے قرآن پاک میں ملائکہ کے لیے رسل کا لفظ بھی آیا ہے جس کے معنی قاصد اور ''پیام رساں'' کے ہیں، ان سے مراد وہ غیر مادی مگر مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب وعلل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں، اگر یہ عالم ایک مشین ہے تو ملائکہ اس کے انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں۔ جو خدا کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔ یعنی وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان اس حیثیت سے پیام رسانی اور سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے۔ وہ سرتاپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، گویا، ان کی خلقت ہی صرف اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے، دنیا پر رحمت یا عتاب جو کچھ نازل ہوتا ہے، وہ انہیں کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور خدا انبیا پر اپنے جو احکام اتارتا ہے، یا ان سے ہم کلام ہوتا ہے، وہ انہیں کی وساطت سے کرتا ہے۔

دنیا کے تمام مذاہب، بلکہ قدیم یونانی مصری فلسفہ میں بھی اس قسم کی ہستیوں کا وجود تسلیم کیا گیا ہے، صابی مذہب میں یہ ستاروں اور سیاروں کی صورت میں مانے گئے ہیں۔ یونانی، مصری (سکندری) فلسفہ میں ان کا نام ''عقولِ عشرہ'' (دس عقلیں) رکھا گیا ہے اور ساتھ ہی نو آسمانوں میں بھی الگ الگ ذی ارادہ نفوس تسلیم کیے گئے ہیں، بلکہ خالص یونانی فلسفہ میں بھی بعض غیر مادی ارواح مجردہ کا پتہ لگتا ہے، جن میں سے سب سے اہم لوگس کا تخیل ہے، جس سے مقصود وہ اولین ہستی ہے جس کو خدا نے تمام کائنات کی خلق کا ذریعہ اور واسطہ قرار دیا ہے اور جس کو اہلِ فلسفہ عقلِ اول سے تعبیر کرتے ہیں، پارسیوں میں ان ہستیوں کا نام ''امشاسپند'' ہے اور ان کی بے شمار تعداد قرار دی گئی ہے، یہودی ان کو ''وہیم'' کہتے ہیں اور ان میں سے خاص خاص کے نام جبریل اور میکائیل وغیرہ رکھے ہیں، عیسائی بھی ان کو انہیں ناموں سے یاد کرتے ہیں اور جبریل وروح القدس وغیرہ سے ان میں سے بعض کی تعبیر کرتے ہیں، ہندوؤں میں وہ دیوتاؤں اور دیویوں کے نام سے روشناس ہیں، جاہل عرب ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے، بہرحال یہ تمام مختلف صحیح اور غلط نام اور تعبیریں ایک ہی حقیقت کی ہیں اور جس سے مراد وہ روحانی وسائط ہیں جو صانع ومصنوعات اور خالق ومخلوقات کے درمیان اس

کے حکم سے عمل پیرا اور کارفرما ہیں۔

مذاہب سابقہ میں ان غیر مادی ذی روح مخلوق ہستیوں کی حیثیت نہایت مشتبہ تھی، وہ کبھی مخلوق بھی کہی جاتی تھیں اور کبھی وہ خدائی کے مرتبہ پر بھی بلند کر دی جاتی تھیں، ہندوؤں کے دیوتاؤں اور دیویوں کی یہی صورت تھی، پارسیوں میں امشا سپند کا بھی یہی حال تھا، کہ کبھی ان کی حیثیت فرشتوں کی تھی، کبھی وہ خدا کے مقابل بن جاتی تھیں اور کبھی خدا امشا سپندوں میں سے ایک ہو جاتا تھا، ہندوؤں کی طرح پارسیوں میں بھی وہ قابل پرستش سمجھی جاتی تھیں، ان کے نزدیک سب سے عالی رتبہ امشا سپند (۶) تھے اور ان کے تحت میں ۳۳ تھے، پھر ان میں سے ہر ایک کے ماتحت ہزاروں تھے اور چونکہ پارسی نیکی اور بدی کے دو متقابل خداؤں کے قائل تھے، اس لیے دونوں کے ماتحت اچھے اور برے فرشتوں کی بے شمار تعداد تھی، نیکی کے فرشتے براہ راست نیکی کی چیزوں کو اور برائی کے فرشتے مصیبتوں، ہلاکتوں اور بدیوں کو دنیا میں خلق کرتے تھے اور اپنے اپنے خدا کی طرف سے وہ ان اشیاء کے حاکم سمجھے جاتے تھے اور دونوں خدا اپنی اپنی فوجوں اور لشکروں کے پروں کو لے کر باہم نبرد آزما رہتے تھے، یہ بھی ان کا اعتقاد تھا کہ ہر امشا سپند یا نر فرشتہ کے ساتھ ایک یزدیعنی مادہ فرشتہ بھی ہوتی تھی، جو اس کی بیوی ہوتی تھی، ہندوؤں میں نر دیوتاؤں اور مادہ دیویوں کا تصور تھا، مگر ان نر و مادہ ہستیوں میں کسی نر کو کسی مادہ سے خصوصیت خاص نہ تھی، بلکہ ہر ایک جنس کا ہر فرد دوسری جنس کے ہر فرد سے لطف اندوز ہو سکتا تھا، یہودیوں میں ان فرشتوں کی حیثیت ایسی تھی کہ ان کی تقدیس اور ثنا و صفت خدا سے مشتبہ ہو جاتی تھی، نظر آنے والے فرشتہ کی تعظیم کی جاتی تھی، اس کے آگے جھکا جاتا تھا اور اس کو خداوند کہہ کر خطاب اس طرح کیا جاتا تھا کہ کہیں کہیں یہ شبہہ ہو جاتا ہے کہ خدا مخاطب ہے یا فرشتہ، (تکوین ۱۶، ۱۳ و ۱۸، ۲، ۳، ۲۲) وہ کبھی کبھی خدا کے بیٹے بھی کہے جاتے تھے، (تکوین ۶۔۲)، عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً: روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہو کر تثلیث کا رکن ہے۔

صابیوں میں ان فرشتوں کی قربانی کی جاتی تھی، ان کے ہیکل بنائے جاتے تھے اور ان کو مظہر خدا تسلیم کیا جاتا تھا، عربوں میں فرشتے مادہ سمجھے جاتے تھے، وہ خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارے جاتے تھے اور ان کی پرستش ہوتی تھی اور سمجھا جاتا تھا کہ وہ خدا کے دربار میں سفارشی ہوں گے، یونانیوں میں عقلِ اول اور عقولِ عشرہ تمام عالم کے خالق و کارفرما و مرجعِ کل مانے گئے اور خدا کو معطل ٹھہرایا گیا۔

اسلام نے آ کر ان تمام عقائد کو مٹا دیا، خدائی اور ربوبیت کی ہر صفت سے وہ محروم بنائے گئے، ان کی پرستش و عبادت قطعاً ناجائز کی گئی، نر و مادہ کی مادی جنسیت سے پاک کیے گئے اور انسانوں کو ان پاک مخلوقات کی غلامی و بندگی سے آزاد کیا گیا، ان کی تعداد و شمار و درجات بندی کا کوئی تخیل باقی نہیں رکھا گیا، ان کی ہستی خدائے تعالیٰ کے سامنے ایک سراپا مطیع و فرمانبردار غلام کی قرار دی گئی جس کا شب و روز کام صرف آقا کا حکم بجا

لاتا ہے، عالم میں ان کا کسی قسم کا تصرف نہیں مانا گیا اور نہ نیکی و بدی کی دو تقسیمیں کی گئیں، نہ وہ الگ الگ جنس مخلوقات کے حاکم و منتظم قرار دیے گئے، قرآن میں ان کی ہستی صرف اس حیثیت سے تسلیم کی گئی کہ یہ غیر مادی ذی روح مخلوقات ہیں، جن کا کام خدا کی حمد و ثنا، اطاعت و فرمانبرداری ہے اور خالق اور اس کے مخلوقات کے درمیان وہ پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں اور اس کے حکم کے مطابق وہ اس کی مخلوقات کے اس کارخانہ کو چلا رہے ہیں، لیکن اس چلانے میں خود ان کی ذاتی مرضی اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں ہے، اسی لیے قرآن پاک نے ان کا خطاب یہودیوں کی طرح ''خداوند'' نہیں مقرر کیا، نہ پارسیوں کی طرح ان کو ''قابل پرستش'' کے لقب سے ملقب کیا، نہ ہندوؤں کی طرح دیو اور دیوتا اور دیوی کہا، بلکہ صرف ''ملک'' اور ''رسول'' کے الفاظ استعمال کیے جن کے لفظی معنی فرستادہ، قاصد، پیغام رساں اور ایلچی کے ہیں، بلکہ قرآن نے آغازِ خلقتِ انسانی کے قصہ میں یہ حقیقت واضح کر دی کہ ملائکہ اس لائق نہیں کہ آدم ان کو سجدہ کرے، بلکہ آدم میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ملائکہ کا مسجود بنے اور وہ مرتبہ علم میں ان سے فوق ٹھہرایا گیا، خدا کی جس تسبیح و تقدیس کا ان کو دعویٰ تھا، اس کے باوجود جب انسان کا جوہر طبیعت انہوں نے پہچانا تو یہ تسلیم کرنا پڑا:

﴿ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴾

(۲/ البقرۃ:۳۲)

''تو پاک ہے ہم کو کوئی علم نہیں، لیکن وہ جو تو نے ہم کو سکھایا، بے شک تو جاننے والا اور حکمت والا ہے۔''

اس قصہ نے شروع ہی میں یہ واضح کر دیا کہ وہ ہستیاں جن کو دوسرے مذاہب نے انسانوں کا دیوتا، انسانوں کا خداوند اور کبھی خدا کا ہمسر اور متصرفِ مطلق قرار دیا تھا، اسلام میں ان کی حیثیت انسان کے مقابلہ میں کیا ہے؟ انسان اور فرشتے خدا کے سامنے برابر کے مخلوق و بندہ اور عاجز و درماندہ ہیں، انسانوں کو مادی اشیاء پر حکومت خاص بخشی گئی کہ اپنے نفع و نقصان کے لیے ان سے کام لے سکیں اور ملائکہ کو اپنے حضور میں متعین فرمایا کہ وہ آسمان و زمین اور پوری مملکت الٰہی میں اس کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اسباب و علل کا ایک سلسلہ پیدا کیا ہے جو ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے لوگ انہیں ظاہری اسباب و علل کو دیکھ کر دھوکا کھاتے ہیں اور ان کی پرستش کرنے لگتے ہیں، مثلاً: آگ جلاتی اور روشن کرتی ہے، اس کو دیکھ کر آتش پرست اور مادہ پرست یقین کرتے ہیں کہ خود اس آگ میں جلانے کی طاقت ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ آتش پرست اس کے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، مادہ پرست گو اپنا سر اس کے آگے نہیں جھکاتے مگر ان کا دل جھک جاتا ہے اور یہ ایمان رکھتے ہیں کہ یہ طاقت خود اسی آگ کے اندر ہے۔ کچھ لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ جلانے کی طاقت آگ میں نہیں بلکہ اس کا ایک مستقل دیوتا یا فرشتہ ہے جو اس پر حکمران ہے،

یہ لوگ اس آگ کے فرمانروا کے سامنے جھک جاتے ہیں، اسلام کے نظریہ توحید نے اس شرک کو بھی مٹایا اور بتایا کہ آگ اور آگ کا اگر کوئی فرشتہ ہے تو وہ کل کے کل اسی ایک رب العالمین اور فرمانروائے ارض وسماء کے حکم کے تابع ہیں، اسی کے آگے جھکنا چاہیے اور اسی کی بندگی کرنی چاہیے۔

اسلام میں فرشتوں کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا جواب ان نصوص سے مل سکتا ہے، جو ان کے کاموں کے متعلق قرآن میں مذکور ہیں، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان سے مراد وہ غیر مادی ذی روح ہستیاں ہیں جو احکام اور پیغام الٰہی کو دنیائے خلق تک پہنچاتے اور نافذ کرتے ہیں اور ان اسباب وعلل کو جن کو مادہ پرست ذاتی طور پر موثر جانتے ہیں اور جن کو بت پرست، دیوتاؤں کا کرشمہ سمجھتے ہیں، ان کو فرشتے احکام الٰہی کے مطابق کام میں لگاتے ہیں اور مرضی الٰہی کو پورا کرتے ہیں۔

عقلی حیثیت سے یہ عقیدہ بھی اسی طرح قبول اور انکار کے قابل ہے جس طرح عقلیات کے دوسرے عقائد اور نظریے ہیں، جن کی تصدیق یا تکذیب، عقل کی دسترس سے باہر ہے، اس لیے اس عقیدہ کو یہ کہہ کر کوئی رد کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ یہ خلاف عقل ہے، بلکہ جس طرح قیاسات اور عقلی نکتہ پردازی سے دوسرے عقلی مباحث کا فیصلہ کیا جاتا ہے، وہی یہاں بھی کارگر ہے، اشیاء میں خصائص اور لوازم کے وجود اور ان کے اسباب وعلل کا مسئلہ عقلا میں ہمیشہ اختلافات کا دنگل رہا ہے اور یہ معمہ آج بھی اسی طرح لاینحل ہے، جس طرح پہلے دن تھا، اس کا حل سائنس کی مادی تحقیقات اور تجربوں کی طاقت سے باہر ہے اور فلسفہ بھی اس کی گتھی کے سلجھانے سے عاجز ہے، اس لیے اگر حکمائے ملحدین کی شاہراہ سے الگ ہٹ کر اس کے حل کی کوئی صورت ارباب مذاہب نے نکالی ہے، تو وہ محل اعتراض نہیں ہو سکتی اور نہ وہ خلاف عقل کہی جا سکتی ہے، کائنات کے حوادث میں جس طرح مادی علل واسباب کارفرما ہیں، اسی طرح ان سے بالاتر روحانی علل واسباب بھی ساتھ ساتھ کارفرما ہیں، ان دونوں قسم کے توافق سے حوادث کا وجود ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ انسان اکثر مادی علل و اسباب موجود ہونے یا نہ ہونے کے باوجود کامیاب یا ناکام ہوتا ہے اور اس کا نام ''بخت واتفاق'' رکھتا ہے، حالانکہ مسئلہ علل واسباب کو ماننے کے بعد بخت واتفاق کوئی چیز نہیں، رہ جاتا۔ یہی روحانی علل واسباب ہیں جن کا سررشتہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان فرشتوں کو سپرد کیا ہے، جو فرمانبردار چاکروں کی حیثیت سے اس نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، ہمارے اور دوسرے متکلمین اور حکماء کے درمیان فرق یہ ہے کہ وہ ملائکہ کی تعبیر اسباب وعلل کے ''قوائے طبعی'' سے کرتے ہیں اور ہم ان کے ''قوائے روحانی'' سے۔ اس تقریر کا یہ منشا نہیں ہے کہ اشیاء میں خواص اور طبائع اور اس مادہ کی ملکیت میں مقررہ طبعی اصول وقوانین موجود نہیں ہیں اور نہ یہ منشا ہے کہ خود اشیاء اور مادہ کے ذرات کے اندر کوئی خواص وطبائع اور مادہ کے اجزائے عنصری کے اندر بالطبع کوئی اصول ودیعت نہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی اندازہ (تقدیر) کے مطابق ہر چیز کے خصائص وطبائع اور

اصول وقوانین مقرر کر کے ملائکہ کو حکم دیا ہے کہ وہ ان کو انہیں اصول وطبائعِ مقررہ کے مطابق چلاتے رہیں۔ سمجھنے کے لیے اس کی صحیح مثال خود انسان بلکہ ہر جاندار ہستی ہے، مخلوقات کی دو قسمیں ہیں، ذی روح اور غیر ذی روح، ذی روح مخلوقات کے اکثر افعال وحرکات، اس کی روح کی ارادی قوت کی وساطت سے انجام پاتے ہیں، وہی روح اس کے ہاتھ پاؤں اور تمام اعضاء بلکہ ہر عضو کے ایک ایک رگ وریشہ پر حکمران اور مسلط ہے، بایں ہمہ وہ روح اصولِ مقررہ کے تحت ہی ان اعضاء سے کام لیتی ہے اور ان اصول سے باہر نہیں جاتی، اسی طرح غیر ذی روح اشیاء میں ابروباد سے لے کر دریا اور پہاڑ اور سورج اور چاند تک پر ارواح مقرر ہیں، جو ان اشیاء سے خدا کے اصولِ مقررہ کے اندر یکساں افعال وحرکات کا صدور کراتی ہیں، جس طرح ہماری روح اپنے اعضاء اور اعضاء کے ذریعہ سے مادہ میں جو تغیرات پیدا کرتی ہے، وہ اشیاء کے مقررہ خواص وطبائع ہی کے سہارے کرتی ہے، اسی طرح ملائکہ بھی انہیں مقررہ خواص وطبائع کے ذریعہ ہی اپنے مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں۔

الغرض جس طرح ہمارے ارادی افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان ہماری انسانی ارواح ونفوس واسطہ ہیں، اسی طرح تمام عالمِ مخلوقات اور کائنات کے افعال اور حکمِ الٰہی کے درمیان یہ ملکوتی ارواح اور نفوسِ مجردہ واسطہ ہیں اور جس طرح ہماری انسانی ارواح کی اس وساطت سے خدا کی حکومت علی الاطلاق پر کوئی اعتراض نہیں واقع ہوتا، اسی طرح ان ملکوتی ارواح کی وساطت سے بھی خدا کی علی الاطلاق حکومت میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا، یہیں سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے، کہ ہمارے ارادی افعال میں اختلافات کی اتنی نیرنگیاں نظر آتی ہیں، مگر ہمارے اور عالمِ کائنات کے تمام نوعی افعال میں اختلافات اور نیرنگیوں کے بجائے یکسانی، ہم رنگی اور عدمِ اختلاف پایا جاتا ہے، کیونکہ انسان نے ارادہ پا کر کسی قدر ذاتی اختیار پالیا ہے اور یہی ذاتی اختیار اس کے افعالِ اختیاری کی ذمہ داری، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور جس کی بنا پر وہ اپنی اطاعت کے ذریعہ سے ثواب اور عصیان کر کے عتاب کا مستحق ہو جاتا ہے، مگر دنیا کی یہ ملکوتی ارواح مجردہ یعنی یہ ملائکہ، ذاتی ارادہ اور اختیار سے تمام تر محروم ہو کر صرف اطاعت، فرمانبرداری اور انقیاد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، اس لیے ان میں عصیان، تمرد، سرکشی اور حکمِ الٰہی سے انحراف کی کوئی صلاحیت نہیں ہے، اسی بنا پر اشیاء کے تمام نوعی افعال وحرکات وخصائص میں یکسانی، ہم رنگی اور عدمِ اختلاف پایا جاتا ہے اور یہی فطرت، طبیعت اور نوعی خاصیت کی اصطلاحات کی صورت میں ہمارے لیے دھوکے اور اشتباہ کا باعث بن گئی ہے۔

① اب ہم کو تعلیماتِ نبوی ﷺ یعنی آیات واحادیث سے ملائکہ کی حقیقت کو روشن کرنا چاہیے، ملائکہ کی سفارت وپیام رسانی، یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا اور ان میں ان کا بے اختیار ہونا، ان دو آیتوں سے ثابت ہوتا ہے:

﴿ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ۞ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ

﴿ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۵۔۷۶)

''خدا ہی ہے جو فرشتوں اور آدمیوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے، بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے اور ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام کاموں کا مرجع خدا ہی ہے۔''

یعنی پیام رسانی اور سفارت کے سوا ان کو اصل حکم میں کوئی دخل نہیں، اختیارات سب خدا کے ہاتھ میں ہیں اور وہی تمام امور وانتظامات کا مرجع کل ہے، دوسری جگہ ہے:

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَاعِلِ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيْٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۭ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا ۚ وَمَا يُمْسِكْ ۙ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ﴾

(۳۵/ فاطر:۱، ۲)

''حمد ہو اس خدا کی جو آسمانوں کا اور زمین کا پیدا کرنے والا اور فرشتوں کو دو دو تین تین اور چار چار شہپر بازوؤں والے پیام رساں بنانے والا ہے، وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے، وہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ لوگوں کے لیے رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہ غالب ودانا ہے۔''

اس آیت پاک میں بھی یہی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، کہ یہ ملائکہ سفارت اور درمیانگی کے علاوہ اور کوئی اختیار نہیں رکھتے، رحمت کے دروازوں کا کھولنے والا اور بند کرنے والا صرف خدا ہی ہے، یہ تعلیم اس غلط عقیدہ کی تردید میں ہے کہ ان فرشتوں کو دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی ذاتی دخل ہے، یا ان میں الوہیت اور ربوبیت کا کوئی شائبہ بھی ہے، یا وہ پرستش کے قابل بھی ہیں، یا ان کی دہائی بھی مانگنی چاہیے۔

② ملائکہ خدا کے احکام کو دنیا میں جاری کرتے ہیں، سورۂ انفال میں ہے:

﴿ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ ﴾ (۸/ الانفال:۱۲)

''(یاد کر) جب تیرا پروردگار فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔''

﴿ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝ ﴾ (۹۷/ القدر:۴)

''اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں۔''

وہ جس طرح احکام لے کر اترتے ہیں، اسی طرح دربار الٰہی تک عروج بھی کرتے ہیں:

﴿ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ ﴾ (۷۰/ المعارج:۴)

’’فرشتے اور روح اس تک چڑھتے ہیں۔‘‘

موت کے وقت روح کا قبض کرنا انہی سے متعلق ہے:

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۱۱)

’’کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر ہے، وہ تم پر موت طاری کرے گا۔‘‘

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْۤا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ ﴾

(۶/ الانعام:۹۳)

’’اور اگر دیکھو تم جب گناہ گار موت کے سکرات میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھوں کو پھیلائے ہوں کہ نکالو اپنی جانوں کو۔‘‘

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ ﴾ (۸/ الانفال:۵۰)

’’اور اگر دیکھو جب فرشتے کافروں کو موت دے رہے ہوں۔‘‘

اس کے ہم معانی اور بھی کئی آیتیں ہیں، ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق موت وفنا کی تدبیر انہیں روحانی علل واسباب کی ہستیوں سے متعلق ہے۔

دنیا میں کسی شے کے وجود، انقلاب اور فنا کے لیے کسی ایک علت وسبب کا وجود کافی نہیں ہے، بلکہ ضروری ہے کہ اس کے متعلقہ علل واسباب کی تمام کڑیاں باہم پیوستہ اور ایک دوسرے کی معاون ہوں اور موانع اور عوائق معدوم ہوں، یہ متعلقہ علل واسباب کا توافق اور موانع کا انسداد تدبیر ہے، جو بحکم الٰہی ان ملائکہ کے سپرد ہے۔ [1] اسی لیے کبھی اس تدبیر کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے، ﴿ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ ﴾ ’’وہ کام کی تدبیر کرتا ہے۔‘‘ اور کبھی اس کو ملائکہ کی طرح منسوب کرتا ہے:

﴿ وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ۙ وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا ۙ وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا ۙ فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا ۙ فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا ۘ ﴾ (۷۹/ النازعات:۱۔۵)

’’ڈوب کر (روحوں کے) کھینچنے والوں کی قسم ہے (رگوں کی) گرہوں کو کھولنے والوں کی قسم ہے، (اس فضائے آسمانی میں) تیرنے والوں کی، پھر دوڑ کر (مادی اسباب وعلل پر) آگے بڑھ جانے والوں کی، پھر کام کی تدبیر کرنے والوں کی۔‘‘

③ یہی ملائکہ خدا اور رسولوں کے درمیان بھی سفیر ہیں:

﴿ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۵۱)

’’یا خدا آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے، کہ اپنا ایک سفیر بھیجتا ہے، تو وہ (اس خدا کی اجازت

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ:۳۲۰۸ میں ہے کہ رحم نسوانی پر ایک فرشتہ مقرر ہے جو بچہ کی نسبت قضائے الٰہی کو تحریر کرتا ہے۔

سے جو) وہ (خدا) چاہتا ہے، وحی کرتا ہے۔''

دوسری جگہ ہے:

﴿ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ ﴾ (۱۶/ النحل:۲)

''خداروح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے۔''

خاص آنحضرت ﷺ کے متعلق ہے:

﴿ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۹۷)

''بس اس (جبریل فرشتہ) نے اس قرآن کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا۔''

④ یہ لوگوں پر بشارت اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں:

﴿ وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى قَالُوْا سَلٰمًا ﴾ (۱۱/ ھود:۶۹)

''ہمارے سفیر ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت لے کر اترے۔''

اسی طرح حضرت زکریا اور مریم علیہما السلام کو انہوں نے بشارت دی:

﴿ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم:۱۹)

''میں تیرے پروردگار کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں۔''

حضرت لوط علیہ السلام کے پاس ان کی قوم کی بربادی کے لیے جاتے ہیں۔

﴿ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ ﴾ (۱۱/ ھود:۸۱)

''انہوں نے کہا، اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں۔''

اس کے بعد یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم پر کوہ آتش فشاں کا منہ کھول دیتے ہیں اور تمام قوم برباد ہو جاتی ہے، یہ کام اگرچہ فرشتوں نے انجام دیا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے اس فعل کو خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے، کہ وہ فرشتوں کے ذاتی اختیار کے بجائے خدا ہی کے حکم سے ہوا تھا:

﴿ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ﴾

(۱۱/ ھود:۸۲)

''جب ہمارا حکم آیا، تو ہم نے اس کے اوپر کو نیچے اور نیچے کو اوپر کر دیا (یعنی زمین الٹ دی) اور اس پر تہ بہ تہ پتھروں کی بارش کی۔''

⑤ فرشتے انسانوں کے اعمال کی نگہبانی اور نگرانی کرتے ہیں اور ان کے ثواب اور گناہ کے کاموں کو محفوظ رکھتے ہیں:

﴿ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ۝ ﴾

(۸۲/ الانفطار:۱۰-۱۲)

''بے شک تم پر نگہبان ہیں، جو بزرگ ہیں، لکھنے والے ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو وہ اس کو جانتے ہیں۔''

﴿ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴾ (۵۰/ ق:۱۸)

''کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے۔''

﴿ سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ ۝ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ﴾ (۱۳/ الرعد:۱۰، ۱۱)

''تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے، یا زور سے کہے، یا وہ رات میں چھپے، یا دن کو کرے، خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے، خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔''

﴿ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴾

(۶/ الانعام:۶۱)

''اور وہ خدا تم پر نگران بھیجتا ہے، یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے قاصد اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے۔''

⑥ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطے ہیں:

﴿ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ۭ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴾

(۲۱/ الانبیآء:۱۰۳)

''نیکو کاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غمگین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے، کہ یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔''

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰۗؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ﴾

(۴۱/ فصلت:۳۰، ۳۱)

''جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔''

﴿ هُوَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ عَلَيْكُمْ وَمَلٰۗىِٕكَتُهٗ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۴۳)

''وہی خدا تم پر رحمت بھیجتا ہے اور اس کے فرشتے۔''

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰۗىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۵۶)

''اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔''

﴿ وَيَسْتَغْفِرُونَ لِمَنْ فِي الْأَرْضِ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:٥)

''اور جو زمین میں ہیں، ان کے لیے وہ خدا سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔''

اسی طرح وہ بدکاروں پر لعنت بھی کرتے ہیں:

﴿ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴾

(٣/ آل عمران: ٨٧)

''ان کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔''

﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴾

(٢/ البقرة:١٦١)

''جو کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے۔''

⑦ جنت اور دوزخ کا کاروبار بھی ملائکہ کے زیر اہتمام ہوگا:

﴿ وَسِيقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا فُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ ﴾ (٣٩/ الزمر:٧١)

''اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے دوزخ کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے، تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے چوکیدار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے۔''

﴿ وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا ۖ حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ ﴾ (٣٩/ الزمر:٧٣)

''اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔''

﴿ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ ۝ سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ ۚ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾

(١٣/ الرعد:٢٣، ٢٤)

''اور جنتیوں پر فرشتے ہر دروازہ سے داخل ہو ہو کر کہیں گے، تم پر سلامتی ہو، یہ تمہارے صبر کا بدلہ ہے، یہ کیسا اچھا عاقبت کا گھر ہے۔''

﴿ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ ﴾ (٦٦/ التحريم:٦)

''دوزخ پر سخت دل طاقتور فرشتے مقرر ہیں۔''

﴿ وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً ﴾ (۸٤/ المدثر:۳۱)

''ہم نے دوزخ کا اہل کار فرشتوں ہی کو بنایا ہے۔''

⑧ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ قدس کے حاضر باش ہیں:

﴿ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾

(۳۹/ الزمر:۷۵)

''اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں مصروف ہوں گے۔''

﴿ لَا يَسَّمَّعُوْنَ اِلَى الْمَلَاِ الْاَعْلٰى ﴾ (۳۷/ الصّافات:۸)

''اعلیٰ اہل دربار کی باتیں وہ (شیاطین) نہیں سن سکتے۔''

﴿ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۢ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝ ﴾ (۳۸/ صٓ:٦۹)

''مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔''

قیامت کے دن بھی یہ تخت الٰہی کے حامل اور اس بارگاہ کے حاضر باش ہوں گے، جو ہر وقت اس کے ہر حکم کو بجا لانے کے لیے تیار رہیں گے:

﴿ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ۭ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ۝ ﴾

(٦۹/ الحآقۃ:۱۷)

''اور فرشتے زمین کے کناروں پر کھڑے ہوں گے اور تیرے پروردگار کے تخت کو آٹھ (فرشتے) اس دن اپنے اپنے اٹھائے ہوں گے۔''

﴿ كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ۝ وَّجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ۝ ﴾

(۸۹/ الفجر:۲۱، ۲۲)

''ہرگز نہیں، جب زمین ریزہ ریزہ کر دی جائے گی اور تیرا رب تشریف فرما ہوگا اور فرشتے قطار در قطار آئیں گے۔''

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا ﴾ (۷۸/ النبا:۳۸)

''جس دن روح اور فرشتے صف باندھے کھڑے ہوں گے۔''

⑨ فرشتے خدا سے سرکشی اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور ہمیشہ اس کی تہلیل و تقدیس اور حمد و ثنا میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے جلال و جبروت سے ڈرتے اور کانپتے رہتے ہیں اور خدا کے حضور میں اہل

زمین کے لیے عموماً اور نیکوکاروں کے لیے خصوصاً مغفرت کی دعا مانگا کرتے ہیں:

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۵)

''اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشائش کی دعا مانگا کرتے ہیں، ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔''

یعنی یہ دھوکا نہ ہو کہ ان کی دعا ہی رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے، بلکہ بخشش اور رحمت کرنے والا صرف وہی خدائے واحد ہے اور یہ بخشش و رحمت اسی کے دست اختیار میں ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۷)

''جو (فرشتے) عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے پاس ہیں، وہ سب اپنے پروردگار کی حمد اور تسبیح کرتے ہیں اور اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان لانے والوں کی بخشائش کی دعا کرتے ہیں۔''

﴿ وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ ۝ۚ يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۱۹، ۲۰)

''آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور جو اس کے پاس ہیں (یعنی فرشتے) وہ اس کے سامنے اپنی عبودیت کے اظہار سے غرور نہیں کرتے اور نہ اس کی عبادت سے تھکتے ہیں، وہ رات دن خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سست نہیں پڑتے۔''

﴿ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ۙ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ ﴾

(۲۱/ الانبیآء:۲۶۔۲۸)

''بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں، جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں............ اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں۔''

﴿ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ ﴾ (۶۶/ التحریم:۶)

''خدا ان کو جس بات کا حکم دیتا ہے، وہ اس میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔''

﴿ وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ ﴾ (۱۳/ الرعد:۱۳)

''اور بجلی کی کڑک اور فرشتے خدا کے ڈر سے اس کی حمد وتسبیح کرتے ہیں۔''

﴿ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ۝ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۝ ﴾

(١٦/ النحل:٤٩، ٥٠)

''اور آسمانوں میں اور زمین میں جو چار پائے اور فرشتے ہیں، وہ سب خدا کو سجدہ کرتے ہیں اور اس کے سامنے اپنی بڑائی نہیں کرتے، وہ اپنے مالک سے جو ان کے اوپر ہے ڈرتے رہتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے۔''

گزر چکا ہے کہ ملائکہ کا اعتقاد دنیا کے تمام مذاہب اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے، لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی باتیں ایسی داخل تھیں جو توحید کامل کے منافی تھیں، اسکندریہ کے نو افلاطونی فلسفہ کی رو سے عقل اوّل کی اضطراری پیدائش اور وجود کے بعد خدا کو معطل ٹھہرا کر فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا، عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے اور انہیں کو عالم میں فرمانروا جانتے تھے، یہود بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور ان کو کبھی کبھی خداؤں کا درجہ دے دیتے تھے، جیسا کہ توراۃ (صحیفۂ تکوین ١٦، ١٣ و ١٨، ۲ و ٣، ٢٢) کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے، ان کو وہ ''خدا کے بیٹوں'' کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے، (تکوین ٦، ٢) ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے اور دوسری طرف وہ اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے ''چھوٹے خداؤں'' کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، عیسائیوں میں ان میں سے بعض مثلاً: روح القدس خدا کا ایک جزو تسلیم ہوتی تھی اور ان کی تثلیث کا ایک رکن تھی، عربوں میں وہ خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے، وہ ان کی پوجا کرتے تھے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے، تعلیم محمدی نے ان تمام عقائد باطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدہ کی تردید کر دی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں، ان کو خدائی کا کوئی اختیار حاصل نہیں، وہ صرف خدا کی اطاعت اور عبادت اور اسی کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کو جو کام سپرد ہے، وہ اسی کو انجام دیتا ہے، وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں، وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں اور نہ خدا کے بلا اذن وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں اور نہ خدا کے سامنے وہ کچھ عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں، یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، قرآن نے ان دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، نہ وہ مرد ہیں، نہ عورت ہیں، نہ وہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، نہ وہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں، وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں:

﴿ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ

يَعْمَلُونَ ۝ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُونَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ۭ كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۲۶۔۲۹)

''مشرکوں نے کہا کہ مہربان خدا نے اپنا لڑکا بنایا ہے اور وہ اس سے پاک ہے، بلکہ یہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں، جو بات میں اس پر پیش دستی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں، خدا اس سے جو ان کے آگے اور پیچھے ہوتا ہے، واقف ہے، وہ شفاعت نہیں کرتے، لیکن اسی کی جس کے لیے خدا پسند کرتا ہے اور وہ خدا کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں، ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا ہوں تو اس کو بھی اسی طرح ہم جہنم کی سزا دیں گے ایسی ہی ہم ظالموں کو سزا دیتے ہیں۔''

﴿ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۡ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ڟ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ۝ ﴾ (۴/ النسآء:۱۷۱، ۱۷۲)

''خدا تو ایک ہی ہے وہ اس سے پاک ہے کہ اس کے کوئی اولاد ہو، آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اس کی ملکیت ہے اور خدا کافی وکیل ہے، مسیح کو اس سے عار نہ ہوگا کہ وہ خدا کا بندہ ہے اور نہ مقرب فرشتوں کو اس سے عار ہے اور جو لوگ اس کی عبادت سے عار اور غرور کریں گے تو ان سب کو وہ اپنے پاس اکٹھا کرے گا۔''

﴿ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۸۰)

''خدا اس کا حکم تم کو نہیں دیتا کہ تم فرشتوں کو اور پیغمبروں کو خدا بناؤ، کیا تم کو مسلمان ہونے کے بعد کفر کرنے کا حکم دے گا۔''

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيْعًا ثُمَّ يَقُوْلُ لِلْمَلٰۗىِٕكَةِ اَهٰٓؤُلَاۗءِ اِيَّاكُمْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

(۳۴/ سبا:۴۰، ۴۱)

''اور جس دن وہ سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے کہے گا کہ کیا یہ مشرکین تمہیں کو پوجتے

تھے، وہ کہیں گے پاک ہے تو، تو ہمارا والی ہے، وہ نہیں ہیں، بلکہ وہ جنوں کو پوجتے تھے، اکثر انہیں جنوں پر ایمان لائے۔''

﴿ یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِکَةُ صَفًّا ۗ لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ۝ ﴾

(۷۸/ النبا:۳۸)

''جس دن روح اور فرشتے صف بستہ خدا کے سامنے کھڑے ہوں گے، تو کچھ نہ بول سکیں گے لیکن وہ جس کو وہ مہربان اجازت دے اور وہ ٹھیک بات کہے۔''

﴿ وَکَمْ مِّنْ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی ۝ ﴾ (۵۳/ النجم:۲۶)

''اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتی، لیکن اس کے بعد کہ خدا جس کو اجازت دے اور پسند کرے۔''

﴿ اَفَاَصْفٰکُمْ رَبُّکُمْ بِالْبَنِیْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِکَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّکُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِیْمًا ۝ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِیَذَّکَّرُوْا ؕ وَمَا یَزِیْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ۝ قُلْ لَّوْ کَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ کَمَا یَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰی ذِی الْعَرْشِ سَبِیْلًا ۝ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا ۝ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْهِنَّ ؕ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۴۰۔۴۴)

''کیا تمہارے لیے خدا نے بیٹوں کو پسند کیا اور خود فرشتوں میں سے لڑکیاں اپنے لیے پسند کیں، تم یقیناً بہت بڑی بات منہ سے نکالتے ہو اور ہم نے قرآن میں پھیر پھیر کر سمجھنے کی باتیں بیان کی ہیں، لیکن یہ ان کی نفرت کو اور بڑھاتا ہے، کہہ دوا ے پیغمبر! کہ اگر اس ایک خدائے برحق کے ساتھ اور بھی چند خدا ہوتے، تو اس تخت والے خدا کی طرف وہ راستہ ڈھونڈتے (کہ اس کے ہاتھ سے حکومت چھین کر خود قبضہ کر لیں) یہ مشرک جو کہتے ہیں خدا اس سے بلند و برتر ہے ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے، وہ اس کی تسبیح پڑھتے ہیں۔''

﴿ وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِکَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا ؕ اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ ؕ سَتُکْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَیُسْئَلُوْنَ ۝ وَقَالُوْا لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ ؕ مَا لَهُمْ بِذٰلِکَ مِنْ عِلْمٍ ۗ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ ۝ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۱۹، ۲۰)

''اور ان مشرکوں نے فرشتوں کو جو رحمت والے خدا کے بندے ہیں، عورتیں بنا دیا، کیا وہ ان کی پیدائش کے وقت حاضر تھے؟ ہم ان کی گواہی لکھیں گے اور ان سے اس کی باز پرس کی جائے گی اور انہوں نے کہا کہ اگر خدا چاہتا تو ہم ان فرشتوں کو نہ پوجتے انہیں اس کا تحقیقی علم نہیں، وہ

صرف اٹکل لگاتے ہیں۔"

قرآن پاک میں اس مفہوم کی اور بہت سی آیتیں ہیں، مگر یہاں استقصا مقصود نہیں۔

یہودیوں کا خیال تھا کہ فرشتے کھاتے پیتے بھی ہیں، چنانچہ توراۃ میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے آنے کا ذکر ہے، یہ بھی مذکور ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا "اور انہوں نے کھایا" (تکوین ۱۸، ۸) لیکن قرآن پاک نے اسی قصہ کو دہرا کر یہ تصریح کر دی کہ وہ ان انسانی ضرورتوں سے پاک ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا سامان کیا، مگر:

﴿ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ﴾ (۱۱/ هود:۷۰)

"جب ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ وہ کھانے کو ہاتھ نہیں لگاتے، تو اس کو وہ انجان معلوم ہوئے اور دل میں ڈرا، انہوں نے کہا ڈر نہیں، ہم لوط کی قوم کی طرف (ان کے تباہ کرنے کے لیے) بھیجے گئے ہیں۔"

کفار قریش کا مطالبہ تھا، کہ انسان کے بجائے کوئی فرشتہ پیغمبر بنا کر کیوں نہیں بھیجا گیا، اس کے جواب میں کہا گیا:

﴿ وَ لَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّ لَلَبَسْنَا عَلَیْهِمْ مَّا یَلْبِسُوْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:۹)

"اگر ہم پیغمبر کو فرشتہ بنا کر بھیجتے تو (آدمیوں کے لیے) اس کو آدمی ہی بناتے، تو جس شبہ میں اب ہم نے ان کو ڈالا ہے اسی میں وہ پھر بھی پڑے رہتے، (یعنی یہی کہتے کہ تم فرشتہ نہیں ہو بلکہ آدمی ہو)"

اس آیت اور دوسری آیتوں میں سے ملکوتیت اور بشریت کی قوتوں کا اختلاف ظاہر ہے، تاہم وہ کبھی کبھی عارضی طور سے انسان کے مثالی لباس میں بھی جلوہ گر ہوتے ہیں، جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام وغیرہ کے قصوں میں ہے:

﴿ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِیًّا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم:۱۷)

"وہ فرشتہ ایک اچھے خاصے بشر کی مثالی صورت میں ظاہر ہوا۔"

اور یہی وہ صورت تھی جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے انسان ہونے کا دھوکا ہوا اور ان کے لیے دعوت کا سامان کیا، مگر یہ دھوکا جلد دفع ہو گیا کہ وہ انسان کی مثالی صورت میں فرشتے ہیں۔ ان تمام تفصیلات کے بعد یہ غور کرنا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام کا کیا مقصود ہے؟ حقیقت میں اس سے دو باتیں مقصود ہیں۔

① ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بت پرست اقوام اور دوسرے اہل مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا، اس غلط عقیدہ کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے، جب تک اس کی تصریح نہ ہوئی، کلمہ توحید کی تکمیل ممکن نہ تھی۔

② دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادہ کے خواص وطبائع کو دیکھ کر مادہ پرست انہیں مادی خواص وطبائع کی بالذات کارفرمائی کا اہل یقین کرتے ہیں، اس کا ازالہ کیا جائے کیونکہ یہی پتھر ان کی ٹھوکر کا باعث ہوتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک ان کو لے جاتا ہے اور حقیقت ان مادی خواص وطبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں، جو خدا کے حکم سے اس کے مقررہ اصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں، مادہ اور اس کے خواص بالذات مؤثر نہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواح مجردہ کے ذریعہ ان کو مؤثر بناتا ہے، اس عقیدہ سے مادیت کا بت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے، غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام وشرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواح مجردہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

رسولوں پر ایمان

﴿ وَرُسُلِهٖ ﴾

یہ عقیدہ اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسی کے ذریعہ سے انجام کو پہنچتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے وجود مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے، تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کے لیے وہی منتخب کی گئی ہے اور اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں اور رہیں گی، اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیویوں کا مسکن اور ہماری زبان خدا کی خاص مقدس زبان ہے، بابل ونینوا ہو یا مصر و یونان، ایران ہو یا آریہ ورت ہندوستان، ہر ملک اور ہر قوم کو بجائے خود تنہا خدا کی مقدس اور برگزیدہ مخلوق ہونے کا دعویٰ تھا اور وہ صرف اپنے ہی کو خدا کے پیغام اور خطاب سے مشرف ہونے کا مستحق جانتے تھے لیکن تعلیم محمدی نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرہ کو دنیا کی عظیم الشان وسعت میں بدل دیا۔ آپ ﷺ نے یہ سکھایا کہ ''دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں نہ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے۔'' [1] ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو! تم سب ایک ہی باپ (آدم) کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے پیدا ہوا تھا۔'' [2] اسی طرح یہ بھی تعلیم دی کہ انسانوں اور قوموں کا امتیاز رنگ روپ ملک و مرز بوم اور زبان سے نہیں ہے بلکہ صرف تقویٰ اور نیکوکاری سے ہے۔ [3] اس تعلیم کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان فراموش ہوگئی، دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہوگیا، بنی اسرائیل جن کو اپنے خدا کا کنبہ ہونے پر ناز تھا۔ وحی محمدی ﷺ نے ان کی اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا:

﴿ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۸)

''بلکہ تم بھی خدا کی مخلوقات میں سے بشر ہو۔''

بنی اسرائیل کو دعویٰ تھا کہ نبوت اور پیغمبری صرف ہمارے ہی خاندان کا ورثہ ہے جس طرح اس آریہ ورت کا دعویٰ ہے کہ خدا کی بولی صرف یہیں کے رشیوں اور نبیوں نے سنی اور وہ صرف وید کے اوراق میں محفوظ ہے، اسی طرح دوسری قوموں کو بھی اپنی جگہ یہی خیال تھا۔ اسلام نے اس تخصیص کو خدا کے انصاف، عدل وکرم اور اس کی رحمتِ عام کے منافی قرار دیا اور کہہ دیا:

﴿ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۴)

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج۵، ص: ۴۱۱۔ [2] جامع ترمذی، ابواب المناقب: ۳۹۵۵۔
[3] قرآن میں ہے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (۴۹/ الحجرات:۱۳)

''یہ نبوت اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہے دے اور اللہ بڑی مہربانی والا ہے۔''

﴿ قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ أَن يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِندَ رَبِّكُمْ ۗ قُلْ إِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۞ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۞ ﴾ (۳/ آل عمران:۷۳، ۷۴)

''کہہ دو کہ ہدایت، اللہ کی ہے (اسرائیلی علما اپنے ہم مذہبوں سے کہتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ) جیسا دین تم کو دیا گیا ہے کسی اور کو دیا جائے یا یہ نئے دین والے تم سے خدا کے آگے جھگڑ سکیں کہہ دو کہ یہ (نبوت کا فضل) اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے اور اللہ کی رحمت سب پر عام ہے اور وہ اپنی مصلحتوں کو اچھی طرح جانتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے، وہ بڑا فضل والا ہے۔''

﴿ مَّا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۞ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۰۵)

''اہل کتاب میں جو منکر ہیں وہ یہ نہیں پسند کرتے اور نہ مشرکین پسند کرتے ہیں کہ تم پر تمہارے پروردگار کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو اور اللہ اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے مخصوص کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔''

اس نے یہ تعلیم دی کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں، ہر قوم میں اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے، اس کی آواز پہنچانے والے اور انسانوں کو ان کی غفلت سے چونکانے والے پیغمبر یا نائب پیغمبر بن کر آئے اور یہ سلسلہ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت تک برابر جاری رہا۔ بعثتِ محمدی ﷺ سے پہلے دنیا کی کل آبادی مختلف گھرانوں میں بٹی ہوئی اور ایک دوسرے سے ناآشنا تھی۔ ہندوستان کے رشیوں اور منیوں نے آریہ ورت سے باہر کی دنیا کو خدا کی آواز سننے کا کبھی مستحق نہیں سمجھا تھا، ان کے نزدیک پرمیشور صرف آریہ ورت کی ہدایت اور راہنمائی کا خواہاں تھا۔ زردشت نے پاک نژادانِ ایران کے سوا سب کو یزداں کے جلوہ نورانیٰ سے محروم یقین کیا۔ بنی اسرائیل اپنے خانوادہ کے سوا کہیں اور کسی نبی یا رسول کی بعثت کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ عیسائی صرف اپنے کو خدا کی فرزندی کا مستحق سمجھتے تھے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر بتایا کہ خدا کی ہدایت اور راہنمائی کے ظہور کے لیے کسی ملک، قوم اور زبان کی تخصیص نہیں اس کی نگاہ میں عرب و عجم اور شام و ہند سب برابر ہیں، محمد رسول اللہ ﷺ کی ہمہ بین آنکھوں نے پورب، پچھم، اتر، دکھن ہر ملک اور ہر قوم میں خدا کا نور دیکھا اور ہر زبان میں اس کی آواز سنی۔

﴿ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ ﴾ (۱۰/ یونس:٤٧)

''اور ہر قوم کے لیے ایک رسول ہے۔''

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا ﴾ (۱٦/ النحل:٣٦)

''اور یقیناً ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا۔''

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا اِلٰی قَوْمِهِمْ ﴾ (۳۰/ الروم:٤٧)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کتنے رسول ان کی اپنی اپنی قوم میں بھیجے۔''

﴿ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ ﴾ (۱۳/ الرعد:۷)

''اور ہر قوم کے لیے ایک راہنما آیا۔''

﴿ وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ۝ ﴾ (۳۵/ فاطر:٢٤)

''کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار کرنے والا نہ آیا ہو۔''

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ ﴾ (١٤/ ابراھیم:٤)

''اور ہم نے پہلی قوموں میں کتنے پیغمبر بھیجے اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی میں بھیجا، تاکہ وہ ان کو بتا سکے۔''

اس آخری آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ رسول کی یہ تعلیم الٰہی تشریح و بیان کے لیے مامور ہے۔

ایک یہود کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی اور کو پیغمبر ماننا ضروری نہیں، ایک عیسائی تمام دوسرے پیغمبروں کا انکار کر کے بھی عیسائی رہ سکتا ہے، ایک ہندو تمام دنیا کو ملیچھ، شودر اور چنڈال کہہ کر بھی پکا ہندو رہ سکتا ہے، ایک زردشتی تمام عالم کو بحرِ ظلمات کہہ کر بھی نورانی رہ سکتا ہے اور وہ ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا کہہ کر بھی دین داری کا دعویٰ کر سکتا ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ ناممکن کر دیا ہے کہ کوئی ان کی پیروی کا دعویٰ کر کے ان سے پہلے کے کسی پیغمبر کا انکار کر سکے۔ آنحضرت ﷺ تہجد میں جو دعا پڑھتے تھے، اس میں ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا ((وَالنَّبِيُّوْنَ حَقٌّ وَمُحَمَّدٌ حَقٌّ)) [1] ''سب نبی برحق تھے اور محمد بھی برحق ہے۔'' غرض کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک اس سے پہلے وہ موسوی یا عیسوی اور سلیمانی داؤدی نہ بن لے اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور راہنمائی سے سرفراز کیا ہے، ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا خدا کا ماننا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ

[1] صحیح بخاری، کتاب التهجد، باب التهجد باللیل: ۱۱۲۰۔

بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٥٠ـ١٥٢)

''بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانیں گے اور بعض کو نہیں مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ اس کے بیچ بیچ میں کوئی راستہ پکڑیں وہی حقیقت میں کافر ہیں اور کافروں کے لیے ہم نے اہانت والا عذاب تیار کر رکھا ہے اور جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان رسولوں میں سے کسی کو الگ نہیں کیا وہ ان کو ان کی مزدوری ان کو دے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔''

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ ﴾ (٢/ البقرۃ:١٧٧)

''اور فرشتوں پر، کتاب پر اور سب نبیوں پر ایمان لانا نیکی ہے۔''

﴿ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ ﴾

(٤/ النساء:١٣٦)

''اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں اور قیامت کا انکار کیا، وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔''

سورۂ بقرہ کے خاتمہ میں ہے:

﴿ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ ﴾

(٢/ البقرۃ:٢٨٥)

''ہر ایک خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا، ہم خدا کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

﴿ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٨٥)

''ہم ان پیغمبروں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔''

پیغمبروں میں تفریق کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ان میں سے بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں، اسلام نے اس کی ممانعت کی اور عام حکم دیا کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں خدا کا رسول، صادق اور راست باز تسلیم کیا جائے۔

یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے۔ یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لیے اگر اسلام کی راہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نام نہ آئے تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو جائیں، مگر اسلام نے کبھی یہ ننگ گوارا نہیں کیا اور جب تک کسی یہودی سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، معصومیت اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا، اس کو اپنے دائرہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بہت سے یہود آپ کی رسالت اور شریعت پر ایمان لانے کو تیار تھے، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے، آنحضرت ﷺ نے ان کی دوستی کے عظیم الشان فائدوں سے محرومی قبول کی، مگر مسیح علیہ السلام کی سچائی سے محرومی قبول نہ فرمائی [1] اور ان سے صاف کہا:

﴿ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۵۹)

''اے یہود! کیا بیر ہے تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم خدا پر، اور جو ہماری طرف اتارا گیا ہے اور جو پہلے اتارا گیا اس پر ایمان رکھتے ہیں تم میں اکثر بے حکم ہیں۔''

خود قریش کا یہ حال تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام سے چڑھتے تھے، مگر ان کی خاطر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت، تقدس اور معصومیت سے انکار نہیں کیا گیا، قرآن نے کہا:

﴿ وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ۝ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۵۷۔۵۹)

''اور جب مریم کے بیٹے کی کہاوت بیان کی گئی تب ہی تیری قوم اس سے چلانے لگتی ہے اور بولی کہ ہمارے معبود اچھے ہیں یا وہ، یہ نام جو تجھ پر دھرتے ہیں صرف جھگڑنے کو بلکہ وہ جھگڑالو ہیں، وہ تو ایک بندہ ہے جس پر ہم نے فضل کیا۔''

قریش کو معلوم تھا کہ اسلام عیسیٰ ابن مریم کو بندہ اور رسول مانتا ہے خدا نہیں، باوجود اس کے عیسائیوں کی طرح مسلمانوں کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے کی وجہ سے عیسیٰ پرست تصور کر کے الزام دھرتے تھے، قرآن نے ان کے اس بے معنی اعتراض کی تردید کی۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں، طبرانی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا مبعوث ہوئے، ایک دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے۔ قرآن پاک میں نام کے ساتھ

[1] تفسیر ابن جریر طبری، ج۶، ص: ۱۶۷، مصر۔

صرف انہیں انبیا علیہم السلام کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے۔ قرآن میں بعض ایسے انبیا بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے مگر یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، مثلاً: حضرت ہود اور حضرت شعیب علیہما السلام بعض ایسے ہیں جن کو وہ جانتے تھے لیکن ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کرتے تھے، مثلاً: حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام۔ وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

اسی سلسلہ میں ایک اور واقعیت کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے۔ اسلام سے پہلے نبوت و رسالت اور پیغمبری کی کوئی خاص، واضح اور غیر مشتبہ حقیقت دنیا کے سامنے نہ تھی۔ یہود کے ہاں نبوت کے معنی صرف پیشین گوئی کرنے کے تھے اور نبی پیشین گو کو کہتے تھے اور جس کے متعلق یقین رکھتے تھے کہ اس کی دعا یا بددعا فوراً قبول ہو جاتی ہے [1] اسی لیے حضرت ابراہیم، حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہم السلام کی نبوت اور رسالت کا محض دھندلا سا خاکہ ان کے ہاں موجود ہے بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں شام کے کاہن مالک کی پیغمبرانہ شان ان کے نزدیک زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے [2] حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کی حیثیت بھی ان کے ہاں صرف بادشاہ کی ہے اور ان کے زمانہ کے پیشین گوئی کرنے والے پیغمبر اور ہیں، یہی سبب ہے کہ یہود کے قصوں اور کتابوں میں اسرائیلی پیغمبروں کی طرف نہایت نحیف باتیں بے تامل منسوب کی گئی ہیں اسی طرح عیسائیوں میں بھی رسالت اور نبوت کی کوئی واضح حقیقت نہیں ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ ''مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے۔'' [3] موجودہ انجیلوں میں نہ خدا کے رسولوں کی تعریف ہے، نہ ان کے تذکرے ہیں، نہ ان کی سچائی اور صداقت کی گواہی ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام جن کے تذکرے انجیل میں ہیں وہ بھی پیغمبرانہ شان کے ساتھ ان کے ہاں مسلم نہیں لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے آ کر اس جلیل القدر منصب کی حقیقت ظاہر کی اور اس کے فرائض بتائے اور اس کی خصوصیات کا اظہار کیا اور ان سب پر ایمان لانا نجات کا ضروری ذریعہ قرار دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ نبوت و رسالت خاص خاص انسانوں کو خدا کا بخشا ہوا ایک منصب ہے جس کو دے کر وہ دنیا میں اس غرض سے بھیجے گئے ہیں کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو بتائیں اور سچائی اور نیکی کا راستہ ان کو دکھائیں وہ ہادی (راہنما) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف بلانے والے) مبشر (خوش خبری سنانے والے) معلم (سکھانے والے) مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) اور نور (روشنی) تھے۔ خدا ان سے ہم کلام ہوتا تھا اور اپنی باتوں سے ان کو مطلع کرتا تھا اور وہ ان سے دوسرے انسانوں کو آگاہ کرتے تھے، وہ گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ تھے، وہ خدا کے نیک اور مقبول بندے تھے اور اپنے عہد کے سب سے بہترین انسان تھے، ان کے سب کام خدا کے لیے تھے اور خدا ان کے لیے تھا۔ یہ ہستیاں اپنے فرائض کو انجام دینے کے لیے ہر قوم میں پیدا ہوئیں

---

[1] دیکھو: تورات صحیفہ تکوین، باب: ۲۰۔۷۔ [2] سفر تکوین: ۱۴۔۱۸۔ [3] انجیل۔

جنہوں نے ان کو مانا انہوں نے نجات پائی اور جنہوں نے جھٹلایا ہلاک و برباد ہوئے، قرآن پاک نے ان کی زندگی کے سوانح، ان کی تبلیغ کی روداد، ان کے اخلاق کی بلند مثالیں اور ان کی خدا پرستی کا اخلاص اس طرح بیان کیا ہے کہ ان کے پڑھنے اور سننے سے ان کی پیروی کا جذبہ، ان کی اتباع کا شوق اور ان کی صداقت کا یقین دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ان کی طرف شان نبوت کے خلاف جو غلط باتیں دوسرے صحیفوں میں منسوب ہیں ان کو چھوڑ دیا ہے یا ان کی تردید کر دی ہے۔

الغرض نبوت اور رسالت کی سب سے اہم خصوصیت اسلام نے جو یہ قرار دی کہ نبی و رسول گناہوں سے پاک اور برائیوں سے محفوظ اور معصوم ہوتے ہیں بنی اسرائیل کو نبوت اور رسالت کے اس بلند تخیل کی ہوا بھی نہیں لگی تھی اس لیے انہوں نے نہایت بے باکی سے اپنے پیغمبروں کی طرف ہر قسم کے گناہ منسوب کر دیے، عیسائی ایک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تو معصوم کہتے ہیں باقی سب کی گناہگاری کے قائل ہیں لیکن اسلام نے دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کی عظمت کی ایک ہی سطح قائم کی ہے، اس کے نزدیک گناہوں سے پاکی اور عصمت تمام انبیا اور مرسلین کا مشترکہ وصف ہے کہ جو خود گناہگار ہے وہ گناہگاروں کی راہنمائی کا مستحق نہیں کہ اندھا اندھے کو راہ نہیں دکھا سکتا اس بنا پر محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی و تعلیم نے خدا کے تمام معصوم رسولوں کی عظمت و جلالت دنیا میں قائم کی اور جن کور باطنوں نے ان کی عصمت و بے گناہی کے دامن پر اپنے وہم و نادانی سے داغ لگائے تھے ان کو دھو کر پاک و صاف کیا اور یہ رسالت محمدی ﷺ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

خود انجیل کے طرز سے ظاہر تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام احکام عشرہ کے برخلاف اپنی ماں کی عزت نہیں کرتے تھے تو قرآن نے اس کی تردید کی اور خود حضرت عیسیٰ کی زبان سے کہلوایا:

﴿ وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم : ۳۲)

''اور اپنی ماں کے ساتھ نیکی کرنے والا اور مجھ کو خدا نے جبار و بدبخت نہیں بنایا۔''

کیونکہ احکام عشرہ کے مطابق ماں باپ کا ادب نہ کرنا بدبختی تھی، اسی طرح موجودہ انجیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سر پر تھوپا ہے کہ وہ نماز و روزہ کی پروانہ کرتے تھے، قرآن نے ان کی زبان سے کہلوایا:

﴿ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِن رُّوحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ﴾ (٦٦/ التحریم:۱۲)

''اور مریم بنت عمران جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے پروردگار کی باتوں اور اس کی کتابوں کو سچ جانا اور وہ بندگی کرنے والوں میں تھی۔''

یہود حضرت سلیمان علیہ السلام کو گنڈہ، تعویذ اور عملیات وغیرہ کا موجد سمجھتے تھے، حالانکہ سحر و جادو وغیرہ توراۃ میں شرک قرار دیا جا چکا تھا اور قرآن نے اعلانیہ یہودیوں کے اس الزام کی تردید کی:

﴿ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۰۲)

''اور سلیمان نے کفر کا کام نہیں کیا بلکہ شیطانوں نے کیا، لوگوں کو وہ جادو سکھاتے تھے۔''

اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام پر بدکاری کا جو الزام یہود لگاتے ہیں، اس کی تردید کی۔

اوپر گزر چکا ہے کہ قرآن نے یا آنحضرت ﷺ نے دنیا کے تمام پیغمبروں کے نام نہیں لیے ہیں کہ صرف ناموں کی فہرست یا نامعلوم اشخاص کے نام لینے سے دلوں میں جوش عقیدت پیدا نہیں ہو سکتا، تاہم معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی صدائے دعوت ایک دن دنیا کے کناروں تک پہنچے گی اور بہت سی غیر قومیں اور دوسرے انبیا علیہم السلام کی امتیں اس حلقہ میں داخل ہوں گی اور اپنے اپنے انبیا علیہم السلام کا نام و نشان صحیفہ محمدی ﷺ میں تلاش کریں گی، اس لیے ایک جامع آیت میں تمام انبیا کا تذکرہ کر دیا گیا اور ان کی صداقت کی پہچان بتا دی گئی، فرمایا:

﴿ اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ۝ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٣-١٦٥)

''ہم نے (اے محمد ﷺ) تمہارے پاس وحی بھیجی جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے بعد کے پیغمبروں کو بھیجی، ہم نے ابراہیم کو اور اسماعیل کو اور اسحاق کو اور یعقوب کو اور ان کے خاندان کو اور عیسیٰ کو اور ایوب کو اور یونس کو اور ہارون کو اور سلیمان کو، وحی بھیجی اور داؤد کو زبور عطا کی اور دوسرے رسولوں کو بھیجا، جن کا حال تم سے ہم نے پہلے بیان کیا ہے اور ان رسولوں کو جن کا حال ہم نے تم سے بیان نہیں کیا اور خدا نے موسیٰ سے بات کی اور ان رسولوں کو خوشخبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا، تاکہ لوگوں کو رسولوں کے آ جانے کے بعد خدا کے آگے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے اور خدا غالب اور دانا ہے۔''

انبیا کے متعلق یہی حقیقت سورۂ مومن میں دوبارہ بیان کی گئی ہے:

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۭ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٧٨)

''اور ہم نے یقیناً تم سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے، ان میں کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان کیا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا حال تم سے بیان نہیں کیا۔''

تعلیمِ محمدی ﷺ کے اصول کے مطابق یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی قوموں اور ملکوں جیسے چین، ایران اور ہندوستان میں بھی آنحضرت ﷺ سے پہلے خدا کے انبیا مبعوث ہو چکے ہیں اس لیے یہ تمام قومیں اپنے جن بزرگوں کی عزت و عظمت کرتی ہیں اور اپنے دین و مذہب کو ان کی طرف منسوب کرتی ہیں ان کی صداقت اور راستبازی کا قطعی انکار کوئی مسلمان نہیں کر سکتا، اسی بنا پر بعض علما نے ہندوستان کے کرشن اور رام [1] کو بلکہ ایران کے زردشت [2] کو بھی اور بعض صاحبوں نے تو بودھ تک کو بھی پیغمبر کہا ہے، بہر حال امکان میں تو شک ہی نہیں لیکن یقین کے ساتھ ان ناموں کی تعیین بھی حد سے تجاوز کرنا ہے، اصل یہ ہے کہ قرآن نے انبیا کی دو قسمیں کی ہیں، ایک وہ جن کے ناموں کی اس نے تصریح کی ہے اور دوسرے وہ جن کے نام اس نے بیان نہیں کیے، اس لیے صحیح یہ ہے کہ جن انبیا علیہم السلام کے نام مذکور ہیں تمام مسلمانوں کو ان پر نام بنام ایمان لانا چاہیے اور جن کے نام مذکور نہیں ان کی نسبت صرف یہ اجمالی ایمان کافی ہے کہ ان قوموں میں بھی خدا کے فرستادہ اور پیغمبر آئے لیکن بہ تخصیص ان کے نام نہیں معلوم، وہ قومیں جن کا نام لیتی ہیں ان کی زندگی اور ان کی تعلیم نبوت اور رسالت کی شان کے مطابق ہے تو ان کی نبوت اور رسالت کی طرف رجحان اور میلان بلکہ قرینہ غالب ہو سکتا ہے لیکن یقین اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے پاس ان باتوں پر یقین کرنے کا ذریعہ صرف وحیِ محمدی ہے اور وہ اس تخصیص و تعیین سے خاموش ہے۔ اس قسم کے انبیا علیہم السلام جن کے نام گو قرآن میں مذکور نہیں مگر وہ آنحضرت ﷺ سے پہلے گزر چکے ہیں اور ان کے پیرو ان کو اپنے ہاں نبوت و رسالت کا یہ درجہ دیتے ہیں، ان کی شناخت اور پہچان کا ایک اصول قرآن نے مقرر کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کی تعلیم دی ہے:

﴿ وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ ﴾

(۱۶/ النحل:۳۶)

''اور ہم نے ہر قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی پرستش کرو اور جھوٹے معبود سے بچے رہو۔''

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ۝ ﴾

(۲۱/ الانبیآء:۲۵)

''اور ہم نے تجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا لیکن اس کو یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی خدا نہیں، مجھ کو پوجو۔''

اس لیے وہ تمام قدیم رہبرانِ انسانی اور راہنمایانِ عالم جو دنیا میں کسی مذہب کو لائے ہوں اور جن کی

[1] کلماتِ طیبات حضرت شاہ مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ ۔ مکتوب چہارم ص: ۲۷ تا ۳۰۔

[2] ملل و نحل لابن حزم، الکلام علی الیہود، ج:۱، ص: ۱۱۳۔

تبلیغ اور تعلیم توحید کی دعوت اور بت پرستی سے اجتناب تھی اور ان کی زندگی اس تعلیم کے شایان شان تھی ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی قوم کے اور اپنے وقت کے رسول اور پیغمبر نہ تھے کہ اتنی بڑی بڑی قومیں خود قرآن کے اصول کی بنا پر انبیا اور رسولوں کے وجود سے خالی نہیں رہ سکتی تھیں۔ اس بنا پر اسلام کی ان تلقینات میں سے جن کے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا ایک یہ ہے کہ وہ تمام ملکوں کے پیغمبروں اور تمام قوموں کے رسولوں کو جو حضرت خاتم نبوت ﷺ کے زمانے سے پہلے پیدا ہوئے یکساں صداقت کے ساتھ تسلیم کرے، ان سب نے تمام دنیا کو ایک ہی تعلیم دی ہے اور وہ توحید ہے البتہ ان انبیا علیہم السلام میں سے ایک کو دوسرے پر بعض بعض حیثیتوں سے ترجیح ہے:

﴿ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ ﴾ (۲/ بقرہ: ۲۵۳)

''ان رسولوں میں سے کسی کو کسی پر فضیلت دی، ان میں سے کسی سے اللہ نے کلام کیا اور کسی کے بہت درجے بڑھائے اور ہم نے عیسیٰ بن مریم کو نشانیاں دیں اور سچائی کی روح سے ہم نے اس کی تائید کی۔''

آپ نے دوسرے انبیا علیہم السلام کی جائز تعظیم و تکریم یہاں تک کی کہ ان کے مقابلہ میں کبھی کبھی اپنی ہستی بھی فراموش کر دی ہے۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آپ کو خیر البریہ اے بہترین خلق! کہہ کر خطاب کیا۔ فرمایا: ''وہ تو ابراہیم علیہ السلام تھے۔'' [1] ایک دفعہ ایک صاحب نے دریافت کیا کہ سب سے بزرگ عالی خاندان کون تھا، فرمایا: ''یوسف علیہ السلام پیغمبر بن پیغمبر بن پیغمبر بن خلیل اللہ۔'' [2] ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک یہودی مدینہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو بشر پر فضیلت دی ایک مسلمان کھڑے یہ سن رہے تھے ان کو غصہ آیا کہ ہمارے پیغمبر کی موجودگی میں تم یہ کہہ رہے ہو اور اس کو ایک تھپڑ کھینچ مارا، اس نے دربار نبوی میں جا کر شکایت کی آپ نے ان صحابی کو بلا بھیجا اور مقدمہ کی روداد سنی اور نہایت برہم ہو کر فرمایا: ''پیغمبروں میں باہم ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دو۔'' [3] یعنی ایسی فضیلت جس سے کسی دوسرے نبی کی تنقیص ہو۔

یہی وہ تعلیمات محمدی ہیں جن کے ذریعہ سے دنیا میں وحدتِ مذاہب، روحانی مساوات اور انسانی اخوت اور تمام انبیا علیہم السلام اور پیغمبروں کے ادب و احترام کے جذبات پیدا ہوئے، بنی اسرائیل کے وہ پیغمبر جن کو ماننے والے تمام دنیا میں چند لاکھوں سے زیادہ نہ تھے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ ان کی عظمت، جلالت اور ادب و احترام کرنے والے چالیس کروڑ سے زیادہ ہو گئے۔ وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جو چھ سو برس

---

[1] مسند احمد، ج ۳، ص: ۱۷۸، ۱۸٤۔ [2] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ عزوجل: ﴿لقد کان فی یوسف واخوتہ......﴾: ۳۳۹۰۔

[3] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: ﴿وإنّ یونس لمن المرسلین﴾: ۳٤۱٤۔

تک یہودیوں کی جھوٹی تہمت سہتے رہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے آکر اس کو مٹایا اور ان کی پاکی کی گواہی دی، جس کی بدولت آج چالیس کروڑ زبانیں ان کی عصمت کی شہادت دے رہی ہیں۔ ہندوستان، ایران، چین جن کے سچے راہنماؤں کا ان کے ملک سے باہر کوئی ادب واحترام نہ تھا، جہاں جہاں مسلمان گئے ان کے جائز ادب واحترام کو اپنے ساتھ لے گئے۔

وہ عرب جو پیغمبروں کے ناموں تک سے ناواقف تھے، جو نبوت اور رسالت کے خصائص کے علم سے محروم تھے، جو انبیا علیہم السلام اور رسولوں کی سیرتوں سے ناآشنا تھے، جو ان کے ادب واحترام اور تصدیق واعتراف سے بیگانہ تھے اور جن کو اپنے دیوتاؤں کے سامنے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام پر تحقیرانہ ہنسی آتی تھی، [1] اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا ذکر سن کر اپنے غصہ کو ضبط نہ کر سکتے تھے [2] محمد رسول اللہ کی تعلیم سے ان کا یہ حال ہوا کہ وہ ایک ایک پیغمبر کے نام ونشان اور تاریخ وسیرت سے واقف ہو گئے اور تبرکاً ان کے ناموں پر اپنی اولادوں کے نام رکھنے اور آج تمام مسلمانوں میں وہ نام شائع اور ذائع ہیں، ان کی صداقت اور سچائی کی گواہی دی اور ان کے ادب واحترام کو اپنے سینوں میں جگہ دی، ان کی تعظیم وتکریم کو اپنے دین وایمان کا جزو بنالیا، دنیا کی کسی قوم میں یہ رواج نہیں ہے کہ انبیا علیہم السلام کے نام ادب سے لیے جائیں، مگر ایک مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ جب کسی پیغمبر کا نام لے تو ادب سے لے اور ان پر درود وسلام پڑھے۔

---

[1] قرآن پاك سورة زخرف، آیت نمبر:٥٧۔

[2] صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ﴿ان یونس لمن المرسلین﴾: ٣٤١٤۔

کتبِ الٰہی پر ایمان

﴿ وَكُتُبِهٖ ﴾

ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے صحیفۂ وحی پر ایمان لائے۔ ہر چند یہ عقیدہ پچھلے عقیدہ رسالت کا لازمی نتیجہ ہے یعنی رسول کو رسول مان لینا، اس کی تعلیمات کو اور وحی کو مان لینے کے مترادف ہے۔ تاہم یہ تصریح اس لیے کی گئی ہے، تاکہ یہ پوری طرح صاف اور واضح ہو جائے کہ رسول کو رسول مان لینے کے بعد اس کے صحیفۂ وحی کو مان کر اس کی تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ سورۂ بقرہ کے شروع ہی میں سچے مومنوں کی تعریف میں کہا گیا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ ﴾ (۲/ البقرة:٤)

''اور جو اس (کتاب یا وحی) پر ایمان رکھتے ہیں جو تجھ پر (اے محمد) اتاری گئی۔''

کتابِ الٰہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور علموں کو بہ دل و جان قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں، یہ گویا پوری شریعتِ مطہرہ کے قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں، اس ایک فقرہ کے تحت میں آ جاتی ہیں، اس لیے قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام کی باتیں ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی سرے سے ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ ہو سکتا ہے۔ اسی بنا پر اس کی تشریح آنحضرت ﷺ نے بھی ان الفاظ میں فرمائی کہ ((بِمَا جِئْتُ بِهٖ)) ''جو کچھ میں لے کر آیا اس پر ایمان لاؤ۔'' قرآن نے کہا:

﴿ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﴾ (٤٧/ محمد:٢)

''اور جو ایمان لائے اس پر جو محمد پر اتارا گیا۔''

لیکن قرآن اگر اتنا ہی کہتا کہ میرے پیرو صرف مجھ پر ایمان لائیں تو یہ کوئی اہم بات نہ ہوتی کہ ہر صاحبِ مذہب کی یہی تعلیم ہوتی ہے، قرآن نے اپنے عقائد کی اس دفعہ میں بھی اپنے تکمیلی پہلو کو پیش نظر رکھا ہے اور قرار دیا کہ اہلِ قرآن، قرآن کے ساتھ ہی دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی تسلیم کریں یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک صحیفہ محمدی ﷺ کے ساتھ ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے، چنانچہ سورۂ بقرہ کے شروع والی مذکورہ آیت کے ساتھ یہ بھی فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ ﴾ (۲/ البقرة:٤)

''اور جو ایمان لائے اس پر جو تجھ پر اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا۔''

پھر اسی سورہ کے آخر میں فرمایا:

﴿ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۸۵)

''رسول ایمان لایا اس پر جو خدا کی طرف سے اس پر اترا اور اہل ایمان بھی، ہر ایک، خدا پر، اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر ایمان لایا۔''

بقرہ کی آیتوں میں بعض انبیا علیہم السلام کا تفصیلی درجہ اور بقیہ تمام انبیا علیہم السلام کا اجمالی ذکر کر کے ان کی کتابوں اور وحیوں کی تصدیق کا حکم دیا گیا ہے:

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۳۶)

''(اے مسلمانو!) تم کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور خاندان یعقوب کی طرف اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر اور جو کچھ سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، ان سب پر ایمان لائے۔''

آل عمران میں کسی قدر اور تفصیل ہے:

﴿ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ ﴾

(۳/ آل عمران:۸۴)

''کہہ کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہم پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور خاندان یعقوب پر اتارا گیا اس پر اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا گیا اس پر، اور دوسرے سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے جو کچھ دیا گیا ہم ان سب پر ایمان لائے۔''

سورۂ نساء میں اس پر ایمان لانے کے حکم کے ساتھ ساتھ اس کے انکار کو کفر قرار دیا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّھَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ ﴾ (۴/ النسآء:۱۳۶)

''اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو ایمان لاؤ خدا پر، اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر اتاری اور اس کتاب پر جو پہلے اتاری اور جس نے خدا کا اور اس کے فرشتوں

کا اور اس کی کتابوں کا.........انکار کیا وہ نہایت سخت گمراہ ہوا۔"

سورۂ مومن میں ان منکروں، کو عذاب کی بھی دھمکی دی گئی ہے جو کسی پیغمبر کے پیغام کی بھی تکذیب کریں:

﴿ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۫ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ۝ ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۷۰، ۷۱)

"جن لوگوں نے کتاب کو اور جو پیغام دے کر ہم نے اپنے پیغمبروں کو بھیجا، ان کو جھٹلایا وہ عنقریب جانیں گے جب ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی اور وہ کھینچے جائیں گے۔"

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے تورات جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا گیا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور خود قرآن۔ ان کے علاوہ ایک موقع پر صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے:

﴿ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝ ﴾

(۸۷/ الاعلی: ۱۸، ۱۹)

"یہ باتیں گزشتہ صحیفوں میں بھی ہیں، ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی۔"

ان کے ماسوا اجمال کے ساتھ دو موقعوں پر گزشتہ آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے الفاظ ہیں:

﴿ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۳۳)

"کیا اگلے صحیفوں میں جو کچھ ہے اس کی گواہی ان کو نہیں پہنچی؟"

﴿ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء: ۱۹۶)

"اور بے شبہ یہ پہلوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔"

اس بنا پر انبیا علیہم السلام کی طرح ان کتابوں پر بھی اسی طرح تفصیلی اور اجمالی ایمان ہر مسلمان کا ہے، جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں ان پر بالا جمال ایمان ضروری ہے۔ کسی قوم میں اگر کوئی ایسی آسمانی کتاب ہے، جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن اس کا تصریحی نام قرآن میں مذکور نہیں ہے اور اس میں توحید کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت ہے تو اگرچہ ہم اس کو بتصریح خدا کی کتاب قبول نہیں کر سکتے، تاہم بالتصریح اس کو رد بھی نہیں کر سکتے اسی بنا پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ "اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔" [1] یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔ یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں مگر انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں

[1] صحيح بخاري، كتاب التوحيد، باب يجوز من تفسير التوراة: ۷۵۴۲ وكتاب التفسير: ۴۴۸۵۔

کرتے، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور برہمن ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، توراۃ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری پیشتر آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے۔

حقیقت میں اسلام کی یہ تعلیم دنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے، جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہ تھا یہ رواداری، بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے، یہود اپنی کتاب کو چھوڑ کر تمام دوسری آسمانی کتابوں سے انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے، عیسائی توراۃ اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہی کا متوقع ہو سکتا ہے، پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی مینو (جنت) کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے، ہندو اپنے ویدوں کے سوا دنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل و فریب مان کر بھی آواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے، بودھ مت والے اپنے سوا تمام دنیا کی وحیوں کا انکار کر کے بھی نروان کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں، مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دنیا کی آسمانی کتابوں کو منجانب اللہ نہ تسلیم کریں جنت کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ عملاً اس پر اسلامی حکومت کے قوانین اور احکام مبنی ہیں، یہودیوں کی نظر میں دنیا میں صرف دو ہی قومیں ہیں، بنی اسرائیل اور غیر بنی اسرائیل یا اسرائیل کا گھرانہ اور ''غیر قومیں'' یا مختون اور غیر مختون اور ان ہی دونوں تقسیموں پر ان کے قانون کی بنیاد ہے۔ عیسائیوں میں مذہبی حیثیت سے مسیحی اور یہود اور بت پرستی گو تین قومیں مانیں جاتی ہیں مگر چونکہ ان کے مذہب میں قانون نہیں، اس لیے وہ اکثر امور میں رومن لا کے ماتحت رہے ہیں لیکن رومن عیسائیوں میں بھی ملکی حیثیت سے دو ہی تقسیمیں ہیں رومی اور غیر رومی اور ایک رومی ملک میں غیر رومی کا کوئی حق نہیں کہ رومی حکومت کے لیے اور غیر رومی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے۔ پارسیوں میں پاک نژادان ایران اور بیرونی لوگ، دنیا کی دو ہی حیثیتیں ہیں، ہندوؤں میں اونچی ذاتیں اور اچھوت اور ملیچھ قوموں کی دو ہی صورتیں ہیں۔

مگر اسلام کے گزشتہ عقیدہ کی بنا پر آنحضرت ﷺ نے قانون کی حیثیت سے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق قرار دیے اور اسلام کی تیرہ صدیوں میں ان پر برابر عمل ہوتا رہا یہ تقسیمیں حسب ذیل ہیں:

① مسلمان

جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتابِ الٰہی یقین کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں وہ ایک دوسرے کا شریک ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ

کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ سے ذبح کیے ہوئے جانور کھا سکتے ہیں اور اسلام کی سلطنت میں ان کے حقوق یکساں ہیں۔

② اہل کتاب

یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں، یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس (جزیہ) ادا کر کے اسلامی حکومتوں کے دور میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، ان کی جان و مال اور عزت کے مسلمان محافظ رہیں گے، ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں ان کا جائز کھانا ہم کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

③ شبہ اہل کتاب

یعنی وہ لوگ جو قرآن اور توراۃ اور انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعوئ کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوس یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعوئ کرتے تھے اور ساتھ ہی سورج اور آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں، ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے انہیں پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بودھوں وغیرہ کو بھی اس صف میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق آنحضرت ﷺ نے ان کو عطا کیے اور وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں اور ان کی جان و مال و آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

④ کفار اور مشرکین

یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دینِ الٰہی کی طرف منسوب ہیں ان کو چند شرائط کے ساتھ امن دیا جا سکتا ہے، لیکن حقوق کے حصول کے لیے ان کو کہا جائے گا کہ وہ کسی نہ کسی آسمانی دین کے اندر اپنے کو داخل کر لیں جیسا کہ عباسیوں کے ابتدائی زمانہ میں حرانی عراقیوں نے اپنے کو صابیوں میں داخل کر کے اپنے حقوق حاصل کر لیے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی اس تعلیم نے دنیا میں امن و امان اور مسلمانوں میں مذہبی رواداری کے پیدا کرنے میں کتنا عظیم الشان حصہ لیا ہے یہی وہ نظریہ تھا جس نے مسلمانوں کو اپنے مذہبی عقائد و شریعت کی سخت پیروی کے باوجود دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت اور میل جول کے

لیے آمادہ کیا اور مجوسیوں اور صابیوں اور یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے ساتھ مل کر مختلف ملکوں میں ان ملکوں کے مناسب مختلف تمدنوں کی بنیاد رکھنے کی قوت پیدا کی۔

وحدۃ الادیان

تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہو کہ آدم علیہ السلام سے لے کر محمد تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ چنانچہ درحقیقت آپ کی تعلیم یہی تھی اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے جو آدم علیہ السلام سے محمد تک باری باری سے پیغمبروں کے ذریعہ آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔

صحیفۂ محمدی نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں ایک دین اور دوسرا شرعۃ، منسک اور منہاج۔ شرعۃ اور منہاج کے معنی راستہ کے ہیں اور منسک کے معنی طریقِ عبادت کے ہیں۔ دنیا میں یہ راز سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ کے قلب پاک پر منکشف ہوا کہ دینِ الٰہی ہمیشہ ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا، نورِ معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہوا، اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیا آتے رہے، اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا، وہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں، یعنی خدا کی ہستی اور اس کی توحید، اس کے صفاتِ کاملہ انبیا اور مرسلین کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی اور اخلاقِ فاضلہ اور اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا یہ تمام مذاہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر جملہ مذاہب حقہ کا اتفاق ہے اگر ان میں سے کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو یا تو طریقہ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی نقص پیدا ہو گیا ہے۔ دوسری چیز جس کو آنحضرت ﷺ کی زبان وحی ترجمان نے شرعہ منہاج اور منسک کہا ہے اور وہ جزئیات احکام اور متفقہ حصول مقصد کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہے ہیں، مثلاً: عبادتِ الٰہی ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریقِ عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر مذہب میں موجود ہے، عبادت کی کوئی خاص سمت ہر مذہب میں ہے مگر وہ سمت ہر مذہب نے اپنی اپنی مصلحت سے الگ مقرر کی ہے اسی طرح اعمالِ فاسدہ کا انسداد ہر مذہب کا متفقہ نصب العین ہے مگر اس انسداد کے راستے اور طریقے جدا جدا ہیں، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے، مگر اصلِ دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے نا قابل تبدیل اور نا قابل تغیر رہا ہے۔

انبیا علیہم السلام کا دنیا میں وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی وابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اپنے اصل مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لیے مناسب حال ہوں وہ ان کو بتائیں اور سکھائیں۔

انبیا علیہم السلام کے سوانح پر نظر کرنے سے اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحبِ شریعت نبی اسی وقت مبعوث ہوا ہے جب اس کا صحیفۂ وحی جو اس کے دین و شریعت کا محافظ ہوتا ہے کھو گیا ہے یا انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہو گئی ہے، صحیفۂ ابراہیم کے گم ہو جانے کے بعد جس کا نہایت ناقص خلاصہ توراۃ کے سفر تکوین میں ہے صحیفۂ موسیٰ نازل ہوا۔ صحیفۂ موسیٰ کے اختلاف کو دور کرنے کے لیے زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی اور انجیل میں انسانی تصرفات کے راہ پانے کے بعد قرآن آیا اور چونکہ وہ دنیا کے آخر تک کے لیے آیا اس لیے ہر تحریف اور انسانی تصرف سے اس کی حفاظت کی گئی اور قیامت تک کی جائے گی اسی لیے اس کے بعد کسی اور صحیفہ کی ضرورت نہیں اور نہ کسی پیغمبر کی بعثت کی حاجت ہے، البتہ اس کے معانی کی صحیح تشریح اور بدعات واحداثات کے انسداد کے لیے ائمہ، خلفا، مجددین، محدثین اور علمائے راسخین پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے اور ان کی اصلاح کی صداقت کی پہچان سنت محمدی ﷺ کا احیا اور بدعات کا قلع قمع ہے۔

اب ہم کو پھر اوپر سے چلنا ہے اور اپنے ایک ایک دعویٰ کو وحی محمدی ﷺ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

''وحدت دین'' کی حقیقت کو وحی اسلامی کے آخری ترجمان نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۭ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ ۭ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۭ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۭ لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۭ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورٰی:١٣، ١٥)

''اس نے دین میں تمہارے لیے وہی راہ مقرر کی جو اس نے نوح سے کہی تھی اور جو ہم نے حکم بھیجا تم کو اور جو کہہ دیا ہم نے ابراہیم سے اور موسیٰ کو اور عیسیٰ سے یہ کہ ''دین'' کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو، مشرکوں کو جدھر تو بلاتا ہے وہ ان پر گراں گزرتا ہے اور خدا اپنی طرف جس

کو چاہتا ہے چن لیتا ہے اور اپنی طرف اس کو راہ دیتا ہے جو (اس کی طرف) رجوع ہوتا ہے اور یہ تفرقے انہوں نے وحی کے علم (حقیقی) ملنے کے بعد آپس کی ضد اور تعصب سے پیدا کیے اور اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات وقت مقررہ تک کے لیے نہ ہو چکی ہوتی تو (کشفِ حقیقت کر کے) ان کے اختلافات کا فیصلہ کر دیا جاتا اور جن کو ان اگلوں کے بعد کتاب وراثت میں ملی وہ اس امرِ حق کی طرف سے ایسے شک میں ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتا سو تو سب کو اسی حقیقت کی طرف بلا اور اسی پر استواری سے قائم رہ جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور ان تفرقہ اندازوں کی غلط خواہشوں کی پیروی نہ کر اور کہہ کہ میں ایمان لایا ہر اس کتاب پر جو خدا نے اتاری اور مجھے حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، ہمارا رب اور تمہارا رب وہی ایک اللہ ہے، ہم کو ہمارے کام کا بدلہ ملے گا اور تم کو تمہارے کام کا، ہم میں کچھ جھگڑا نہیں اللہ ہم سب کو اکٹھا کرے گا اور اسی کی طرف پھر جانا ہے۔''

ان آیاتِ مبارکہ میں کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور عیسیٰ علیہم السلام کو اور تم کو اے محمد ﷺ عطا کیا گیا ہے اگلوں کے بعد پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنے ذہنی تحریفات اور ذہنی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور آپس کی ضد اور تعصبات سے الگ الگ فرقہ واری کی راہیں نکالیں، پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدت دین کی حقیقت کا یقین اہل کتاب کو نہیں ہے حالانکہ وہ شکوک وشبہات کے دلدل میں پھنسے ہیں پھر حکم ہوتا ہے کہ اے محمد رسول اللہ ﷺ! تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی دنیا میں آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں اور تم سے اے اہل کتاب! جو مختلف فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئے ہو تمہارے ساتھ انصاف کروں یعنی جس میں جو سچائی ہے اس کو قبول کروں یا معاملات میں ان کے ساتھ عدل وانصاف کروں پھر فرمایا ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے دو نہیں، اگر اتحاد چاہو تو اس نقطہ پر ہم تم متحد ہو سکتے ہیں البتہ ہمارے اور تمہارے راستوں میں جو اختلاف ہے، اس کے ذمہ دار ہم اور تم خود ہیں، ہمارے کام کے تم جواب دہ نہیں اور تمہارے کام کے ہم نہیں، اب ہمارے تمہارے درمیان یہاں کوئی جھگڑا نہیں۔

اسی وحدت کی دعوت محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی نے ایک اور آیت میں دی ہے:

﴿ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:٦٤)

''اے کتاب والو! آؤ ہم تم ایک بات پر جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں ہے۔ متفق ہو جائیں، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں اور نہ کسی کو اس کا شریک بنائیں اور نہ آپس میں ایک کو خدا کو چھوڑ کر رب بنائیں، اگر وہ اس کو قبول نہ کریں تو کہہ دے کہ تم گواہ رہو کہ ہم حکمِ الٰہی کے تابع (مسلم) ہیں۔''

یہود ونصاریٰ جنہوں نے اپنی فرقہ داریوں سے اصل دین میں تفریقیں پیدا کر دی تھیں، ان کی طرف اشارہ کر کے محمد رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴾ (٦/ الانعام:١٥٩)

''بے شک وہ جنہوں نے اپنے دین میں الگ الگ راہیں نکالیں اور کئی فرقے ہو گئے، تجھ کو ان سے کوئی کام نہیں، ان کا کام اللہ کے حوالے ہے، وہی ان کو جتا دے گا جیسا کچھ وہ کرتے تھے۔''

پھر دونوں کو اس کے بعد ہی اصل ''دین قیم'' جو ابراہیم علیہ السلام کا تھا، اس کی دعوت دی گئی:

﴿ قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِّلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾ (٦/ الانعام:١٦١)

''کہہ دے کہ میرے خدا نے اس سیدھی راہ کی طرف راہنمائی کی جو دینِ صحیح ہے، ابراہیم حنیف کا مذہب اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرکوں میں سے نہ تھے۔''

غرض اسلام وہ ''دینِ قیم'' ہے جو ہمیشہ سے انبیا کا دین رہا اور موجودہ دین اسلام یہود ونصاریٰ کی تحریفات اور تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے، جس کی طرف انبیا علیہم السلام اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو پکارتے رہے، اسی لیے اکثر انبیا علیہم السلام کے ناموں کو گنانے کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کو یہ ہدایت فرمائی گئی:

﴿ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۖ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ ﴾ (٦/ الانعام:٩١)

''یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، سو تو انہیں کی راہ پر چل۔''

بعض اسلامی حدود وشرائع کے بعد فرمایا گیا:

﴿ يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ ﴾ (٤/ النسآء:٢٦)

''خدا چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان کے راستے دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔''

اس کے بعد معلوم ہوا کہ اسلام اپنے حدود وشرائع میں بھی اگلے پیغمبروں کی تعلیمات کے ساتھ اتحاد رکھتا

ہے اور یہ امر واقعہ ہے، جو لوگ قرآن کا اس لیے انکار کرتے تھے کہ یہ کوئی الگ صحیفہ ہے، ان سے یہ کہا گیا:

﴿ إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ۝ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ ۝ ﴾

(۸۷/ الاعلیٰ:۱۸، ۱۹)

''بے شبہ یہ بات اگلے صحیفوں میں بھی تھی، یعنی ابراہیم اور موسیٰ علیہما السلام کے صحیفوں میں۔''

ایک اور آیت میں کہا گیا:

﴿ وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعراء:۱۹۶)

''اور یہی پہلے پیغمبروں کی کتابوں میں تھا۔''

ایک مقام پر یہ فرمایا گیا:

﴿ مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ ۚ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۴۳)

''(اے محمد ﷺ) تجھ سے (اس کتاب میں) وہی کہا گیا ہے جو تجھ سے پہلے پیغمبروں سے کہا گیا۔''

اس اعلان میں یہ ظاہر کر دیا گیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو وہی کہا گیا جو اگلے پیغمبروں سے کہا جا چکا تھا، ان معنوں میں قرآن کوئی نئی دعوت لے کر نہیں آیا ہے بلکہ اسی پرانی دعوت کی یہ تکرار ہے، جس کی آواز دنیا سے گم ہو چکی تھی یا دب گئی تھی، اگر فرق ہے تو اجمال و تفصیل یا نقص و تکمیل کا کہ اسلام گزشتہ اجمال کی تفصیل اور دین سابق کی تکمیل ہے۔

اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا اور ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی، لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی اور گم ہوتی رہی اور آخری دفعہ دنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانے میں وہ پوری طاقت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور وہ قیامت تک محفوظ اور باقی رہے گی۔

دوسری چیز جس کی مذہب میں ثانوی حیثیت ہے اور جو اصل مقصد نہیں ذریعہ ہے، وہ بدلتی رہتی ہے اور عہد محمدی تک برابر بدلتی رہی ہے، اس کا نام شرعہ، منہاج اور منسک ہے۔ یہودیوں کو آنحضرت ﷺ پر اعتراض تھا کہ وہ یہودی شریعت کے جزئیات میں کیوں تبدیلی کرتے ہیں؟ قرآن نے اس کے جواب میں ہمیشہ یہی کہا کہ یہ مقصود نہیں ذرائع ہیں، اصول نہیں فروع ہیں، ہر قوم کی مناسبت سے ان میں تغیر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اس کی ایک مثال قبلہ ہے کہ مقصودِ اصلی نماز ہے اور سمت کا تعین ایک فرعی اور ثانوی چیز ہے۔ حضرت داؤد کی اولاد بنی اسرائیل کو اپنی آبائی مسجد (بیت المقدس) سے گرویدگی تھی وہ ان کا قبلہ ہوئی، ابراہیم

عربوں کو اپنی مرکزی مسجد (کعبہ) سے وہی وابستگی اور لگاؤ تھا، اس لیے یہ ان کا قبلہ بنی۔ چنانچہ قرآن نے تعیین قبلہ کے موقع پر کہا:

﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَٰتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱٤۸)

''اور ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جدھر وہ منہ کرتا ہے، سو تم نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔''

یعنی سمتوں اور جہتوں کی تعیین کو اہمیت کی چیز نہ سمجھو بلکہ نیکیوں کو اصلی اہمیت دو اسی لیے فرمایا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ أَن تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم پورب یا پچھم کی طرف رخ کرو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ جو ایمان لائے (اور دوسرے نیک کام کرے)۔''

اسی طرح خانہ کعبہ کا حج یہودیوں میں نہ تھا، اسلام نے جب اس کو رائج کیا تو کہا، ہر مذہب نے اپنے لیے عام مذہبی اجتماع اور قومی عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ مقرر کیا ہے، اسلام نے خانہ کعبہ کے حج کو اس کے لیے متعین کیا:

﴿ لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ ۚ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ ۖ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ ﴾

(۲۲/ الحج:٦۷، ٦۸)

''ہر قوم کے لیے ہم نے عبادت کا ایک طریقہ بنایا جس کی اس قوم کے لوگ مذہبًا پابندی کرتے ہیں سو اس بات میں وہ تجھ سے جھگڑا نہ کریں، تو اپنے رب کی طرف بلائے جا، تو بے شک سوجھ کی سیدھی راہ پر ہے اور اگر وہ تجھ سے جھگڑنے لگیں تو کہہ دے کہ اللہ بہتر جانتا ہے، جو تم کرتے ہو۔''

سورہ مائدہ میں عدل و انصاف اور قانونی جزا و سزا کے طریقوں کے ضمن میں ان یہودیوں اور عیسائیوں کو جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا یہی کہا گیا کہ وہ اپنی اپنی کتابوں ہی کے احکام پر عمل کریں، جن کو وہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ پہلے یہودیوں سے کہا:

﴿ إِنَّا أَنزَلْنَا التَّوْرَاةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّونَ الَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَالرَّبَّانِيُّونَ وَالْأَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوا مِن كِتَابِ اللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ شُهَدَاءَ ۚ ﴾

(۵/ المآئدۃ:٤٤)

''ہم نے تورات اتاری، اس میں ہدایت اور روشنی تھی، پیغمبر جو حکم بردار تھے وہ یہود کا فیصلہ

کرتے اوران کے عالم اورفقیہ کہ اللہ کی کتاب پر وہ نگہبان تھے اوروہ تھے اس پرخبردار۔''

پھرعیسائی شریعت کی نسبت کہا:

﴿ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۪ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ؕ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۶، ۴۷)

''اورہم نے ان پیغمبروں کے پیچھے مریم کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا سچ بتا تا ہوا اس کو جو اس کے پہلے تھا یعنی تورات اورہم نے انجیل دی، اس میں ہدایت اورروشنی اور تصدیق کرتی ہوئی اپنے سے پہلے کی یعنی تورات کی اور ہدایت اور نصیحت پرہیز گاروں کے لیے اور چاہیے کہ انجیل والے اس کا حکم دیں جو اس میں اترا۔''

اس کے بعد آنحضرت ﷺ کو خطاب کر کے کہا:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۴۸)

''اورہم نے تیری طرف یہ کتاب سچائی کے ساتھ اتاری، جو اپنے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور امانت کے ساتھ اس پر شامل ہے، سوتو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر، جو خدا نے اتارا اور تیرے پاس جو سچائی آئی ہے اس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔''

دیکھو کہ کس خوبی کے ساتھ صحیفۂ محمدی ﷺ نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح وتعریف کی اوران اہل مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لائے اپنی اپنی کتب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور پھر یہ دعویٰ کیا کہ قرآن تمام گزشتہ کتابوں پر امین ومحافظ بن کر آیا ہے اور اس میں ان سب کتابوں کی سچائیاں یک جا ہیں لیکن ان لوگوں نے اپنی اپنی کتابوں کو چھوڑ کر اہوا (غلط خواہشوں) کی پیروی شروع کر دی۔ یہ اہوا کیا ہیں؟ کتابِ الٰہی میں تحریف وتصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکامِ الٰہی کے مقابلہ میں انسانی اجتہادات کی آمیزش:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۷۹)

''افسوس ہے ان پر جو اپنے ہاتھوں سے کتاب بناتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔''

آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ اپنی شریعتِ الٰہی کو چھوڑ کر ان اہلِ کتاب کی اہوا کی پیروی نہ کر،

اس کے بعد حدود اور جزاوسزا میں ان خفیف اختلافات اور تبدیلیوں کو جو تورات انجیل اور قرآن میں ہیں غیر اہم بتایا گیا فرمایا:

﴿ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا ﴾ (۵/ المآئدۃ:۴۸)

''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک دستور اور ایک راستہ بنا دیا۔''

انہی اختلافات کی بنا پر یہود اور نصاریٰ دونوں ایک دوسرے کو برسر باطل کہتے تھے:

﴿ وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُمْ يَتْلُونَ الْكِتَابَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۳)

''اور یہود نے کہا نصاریٰ کچھ راہ پر نہیں اور نصاریٰ نے کہا: یہود کچھ حق پر نہیں، حالانکہ وہ دونوں خدا کی کتاب پڑھتے ہیں۔''

دونوں مل کر مسلمانوں سے کہتے تھے:

﴿ وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۳۵)

''اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی بن جاؤ تو ہدایت پاؤ گے۔''

ارشاد ہوا کہ تم دونوں اپنے الگ الگ راستوں کو چھوڑ کر آؤ اور اصل دین ابراہیمی پر متفق ہو جاؤ:

﴿ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۳۵۔۱۳۷)

''کہہ بلکہ ابراہیم علیہ السلام کے دین کی پیروی کرو، جو موحد تھا مشرک نہ تھا اور کہو کہ ہم خدا پر اور جو کچھ ہماری طرف اترا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام اور اس کی اولاد پر اتارا گیا اور جو موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کو دیا گیا اور جو سب نبیوں کو ان کے خدا کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے ہم ان رسولوں میں فرق نہیں کرتے اور ہم اس ایک خدا کے تابع ہیں تو اگر یہ بھی اسی طرح ایمان لائیں، جس طرح تم ایمان لائے تو انہوں نے ہدایت پائی اور اگر روگردانی کریں تو وہی ہیں ضد اور مخالفت پر۔''

یہود و نصاریٰ کو یہ دعویٰ تھا:

﴿ لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۱)

''یہود اور نصاریٰ کے سوا کوئی جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

جواب دیا گیا:

﴿ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۱) ”یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔“

﴿ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۲)

”ہاں جس نے بھی اپنے کو خدا کا مطیع بنایا اور وہ نیکوکار ہے، تو اس کی مزدوری اس کے خدا کے پاس ہے، نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ غم۔“

تمام اہل مذاہب کو یکساں خطاب کر کے فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:٦٢)

”بے شک جو ایمان لائے (یعنی مسلمان) اور جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی جو بھی خدا پر اور آخری دن پر ایمان لایا اور نیک عمل کیا تو ان کی مزدوری ان کے پروردگار کے پاس ہے نہ ان پر خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔“

اب جو ایمان لائے یعنی مسلمان اور جو یہودی ہے اور نصاریٰ اور صابئین ان میں سے جو بھی اپنے اپنے دور نبوت میں خدا کی توحید پر، روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لایا اور اچھے عمل کیے ان کو اپنے کام کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ یعنی جس نے بھی اپنے اپنے پیغمبر کی اصلی تعلیم اور سچی شریعت کے مطابق جو شرک وکفر وبت پرستی سے یقیناً پاک تھی عمل کیا اس کو اس کا ثواب ملے گا، خدا کی توحید اور روزِ آخر کی صداقت پر ایمان لانا اور اچھے کام کرنا صرف عقل کی ہدایت سے نہیں ہوسکتا، بلکہ کسی رسول کی تعلیم ہی سے ہوسکتا ہے، جیسا کہ تمام اہل مذاہب کا متفقہ مسئلہ ہے، اس لیے رسالت کی تصدیق بھی اس کے ضمن میں داخل ہے کہ

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾

(٤/ النسآء:۱۵۰۔۱۵۲)

”بے شک جو اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں جدائی کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے اور چاہتے ہیں

کہ وہ اس میں درمیان کا راستہ اختیار کریں، وہی حقیقی کافر ہیں اور ہم نے کافروں کے لیے اہانت کرنے والا عذاب تیار کیا ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کا بھی انکار نہیں کیا، یہ وہ ہیں جن کو ان کی مزدوریاں خدا دے گا اور خدا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

دوسری آیت میں ہے:

﴿ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ﴾ (٢٤/ النور:٦٢)

''مومن وہی ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔''

اس بنا پر ان آیتوں سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ قبولِ عمل کے لیے ایمان مشروط ہے اور دوسرے یہ کہ ایمان وعمل کے علم کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے، اسی لیے اوپر جن چار فرقوں کا ذکر ہوا ہے وہ چاروں وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کو ماننے والے ہیں، اس بنا پر کامل اسلام یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے۔ چنانچہ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَسْتُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ حَتَّىٰ تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَلَيَزِيدَنَّ كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۖ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ﴾

(٥/ المآئدة:٦٧_٦٩)

''کہہ دے اے کتاب والو! تم کچھ نہیں جب تک تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اتارا گیا اس کو قائم نہ کرو اور (اے پیغمبر ﷺ) جو تیری طرف اُترا ہے وہ ان کی سرکشی اور انکار کو اور بڑھائے گا، تو ان منکروں کا غم نہ کر واس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور صابی اور عیسائی جو خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو ان پر، کوئی خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اس کے بعد ہی اس کا ذکر ہے کہ یہودیوں نے ہمیشہ رسولوں کا انکار کیا اور نصاریٰ توحید کو چھوڑ کر تثلیث اور الوہیتِ مسیح میں مبتلا ہو گئے اس لیے اصلِ اسلام سے یہ دونوں ہٹ گئے۔ فرمایا:

﴿ لَقَدْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَأَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ رُسُلًا ۖ كُلَّمَا جَاءَهُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُهُمْ فَرِيقًا كَذَّبُوا وَفَرِيقًا يَقْتُلُونَ ۝ وَحَسِبُوا أَلَّا تَكُونَ فِتْنَةٌ فَعَمُوا وَصَمُّوا ثُمَّ تَابَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوا وَصَمُّوا كَثِيرٌ مِّنْهُمْ ۚ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ

اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۷۰ـ۷۳)

''بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف کئی رسول بھیجے جب کبھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی نفسانی خواہشوں کے خلاف احکام لے کر آیا تو کتنوں کو جھٹلایا اور کتنوں کا خون کرنے لگے اور خیال کیا کہ اس سے کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے، پھر خدا ان پر رجوع ہوا اور ان میں بہتیرے اندھے اور بہرے ہوئے اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں، بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے یہ کہا کہ مریم کا بیٹا مسیح علیہ السلام ہی اللہ ہے مسیح علیہ السلام نے تو یہ کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کو پوجو جو میرا اور تمہارا رب ہے بے شک جو اللہ کو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور گناہگاروں کی کوئی مدد کرنے والا نہیں بے شبہ وہ کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں تیسرا ہے، حالانکہ کوئی اللہ نہیں، مگر وہی ایک، اگر وہ اپنے اس قول سے باز نہ آئے تو ان میں سے کافروں کو یقیناً دردناک عذاب چھوئے گا۔''

یہ تو ان یہود و نصاریٰ کے ایمان کا حال تھا اس کے بعد اسی رکوع میں ان کے ''حسن عمل'' کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے بعد ہی ان سے کہا گیا ہے:

﴿ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَاۗءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۸۱)

''اور اگر اللہ اور اس نبی پر اور جو اس نبی پر اترا اس پر یہ ایمان لے آتے، تو ان مشرکوں کو وہ اپنا دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثر نافرمان ہیں۔''

اسلام یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کے واحد مشترکہ دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں توحید کامل اور رسالت عمومی، یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل بلاشریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو یکساں صادق اور راست باز تسلیم کرنا، چنانچہ فرمایا:

﴿ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓي اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۠ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ

مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۝ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝﴾ (۳/ آل عمران:۸۳-۸۵)

''کیا وہ دین الٰہی کے سوا اور کوئی دین چاہتے ہیں، حالانکہ جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ خوشی سے یا مجبوراً خدا کا مسلم یعنی فرمانبردار ہے اور اسی کی طرف سب لوٹائیں جائیں گے (اے پیغمبر!) کہہ کہ ہم اللہ پر اور جو اس نے ہم پر اتارا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور ان کی اولادوں پر اُترا اور جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور سب پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے ملا، ہم سب کی صداقت کو تسلیم کرتے ہیں، ان میں سے کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں اور جو اسلام کے سوا کوئی اور دین چاہے گا تو وہ اس سے قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔''

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا دین اللہ ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں نقصان اٹھائے گا۔ آل عمران میں ہے کہ یہود و نصاریٰ تاویلاتِ باطلہ اور اتباعِ متشابہات کی وجہ سے گمراہ ہو گئے، یعنی دین اسلام سے روگرداں ہو گئے اور اختلافات میں پڑ گئے، فرمایا:

﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَھُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَھُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۝ فَاِنْ حَاۗجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹، ۲۰)

''بے شک دین خدا کے نزدیک اسلام ہے اور جن کو کتاب دی گئی انہوں نے علم آنے کے بعد اس میں آپس کی ضد کے سبب سے اختلاف کیا اور جو اللہ کی آیتوں کا انکار کرے گا تو اللہ، جلد حساب لینے والا ہے، تو اگر اے پیغمبر! یہ تجھ سے پھر کج بحثی کریں، تو کہہ دے کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے کو خدا کا تابع فرمان (مسلم) کر دیا ہے۔''

اسی کے بعد آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ سے سوال کریں کہ وہ اس اسلام کو قبول کرتے ہیں یا نہیں؟

﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اھْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۝﴾ (۳/ آل عمران:۲۰)

''اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دے کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا، اگر کیا تو انہوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر انکار کیا تو تجھ پر صرف پہنچا دینا ہے

اور اللہ بندوں کو دیکھتا ہے۔“

یہود و نصاریٰ کو اس اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت نامہ ملنے کی بشارت ہوتی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ”ہدایت نامہ“ ہے کہ وہ دینِ اسلام جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گزشتہ پیغمبر کی اُمت ہوں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے، اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور اسلام جس کو لے کر آیا وہ کامل ہے، نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ اب جو ایمان لائے اور جو یہودی ہوئے اور نصرانی اور صابی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود ”توحید کامل“ ہے اور اس کا یہ منشا نہیں کہ یہود و نصاریٰ اور صابی وغیرہ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کلی کے مستحق ہیں یہود و نصاریٰ کیا، مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کلی کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہوں جو ان کے رسول کے ذریعہ دنیا میں آئی ہے یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو، یا یہودی، عیسائی ہو یا صابی، غرض کسی نبی کی پیروکاری کا مدعی ہو۔

نبوت محمدی ﷺ کا دعویٰ یہ نہیں کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے اور ان کے پیرو، اپنے تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اسی کو لے کر آخری دفعہ محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی، پھر کبھی ناقص نہ ہوگی کہ اس کا صحیفہ ہدایت (قرآن) تحریف و اختلاف و تصرف سے محفوظ و پاک رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوت محمدی ﷺ کی دعوت جہاں دی گئی ہے، ہدایت کی بشارت سنائی گئی ہے، چنانچہ اسی آیت میں جو ابھی اوپر گزری یہ ہے:

﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ ﴾

(۳/ آل عمران: ۲۰)

”اور اے پیغمبر! ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ کیا وہ اسلام لائے اگر اسلام لائے، تو انہوں نے سیدھی راہ پائی۔“

سورۂ بقرہ میں ہے:

﴿ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۟ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا

هُمْ فِي شِقَاقٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۳۶، ۱۳۷)

''(اے مسلمانو)! کہو کہ ہم اللہ پر اور جو ہم پر اترا اور جو ابراہیم اور اسمٰعیل پر اور اسحاق اور یعقوب علیہم السلام پر اور ان کی اولاد پر اترا اور جو موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور سب پیغمبروں کو ان کے پروردگار کی طرف سے دیا گیا، سب پر ایمان لائے اور ہم ان میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی خدا کے مسلم یعنی فرمانبردار ہیں، تو اگر یہ بھی اسی طرح مانیں جس طرح تم نے مانا تو انھوں نے سیدھی راہ پائی اور اگر وہ اس سے باز رہیں تو وہ محض ضد میں ہیں۔''

یہود ونصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیمِ محمدی ﷺ کی طرف دعوت اسی ''ہدایت'' کے پانے کے لیے ہے جو اسلام یعنی انبیا کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے اور فلاح ونجاتِ کامل اب اسی کے ماننے پر منحصر ہے:

﴿ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۴، ۵)

''جو اس کو جو تیری طرف (اے پیغمبر)! اترا اور جو تجھ سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں اور وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے بعد فرمایا کہ رحمتِ الٰہی گو عام ہے مگر یہ نعمت خاص طور سے ان کا حصہ ہے جو تعلیم محمدی ﷺ کو قبول کریں اور وہی نجات کامل کے مستحق ہیں:

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِآيَاتِنَا يُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۶۔۱۵۸)

''اور میری رحمت ہر چیز کو سمائے ہے پھر اس رحمت کو میں ان کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیز گار ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور جو ہمارے حکموں کو مانتے ہیں جو اس ان پڑھ فرستادہ پیغمبر کی پیروی کرتے ہیں جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا پاتے ہیں جو ان کو نیکی کا حکم دیتا

ہے اور برائی سے باز رکھتا ہے اچھی چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتا ہے اور بری چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان کے بندھن کو اور ان زنجیروں کو جو ان پر پڑی تھیں اتارتا ہے تو جنھوں نے اس پیغمبر کو مانا اور اس کی تائید کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیچھے چلے جو اس کے ساتھ اُتری وہی کامیاب ہیں کہہ دے (اے پیغمبر!) کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں جس کی آسمانوں اور زمین کی شہنشاہی ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے سو اللہ اور اس کے اس ان پڑھ پیغام رساں رسول پر ایمان لاؤ جو اللہ پر اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اس رسول کی پیروی کرو تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ۔"

ان آیات میں صاف ظاہر کر دیا گیا کہ گزشتہ مذاہب کے پیروؤں کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دینِ خالص جو انسانی تصرفات اور آمیزشوں سے مکدر ہو گیا تھا وہ صحفِ الٰہی کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ کے ذریعہ پھر نکھارا گیا ہے اور جن اضافوں اور جزئیات احکام کی سختیوں کو انسانوں نے اس میں شامل کر دیا تھا وہ آپ کے ذریعہ دور کی گئیں اور نیز آپ عالمگیر پیغمبر بن کر مبعوث ہوئے، اس لیے ہدایت نامہ نبوتِ عمومی اور نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف وحی محمدی ﷺ کے اندر محدود ہے۔

الغرض دین محمدی ﷺ کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں پر ضروری ہے کہ وہ دینِ ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا اسی کو صحیفۂ محمدی ﷺ لے کر آیا اور اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے، یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مہیمن ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رکھنا اور ختمِ نبوت حسب ذیل دلائل سے ثابت ہیں:

تکمیلِ دین

قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ دینِ الٰہی اپنے تمام اصول اور فروع (مناسک و مناہج و شرائع) کی حیثیت سے تکمیل کو پہنچ گیا، بلکہ گزشتہ مذاہب میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوت آئے گی، جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی۔ خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا:

"میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔" (استثنا ۱۸۔۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ان کے مانند ایک اور نبی آنے والا تھا جس کے منہ میں

اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا، اس سے ثابت ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک اور صاحب شریعت نبی خدا کے نئے کلام کے ساتھ آئے گا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی کہا:

''لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں، تمہیں یاد دلائے گا۔'' (یوحنا ۱۴۔۲۶)

''اور وہ فارقلیط (احمد) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا، گناہ اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی لیکن جو کچھ وہ سنے گی، سو کہے گی، میری بزرگی کرے گی۔'' (یوحنا ۱۶۔۸)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے کلام کو ہنوز ناتمام ہی فرمایا اور ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔

آخر وہ موعود الامم ﷺ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ علیہ السلام کے مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں اور میرے منہ میں خدا نے اپنی بولی ڈالی ہے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی سچائی کی روح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو کامل کرنے کے لیے آیا ہوں، میں اپنی نہیں کہتا بلکہ وہی کہتا ہوں جو اوپر سے سنتا ہوں اور آخر منصب نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے آپ ﷺ کی زبان سے یہ اعلان عام کیا:

﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴾

(۵/ المآئدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کا دین پسند کیا۔''

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام جو ان کی سخت گیری کے لیے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے [1] یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے۔ بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام نازل کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں، اسی لیے قرآن نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیش گوئی نہیں کی، نہ کسی کلام کے نزول کی خبر دی، نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ﴿ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ﴾ (جو محمد ﷺ سے پہلے نازل کیا گیا) پر ایمان لانے کی تاکید کی، لیکن وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِكَ کے

[1] دیکھو آیت ﴿ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ ﴾ الآیۃ (۳/ آل عمران:۹۳)

قبول کرنے کا کہیں شائبہ بھی نہیں۔

قرآن مہیمن کتب ہے

اس دین کامل کا صحیفہ تمام اگلی کتابوں کا مصدق ہے:

﴿ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ (۵/ المآئدۃ:٤٨)

''اپنے آگے کی کتابوں کی تصدیق کرنے والا۔''

وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے، اس لیے جو کوئی اس صحیفہ کو قبول کرتا ہے، وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے، یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں۔ فرمایا:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ ﴾

(۵/ المآئدۃ:٤٨)

''اور ہم نے (اے محمد) تیری طرف سچائی کے ساتھ یہ کتاب اتاری جو اپنے سے پہلے کی کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور اس پر شاہد و حاوی ہے۔''

لفظ ''مہیمن'' کی تفسیر اہلِ زبان مفسروں نے یہ کی ہے:

ابن عباس رضی اللہ عنہما: شاہد اور امین، قرآن اپنے سے پہلے کی ہر کتاب کا امین ہے۔

قتادہ رحمۃ اللہ علیہ: قرآن سے پہلے جو کتابیں بھی تھیں، قرآن ان کا امین اور شاہد ہے۔

غرض قرآن اگلی کتابوں کی صداقتوں اور سچی تعلیموں کی امانت اپنے اندر رکھتا ہے۔

قرآن محفوظ ہے اور رہے گا

پیغمبر کی تعلیم کی حفاظت اس کے صحیفۂ الٰہی کی حفاظت پر موقوف ہے، قرآن سے پہلے کوئی کتابِ الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے تمام تر بری نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی اور پھر ان سوختہ اوراق سے، تحریر ہوئی پھر ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی، انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا اور اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا، کھچا رہ گیا ہے۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ایسا ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری مذہب بنا کر نہیں بھیجا تھا اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہ تھا، لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہوا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا اسکی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی اور فرمایا اور پھر کس وثوق سے فرمایا:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۹)

''ہم نے اس نصیحت کی کتاب کو اتارا اور بے شبہ ہم ہیں اس کی حفاظت کرنے والے۔''

یہ وعدہ الٰہی ایک اور آیت میں ان الفاظ میں دہرایا گیا ہے:

﴿ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۝ ﴾

(۷۵/ القيامة:۱۶۔۱۹)

''بے شک ہمارے ذمہ ہے اس (قرآن) کو سمیٹ کر رکھنا اور اس کا پڑھنا، پھر جب ہم پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کے ساتھ رہ، پھر بے شبہ ہم پر ہے اس کو کھول کر بتانا۔''

اس آیت میں قرآن کی قراءت یعنی لفظ و عبارت اور بیان یعنی معنی دونوں کی ذمہ داری خدائے تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔ ایک تیسری آیت میں اس کی تصریح ہے کہ اس حق میں باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی، فرمایا:

﴿ وَإِنَّهُ لَكِتَابٌ عَزِيزٌ ۝ لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ ۖ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ ۝ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدة:۴۱، ۴۲)

''اور بے شک، یہ قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو غالب ہے، باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ اس کے پیچھے سے اس کے پاس آئے گا، ایک حکمت والے اور خوبیوں والے کی طرف سے اُترا۔''

اس کتاب کو غالب فرمایا گیا ہے یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پست کرے گی، باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے، یعنی نہ لفظ و عبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت و معنی کی جہت سے کیونکہ وہ ایک حکمت والے کی طرف سے اتری ہے، اس لیے وہ اپنی حکمت و دانائی کی تعلیم سے غالب رہے گی اور چونکہ وہ ایک سراسر خوبیوں والے کی جانب سے عطا ہوئی ہے اس لیے یہ بھی ہر باطل کے عیب سے پاک رہے گی۔ یہ قرآن کا اپنا دعویٰ ہے اور ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ اس کی صداقت پر گواہ ہے۔

ختمِ نبوت

مقدماتِ بالا کا نتیجہ گو خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کی، قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہ ہو، لیکن وحی محمدی ﷺ نے ہر شک کے ازالہ کے لیے آگے بڑھ کر یہ تصریح بھی کر دی کہ اب نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب آپ کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں کہ دین کامل اور صحیفہ الٰہی محفوظ ہو چکا اور ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دور ہو گیا اور خود تاریخِ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی ﷺ کے بعد سے دنیا کی حالت بدل گئی متفرق قومیں پیوستہ ہو گئیں۔ زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے اور توحیدِ کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہو گیا اور خدا کے تمام رسولوں کو سچا اور

صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا یہاں تک کہ ان قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کر لیا۔

وحدت ادیان اور دینِ اسلام

تفصیل بالا کے بعد یہ واضح ہو گیا کہ وحدت ادیان کا منشا کیا ہے یعنی یہ کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیا کا مذہب رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف وتصرف کے سبب سے بگڑتا رہا، اسی دین ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ ﷺ آئے اور اسی کا نام اسلام ہے، جو اپنے صحیفہ کی بقا اور حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کے سبب سے ہمیشہ قائم وباقی رہے گا، اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اس اصلِ دین پر آ جائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ وہی دینِ ازلی ہو گا جس کا نام ''اسلام'' ہے اور نوحی اور ابراہیمی اور موسوی، عیسوی اور محمدی دینوں میں سوائے اجمال وتفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا، اسی لیے فرمایا گیا:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ﴾ (٤/ النسآء:٤٧)

''اے وہ لوگو! جن کو پہلے کتاب دی گئی، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور ان کو پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا سبت کے گناہگاروں پر جس طرح لعنت کی تھی ہم ان پر لعنت کریں، اس وحی پر ایمان لاؤ جو ہم نے اب اتاری، قرآن (جو) ان تعلیمات کی جو تمہارے پاس ہیں، تصدیق کرتی ہے۔''

مشرکینِ عرب سے زیادہ اہلِ کتاب ہی کو اس حقیقت کے سمجھنے کا زیادہ استحقاق تھا، اس لیے انہی کو سب سے پہلے اس کا منکر نہ ہونا چاہیے:

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ﴾

(٢/ البقرۃ:٤١)

''اور جو کتاب ہم نے اب اتاری جو تمہارے پاس والی کتاب کو سچا بتاتی ہے، اس پر ایمان لاؤ اور تم ہی پہلے کافر نہ بنو۔''

لیکن ان کی حالت یہ ہوئی کہ

﴿ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ﴾ (٢/ البقرۃ:٩١)

''اور جب ان سے کہا گیا کہ خدا نے جو بھی اتارا اس پر ایمان لاؤ، تو جواب دیا کہ جو ہم پر اترا ہم اس کو مانتے ہیں اور اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں حالانکہ یہی قرآن حق ہے اور جو ان کے

پاس ہے اس کی تصدیق کرتا ہے۔“

اس کے برخلاف محمد رسول اللہ ﷺ نے جس دین کو پیش کیا اس کی بنیاد تمام اگلی نبوتوں اور کتابوں کی صداقت کے تسلیم کرنے پر رکھی گئی، یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کسی مسلمان کے مسلمان ہونے کے لیے صرف یہی نہیں فرمایا کہ وہ تنہا آپ کی نبوت پر ایمان لائے، بلکہ یہ بھی فرمایا کہ وہ تمام نبوتوں اور صحیفوں پر ایمان لائے۔ چنانچہ خود قرآن کی شہادت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو صرف اسی کی تکلیف نہ تھی کہ آپ کے ہم وطن آپ کے صحیفہ کو نہیں مانتے، بلکہ اس کی بھی تھی کہ وہ اگلے صحیفوں کو بھی نہیں مانتے، سورۂ سبا میں ہے:

﴿ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ بِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَلَا بِالَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ ﴾ (٣٤/ سبا:٣١)

”اور منکروں نے کہا کہ ہم اس قرآن پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے اور نہ اس سے اگلی کتاب (یعنی تورات) پر۔“

اور اسی لیے آنحضرت ﷺ نے تصریح کے ساتھ یہ فرمایا کہ ”جو میری عبودیت اور رسالت کے ساتھ عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو بھی خدا کا بندہ اور اس کا رسول اور کلمہ اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی روح تسلیم کرے گا وہ جنت میں جائے گا۔“ [1] الغرض وہ ازلی و ابدی دین صرف ایک ہی تھا اور تمام انبیا علیہم السلام اسی ایک پیغام کو لے کر دنیا میں آئے، یہی وحدتِ دین کی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن نے اپنے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ؕ وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ ۝ فَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:٥١-٥٣)

”اے پیغمبرو! ستھری چیزیں کھاؤ اور بھلا کام کرو میں تمہارے کاموں سے آگاہ ہوں اور بے شک تم سب کی امت ایک امت ہے اور میں تم سب کا (ایک) پروردگار ہوں تو مجھ سے ڈرتے رہو تو ان کے پیروؤں نے اپنے مذہب کو آپس میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، ہر فرقہ اپنے پاس کے خیال پر نازاں ہے۔“

اس حقیقت کی مزید تشریح آنحضرت ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی:

((اَلْاَنْبِيَاءُ اِخْوَةٌ لِّعَلَّاتٍ، اُمَّهَاتُهُمْ شَتّٰى وَدِيْنُهُمْ وَاحِدٌ)) [2]

”تمام انبیا ایسے بھائی ہیں، جن کا باپ ایک ہے اور مائیں مختلف ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔“

---

[1] صحيح بخاري، كتاب احاديث الانبياء، باب قوله: يآ اهل الكتاب لا تغلوا......: ٣٤٣٥۔

[2] صحيح بخاري، كتاب احاديث الانبياء، باب قوله: واذكر في الكتاب مريم......: ٣٤٤٣۔

پچھلے دن اور پچھلی زندگی پر ایمان

﴿وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷) ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾

(۲/ البقرۃ:٤)

اسلام کے سلسلہ ایمانیات کی آخری کڑی [1] ایک پچھلے دن اور پچھلی زندگی یا پچھلی دنیا پر یقین کرنا ہے، سورۂ بقرہ کے پہلے ہی رکوع میں ہدایت یاب اور کامیاب انسانوں کے ایمانیات کی آخری دفعہ یہ بیان کی گئی ہے:

﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ (۲/ البقرۃ:٤) ''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

﴿مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۸)

''جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لایا۔''

﴿الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ﴾ (۹/ التوبۃ:٤٥) (۲/ البقرہ:۱۷۷)

''جو اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے ہیں۔''

''آخرہ'' کے معنی پچھلی کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے، عربی میں اوصاف کو موصوف کا قائم مقام کر کے اکثر موصوف کو حذف کر دیتے ہیں، مثلاً: ''دنیا'' کے لفظی معنی ''قریب ترین'' کے ہیں اور یہ صفت ہے، اسکا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدّار (گھر) ہے، اس لیے الدنیا کا مفہوم اَلْحَيَاةُ الدُّنْيَا (قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ زندگی) یا اَلدَّارُ الدُّنْيَا (قریب ترین گھر یعنی موجودہ عالم ہے) اسی طرح الآخر اور الآخرۃ کا مفہوم اَلْيَوْمُ الْآخِرُ وَالْحَيٰوةُ الْآخِرَةُ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ (پچھلا دن اور پچھلی زندگی اور پچھلا آنے والا گھر ہے) یعنی موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دوسری دنیا کی زندگی اور گھر اور قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنوں میں ایک سو تیرہ مقام پر آیا ہے اور ہر جگہ اس کا محذوف موصوف حَيَاة (زندگی) یا دار (گھر) ہے۔

چنانچہ حسب ذیل آیتوں کے پڑھنے سے یہ حقیقت منکشف ہوگی:

﴿وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ﴾ (۲۹/ العنکبوت:٦٤)

''بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے۔''

﴿وَلَلدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ﴾ (٦/ الانعام:۳۲)

''اور بے شک آخری گھر بہتر ہے۔''

ان دونوں آیتوں میں (دار) یعنی گھر کا لفظ موجود ہے۔

﴿أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ﴾ (۹/ التوبۃ:۳۸)

''کیا پچھلی زندگی کو چھوڑ کر اس موجودہ زندگی پر تم راضی ہو گئے۔''

[1] قرآن پاک میں جہاں جہاں ایمان کے تفصیلات ذکر کیے گئے ہیں وہاں وہاں یوم آخرت پر ایمان سب سے آخر میں بیان کیا گیا ہے۔

﴿ الَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِلِقَاءِ الْآخِرَةِ وَأَتْرَفْنَاهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۳۳)

''جنہوں نے انکار کیا اور پچھلی زندگی کی ملاقات کو جھٹلایا، اور ہم نے موجودہ زندگی میں ان کو نعمت دی۔''

ان آیتوں میں الحیاۃ الدنیا یعنی موجودہ دنیا کے تقابل سے ظاہر ہے، کہ الآخرۃ سے مراد الحیاۃ الآخرۃ یعنی پچھلی زندگی ہے۔ [1] اور اس لفظ کے عموم میں وہ تمام منازل و مقامات داخل ہیں جو ابتدائے موت سے لیکر حشر و نشر اور اس کے بعد پیش آتے ہیں، یا آئیں گے، چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ اس آیت میں:

﴿ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۲۷)

''جو ایمان لائے ان کو اللہ حیاتِ دنیا میں اور آخرت میں اس کی پکی بات کلمہ توحید پر مضبوط رکھے گا۔''

اس آیت میں ''آخرت سے مراد'' عالمِ برزخ'' ہے اور قرائن بھی اسی پر دلالت کرتے ہیں کہ قیامت میں قولِ ثابت پر قائم رہنا کونسی بڑی بات ہوگی، جبکہ ہر چیز اس وقت واضح اور نمایاں ہوگی۔ اس لیے اس آیت میں "آخرۃ" سے مراد عالم برزخ کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا، ایک اور حدیث میں تصریحاً بیان ہے کہ ''قبر (یعنی برزخ) آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔'' [2]

یومِ آخر اور حیات آخر ایمان، اسلام کی نہایت اہم تعلیم ہے، اور قرآنِ پاک میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے، کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آیندہ دنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے، اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا رشتہ

---

[1] دنیا اور آخرت کا یہ تقابل قرآن پاک کی بے شمار آیتوں میں مذکور ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہے: ﴿ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴾ (۳/ آل عمران:۴۵) ''دنیا اور آخرت میں معزز۔'' سلسلۂ دعا میں ہے:

﴿ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۱)

''پروردگار ہم کو دنیا میں نیکی اور آخرت میں نیکی دے۔'' کفار کے بطلانِ عمل کے ذکر میں ہے:

﴿ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۷) ''ان کے عمل دنیا اور آخرت میں گر گئے۔''

﴿ اسْتَحَبُّوا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ ﴾ (۱۶/ النحل:۱۰۷) ''انہوں نے دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دی۔''

﴿ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ﴾ (۴۱/ حم السجدۃ:۳۱)

''ہم تمہاری قریب کی زندگی اور پچھلی زندگی کے دوست ہیں۔''

اور کبھی دنیا کے بجائے ''اولیٰ'' (پہلی زندگی) کا لفظ اختیار کیا گیا ہے فرمایا:

﴿ فَأَخَذَهُ اللَّهُ نَكَالَ الْآخِرَةِ وَالْأُولَىٰ ﴾ (۷۹/ النازعات:۲۵) ''تو خدا نے اس کو پچھلی زندگی اور پہلی زندگی کی سزا بنایا۔''

﴿ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ﴾ (۹۲/ الیل:۱۳) ''اور ہمارے ہی لیے ہے، پچھلی اور پہلی زندگی۔''

[2] ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی فظاعۃ القبر:۲۳۰۸؛ ابن ماجہ، ابواب الزھد، باب القبر والبلی: ۴۲۶۷؛ مسند أحمد، ج۱، ص: ۶۳؛ کنز العمال، ج۸، ص: ۹۵۔

ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے، اسی لیے تمام مذاہب نے کسی نہ کسی رنگ اور کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔

آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے، ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد (ہمیشہ) تک جس میں پھر موت وفنا نہیں، پہلے دور کا نام ''برزخ'' اور دوسرے کا نام ''بعث'' یا حشر ونشر اور قیامت ہے اور ان سب کے معنی اُٹھنے، اکٹھے کیے جانے اور کھڑے ہونے کے ہیں۔ لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اور وہ موجودہ دنیا کے خاتمہ کے بعد دوسری دنیا کی زندگی ہے اور اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس عالم کا نام قرآن میں ﴿الدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ اور ﴿عُقْبَى الدَّارِ﴾ وغیرہ ہے۔ جس کے معنی دوسرے یا پچھلے گھر کے ہیں۔

توراۃ وانجیل میں برزخ وقیامت کی تفصیل نیز یہ کہ مرنے کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان کی روح کس حالت اور کیفیت میں رہے گی، مذکور نہیں ہے، لیکن اسلام میں یہاں بھی گنجلک اور ابہام نہیں، بلکہ اس نے اس کی پوری تفصیل کی ہے اور بتایا ہے کہ موجودہ عالم کے علاوہ عالمِ برزخ اور میدانِ قیامت ہمارے سزا و جزا کے دو مقام ہیں شخصی موت کے بعد ہر شخص عالمِ برزخ میں داخل ہو جاتا ہے اور وہاں اس کے معاملات شروع ہو جاتے ہیں، پھر اپنے مقررہ وقت پر جس کو خدا نے اپنی مصلحتوں اور حکمتوں کے لحاظ سے طے کر لیا ہے، سلسلہ خلق کے خاتمہ پر جب موجودہ دنیا پر عام موت اور فنا طاری ہوگی دوسری زندگی کی دنیا شروع ہوگی جو تمام تر ہماری پہلی دنیا میں ہمارے اچھے یا بُرے اعمال کا سراپا عکس اور ظل ہوگی، چنانچہ سورۂ توبہ کی حسب ذیل آیت میں ہمارے ان تینوں دور ہائے حیات کا ذکر ہے:

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ (۹/ التوبة:۱۰۱)

''ہم ان کو دو مرتبہ عذاب دیں گے پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔''

عذاب کی یہ تین منزلیں دنیا، برزخ اور قیامت ہیں۔

اُن تینوں عالموں میں جو فرق ہے، وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم (مادہ) نمایاں اور روح پوشیدہ ہے اور روح کو جو کچھ مسرت وتکلیف یہاں پہنچتی ہے، وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے، ورنہ درحقیقت اس کی براہ راست راحت ولذت کا اس مادی دنیا میں کوئی امکان نہیں، دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے، روح نمایاں ہوگی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو راحت وتکلیف پہنچے گی، وہ دراصل روح کو پہنچے گی اور جسم اس کی تبعیت میں ضمناً اس سے متاثر ہوگا، لیکن اس تیسرے عالم میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے، روح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت وتکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے۔

برزخ

''برزخ'' کا لفظ قرآن پاک میں تین دفعہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے دو چیزوں کے درمیان کا پردہ حاجب اور حائل مراد ہے، چنانچہ سورۂ رحمٰن میں دو دریاؤں کا ذکر ہے جن میں ایک میٹھا اور دوسرا کھاری ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ حائل ہے جو انکو آپس میں ملنے نہیں دیتا:

﴿ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۚ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۲۰)

''ان دونوں کے بیچ میں ایک پردہ ہے جس سے ایک دوسرے پر بڑھ کر نہیں جاتا۔''

اسی عجیب وغریب بحری منظر کا ذکر سورۂ فرقان میں ہے اور وہاں بھی یہی لفظ واقع ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۳)

''اور اسی نے دو دریاؤں کو ملا کے چلایا اور یہ میٹھا اور پیاس بجھاتا ہے اور وہ کھاری کڑوا ہے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ اور روکی ہوئی اوٹ بنائی ہے۔''

اسی بنا پر موجودہ زندگی اور آیندہ زندگی کے درمیان جو مقام حائل اور حاجب ہے اس کا نام ''برزخ'' ہے سورۂ مومنون میں نزع کے وقت کے بیان میں ہے کہ

﴿ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۰۰)

''اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ قیامت میں اٹھائے جائیں گے۔''

عربوں بلکہ کل سامی قوموں کے رسم ورواج اور مشاہدات کی بنا پر اسی درمیانی منزل (برزخ) کا نام ''قبر'' ہے، خواہ وہ خاک کے اندر ہو یا قعر دریا میں یا کسی درندہ یا پرندہ کے پیٹ میں، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۝ ﴾ (۲۲/ حج:۷)

''بے شبہ اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔''

اب ظاہر ہے کہ یہ ''بعث'' صرف انہی مردوں کے لیے مخصوص نہیں جو تو دہ خاک کے اندر دفن ہوں بلکہ ہر میت کے لیے خواہ وہ کسی حالت اور کسی عالم میں ہو، اسی لیے قبر سے مقصود ہر وہ مقام ہے، جہاں مرنے کے بعد جسم خاکی نے جگہ حاصل کی۔

موت وحیات کی منزلیں

قرآن پاک میں دو موتوں اور دو حیاتوں کا ذکر ہے، ایک جگہ دوزخیوں کی زبان سے کہا گیا ہے:

﴿ قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝ ﴾

(۴۰/ المؤمن:۱۱)

''ہمارے پروردگار تو نے ہم کو دو دفعہ مارا اور دو دفعہ جلایا ہم نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا پھر کیا نکلنے کی کوئی راہ ہے۔''

ان دو موتوں اور دو حیاتوں کی تفصیل خود اللہ نے سورۂ بقرہ میں فرمائی ہے:

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۸)

''کیسے تم اللہ کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم پہلے مردہ تھے پھر تم کو اس نے زندہ کیا، انسان بنا کر پیدا کیا تم کو مار دے گا پھر تم کو جلائے گا، پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

پہلی موت تو ہر انسان کی خلقت سے پہلے کی ہے جب وہ مادہ یا عنصر کی صورت میں تھا، پھر زندہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوا یہ اس کی پہلی زندگی ہے، پھر موت آئی، روح نے مفارقت کی اور جسم اپنی اگلی مادی صورت میں منتقل ہو گیا، یہ دوسری موت ہوئی، پھر خدا اس کی روح کو جسم سے ملا کر زندہ کرے گا، یہ اس کی دوسری زندگی ہوئی جس کے بعد پھر موت نہیں۔ قرآن پاک میں خود رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا:

﴿ اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۝ ﴾

(۳۹/ الزمر:۳۰، ۳۱)

''بیشک تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں پھر تم قیامت کے دن اپنے پروردگار کے سامنے دعویٰ پیش کرو گے۔''

﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ۝ ﴾(۲۳/ المؤمنون:۱۵، ۱۶)

''پھر تم اس کے بعد مر جانے والے ہو پھر تم قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔''

اب سوال یہ ہے کہ برزخ کے عالم میں کیا کیفیت ہوگی، اس کے سمجھنے کے لیے ایک مختصر تمہید کی ضرورت ہے۔

نیند اور موت کی مشابہت

اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں روحانی عالم کی باتوں کے سمجھنے کے لیے اپنی عجیب وغریب قدرت سے ہم کو ایک چیز عنایت کی ہے جس کو ہم نیند کہتے ہیں۔ روح کو اپنے جسم سے دو قسم کا تعلق ہے ایک ادراک واحساس کا اور دوسرے تدبیر وتغذیہ کا، نیند کا وہ عالم جس میں ہمارے تمام آلات ادراک واحساس اس دنیا سے بے خبر ہو کر اپنے گردش کی مادی دنیا سے یک سر بیگانہ بن جاتے ہیں، تاہم ہمارے نفس یا روح کا تعلق ہمارے جسم سے باقی رہتا ہے اور وہ اس حالت میں بھی جسم کی مادی زندگی، نشو ونما اور بقا کی تدبیروں اور دل ودماغ اور دیگر اعضائے رئیسہ کے غذا رسانی اور خون کے دوران میں مصروف رہتی ہے، اسی کا نام روح کا جسم سے تدبیری

تعلق ہے اب نینداور موت میں فرق ہے تو یہ ہے کہ نیند کی حالت میں جسم سے نفس کا تدبیری تعلق قائم رہتا ہے اس لیے جسم باقی اور زندہ رہتا ہے لیکن موت کی حالت میں جسم سے روح کا تدبیری تعلق بھی اکثر منقطع ہو جاتا ہے اس لیے جسم کے اجزا کچھ دنوں میں منتشر ہو جاتے ہیں، موت اور نیند کی یہی مشابہت ہے جس کی بنا پر تمام انسانوں کی زبانوں میں موت کو نیند سے تشبیہ دیتے ہیں اور دنیا بھر کی زبانوں کا یہ توافق الہام طبعی کی خبر دیتا ہے قرآن پاک میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّىٰكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ لِيُقْضَىٰ أَجَلٌ مُّسَمًّى ﴾ (٦/ الانعام:٦٠)

''اور وہی ہے جو تم کو رات میں مارتا ہے اور جلاتا ہے جو تم نے دن میں کمایا پھر تم کو دن میں جلاتا ہے، تا کہ مقررہ وقت پورا کیا جائے۔''

اس سے زیادہ تفصیل سورۂ زمر میں ہے:

﴿ اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا ۖ فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ ﴾

(٣٩/ الزمر:٤٢)

''وہ اللہ ہی ہے جو روحوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے اور جو نہیں مری ہیں ان کو ان کی نیند میں وفات دیتا ہے تو جس پر موت کا حکم اس نے جاری کیا اس کو روک لیتا ہے اور دوسری روح کو جس پر موت کا حکم نہیں یعنی نیند والی کو ایک مدتِ معینہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے بیشک اس میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی نے ''برزخ'' کی زندگی کو نیند کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، قرآن پاک میں ہے کہ قیامت میں جب لوگ دوسری زندگی پا کر قبروں سے اٹھیں گے تو گناہگاروں کی زبانوں پر یہ فقرہ ہوگا:

﴿ قَالُوا يَا وَيْلَنَا مَن بَعَثَنَا مِن مَّرْقَدِنَا ۜ ﴾ (٣٦/ یٰس:٥٢)

''اے ہماری خرابی! کس نے ہم کو ہماری نیند کی جگہ سے اٹھا دیا۔''

غزوۂ احد کے موقع پر ہے کہ جن کو مرنا تھا، ان کی موت ٹل نہیں سکتی تھی، اگر وہ میدان جنگ کے بجائے گھروں میں بھی ہوتے تو نکل کر اپنے مقتل میں خود آ جاتے، اس مفہوم کو قرآن نے یوں ادا کیا ہے:

﴿ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ ﴾

(٣/ آل عمران:١٥٤)

''کہہ دے کہ اگر وہ گھروں میں بھی ہوتے تو جن کے لیے مارا جانا لکھا گیا تھا وہ خود نکل کر اپنی سونے کی جگہوں میں چلے آتے۔''

اسی لیے قرآن پاک میں دوسری زندگی کے لیے اکثر لفظ ''بعث'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی جگانے اور بیدار کرنے کے بھی ہیں [1] جیسا کہ اوپر کی اس آیت میں ہے:

﴿ وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيهِ ﴾ (٦/ الانعام:٦٠)

''اور وہی ہے جو تم کو رات میں موت دیتا ہے اور دن کو جو تم کرتے ہو اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگاتا ہے۔''

﴿ وَأَنَّ اللَّهَ يَبْعَثُ مَن فِي الْقُبُورِ ﴾ (٢٢/ الحج:٧)

''اور بے شک اللہ ان کو جو قبروں میں ہیں، جگا لے گا۔''

احادیث میں ہے کہ قبر میں سوال و جواب کے بعد نیکوکاروں سے کہا جاتا ہے کہ ((نَمْ كَنَوْمَةِ الْعُرُوْسِ)) ''دلہن کی نیند سو جاؤ۔'' جس کو وہی جگاتا ہے، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے یہاں تک کہ خدا اس کو اس خواب سے اٹھائے گا۔ [2]

ان شواہد سے ظاہر ہے کہ برزخ کی زندگی جس میں روح جسم سے الگ ہوتی ہے، روح کی ایک طویل وعمیق [3] نیند کے مشابہ ہے۔

خواب میں لذت والم

انسان جب سوتا ہے تو اس کے ادراک واحساس کے آلات اپنی مادی دنیا سے عارضی طور پر بے خبر ہوجاتے ہیں مگر اس کے ادراک واحساس کی تخیلی، تمثالی یا ذہنی دنیا اس کے سامنے بالکل اسی مادی دنیا کی طرح متشکل ہوجاتی ہے، اس میں وہ خود اپنے جسم سے الگ مگر ہو بہو وہی جسم کو دیکھتا ہے جو آتا جاتا، چلتا پھرتا اور دیکھتا سنتا سب کچھ ہے اس کے سامنے کھانے پینے اور لطف انگیزی کے سب سامان ہوتے ہیں نیز اس میں درد، رنج اور تکلیف کی تمام وہی صورتیں ہوتی ہیں جو مادی دنیا میں ہیں اس کے خیالی جسم کو اگر اس عالم میں

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التھجد، باب تحریض النبی ﷺ علی قیام اللیل: ١١٢٧ میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نماز تہجد کے لیے اس وقت تک بیدار نہ ہونے پر سوال فرمایا، تو حضرت ممدوح نے ان لفظوں میں معذرت پیش کی کہ یارسول اللہ ﷺ! انفسنا بید اللہ فاذا شاء ان یبعثنا بعثنا۔ ''ہماری روحیں خدا کے ہاتھ میں ہیں وہ جب جگانا چاہتا ہے جگاتا ہے۔'' اس حدیث میں بھی بعث جگانے کے معنوں میں آیا ہے۔ [2] جامع ترمذی، ابواب الجنائز، باب ما جاء عذاب القبر: ١٠٧١ حدیث حسن غریب۔ [3] شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں: فھذا المبتلی فی الرؤیا غیر انھا رؤیا لا یقظة منھا الی یوم القیمة۔ (باب اختلاف احوال الناس فی البرزخ، ج١، ص: ٢٧) یعنی ''یہ عذاب قبر کا گرفتار خواب میں ہے لیکن یہ کہ یہ ایسا خواب ہے جس سے قیامت تک جاگنا نہیں ہے۔''

تکلیف ہوتی ہے تو وہ خود چیخ اٹھتا ہے اور اگر اس میں لذت ملتی ہے، تو لطف اندوز ہوتا ہے اور ان دونوں کے اثرات اس کو اپنے مادی جسم میں جاگنے کے بعد بھی نظر آتے ہیں غرض عالم خواب کی خیالی دنیا اور اس کی شادی ورنج اور لذت والم اور اس مادی دنیا کے جسمانی و مادی، شادی ورنج اور لذت والم میں فرق نہیں ہوتا اگر کچھ فرق ہے تو یہ ہے کہ عالم خواب کی لذت وتکلیف بیداری کے بعد ختم ہو جاتی ہے اور مادی بیداری والی لذت وتکلیف احساس وادراک کے وجود تک قائم رہتی ہے اور جس طرح مادی بیداری والی لذت وتکلیف خواب میں معدوم ہوتی ہے، اسی طرح خواب والی لذت وتکلیف بیداری میں رخصت ہو جاتی ہے۔

خواب والے لذائذ و آلام کے مختلف مناظر کے حقائق اور اسباب وعلل پر اگر فلسفیانہ حیثیت سے غور کیا جائے تو عجیب وغریب معاملات سامنے آتے ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام احساسات ومعلومات جو کبھی بھی ذہن انسانی میں آئے ہوں اور ان کو بحالت بیداری مادی دنیا کے مشاغل اور زمانہ کے امتداد کے سبب سے انسان کتنا ہی فراموش کر چکا ہو، وہ خواب میں مادی گراں باری سے آزادی کے بعد سامنے مجسم شکلوں میں نمودار ہو جاتے ہیں اور بیچ کی کڑیوں کے بھول جانے کی وجہ سے وہ اس کو بے جوڑ معلوم ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ انسان جن چیزوں کو بھول جاتا ہے وہ اس کے حافظہ سے حقیقت میں معدوم نہیں ہو جاتیں، بلکہ دماغی حجرہ (ذہن) کے منتشر اسباب کے ذخیرہ (معلومات) میں چھپ کر گم ہو جاتی ہیں اور پھر بعد کو مل جاتی ہیں اس لیے وہ تمام اچھے اور برے اعمال جو انسان نے عمر بھر کیے ہیں خواہ وہ ان کو آج بھول گیا ہو مگر ان کی یاد ذہن کے گوشوں میں پڑی ہے، معدوم ومفقود نہیں ہوگئی۔

خواب کی عجیب وغریب صورت وہ ہے، جس کو تمثیلی کہتے ہیں، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کے خدمتِ کعبہ پر وقف کرنے کو قربانی کی شکل میں اور حضرت یوسف علیہ السلام نے والدین کو سورج اور چاند اور گیارہ بھائیوں کو گیارہ سیاروں کی صورت میں دیکھا، شاہ مصر کے سولی پانے والے مصاحب نے اپنے سولی پانے کو اس رنگ میں دیکھا کہ اس کے سر پر خوان ہے اور بڑے بڑے پرندے اس میں چونچ مار مار کر کھاتے ہیں، شاہ مصر نے مصر کی ہفت (سات) سالہ قحط سالی کو سات دبلی گایوں کی صورت میں دیکھا۔ [1] آنحضرت ﷺ نے فتح مکہ کو اس شکل میں دیکھا کہ مسلمان سر منڈوائے اور بال ترشوائے حج کر رہے ہیں، مسیلمہ اور اسود عنسی دو کذابوں کو سونے کے دو کنگنوں کی صورت میں دیکھا، شہدائے اُحد کو موٹی گائے کی صورت میں ملاحظہ کیا، مدینہ کی وبا ایک پریشان مو، کالی عورت کی صورت میں نظر آئی، خلافت کو ڈول کھینچنے کی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم کو دودھ کی اور ان کی دینداری کو لمبی قمیض کی شکل میں دیکھا۔ [2] ان کے علاوہ ہر شخص

---

[1] یہ کل تمثیلی خواب قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ دیکھیے سورۂ الصفت وسورۂ یوسف۔

[2] ان خوابوں کو صحیح بخاری، کتاب التعبیر: ۷۰۰۷، ۷۰۰۸، ۷۰۳۵، ۷۰۳۷، ۷۰۳۹، میں دیکھو۔

کے ذاتی تجربوں سے بھی اس کی بے شمار مثالیں فراہم کی جاسکتی ہیں۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ انسان کے جسم میں اگر کسی قسم کا مادہ بڑھ جاتا ہے تو خواب میں اس کے مناسب مجسم شکلیں نظر آتی ہیں مثلاً: اگر بلغم کی زیادتی ہو تو پانی دریا اور سمندر نظر آئیں گے اگر سودا بڑھ جائے تو ہاتھی اور کالی صورتیں نظر آئیں گی۔ اسی طرح دوسرے تغیرات خلطی بھی اپنے مناسب جسمانی ہیئت میں خواب میں مجسم اور متشکل ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔ [1]

اسی طرح اعمال جو جسم و مادہ سے بالکل الگ ہیں، خواب میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں اگر کسی بھائی کا حقِ واجب کسی نے ادا نہیں کیا تو خواب میں اس کو نظر آئے گا کہ وہ اس کا گلا کاٹ رہا ہے، اگر کسی کی غیبت کی ہے تو معلوم ہوگا کہ وہ مردار کھا رہا ہے، سونے چاندی کے خزانوں کو جمع کر کے اگر بخل کا اژدھا ان کی حفاظت میں بٹھایا ہے تو سانپ بن کر وہ اس کی گردن میں لپٹتا اور کاٹتا ہے، ذلت اور خواری کتے کی، حماقت گدھے کی اور شجاعت شیر کی شکل میں نمودار ہوتی ہے، شبِ معراج میں آنحضرت ﷺ کے سامنے فطرت دودھ کی اور غیر فطرت شراب کی شکل میں پیش ہوئی، اسی طرح کہن سال دنیا ایک بڑھیا کی شکل میں نظر آئی [2]۔ اس قسم کی تمثیلات قرآن مجید میں بھی آئی ہیں، مثلاً: غیبت کی نسبت فرمایا:

﴿ وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ ﴾

(۴۹/ الحجرات:۱۲)

''اور پیٹھ پیچھے ایک دوسرے کو برا نہ کہے، کیا تم میں سے کوئی پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کی بوٹی نوچ نوچ کر کھائے سو گھن آئی تم کو۔''

اور پاگل پن کی شکل میں ظاہر کیا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۵)

''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے (یا نہیں اٹھتے) لیکن جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے حواس شیطان نے چھو کر کھو دیے ہوں۔''

یتیموں کا مال ناجائز طریق سے کھانے کو پیٹ میں آگ بھرنا فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِھِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝ ﴾

(۴/ النسآء:۱۰)

''وہ لوگ جو یتیموں کا مال ظلم کر کے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور جہنم کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ شاہ ولی اللہ ؒ ذکر برزخ، ج۱، ص:۲۷۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب کیف فرضت الصلوۃ فی الاسراء: ۳۴۹۔

آگ میں داخل ہوں گے۔“

وہ خودغرض لوگ جو بیکسوں کے کام نہیں آتے، قیامت میں ان کے بھی کوئی کام نہ آئے گا اور جو خود سیر ہو کر کھاتے ہیں اور غریبوں کے درد گرسنگی سے بے خبر رہ کر اپنے مال کا میل کچیل (زکوۃ) بھی ان کو کھانے کو نہیں دیتے دوزخ میں ان کو زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا، فرمایا:

﴿ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ۝ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ۝ لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ۝ ﴾ (٦٩/ الحآقة:٣٣-٣٧)

”بے شک وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کو کھانا کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا تھا، تو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست نہیں اور نہ زخموں کے سوا کوئی کھانا ہے، اس کو وہی گناہگار کھائیں گے۔“

بے لوث مخلصانہ فیاضی کی تمثیل سرسبز و شاداب باغ سے دی:

﴿ وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ ﴾ (٢/ البقرة:٢٦٥)

”اور ان کی مثال جو اپنی دولت خدا کی خوشنودی چاہنے اور اپنے دلوں کی مضبوطی کے لیے خرچ کرتے ہیں ایک باغ کی ہے جو ایک ٹیلہ پر ہے۔“

خدا کی راہ میں جان دینے والوں اور مر جانے والوں کو جان نو اور حیات جاوداں کی خوشخبری دی گئی۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ ﴾ (٢/ البقرة:١٥٤)

”جو خدا کی راہ میں مارا جائے اس کو مردہ نہ کہو، وہ لوگ زندہ ہیں۔“

اسی طرح یہ ہے کہ جو خدا کو قرض دے گا خدا اس کو بڑھا کر دے گا۔ جو دوسروں کو معاف کرے گا خدا اس کو معاف کرے گا۔ جو دوسروں کی عیب پوشی کرے گا اللہ اس کی ستاری کرے گا۔ قرآن و احادیث اس قسم کی بالمعاوضہ جزا اور سزا کے ذکر سے لبریز ہیں۔

جو لوگ راہ خدا میں اپنا مال نہیں دیتے، ان کی نسبت فرمایا:

﴿ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ ﴾ (٣/ آل عمران:١٨٠)

”جس مال کا بخل کیا تھا قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا۔“

﴿ يَوْمَ يُحْمَىٰ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۝ ﴾ (٩/ التوبة:٣٥)

”جس دن اس سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر ان سے ان کی

پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی کہ یہ ہے جو تم نے اپنے لیے گاڑ رکھا تھا تو اب تم اس کا مزہ چکھو جس کو تم گاڑ کر رکھتے تھے۔''

دنیا میں اللہ کے نور بصیرت سے روگردانی آخرت میں ظاہری نابینائی کی صورت میں رونما ہوگی اور اسی طرح جو خدا کو یہاں بھولے گا، خدا اس کو وہاں بھلائے گا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام سے جنت سے نکلتے وقت یہ فرمایا گیا تھا:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۴، ۱۲۶)

''اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی تو اس کے لیے تنگ گزران اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے وہ کہے گا، میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا میں تو دنیا میں آنکھوں والا تھا۔ خدا کہے گا، اسی طرح تیرے پاس ہماری نشانیاں آتی رہیں تو ان کو تو نے بھلا دیا اور اسی طرح آج تو بھلایا جائے گا۔''

یہی مفہوم اور زیادہ اختصار کے ساتھ اس آیت میں ہے:

﴿ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآئیل:۷۲)

''جو کوئی دنیا میں (دل کا) اندھا تھا وہ آخرت میں اندھا ہے اور راستہ سے بہت بھٹکا ہوا۔''

اس باب میں سب سے زیادہ صریح وہ حدیث صحیح ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا:

قال رسول اللہ ﷺ ((من اتاه الله مالا فلم يؤدّ زكاته مثل له ماله شجاعا اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيامة ياخذ بلهزمتيه اى شدقيه يقول انا مالك انا كنزك))

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوۃ ادا نہیں کی تو اس کا مال اس کو اچھل کر ڈسنے والے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا، جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا اور اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا، میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔'' [1]

[1] بخاری، كتاب التفسير، باب ولا يحسبن الذين يبخلون بما.....: ٤٥٦٥۔

اسی طرح دو حدیثیں ہیں جن میں مختلف اعمال کا مختلف شکلوں میں آنا بیان کیا گیا ہے، مثلاً: یہ کہ مرنے کے بعد قبر میں نماز روزہ وغیرہ اعمال، عذاب سے بچنے کے لیے ڈھال بن کر داہنے بائیں سے نمودار ہوں گے [1] یہ بھی حدیث میں ہے کہ ''مرنے کے بعد جب ایک دفعہ فرشتہ الٰہی مردہ کو بیدار کرتا ہے تو اس کو آفتاب ڈوبتا ہوا دکھایا جاتا ہے مُثِّلَتِ الشَّمْسُ عِنْدَ غُرُوْبِهَا نیک مرد مسلمان اس تنگ وقت کو دیکھ کر نماز کی تیاری کرنا چاہتا ہے۔'' [2] یہ ظاہر ہے کہ دنیا والا آفتاب وہاں نہیں بلکہ اس کی تمثیل ہوئی ہے جیسا کہ حدیث کے الفاظ میں ہے یعنی یہ کہ اس مردہ کو ایسا نظر آتا ہے اور وہ درحقیقت آفتاب نہیں بلکہ آفتاب کی مثالی صورت ہوتی ہے۔

گناہوں کی تمثیلی سزائیں

اوپر کے بیانات سے ہویدا ہے کہ غیر مجسم اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً: ایک صحیح حدیث میں ہے کہ مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک صحابی نے خواب میں دیکھا کہ ان کے لیے ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب اس کا ذکر آنحضرت ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے اس کی تعبیر میں فرمایا:

((ذٰلِكَ عمله)) [3] ''یہ نہر، ان کا (نیک) عمل ہے۔''

اس تمہید کے بعد آنحضرت ﷺ کے اس رؤیائے صادقہ پر غور کرو، جو ظاہر ہے کہ قیامت کا نہیں کہ ابھی وہ آئی نہیں بلکہ برزخ ہی کا مرقع پیش کرتا ہے جواب بھی قائم ہے، آپ ﷺ نے ایک صبح کو فرمایا: ''رات میں نے دیکھا کہ دو آنے والے آئے اور انہوں نے مجھے جگا دیا میں ان کے ساتھ چل کھڑا ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہے اور دوسرا اس کے سر پر ایک بڑا پتھر لیے کھڑا ہے اور وہ اس پتھر کو اس کے سر پر اس طرح دے مارتا ہے کہ اس کا سر چکنا چور ہو جاتا ہے اور پتھر لڑھکنے لگتا ہے وہ اس کے پیچھے جا کر اس کو اٹھا لاتا ہے اور اتنی دیر میں اس کا سر درست ہو جاتا ہے اور پھر وہ مارتا ہے اور پھر وہی صورت پیش آتی ہے ہم آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۲) ایک شخص اوندھا پڑا ہے اور دوسرا لوہے کا ایک آنکس لیے کھڑا ہے اور وہ اس سے اس کے جبڑے کو پھر نتھنے کو پھر آنکھوں کو گدی تک چیر ڈالتا ہے پہلے ایک طرف بعد ازیں دوسری طرف پھر آگے بڑھے تو دیکھا کہ (۳) تنور کی قسم کی ایک چیز دہک رہی ہے اور کچھ مرد اور عورت اس میں ننگے پڑے ہیں اور اس کے شعلے بھڑک کر ان تک پہنچتے ہیں اور وہ چیختے ہیں آگے بڑھے تو نظر آیا کہ (۴) ایک خون کی جیسی سرخ نہر بہہ رہی ہے اور ایک آدمی اس میں تیر رہا ہے نہر کے کنارے ایک آدمی کھڑا ہے جس کے پاس بہت سے پتھر رکھے ہیں، وہ تیرنے والا آدمی تیر کر جب اس شخص کے قریب آتا ہے تو یہ ایک پتھر اٹھا کر اس زور سے

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ج۶، ص:۳۵۲۔ [2] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ذكر القبر والبلى: ٤٢٧٢۔

[3] صحيح بخاري، كتاب التعبير، باب رؤيا النساء: ٧٠٠٤۔

مارتا ہے کہ وہ پتھر اس کے منہ میں جا کر پیٹ میں اتر جاتا ہے۔

اس کے بعد ہم آگے بڑھے تو ایک سرسبز وشاداب چمن نظر آیا جس میں بہار کی ہر کلی کھل رہی تھی، باغ کے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جس کا سر آسمان میں تھا اور اس کے چاروں طرف بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے تھے آگے بڑھے تو ایک بہت بڑا باغ دیکھا جس سے زیادہ بڑا اور خوبصورت باغ میں نے نہیں دیکھا تھا، یہاں پہنچ کر اپنے دونوں ہمراہیوں کے کہنے سے اوپر چڑھا تو ایک شہر ملا جس کی دیوار میں سونے کی ایک ایک اور چاندی کی ایک ایک اینٹ لگی تھی ہم لوگ دروازہ کے پھاٹک پر پہنچے دروازہ کھلوایا، دروازہ کھلا تو اس کے اندر گھسے، تو اس میں کچھ لوگ ملے جن کا آدھا دھڑ نہایت ہی خوبصورت اور آدھا بہت ہی بدصورت تھا میرے ہمراہیوں نے ان سے ایک نہر کی طرف جو بیچ میں نہایت صاف وشفاف بہہ رہی تھی اشارہ کر کے کہا کہ اس میں جا کر غوطہ لگاؤ وہ غوطہ لگا کر آئے تو ان کی بدصورتی کا حصہ جاتا رہا اور وہ پورے دھڑ سے خوبصورت ہو گئے میرے ہمراہیوں نے مجھ سے کہا کہ یہ ''جنت عدن'' ہے اور وہ آپ کا دولت خانہ ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، سپید لکۂ ابر کی طرح ایک محل دکھائی دیا۔ پھر میں نے ان ہمراہیوں سے کہا کہ آج تو میں نے عجیب عجیب چیزیں دیکھیں تو بتاؤ میں نے کیا کیا دیکھا۔ انہوں نے جواب دیا کہ پہلا شخص جس کا سر پتھر سے کچلا جا رہا تھا وہ ہے جو قرآن پڑھ کر اس کی تعمیل سے انکار کرتا ہے اور صبح کی مفروضہ نماز سے غافل ہو کر سو رہتا ہے اور دوسرا شخص جس کے کلپھڑے اور نتھنے اور آنکھیں پھاڑی جاتی تھیں وہ ہے جو جھوٹ بول کر تمام دنیا میں اس کو پھیلاتا ہے اور تنور میں جو مرد اور عورتیں ننگی جل رہی تھیں، وہ بدکار مرد اور عورتیں ہیں اور جو شخص خون کی نہر میں تیر رہا تھا وہ منہ سے پتھر نگلتا تھا وہ سود خوار ہے اور اس سدا بہار چمن میں جو دراز قد آدمی آپ نے دیکھا وہ ابراہیم علیہ السلام تھے اور ان کے گرد جو بچے تھے وہ کمسن بچے تھے جو فطرت پر مرے تھے۔'' کسی صحابی نے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! مشرکوں کے بچے؟ فرمایا: ''اور مشرکوں کے بچے بھی، وہ لوگ جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا وہ ہیں جنہوں نے کچھ اچھے کام بھی کیے تھے، تو خدا نے ان کے گناہ دھو دیے۔'' [1]

برزخ کی ان تمام سزاؤں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ان کی نوعیت اور کیفیت ان کے اعمال کے بالکل مناسب اور مشابہ قرار دی گئی ہے، نمازِ صبح سے غافل ہو کر بالینِ راحت سے سر نہ اٹھانے والے کا سر کچلا جانا، جھوٹے کا کلپھڑا اپھاڑا جانا، زانی اور زانیہ کا برہنہ تنور کی آگ میں جلنا، خون چوسنے والے سود خوار کا انسانوں کے خون کے دریا میں تیرنا اپنا دو بالشت کا پیٹ بھرنے کے لیے سارے غریبوں کی روزی چھین چھین کر جمع کرنے والے کا پتھر کے لقمے کھانا، سراسر ان کے دنیاوی اعمال کی تمثیل وتصویر ہے اور آخر میں نصف حسنِ عمل سے آدھے دھڑ کی خوبصورتی اور نصف سوئے عمل سے آدھے دھڑ کی بدصورتی پوری مشابہ ہے اور

---

[1] صحيح بخاري، كتاب التعبير، باب تعبير الرؤيا بعد صلوٰة الصبح: ٧٠٤٧۔

صاف وشفاف نہر کی صورت میں رحمت ومغفرتِ الٰہی کا ظہور بھی اسی قیاس پر ہے۔ [1] ابھی تک دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ نفس سے باہر ''آفاقی'' یعنی اپنے سے باہر کی بیرونی مادی دنیا کی اشیاء کے خواص وصفات کے جاننے میں کی ہے جن سے سائنس کی ایجادات واختراعات کا تعلق ہے لیکن ابھی اس سے بھی زیادہ ایک وسیع دنیا اپنے اندر کی پڑی ہے جس کو قرآن نے انفس کہا ہے ان انفس یا ارواح کے اوصاف وخصائص کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہے۔ ہماری سائیکالوجی علم النفس ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے، اور اس پر پیچو یلزم (علمِ ارواح) ابھی طلسم وفریب کے عجائبات میں اسی طرح گرفتار ہے جس طرح موجودہ عہد سے پہلے آج کے معمولی سائنٹفک تجربے سحر وجادو کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے بہر حال ابھی تک علم نفس وروح کے عجائبات پر پردے پڑے ہوئے ہیں، ایک یہی مسئلہ کہ شے کے یقین اور اس کے خارجی وجود میں کیا تعلق ہے؟ ایک معما ہے بہت سے ہندو اہلِ فلسفہ اور بعض مسلمان صوفیوں اور موجودہ زمانہ کے مشہور فلاسفر برکلے کے نزدیک تو کسی شے کے یقین اور وجود یا یوں کہو کہ ذہنی اور خارجی وجود میں بہت کم فرق ہے، بلکہ گویا نہیں ہے۔ بہر حال نفسِ انسانی کے اندرونی قویٰ کا علم گو ابھی بہت کچھ محتاجِ تکمیل ہے، تاہم اتنا ثابت ہے کہ کسی شے کے تصوری یقین اور خارجی وجود میں بہت سا شدید تعلق ہے، مسمریزم نے جو سراسر اسی اصول پر مبنی ہے، اس حقیقت کو کسی قدر واضح کر دیا ہے اسی سے معلوم ہوگا کہ مذاہب نے سب سے زیادہ ایمان پر جو یقین ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس قدر زور بے سبب نہیں دیا ہے۔

قرآنِ پاک نے یقین کی دو قسمیں کی ہیں، علم الیقین اور عین الیقین۔ کسی شے کی دلیلوں کو سن کر یا بعض علامتوں کو دیکھ کر اس کے وجود کا اقرار کرلو، تو یہ علم الیقین (یقین جاننا) ہے اور اگر وہ شے خود تمہارے احساس اور مشاہدہ کے سامنے آجائے جس میں پھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہوسکتی تو وہ عین الیقین (خود یقین) ہے۔ قرآنِ پاک نے یقین کی ان دونوں صورتوں کو سورۃ التکاثر میں بیان کیا ہے:

﴿ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ ﴾

(۱۰۲/ التکاثر: ۱۔۷)

''تم کو دولت ونعمت کی بہتات نے غفلت میں مبتلا کر دیا یہاں تک کہ تم نے قبروں کو جا دیکھا ابھی نہیں تم آگے جان لو گے پھر ابھی نہیں تم آگے جان لو گے ہرگز نہیں اگر تم یقین کا جاننا جانتے تو البتہ دوزخ کو دیکھ لیتے پھر البتہ عین الیقین سے اس کو دیکھ لو گے۔''

بنابریں اگر انسان اپنے اندر علمِ یقین حاصل کرے جو کمالِ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے تو وہ اپنے باطن کی

[1] حجة الله البالغة شاه ولی الله رحمه الله ذکر واقعات حشر، ج۱، ص: ۲۸، ۲۹۔

آنکھوں سے اپنی دوزخ یہیں دیکھ لے:

﴿ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۙ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۙ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر:۵، ۶)

''نہیں یہ بات نہیں اگر تم کو علم یقین ہو، تو دوزخ کو بے شبہ دیکھ لو گے۔''

کفار آنحضرت ﷺ سے عذاب کے عینی مشاہدہ کا فوری مطالبہ کرتے تھے وحیِ الٰہی نے اس کے جواب میں کہا:

﴿ يَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۙ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۵۴)

''وہ تجھ سے جلد عذاب مانگتے ہیں، حالانکہ دوزخ گھیر رہی ہے منکروں کو۔''

ایک دوسری آیت میں ہے کہ منافقین بزعم خود آزمائش کے ڈر سے جہاد کی شرکت سے عذر کرتے ہیں اس کے جواب میں ان میں سے فرمایا گیا کہ وہ تو ابھی آزمائش میں مبتلا ہیں اور دوزخ ان کو گھیرے ہوئے ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ۭ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ۭ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۴۹)

''اور ان کا کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ مجھے (جہاد میں عدم شرکت کی) اجازت دیجئے اور آزمائش میں نہ ڈالیے ہاں وہ تو آزمائش میں پڑ چکے اور دوزخ منکروں کو گھیر رہی ہے۔''

لیکن یہ علم الیقین جس کے حصول کا ذریعہ صرف ایمان ہے، ہر شخص اس سے اس دنیا میں بہرہ ور نہیں ہوتا بلکہ بہتیرے اس کے منکر ہیں اس لیے ان کو یہ اپنے پاس کی دوزخ اس وقت نظر نہیں آتی، لیکن موت جس کا آنا ایک دن یقینی ہے جب وہ آئے گی تو مادہ کا یہ حجاب جو آنکھوں پر پڑا ہے، اٹھ جائے گا اس وقت اس عالمِ غیب کے کچھ اسرار ان پر منکشف ہو جائیں گے اور اعمال کے تمثیلی نتائج اور ثواب وعذاب اور جنت ودوزخ کے بعض مناظر ان کے سامنے آجائیں گے اور اسی وقت وہ اپنے یقین کی آنکھوں سے کسی قدر واقعات کا مشاہدہ کر لیں گے:

﴿ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۙ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر:۷)

''پھر تم دوزخ کو عینِ یقین سے دیکھ لو گے۔''

یہ موت کے بعد کا سماں ہوگا جس کو برزخ کا عالم کہتے ہیں اس کے بعد جب قیامت آئے گی تو ہر راز فاش ہو جائے گا:

﴿ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَاۗىِٕرُ ۙ ﴾ (۸۶/ الطارق:۹) ''جس دن تمام بھید کھل جائیں گے۔''

اور بہشت ودوزخ اپنی ظاہری صورتوں میں اس طرح سامنے آجائیں گی کہ پھر شک وشبہ کا شائبہ بھی باقی نہ رہے گا وہ علمِ حقیقی اور یقینِ تحقیقی کا دن ہوگا، قرآن میں قیامت کے موقع پر ہے:

﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيدِ ۝ وَجَاءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَائِقٌ وَشَهِيدٌ ۝ لَّقَدْ كُنتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هَٰذَا فَكَشَفْنَا عَنكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ ۝ ﴾

(٥٠/ ق:٢٠ـ٢٢)

''اور نرسنگا پھونکا گیا، یہ ہے ڈر کا دن۔ تو ہم نے تیرا پردہ تجھ سے کھول دیا تو آج تیری نگاہ تیز ہے۔''

اس پردہ کے ہٹتے ہی اس دن انسان کے تمام اعمال ایک ایک کر کے اس کے سامنے آجائیں گے اور دوزخ منظر عام پر آجائے گی، فرمایا:

﴿ فَإِذَا جَاءَتِ الطَّامَّةُ الْكُبْرَىٰ ۝ يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ مَا سَعَىٰ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيمُ لِمَن يَرَىٰ ۝ ﴾ (٧٩/ النازعات:٣٤ـ٣٦)

''جب وہ بڑا ہنگامہ آئے گا جس دن انسان کو جو کچھ اس نے کیا ہے یاد آجائے گا اور دوزخ دیکھنے والے کے سامنے باہر لائی جائے گی۔''

احوال برزخ کا عین الیقین

ایک طرف شاعر (ابوالعتاہیہ [1]) نے حیرت کے عالم میں کیا خوب کہا ہے:

الموت باب وكل الناس داخله يليت شعري بعدالباب ماالدار

''موت کا ایک دروازہ ہے اور تمام انسان اس دروازہ میں داخل ہوں گے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ اس دروازہ کے بعد کون سا گھر ہے۔''

یہ علم جس کی حسرت اس شاعر نے ظاہر کی ہے، اس زندگی میں صرف علم الیقین کے ذریعہ سے حاصل ہوسکتا ہے البتہ موت کے وقت جب وہ دوسرے عالم کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو پس پردہ کا نظارہ تھوڑا بہت ہوجائے گا اور وہی برزخ کا عالم ہے۔ فرمایا:

﴿ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ ۝ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ۚ كَلَّا ۚ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا ۖ وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ۝ ﴾

(٢٣/ المؤمنون:٩٩، ١٠٠)

''جب ان گناہگاروں میں سے کسی ایک کو موت آتی ہے تو وہ زندگی کے پس پردہ کے بعض مناظر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے ایک بار اور دنیا میں لوٹا دے، تاکہ دنیا میں جو ماحول چھوڑ کر آیا ہوں اس سے شاید کوئی نیک کام کروں ہرگز نہیں یہ بات ہی بات ہے۔ جو وہ کہتا ہے اور اب ان گناہگاروں کے پیچھے اس دن تک ایک پردہ (برزخ) ہے جب وہ موت

[1] الانوار الزاهية في ديوان ابي العتاهية، ص: ٩٦۔

کے بستر سے جگا کر اٹھائے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ اگر موت کے وقت اور بعد کوئی نئی غیبی کیفیت اس کے مشاہدہ میں نہیں آ جاتی، تو اس کا شک وشبہ دفعۃً یقین سے کیسے بدل جاتا ہے، فرمایا:

﴿ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ۖ ذَٰلِكَ مَا كُنتَ مِنْهُ تَحِيدُ ﴾ (۵۰/ ق:۱۹)

''اور موت کی بے ہوشی حقیقت کو لے کر آ گئی یہی ہے وہ جس سے تو ہٹا کرتا تھا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ سکرات کے وقت ''حقیقت'' کا کوئی منظر سامنے ضرور آ جاتا ہے، اہل تفسیر نے بھی اس آیت سے یہی سمجھا ہے، ابن جریر طبری لکھتے ہیں:

بالحق من امر الاخرة فتبينه للانسان حتى تثبته وعرفه۔ [1]

''حق یعنی آخرت کا کچھ حال تو موت کی سکرات انسان پر کھول دیتی ہے، یہاں تک کہ انسان اسکو یقین کر لیتا ہے اور جان لیتا ہے۔''

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ محدث اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

يقول عزوجل وجاءت ايها الانسان سكرة الموت بالحق اى كشفت لك عن اليقين الذى كنت تمترى فيه۔ [2]

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے انسان! موت کی بے ہوشی حق کو لے کر آ گئی یعنی تیرے اس یقین کے پردہ کو کھول دیا، جس میں تو شک کرتا تھا۔''

قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ محدث کی تفسیر میں ہے:

ومعنى بالحق انه عند الموت يتضح له الحق ويظهر له صدق ماجاءت به الرسل من الاخبار بالبعث والوعد والوعيد۔ [3]

''اور حق لے کر آنے کے معنی یہ ہیں کہ موت کے وقت حق بات کھل جاتی ہے اور پیغمبر جس قیامت اور جزا وسزا کی خبریں لے کر آئے تھے۔ ان کی سچائی ہویدا ہو جاتی ہے۔''

مفتی آلوسی حنفی کی تفسیر (ج۲۶، ص:۱۶۵) کی عبارت یہ ہے:

والمعنى احضرت سكرة الموت حقيقة الامر الذى نطقت به كتب الله تعالى ورسله عليهم السلام۔

''اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ موت کی مدہوشی اس حقیقتِ امر کو سامنے کر دیتی ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی کتابوں اور اس کے رسولوں نے بیان کیا ہے۔''

---

[1] تفسیر ابن جریر، طبری، ج۲۶، ص:۹۱۔ [2] تفسیر ابن کثیر بر فتح البیان، ج۹، ص:۲۹۸۔

[3] تفسیر شوکانی، ج:۵، ص:۷۳۔

زمخشری معتزلی کی تفسیر (کشاف ج ۲ ص ۱۴۰۲، کلکتہ) اور ابوحیان اندلسی مالکی کی تفسیر (بحرِ محیط ج ۸ ص ۱۲۴ مصر) میں بھی یہی ہے۔

یہ مفسرین مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان سب کی متفقہ تفسیر یہی ہے، اس تفسیر کی صحت کی مزید دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد ہی قیامت کے ذکر میں ہے:

﴿ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۲۲)

''ہم نے آج تجھ سے تیرا پردہ کھول دیا تو آج تیری نظر تیز ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ موت کے وقت کسی قدر انکشاف ہوتا ہے اور قیامت کے دن انکشاف تام ہو جاتا ہے لیکن بہر حال موت کے وقت یقین کا پردہ بالکل کھل جاتا ہے۔

موت کے بعد خدا کی طرف روح کی بازگشت

موت کے لیے قرآن میں اکثر ''خدا کی طرف بازگشت'' یعنی اللہ کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے:

﴿ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۶۲/ الجمعۃ:۸)

''کہہ دو بیشک وہ موت جس سے تم بھاگتے ہو اس سے ملنا ہی ہے پھر تم اس (خدا) کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو حاضر و غائب کا جاننے والا ہے۔ تو وہ تم کو تمہارے کرتوت بتائے گا۔''

﴿ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۶)

''ہم سب خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔''

﴿ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا ﴾ (۵/ المائدۃ:۱۰۵)

''تم سب کو خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

یہ طرز ادا بیسیوں آیات میں اختیار کیا گیا ہے، یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواحِ انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں، اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا کے دار العمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ

مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ إِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (٦/ الانعام:٦٠)

''اور وہی (خدا) ہے جو تمہیں رات کو موت (نیند) دیتا ہے اور دن کو جو کما چکے اس کو جانتا ہے پھر تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے، تاکہ مقررہ وقت (اصلی موت) پورا ہو، پھر اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو تمہارے اعمال جتائے گا۔''

ایک اور آیت میں ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰ أَنفُسِكُم ۖ مَّتَاعَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴾ (١٠/ یونس:٢٣)

''اے انسانو! تمہاری بغاوت کا نتیجہ تمہیں پر ہے دنیا کی زندگی سے کچھ فائدہ اٹھانا پھر ہماری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے تو ہم تم کو تمہارے اعمال جتائیں گے۔''

اس میں دنیا کی زندگی کے بعد ہی خدا نے اپنی طرف واپس آجانے کی اطلاع دی ہے اور اہلِ تفسیر نے بھی اس رجوع الی اللہ سے موت ہی کے معنی سمجھے ہیں (طبری جلد ١١ص ٦٤ مصر) اب ہم ایک ایسی آیت پیش کرتے ہیں جس میں موت کا پورا نقشہ ہے اور اس کے بعد بیان ہے کہ اس دن مرنے کے بعد ہی خدا کے ہاں ہنکا کر لائے جاؤ گے گویا جس طرح جانور ہنکا کر لائے جاتے ہیں، ویسے ہی گناہگاروں کی روحیں موت کے بعد نکال کر لائی جاتی ہیں، فرمایا:

﴿ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ۝ وَقِيلَ مَنْ ۜ رَاقٍ ۝ وَظَنَّ أَنَّهُ الْفِرَاقُ ۝ وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمَسَاقُ ﴾ (٧٥/ القیامۃ:٢٧۔٣٠)

''ہرگز نہیں جب روح ہانس (ہنسلی) تک آپہنچے اور لوگ کہیں اب کون ہے جھاڑ پھونک کر کے بچانے والا اور سمجھا کہ اب جدائی کا وقت آگیا اور پنڈلی سے پنڈلی لپٹ گئی اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے ہانکا جانا۔''

لیکن سعید اور نیکوکار روحوں کو موت کے وقت یہ محبت بھری صدائے غیب سنائی دیتی ہے:

﴿ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴾

(٨٩/ الفجر:٢٧، ٢٨)

''اے مطمئن روح! تو اپنے مالک سے خوش اور تیرا مالک تجھ سے خوش تو اپنے مالک کے پاس چلی جا۔''

یہ کیسی دلآویز صدا اور کیسی واپسی ہوگی۔

اس وقت کا سماں

وہ لمحہ جب اس روح کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہوتی ہے، کتنا دردناک ہے، اس وقت سے اس کی زندگی صرف اس کے گزشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہوتی ہے، ہر عمل کی صورت اس کو اپنے سامنے کھڑی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور غیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیتی ہیں:

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓىِٕكَةُ بَاسِطُوْۤا اَیْدِیْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَیْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ۝ وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ ﴾

(٦/ الانعام: ٩٣، ٩٤)

''اور کبھی تو دیکھے جس وقت گناہگار موت کی بیہوشی میں ہوں اور فرشتے ہاتھ کھولے ہوں کہ نکالو (اپنے جسموں کے اندر سے) اپنی روحوں کو آج تم کو اس پر ذلت کی سزا ملے گی کہ تم خدا کی شان میں جھوٹ باتیں کہتے تھے اور اس کے حکموں کے ماننے سے غرور کرتے تھے اور تم ایک ایک کر کے (تنہا) جیسے ہم نے پہلی بار تم کو پیدا کیا تھا، ہمارے پاس آئے اور جو سامان واسباب تم کو دیا تھا جس نے تم کو مغرور بنایا تھا اس کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے۔''

ان آیات سے ظاہر ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور روح جسم سے جس وقت الگ ہوتی ہے اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے، یہی بات ایک اور موقع پر مذکور ہے:

﴿ وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ یَتَوَفَّى الَّذِیْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓىِٕكَةُ یَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِیْقِ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۝ ﴾

(٨/ الانفال: ٥٠، ٥١)

''اور کبھی تو دیکھے جس وقت فرشتے کافروں کی جان لیتے ہیں ان کے منہ پر اور پیچھے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہاتھوں کے پہلے کیے ہوئے کاموں کا بدلہ ہے اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔''

اس سے واضح ہے کہ یہ سزا موت ہی کے عالم سے شروع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ یہ سزا نعوذ باللہ کسی انتقام کے سبب سے نہیں دیتا بلکہ وہ درحقیقت قانون عمل کے مطابق خود انسان کے کاموں کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔

نیکوکاروں کا نقشہ اس سے بالکل الگ ہے ان کو ہر طرف سے بشارتیں سنائی دیتی ہیں اور ہر سمت خوشی وشادمانی کا سماں سامنے ہوتا ہے:

﴿ فَلَوْلَاۤ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ۝ وَاَنْتُمْ حِیْنَىِٕذٍ تَنْظُرُوْنَ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا

تُبْصِرُوْنَ۝ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ۝ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ۝ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ۝ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ۝ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ۝ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ۝ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ۝﴾

(۵۶/ الواقعۃ:۸۳۔۹۵)

’’پھر کیوں نہیں جس وقت روح حلق تک پہنچ جاتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس سے تمہاری نسبت زیادہ تر نزدیک ہوتے ہیں لیکن تم کو دکھائی نہیں دیتا تو اگر تم کسی اور کے حکم کے نیچے نہیں ہو تو کیوں نہیں اس روح کو پھر پلٹا دیتے ہو اگر تم اپنے انکار و تکذیب میں سچے ہو تو اگر وہ (مرنے والا) مقرب بندوں میں سے ہوا تو خوشی و آرام اور نعمت کی بہشت ہے اور اگر وہ اس سے کچھ کم درجہ رہنے والوں میں ہوا تو تجھ پر سلامتی داہنے والوں میں سے اور اگر وہ حق کو جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہوا تو گرم پانی کی مہمانی اور دوزخ میں بیٹھنا ہے بے شبہ یہ بات یقین کے لائق ہے۔‘‘

یہ تمام سماں موت کے بعد اور عالمِ برزخ ہی کے مناظر ہیں۔

برزخ کا عذاب و راحت

اوپر کی آیتوں سے پوری طرح ہویدا ہے کہ روح وجسم کی مفارقت کے بعد اچھی روحوں کے سامنے رحمت کے اور بری روحوں کے روبرو عذاب کے منظر گزرتے ہیں، قرآن پاک میں کچھ اور آیتیں ہیں جن سے ثابت ہے کہ یہ منظر نہ صرف روح کے سامنے ہی سے گزرتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی وہ اپنے اعمال کے مدارج کے مطابق رحمت یا زحمت کے اندر بھی داخل کر دی جاتی ہے، منافقین کی نسبت قرآن میں ہے:

﴿سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ۝﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۱)

’’ہم ان کو دو دو دفعہ عذاب دیں گے، پھر وہ ایک بڑے عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔‘‘

﴿عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ سے ظاہر ہے کہ دوزخ کا عذاب مراد ہے اب اس عذاب دوزخ سے پہلے عذاب کے دو دوران پڑاؤ گزر چکے ہوں گے، ایک تو یہ دنیاوی عذاب ہے اور دوسرا موت کے بعد ہی کا ہوسکتا ہے قرآن میں آل فرعون کے ذکر میں ہے:

﴿وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۣ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ۝﴾ (۴۰/ المؤمن:۴۵، ۴۶)

’’اور فرعون والوں پر بری طرح عذاب الٹ پڑا آگ کہ اس پر وہ صبح اور شام پیش کیے جاتے

ہیں اور جس دن سے قیامت کی گھڑی کھڑی ہوگی (ندا ہوگی کہ) فرعون والوں کو پہلے سے بھی بڑھ کر عذاب میں ڈالو۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ گناہگاروں کو قیامت سے پہلے برزخ کے عالم میں بھی عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ چکھایا جاتا ہے ایسا ہی نیکو کاروں کو بہشت کے عیش و آرام کا منظر دکھایا جاتا ہے اسی آیت پاک کی تشریح میں گویا آنحضرت نے فرمایا ہے: ''تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح وشام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے اگر وہ اہلِ جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ سے ہوتا ہے تو دوزخ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام، اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے۔ [1] ایک اور صحیح حدیث میں ہے: ''جنتی مردہ کے سامنے جنت و دوزخ دونوں کے منظر سامنے کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو اچھے عمل نہ کرتا تو تیرا یہ مقام ہوتا مگر تیرے نیک عمل کے سبب سے اب یہ جنت تیرا مقام ہے [2] اور اس دن تک کے لیے کہ لوگ اٹھائے جائیں اس پر سرسبزی بھر دی جاتی ہے۔'' [3]

مشرکوں اور قیامت کے منکروں کا سوال تھا کہ اگر یہ پیغام الٰہی سچ ہے تم ہم کو فرشتے یا خدا نظر کیوں نہیں آتے۔ جواب میں کہا گیا کہ فرشتے جس دن نظر آئیں گے، اس دن ایمان بالغیب کہاں؟ اور اوپر آیتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ فرشتے موت کے وقت نظر آتے ہیں یا پھر قیامت میں نظر آئیں گے اس لیے ارشاد ہے:

﴿ يَوْمَ يَرَوْنَ الْمَلَٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى يَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِيْنَ وَيَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ۝ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ۝ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّاَحْسَنُ مَقِيْلًا ۝ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلَٰٓئِكَةُ تَنْزِيْلًا ۝ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ۭ وَكَانَ يَوْمًا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۲۲۔۲۶)

''جس دن وہ فرشتوں کو دیکھیں گے اس دن ان گناہگاروں کو کوئی خوشخبری نہیں اور کہیں گے (کہ یہ ڈراؤنا منظر جو ہم کو نظر آرہا ہے) اب اوٹ میں روکا جائے اور ہمارا خدا فرماتا ہے ان کے کیے ہوئے کاموں کے پاس پہنچے اور ان کو اڑتا غبار بنا دیا (یعنی بیکار بے سود معدوم) جنت والے لوگ یعنی جنت جن کو ملنے والی ہے اس دن ان کے لیے خوب ٹھکانا اور دوپہر کے سونے کا مقام ہوگا اور جس دن آسمان بادل سے پھٹ جائے گا اور فرشتے آہستہ آہستہ اتارے

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنة والنار، باب عرض مقعد المیت: ۷۲۱۱، ۷۲۱۲؛ جامع ترمذی، کتاب الجنائز، باب عذاب القبر: ۱۰۷۲ حدیث حسن صحیح؛ صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب المیت یعرض علیه مقعده بالغداة والعشی: ۱۳۷۹ وکتاب الرقاق، باب سکرات الموت: ۶۵۱۵۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الجنائز، باب ما جاء فی عذاب القبر: ۱۳۷۴۔ [3] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب عرض مقعد المیت: ۷۲۱۶۔

جائیں گے اس دن راج سچے خدا کا ہوگا اور وہ دن کافروں پر سخت ہوگا۔"

کھلی بات ہے کہ آسمان کا بادل سے پھٹنا اور فرشتوں کا اترنا قیامت کا نقشہ ہے اب اس سے پہلے فرشتوں کے دکھائی دینے کا وہ دن جس میں گناہگاروں کے لیے خوشخبری نہیں اور وہ کہیں گے کہ کاش یہ ڈراؤنا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے نہ ہوتا اور جنت کے مستحقین کو ایک اچھا مستقر قرار گاہ اور دوپہر کی دھوپ سے بچانے والی خواب گاہ بنی ہوگی، قیامت سے پہلے اور موت کے بعد ہی کی کیفیت ہے۔

سورۂ محمد ﷺ میں موت کے وقت کا حال بیان ہوتا ہے کہ جب فرشتے ان گناہگاروں کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ فرمایا:

﴿ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَٰئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمُ اتَّبَعُوا مَا أَسْخَطَ اللَّهَ وَكَرِهُوا رِضْوَانَهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ۝ ﴾ (٤٧/ محمد:٢٧، ٢٨)

"پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو وفات دیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے یہ اس لیے کہ انہوں نے اس کی پیروی کی جس نے خدا کو ان سے ناخوش کر دیا اور جنہوں نے خدا کی خوشنودی کو پسند نہ کیا تو خدا نے ان کے کاموں کو بے نتیجہ کر دیا۔"

یہ غیبی ضرب خواہ اسی مادی جسم پر پڑتی ہو یا اس کے مثالی جسم پر یا روح پر جو بھی کہیے، بہر حال اس سے یہ ثابت ہے کہ گناہگار مردہ پر موت کے وقت ہی سے عذاب کا ایک رنگ شروع ہوتا ہے۔ سورۂ انعام میں اس سے زیادہ ہے:

﴿ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ فِي غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَٰئِكَةُ بَاسِطُوا أَيْدِيهِمْ أَخْرِجُوا أَنفُسَكُمُ ۖ الْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ ﴾ (٦/ الانعام:٩٣)

"اور اگر تو دیکھے جب گناہگار موت کی سکرات میں ہوں اور فرشتے ہاتھ بڑھائے ہوں کہ نکالو اپنے جسم کے اندر سے اپنی روحوں کو آج تم کو ذلت کی سزا ملے گی۔"

اَلْيَوْمَ جس کے معنی آج کے ہیں، ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے، جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں، اس "آج" سے مقصود ہمارا دنیاوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے، بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے (دیکھو فتح القدیر شوکانی وتفسیر ابوالسعود وتفسیر روح المعانی آلوسی) قوم نوح کے غرق ہونے کے بعد ہی دوزخ میں جانے کا حکم ہے:

﴿ أُغْرِقُوا فَأُدْخِلُوا نَارًا فَلَمْ يَجِدُوا لَهُم مِّن دُونِ اللَّهِ أَنصَارًا ۝ ﴾ (٧١/ نوح:٢٥)

"وہ ڈبو دیے گئے، پھر وہ آگ میں داخل کیے گئے، تو انہوں نے خدا کے سوا مددگار نہیں پائے۔"

حضرت لوط اور حضرت نوح علیہما السلام کی کافر بیویوں کی موت کے بعد ہی عذاب کا ذکر ہے:

﴿ وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ ۝ ﴾ (٦٦/ التحریم:١٠)

"اور کہا گیا کہ داخل ہونے والوں کے ساتھ تم دونوں بھی آگ میں داخل ہو جاؤ۔"

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت کے بعد کے واقعات ہیں اور اسی وقفہ کا نام "برزخ" ہے۔

سورۂ یٰسین میں ایک "خیر خواہ" قوم کا ذکر ہے جو عمر بھر اپنی قوم کو حق کی تبلیغ کرتا رہا تھا اور پھر وہ غالباً اسی حق کی راہ میں شہید ہوا۔ مرنے کے بعد جب اس کو بہشت ملی، تو اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش میری قوم کو معلوم ہوتا، کہ مرنے کے بعد خدا نے کس طرح مجھے معاف فرمایا اور عزت بخشی، تاکہ وہ بھی ایمان سے میری طرح بہرہ ور ہو کر اس مغفرت اور عزت سے سرفراز ہوتی:

﴿ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ۚ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى قَوْمِهٖ مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ جُنْدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ ۝ ﴾

(۳۶/ یٰس:۲۶۔۲۸)

"کہا گیا جنت میں داخل ہو، اس نے کہا، اے کاش میری قوم کو یہ معلوم ہوتا، کہ میرے پروردگار نے میری مغفرت کی اور مجھے عزت والوں میں سے بنایا اور ہم نے اس کے مرنے کے بعد اس کی قوم پر آسمان سے کوئی فوج نہیں اتاری اور نہ ہم اتارا کرتے ہیں۔"

شہیدوں کی نسبت تو خاص طور پر ہے:

﴿ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۶۹)

"بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس روزی پاتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ شہدا کو برزخ ہی میں کامل زندگی کے ساتھ جنت کی روزی ملتی ہے اور عام نیکوکاروں کا یہ حال ہے کہ ان کو فرشتے اس وقت سلامتی اور جنت کی خوشخبری سناتے ہیں، فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

(۱۶/ النحل:۳۲)

"جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔"

قبر کی اصطلاح

سطور بالا میں عالم برزخ کے وہ مناظر دکھائے گئے ہیں، جو قرآن کی آیتوں میں نظر آتے ہیں اور احادیث صحیحہ میں اس عالم کے حالات کی جو تفصیلیں مذکور ہیں۔ وہ عموماً قبر [1] کی اصطلاح کے ساتھ بیان

[1] بعض معتزلہ عذاب قبر کے قائل نہ تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ قرآن میں اس کا ذکر نہیں، یہ غلط فہمی ان کو اس لیے پیش آئی کہ قرآن میں لفظ قبر وقبور کے ساتھ عذاب کا ذکر نہیں لیکن اگر وہ دیکھتے کہ قرآن میں بعد موت اور قبل قیامت ارواح انسانی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر موجود ہے تو ان کو اس انکار کی جرأت نہ ہوتی اور قرآن میں اس قسم کی متعدد آیتیں موجود ہیں۔

ہوئی ہیں لیکن، اس لفظ ''قبر'' سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں جس کے نیچے کسی مردہ کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے، مادی عناصر کی نہیں، اسی لیے قرآن پاک نے اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ ہمیشہ نفس اور نفوس کو خطاب کیا ہے اور ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والوں کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے خاکی جسم کا مثنیٰ ہوتا ہے۔تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ وہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہٖ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ وبہار کی لذتوں میں مصروف ہے اور تم کو اس سے وہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف وراحت سے مل سکتی ہے اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہو بہو تمہارا مادی جسم ہے اسی طرح موت کے خواب میں بھی تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا جو اکثر حالتوں میں ہو بہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا [1] اور تمہاری روح اسی جسمِ مثالی کے عذاب وراحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح انسانی ہے، جسم خاکی نہیں فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ ﴾ (۷۴/ المدثر :۳۸) یعنی ''ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرو ہوگی۔'' اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں، جسم صرف بمنزلۂ آلہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا، برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ یا مادیات سے پاک وبری ہوگا، تاہم اس کو اپنے خاکی جسم سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں، قرآن پاک کی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے:

﴿ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذْ يَتَوَفَّى ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ ۙ ٱلْمَلَٰٓئِكَةُ يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَٰرَهُمْ وَذُوقُوا۟ عَذَابَ ٱلْحَرِيقِ ﴾ (۸/ الانفال:۵۰)

''اور اگر تو دیکھے جب فرشتے کافروں کی روح قبض کرتے ہیں، مارتے ہیں ان کے منہ پر اور پیٹھ پر اور کہتے ہیں چکھو جلنے کا مزہ۔''

اس آیت سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ گناہگاروں پر موت کے بعد ہی سے عذاب شروع ہو جاتا ہے، وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مار ان کے منہ اور پیٹھ پر پڑتی ہے مگر یہ منہ اور یہ پیٹھ وہ نہیں ہے جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے، بلکہ اس آیت میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکاتے وقت کبھی آگے (منہ) پر اور کبھی پیچھے (پیٹھ پر) مارتے ہیں اسی طرح گویا کافر روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو،

[1] اس سے اس شبہ کا ازالہ ہوتا ہے کہ ہم کو مردہ کا جسم سامنے پڑا نظر آتا ہے، لیکن اس پر عذاب کا کوئی نشان نظر نہیں آتا اور نیز اس شبہ کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ قبر میں جب جسم گل سڑ جاتا ہے تو پھر عذاب وثواب کا احساس اس کو کیسے ہوتا ہے۔

یہی مفہوم صاف لفظوں میں اسی آیت میں ہے:

﴿ اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِالْمَسَاقُ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۳۰)

''اس دن تیرے پروردگار کی طرف ہے، ہنکایا جانا۔''

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس برزخ میں ان کے جسم خاکی کی شکل وصورت کی قید سے بھی آزاد کر کے دوسرا مناسب مثالی جسم عطا کرتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ ''مومنِ کامل کی روح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے۔'' [1] اور خصوصاً شہدا کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی۔ اسی طرح دوزخ و بہشت سے متعلق آنحضرت ﷺ کا جو رؤیائے صادقہ پہلے گزرا ہے اس میں جن جسمانی قالبوں میں گناہگاروں کی سزا وتکلیف کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام تر مثالی ہیں، ظاہر ہے کہ مومنِ سعید اور شہدا کے وہ مثالی قالب اور ان گناہگاروں کے یہ مثالی اجسام ان کے وہ قالب واجسام نہیں ہیں جو ان کی قبروں میں گل سڑ کر فنا ہو گئے یا وہ آگ میں جل کر خاکستر ہوئے اور ذرے ہوا میں اُڑ کر منتشر ہو گئے، یا کسی جانور کے پیٹ میں جا کر اس کے جزوِ بدن بن گئے۔

بعض حدیثوں میں آنحضرت ﷺ سے ان مٹی کی قبروں میں عذاب کے مشاہدات ومسموعات کا تذکرہ ہے تو ظاہر ہے کہ مادی زبان ومنظر میں ان قوموں کے نزدیک جو مردوں کو گاڑتی ہیں اس میت کی یادگار اس دنیا میں اس کے اس مٹی کے ڈھیر کے سوا اور کیا ہے جس کی طرف اشارہ کیا جا سکے، ایک صحیح حدیث میں اس نیک مرد کا ذکر ہے جس نے خدا کے خوف سے یہ وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اس کا جسم جلا کر اس کی راکھ ہوا میں اڑا دی جائے، تا کہ وہ خدا کے سامنے حاضر نہ کیا جا سکے، مگر قدرت الٰہی نے اس کو مجسم کر کے کھڑا کر دیا اور اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمتوں سے نوازا۔ [2]

سوال و جواب

احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مرنے کے بعد قبر میں دو فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید ورسالت کی نسبت سوال وجواب کرتے ہیں۔''

اس کی تصدیق قرآن پاک کی ان آیتوں سے بھی ہوتی ہے:

﴿ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۱۶/ النحل:۳۲)

''جن کو فرشتے (گناہوں سے) پاک وصاف حالت میں وفات دیتے ہیں کہتے ہیں کہ تم پر

[1] سنن ابن ماجه، كتاب الجنائز، باب ماجاء فيما يقال عند المريض اذا حضر:۱۴۴۹۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الرقاق باب الخوف من الله:۶۴۸۰۔۶۴۸۱۔

سلامتی ہو اپنے کاموں کے بدلہ جنت میں چلے جاؤ۔''

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ ﴾

(٤/ النسآء:٩٧)

''بیشک فرشتوں نے جن کی روحوں کو اس حالت میں قبض کیا کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، وہ ان سے کہتے ہیں، تم کس بات میں تھے وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ملک میں بے یار و مددگار تھے وہ فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اپنا وطن چھوڑ کر باہر چلے جاتے۔''

ایک اور آیت ہے:

﴿ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ قَالُوا أَيْنَ مَا كُنتُمْ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا وَشَهِدُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوا كَافِرِينَ ۝ قَالَ ادْخُلُوا فِي أُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُم مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ فِي النَّارِ ۖ ﴾ (٧/ الاعراف:٣٧، ٣٨)

''یہاں تک کہ جب ان جھٹلانے والوں کے پاس ہمارے فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرنے آئیں گے اور کہیں گے کہاں ہیں وہ جن کو تم خدا کے علاوہ پکارتے تھے (اس وقت وہ مشرک) کہیں گے کہ ہمارے وہ دیوتا ہم سے کنارہ کش ہو گئے اور انہوں نے اپنے اوپر آپ گواہی دی کہ وہ کافر تھے، تب خدا فرمائے گا کہ تم بھی ان لوگوں میں جا ملو جو جن و انس میں سے تم سے پہلے آگ میں جا چکے ہیں۔''

پہلی آیت میں عدمِ ہجرت کے گناہ کے مرتکب مسلمانوں کا اور دوسری میں کافروں کا حال بیان کیا ہے، کہ ان سے ان کی موت کے بعد ہی یہ سوال کیا جائے گا، بہرحال یہ تو خاص خاص گناہوں کے مجرموں کا حال تھا، اب عام لوگوں سے جو سوال ہو سکتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر احادیث میں ہے، یعنی یہ کہ توحید و رسالت کی معرفت کا ان سے سوال ہو گا۔

قرآن پاک میں ایک جگہ کلمہ طیبہ (اچھی بات یعنی کلمہ توحید) اور کلمہ خبیثہ (بری بات یعنی کلمہ کفر) کی ایک ایک مثال ہے، کلمہ طیبہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑیں زمین میں مضبوط گڑی ہیں، اس کی شاخیں آسمانوں تک پھیلی ہیں، اس میں سدابہار میوے لگے ہیں اور کلمہ خبیثہ کی مثال اس درخت کی ہے، جس کی جڑ زمین سے اکھڑی پڑی ہے، وہ اب گرا اور تب گرا، اس کے بعد قرآن میں ہے:

﴿ يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ ۖ وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۚ ﴾ (١٤/ ابراھیم:٢٧)

’’اللہ ایمان والوں کو پکی بات پر اس دنیا میں مضبوط رکھے گا اور آخرت میں بھی اور اللہ ظالموں کو بچلاتا ہے۔‘‘

اس کی تفسیر صحیح حدیثوں میں یہ ہے کہ یہ برزخ کے اسی سوال و جواب سے متعلق ہے کہ صاحب ایمان جس طرح اپنی اس زندگی میں ایمان کی بات پر قائم تھا، اسی طرح برزخ میں بھی اس پر قائم رہے گا اور جو کافر و مشرک یہاں اس پر قائم نہ تھا، وہ وہاں بھی قائم نہ رہے گا اور بہک جائے گا۔ ہر چند کہ رسول کریم ﷺ سے صحیح تفسیر کے ہوتے ہوئے کسی اور استدلال کی حاجت نہیں، تاہم تائیداً یہ عرض ہے کہ اس آیت میں اہل ایمان کے آخرت میں بھی ’’قولِ ثابت‘‘ پر ثابت قدم رکھے جانے کی بشارت ہے، ظاہر ہے کہ اس سے آخرت قیامت اور بہشت و دوزخ کا دن تو مراد نہیں ہوسکتا کہ وہ تو کشفِ راز کا دن ہے، اس دن تو کافر بھی اس قول ثابت سے پلٹنے کی جرأت نہیں کرسکتا، پھر یہ اہلِ ایمان کے لیے کوئی خاص بشارت نہ ہوگی اور نہ یہ اس اظہارِ احسان کا مناسب وقت ہوسکتا ہے، البتہ اس بشارت اور احسان کا اعلان و اظہار، آخرت کے اس حصہ میں موزوں ہوسکتا تھا، جہاں ہنوز اسرار پس پردہ کی پوری نقاب کشائی نہیں ہوتی اور وہ برزخ کا عالم ہے۔ اس آیتِ مبارکہ کی اس تفسیر سے جو احادیث صحیحہ پر مبنی ہے، یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آخرت کی وسعت مفہوم میں برزخ کا میدان بھی داخل ہے۔ حقیقت میں اس عالمِ برزخ کا سوال و جواب کوئی نیا واقعہ نہ ہوگا، بلکہ ہر روح کی پہلی زندگی کی ایمانی کیفیت اقرار و انکار کی مثال ہوگی یا یوں کہو کہ آج کے آئینہ میں کل کا عکس نمایاں ہوگا، یعنی اقرار و انکار کی جس کیفیت پر زندگی کا خاتمہ ہوا ہوگا، وہی بعد کو سوال و جواب میں نمایاں ہوگی۔

برزخ میں ارواح کا مسکن

آخری سوال یہ ہے کہ موت اور قیامت کی اس بیچ کی منزل (برزخ) میں ارواح انسانی کا مسکن کہاں ہوگا؟ قرآن پاک میں اس کا جواب متعدد آیتوں میں ملتا ہے، سب سے پہلی آیت تو ان مذکورہ بالا آیات کے بعد ہے، جس میں ذکر ہے کہ فرشتے جب منکرین سے سوال و جواب کر چکیں گے تو خدا ان کی روحوں کو حکم دے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ عذاب کی آگ میں داخل ہوجائیں، اس کے بعد ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ﴾ (۷/ الاعراف: ۴۰)

’’بے شک جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا، ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے اور نہ وہ جنت میں داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے (یعنی کبھی نہیں)۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ آیات الٰہی کے منکروں اور جھٹلانے والوں کی روحیں مرنے کے بعد آسمانی بادشاہی

کے حدود میں قدم نہ رکھ سکیں گی اور وہ فضائے زمین میں آوارہ پھریں گی یا اپنے جسم خاکی کے لگاؤ سے جہاں وہ سپرد خاک ہوئے ہوں منڈلاتی رہیں گی اور وہیں سے دوزخ کا منظر دیکھیں گی اور تکلیف اٹھائیں گی۔

اس کے برخلاف ہمہ تن پاکباز مومن روح کا یہ حال ہوتا ہے کہ موت ہی کے وقت رحمت الٰہی کا فرشتہ بلکہ خود زبان رحمت اس کے کانوں میں صدا دیتی ہے:

﴿ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَىِٕنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۲۷۔۳۰)

''اے مطمئن روح! اپنے پروردگار کے پاس واپس چلی جاؤ، تیرا پروردگار تجھ سے خوش اور تو اپنے پروردگار سے خوش، تو میرے بندوں میں شامل اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔''

ان سے بڑھ کر وہ پاکباز روحیں ہیں، جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو خدا کی طرف سے ایک تمثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و مسرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جائے گی۔ فرمایا:

﴿ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۵٤)

''جو خدا کی راہ میں مارے جائیں، ان کو مردہ نہ کہو وہ زندہ ہیں لیکن تم شعور نہیں کر سکتے۔''

یہ پر مسرت زندگی کیسی ہوگی اس کی تفصیل دوسری سورہ میں ہے:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِیْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ یَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱٦۹، ۱۷۰)

''اور تو ان کو جو خدا کی راہ میں مارے گئے، مردہ نہ گمان کر بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، ان کو روزی دی جاتی ہے خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو جو دیا ہے اس پر خوش ہیں اور جو ابھی ان کے پیچھے سے ان تک نہیں پہنچے ہیں ان کی طرف سے بھی خوش ہیں، کہ ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے وہ اللہ کے مہر و کرم سے مسرور ہیں اور اللہ ایمان والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔''

یہ پر مسرت زندگی شہدا کو ملے گی اس زندگی کا مقام ''خدا کے پاس'' بتایا گیا ہے، احادیث صحیحہ میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفس عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں

جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں اس کے بعد غالباً اتنا ہر ذی عقل تسلیم کرے گا کہ انبیا علیہم السلام کے روحانی مدارج و مراتب شہدا سے بہر حال اعلیٰ اور برتر ہیں اس لیے ان کا مقام بھی اسی احاطہ قدس کے اندر ہوگا، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے سیرِ معراج اور اپنے رؤیائے صادقہ میں بعض پیغمبروں کو آسمان اور بہشت کے مختلف مدارج میں دیکھا۔ بعض وہ سعید روحیں ہوں گی جو یہاں سے نکل کر فرشتوں کی صف میں داخل ہو جاتی ہیں، جیسا کہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے متعلق احادیثِ صحیحہ میں آیا ہے کہ وہ شہادت کے بعد اپنے دونوں بازوؤں سے فرشتوں کے ساتھ عالم ملکوت میں اڑ رہے تھے، [1] عالم برزخ کے یہ دو اڑنے والے بازو در حقیقت ان کے دونوں جسمانی بازوؤں کی مثال ہیں جو اس جنگ میں ان کے جسم سے کٹ کر گر گئے تھے اور وہ اس پر بھی اسلام کے علم کو اپنے بقیہ کٹے ہوئے بازو اور گردن کے سہارے سے پکڑے تھے، عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کی شان میں ہو:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۝ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ: ۳۰، ۳۱)

''بے شک جن لوگوں نے اقرار کیا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر ثابت قدم رہے ان پر فرشتے یہ خوشخبری لے کر اترتے ہیں کہ خوف نہ کھاؤ اور غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت سنو، جس کا تم سے وعدہ کیا تھا، ہم دنیا کی زندگی میں تمہارے رفیق ہیں اور آخرت میں بھی۔''

یہ آوازۂ بشارت اور فرشتوں کی رفاقت اسی برزخ کا دلکش سماں ہو سکتا ہے۔

[1] جامع ترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب جعفر بن ابی طالب: ۳۷۶۳۔

2 آخرت کی دوسری اور حقیقی منزل

قیامت اور جزائے اعمال

موت تو افراد کا معاملہ ہے، ایک مرتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ پیدا ہوتا ہے۔ قومیں بھی باری باری اس بازی گاہ کے تختہ پر آتی ہیں اور ایک قوم اپنا کھیل ختم کر کے کسی دوسری کے لیے جگہ خالی کر جاتی ہے یہ سلسلہ ازل سے قائم ہے اور اب تک چل رہا ہے کائنات جس نظام پر پیدا ہوئی تھی وہ بعینہٖ قائم ہے اور اس محفل کی جو رونق اول روز تھی وہ اب تک اسی طرح باقی ہے۔ غرض ؎

ہزار شمع بکشتند وانجمن

باقی است

لیکن کیا کوئی ایسا دن بھی آئے گا جب یہ ساری بساطِ ہستی الٹ جائے گی۔ کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان وزمین کے کُرّے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پھر وہ خلاقِ عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھائے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا ہو کر، ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہو گا۔

دنیا کے وہ تمام لوگ جو حال کو دیکھ کر مستقبل کا پتہ لگاتے ہیں کسی نہ کسی طرح اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جس طرح یہ افراد آتے اور فنا ہوتے ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب اس پوری دنیائے حیات پر موت طاری ہو گی، سب سے زیادہ اس سوال کے جواب میں کرید بلکہ انکار کا حق فلسفہ اور سائنس کے محققوں (سائنٹسٹوں) کو ہوسکتا ہے مگر اہل فلسفہ کا بڑا گروہ بھی اس امکان پر یقین رکھتا ہے اور اہل سائنس بھی اس امکان کو بہر حال محال نہیں سمجھتے بلکہ طبعیات وہیئتِ جدید کے مختلف محققوں کے خیالات اس باب میں امکان سے آگے بڑھ کر وقوع کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں اور اس ہولناک دن کی آمد کے متعلق اپنے علم کے زور سے پیشین گوئیاں کرتے رہتے ہیں اور اس عالمگیر موت کے مختلف اسباب ظاہر کرتے ہیں کوئی کہتا ہے اس نظام عالم کی پوری گاڑی جس انجن سے چل رہی ہے وہ یہ گرم آفتاب ہے اور اس کی یہ گرمی روز بروز کم ہوتی جاتی ہے آخر ایک دن آئے گا جب یہ انجن بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور یہ ساری گاڑی ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظام کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیارے روز بروز کھنچے چلے آتے ہیں تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب یہ باہمی توازن باقی نہ رہے گا اور اس وقت تمام کرّے ایک دوسرے سے قریب ہو کر ٹکرا جائیں گے اور یہ تصادم ان کو چور چور کر دے گا۔

ایک اور خیال یہ ہے کہ اس فضا میں کروڑوں ستارے تیر رہے ہیں، ان میں سے بہت کم کا علم ہم کو ہوا

ہے، بہت ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں ہماری زمین کسی نئے ستارے سے ٹکرا کر چور چور ہو جائے اور اس کی ساری آبادی ھباءً منثورًا ہو کر رہ جائے۔

بہر حال اسبابِ طبعی کچھ ہوں مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان، بلکہ وقوع کی امید سے خالی نہیں۔

اہلِ مذاہب میں یہ عقیدہ کسی نہ کسی نوع سے ہر جگہ موجود ہے اور اس کا مجمل تذکرہ تمام آسمانی کتابوں میں ہے، تورات میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں، زبور میں اس کی تصریحات موجود ہیں اور اس میں اس کو ''عدالت کا دن'' کہا گیا ہے۔ [1] حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں یہود کے دو فرقے تھے ایک ''صدوقی'' جو یونانیوں کے اثر سے آزاد خیال ہو گیا تھا اور قیامت کا منکر تھا مگر دوسرا فرقہ جو ''فریسی'' کہلاتا تھا بدستور اپنے پرانے عقیدہ پر قائم تھا [2] آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں بھی جو یہود تھے وہ قیامت اور حشر و نشر اور بہشت و دوزخ کے قائل تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جب قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ ایک انگلی پر آسمانوں کو، دوسری پر زمینوں کو اور تیسری پر درختوں کو، چوتھی پر پانی کو اور اندر کی نرم مٹی کو اور پانچویں پر تمام مخلوقات کو رکھے گا اور ندا دے گا کہ ''میں ہوں بادشاہ۔'' [3] انجیل میں یہ عقیدہ پوری تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صدوقیوں کے مقابلہ میں تورات کی ایک آیت سے حیاتِ اخروی کا ثبوت پیش کیا ہے [4] اور مکاشفاتِ یوحنا میں قیامت کے احوال و اہوال کی پوری تفصیل و تشریح مذکور ہے۔ ہندو ''پرلے'' کے نام سے اس عقیدہ (فنائے عالم) پر یقین رکھتے ہیں لیکن اس حقیقت کی کامل تشریح خاتم انبیا محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے انجام کو پہنچی ہے۔

قیامت کے نام

کسی شے کی حقیقت کی اولین گرہ کشائی اس کے ناموں کی تشریح سے ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک نام اس کے ایک خاص پہلو کو نمایاں اور ظاہر کرتا ہے۔ قرآن میں اس کا سب سے پہلا نام جو قرآن کی سب سے پہلی سورۂ میں ہے، وہ یوم الدین ہے یعنی ''جزا کا دن'' جس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا، اس کے علاوہ اس کے اور بھی بہت سے نام قرآن میں جابجا آئے ہیں:

اَلسَّاعَةَ وہ گھڑی (وہ مقررہ وقت)

یَوْمُ الْقِيَامَةِ کھڑے ہونے کا دن (مُردوں کے کھڑے ہونے کا دن)

اَلْيَوْمُ الْحَقُّ سچا دن (نہ جس کے آنے میں کوئی شک ہے اور نہ جس کے فیصلہ میں کوئی غلطی ہوگی)

---

[1] زبور: ۹، ۱۶، ۱۷، و ۲۲، ۱۔۲ و باب: ۴۹ و ۵۰۔ [2] انجیل مرقس: ۱۲، ۲۴ واعمال: ۲۳۔

[3] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ زمر: ۴۸۱۱، ۴۸۱۲۔

[4] متی: ۲۲، ۳۱، ۳۲؛ لوقا: ۲۰۔۲۷؛ مرقس: ۱۲۔۱۸۔

يَوْمٌ مَّعْلُوْمٌ	جانا ہوا دن یا مقررہ دن
اَلْوَقْتُ الْمَعْلُوْمُ	جانا ہوا وقت یا مقررہ وقت
اَلْيَوْمُ الْمَوْعُوْدُ	موعودہ دن
اَلْيَوْمُ الْاٰخِرُ	پچھلا دن
يَوْمُ الْاٰزِفَةِ	قریب آنے والی مصیبت کا دن
يَوْمٌ عَسِيْرٌ	ایک سخت دن
يَوْمٌ عَظِيْمٌ	ایک بڑا دن
يَوْمٌ عَصِيْبٌ	سخت دن
يَوْمَ الْبَعْثِ	جی اٹھنے کا دن
يَوْمَ التَّغَابُنِ	افسوس کا دن [1]
يَوْمُ التَّلَاقِ	باہم ملنے کا دن
يَوْمُ التَّنَادِ	پکار کا دن
يَوْمُ الْجَمْعِ	اکٹھے ہونے کا دن
يَوْمُ الْحِسَابِ	حساب کا دن
يَوْمَ الْحَسْرَةِ	حسرت کا دن
يَوْمُ الْخُرُوْجِ	قبروں سے نکلنے کا دن
يَوْمُ الْفَصْلِ	فیصلہ کا دن
اَلْقَارِعَةُ	کھڑکھڑانے والی
اَلْغَاشِيَةُ	چھا جانے والی
اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى	بڑی مصیبت
اَلنَّبَاُ الْعَظِيْمُ	بڑی خبر
اَلْحَآقَّةُ	ضرور آنے والی گھڑی
اَلْوَعْدُ	وعدہ
اَلْوَاقِعَةُ	وقوع پذیر
اَمْرُ اللّٰهِ	خدا کی بات

[1] عام مترجمین نے ہار جیت کا دن لکھا ہے اور شاہ عبدالقادر صاحب نے نقصان اٹھانے کا دن لکھا ہے اسی سے اس میں حسرت وافسوس کا مفہوم بھی شامل ہوا۔

اَلصَّاخَّةُ بہرا کرنے والی گھڑی

قیامت کے اوصاف

یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں ہیں، ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ اس کے اور بھی بکثرت نام قرآن میں آئے ہیں، مثلاً:

﴿ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ﴾ (٦/ الانعام:٧٣۔ ٢٠/ طٰهٰ:١٠٢۔ ٢٧/ النمل:٨٧)

''جس دن نرسنگا پھونکا جائے گا۔''

﴿ يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ﴾ (٥/ المائدہ:١١٩)

''جس دن سچوں کو ان کی سچائی کام دے گی۔''

﴿ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٨٨)

''جس دن نہ مال کام آئے گا نہ اولاد۔''

﴿ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ ﴾ (٢٥/ الفرقان:٢٧)

''جس دن گناہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائے گا۔''

﴿ وَيَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ ﴾ (٢٥/ الفرقان:٢٥) ''جس دن آسمان پھٹے گا۔''

﴿ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٥١) ''اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔''

﴿ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ﴾ (٣/ آل عمران:٩) ''جس دن میں کوئی شک نہیں۔''

﴿ وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا ﴾ (٢٧/ النمل:٨٣)

''جس دن ہر قوم سے ایک گروہ کو اکٹھا کریں گے۔''

﴿ يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (٨٣/ المطففين:٦)

''جس دن لوگ جہان کے پروردگار کے لیے کھڑے ہوں گے۔''

﴿ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ ﴾ (٥٤/ القمر:٧)

''(جس دن) لوگ قبروں سے نکلیں گے۔''

﴿ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴾

(٨٠/ عبس:٣٤۔٣٦)

''جس دن آدمی اپنے بھائی اور ماں اور باپ اور بیوی اور بیٹوں سے بھاگے گا۔''

﴿ يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا ﴾ (٢/ البقرۃ:١٢٣)

''جس دن کوئی کسی دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گا۔''

﴿ يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ ﴾ (٢٤/ النور:٢٤)

''جس دن ان کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی۔''

﴿ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ﴾ (٨٢/ الانفطار:١٩)

''جس دن کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ بھلا نہ کر سکے گا۔''

﴿ يَوْمَ لَا يُغْنِي مَوْلًى عَن مَّوْلًى شَيْـًٔا ﴾ (٤٤/ الدخان:٤١)

''جس دن کوئی دوست کسی دوسرے دوست کو فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔''

الغرض یہ اور اسی قسم کے اور دوسرے اوصاف اس ہولناک دن کے بیان کیے گئے ہیں جن سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، عاجزی اور اپنے اعمال کے سوا کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

قیامت میں فسادِ نظام ہوگا

قیامت کے متعلق بعض متکلمین کو یہ شبہ ہوا ہے کہ وہ مادہ کے فنائے محض، یا عدم محض کا نام ہے، حالانکہ یہ بات قرآنی تصریحات کے خلاف ہے۔ قرآن پاک کی بیسیوں آیتوں میں قیامت کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ تمام تر فنائے حیات اور آسمان و زمین کے نظام کی برہمی اور ان کی تباہی کے خاکہ کے سوا کچھ اور نہیں ہے چنانچہ حسب ذیل آیات پر غور کرنے سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آ جائے گا:

﴿ الْقَارِعَةُ ۝ مَا الْقَارِعَةُ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْقَارِعَةُ ۝ يَوْمَ يَكُونُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوثِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنفُوشِ ۝ ﴾ (١٠١/ القارعة:١-٥)

''متنبہ کرنے والی اور کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی اور تم کو کس نے بتایا کہ کیا چیز ہے متنبہ کرنے والی، یہ وہ دن ہے جب لوگ پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہوں گے۔''

﴿ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ ﴾ (٩٩/ الزلزال:١-٤)

''جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور زمین اپنا بوجھ نکالے گی اور انسان کہے گا، زمین کو کیا ہوا، اس دن زمین اپنی حالت بیان کرے گی۔''

﴿ إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ ﴾ (٨٤/ الانشقاق:١-٤)

''جب آسمان پھٹ جائیں گے اور رہ اپنے مالک کی فرمانبرداری کریں گے اور وہ فرمانبرداری

کے لائق ہیں، جب زمین پھیلائی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے وہ ڈال دے گی اور وہ خالی ہو جائے گی۔"

﴿ اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۙ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۙ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۙ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۙ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۗ﴾ (۸۲/ الانفطار:۱۔۵)

"جب آسمان پھٹ جائیں گے اور جب ستارے بکھر جائیں گے اور جب دریا چلائے جائیں گے اور جب قبر کے لوگ زندہ کیے جائیں گے، روحوں نے جو پہلے اور پیچھے بھیجا ہے اس وقت جان لیں گی۔"

﴿ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ۙ وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ سُيِّرَتْ ۙ﴾

(۸۱/ التکویر:۱، ۳)

"جب آفتاب اندھیر کیا جائے گا، جب ستارے تاریک ہو جائیں گے، جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔"

﴿ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۗ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۙ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۙ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۙ﴾

(۷۷/ المرسلات:۷۔۱۰)

"جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والا ہے، جب ستارے ماند کر دیے جائیں گے، جب آسمان کھول دیا جائے گا، جب پہاڑ ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے۔"

﴿ فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۙ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۙ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۙ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۷۔۹)

"جب نگاہ ماند ہو جائے گی، جب ماہتاب بے نور ہو جائے گا اور آفتاب و ماہتاب اکٹھے کر دیے جائیں گے۔"

﴿ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۙ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۙ﴾ (۷۰/ المعارج:۸، ۹)

"جب آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی طرح اور جب پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہو جائیں گے۔"

﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِيَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ۙ﴾

(۶۹/ الحاقۃ:۱۳۔۱۶)

"جب صور میں ایک پھونک پھونکی جائے گی، جب زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور دونوں ٹکڑے ہو جائیں گے، اس دن ہونے والی بات ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس

دن کمزور ہو جائے گا۔''

﴿ يَوْمَ تَرْجُفُ الْأَرْضُ وَالْجِبَالُ وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيبًا مَّهِيلًا ۝ إِنَّا أَرْسَلْنَا إِلَيْكُمْ رَسُولًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَا أَرْسَلْنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ رَسُولًا ۝ فَعَصَىٰ فِرْعَوْنُ الرَّسُولَ فَأَخَذْنَاهُ أَخْذًا وَبِيلًا ۝ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِن كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا ۝ السَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ ۚ كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا ۝ ﴾ (۷۳/ المزمل:۱٤......۱٦، ۱۷)

''جب زمین اور پہاڑوں میں لرزہ ہوگا اور پہاڑ پگھلا ہوا تانبا ہو جائیں گے.............. کیونکر متقی ہو سکتے ہے، جب اس دن کا انکار کرتے ہو، جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا، آسمان اس دن پھٹ جائے گا اور خدا کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔''

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ ﴾ (۱٤/ ابراهيم:٤٨)

''جب یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی۔''

﴿ فَإِذَا انشَقَّتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۳۷)

''جب آسمان پھٹ جائیں گے اور سرخ تلچھٹ کی طرح ہو جائیں گے۔''

﴿ إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ۝ وَبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنبَثًّا ۝ ﴾ (٥٦/ الواقعہ:۱۔٦)

''جب ہونے والی بات ہو جائے گی، جس کے ہونے میں جھوٹ نہیں ہے، زیر و زبر کر دینے والی، جب زمین خوب ہلائی جائے گی اور پہاڑ پراگندہ کیے جائیں گے اس وقت وہ پریشان ذرات کی طرح ہو جائیں گے۔''

﴿ وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا ۝ وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ فَكَانَتْ سَرَابًا ۝ ﴾

(۷۸/ النبا:۱۹، ۲۰)

''اور آسمان کھول دیے جائیں گے اور وہ دروازے ہو جائیں گے اور پہاڑ چلائے جائیں گے، تو وہ سراب ہو جائیں گے۔''

غرض اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قیامت صرف نظامِ عالم کی درہمی اور دنیا کی حیاتِ موجودہ کی تباہی کا نام ہے جس کے بعد ایک نئی زمین اور ایک نیا آسمان بنے گا اور پچھلی دنیا کے اعمال کے نتائج پر اس دنیا کی حکومت کا قانون جاری ہوگا:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمَاوَاتُ وَبَرَزُوا لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ ﴾

(۱٤/ ابراهيم:٤٨)

''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے اور سب لوگ اس ایک، سب پر قابو رکھنے والے خدا کے سامنے نکل کر آئیں گے۔''

قیامت کی حقیقت

اگرچہ قرآن پاک میں متفرق طور پر اس ہولناک دن کے احوال و کیفیات کا ذکر گوناگوں طریقوں سے کیا گیا ہے، تاہم ایک خاص سورہ بھی اس نام سے اس میں موجود ہے جس میں نہایت اختصار و ایجاز کے باوجود انتہائی بلیغانہ وسعت ہے، چھوٹے چھوٹے فقروں میں بڑے سے بڑے اور اہم سے اہم مطالب کو اس طرح بیان کیا ہے کہ عقل ساکت اور قلب مطمئن ہو جاتا ہے، اس سورہ کا آغاز ان آیتوں سے ہوتا ہے:

﴿لَا أُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝ وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَلَّن نَّجْمَعَ عِظَامَهُ ۝ بَلَىٰ قٰدِرِينَ عَلَىٰ أَن نُّسَوِّيَ بَنَانَهُ ۝ بَلْ يُرِيدُ الْإِنسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ ۝ يَسْـَٔلُ أَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ۝ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ۝ وَخَسَفَ الْقَمَرُ ۝ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝ يَقُولُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفَرُّ ۝ كَلَّا لَا وَزَرَ ۝ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ ۝ يُنَبَّؤُا الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ ۝ بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝﴾

(۷۵/ القيامة:۱-۱۵)

''میں قیامت کے دن کی اور ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں، کیا وہ (انسان) سمجھتا ہے کہ ہم اس کے مرنے کے بعد اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہیں کر سکتے، کیوں نہیں ہم تو اس کے پوروں کو درست کر سکتے ہیں، یہ نہیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ انسان چاہتا یہ ہے کہ خدا کے سامنے ڈھٹائی کرے، پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب ہے؟ تو جب نگاہ چوندھانے لگے اور چاند بے نور ہو جائے اور سورج اور چاند ایک جگہ کر دیے جائیں گے، انسان اس دن کہے گا، اب کہاں ہے بھاگنے کی جگہ، ہرگز نہیں، کہیں بچاؤ نہیں، اس دن تیرے رب کے پاس ہے جا ٹھہرنا، اس دن انسان کو جو آگے بھیجا (عمل) اور جو پیچھے چھوڑا (مال و دولت) وہ بتایا جائے گا بلکہ انسان اپنے حال کو آپ دیکھتا ہے اگرچہ وہ زبان سے بہانے تراشا کرے۔''

ان میں سے پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے روزِ قیامت اور نفسِ لوّامہ کی یکے بعد دیگرے قسم کھائی ہے، نفس لوامہ ''یعنی ملامت کرنے والے نفس سے'' مقصود انسان کا اندر کا ضمیر ہے جو انسان کے ہر برے کام کے وقت اندر سے غمگین و نادم ہوتا ہے اور اس کو اس کے اس کام پر ملامت کرتا ہے آخری آیت میں اسی کیفیت ضمیر کو ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے کہ ''بلکہ انسان اپنے حال کو آپ خوب جانتا ہے اگرچہ وہ زبان سے

اپنی برائیوں اور کوتاہیوں کے لیے سینکڑوں بہانے تراشے' انسان کی اسی قلبی کیفیت کا نام نفس لوّامہ ہے۔

① اجتماعیات کے عالم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرد اور جماعت کے احوال میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گناہگار ہوتا ہے، نیکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نیک نام ہوتا ہے، بدنام ہوتا ہے، خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے اور پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے قوائے عمل سرد پڑتے جاتے ہیں اور وہ مر جاتا ہے۔ بعینہ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہو جاتی ہیں، گناہگار ہوتی ہیں، نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قویٰ کمزور و مضمحل ہو جاتے ہیں اور وہ فنا ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہو کر فنا ہو چکی ہیں، جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر اب موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ، جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ اقوام پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، کیا اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا مجموعہ جو پیدا ہوتا، بڑھتا اور ترقی کرتا چلا جاتا ہے، وہ ایک دن فنائے محض کے آغوش میں جا کر سو نہ جائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے قیامت کے ثبوت میں اکثر عاد و ثمود و آلِ فرعون وغیرہ کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے، اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

بہر حال اب جس طرح شخص کے اندر ایک نفسِ لوّامہ یا ضمیر یا احساس ہے جو اس کے ہر برے فعل کے وقت اس کو ملامت کرتا ہے اور اس کو گناہگار ٹھہرتا ہے اور جب کبھی وہ اپنے تمام مجموعی کارناموں پر نگاہ ڈالتا ہے تو اپنے کو قصوروار جانتا ہے اور گناہگار ٹھہراتا ہے اسی طرح قوموں کا ضمیر بھی اپنے گناہوں پر پچھتاتا اور اپنی تقصیروں پر نادم اور اپنی کوتاہیوں سے شرمندہ ہوتا ہے، اسی طرح یہ پوری انسانیت بھی ایک دن اپنے افراد کے مجموعی کارناموں پر نادم و پشیمان ہوگی اور اس کا ضمیر و نفس لوّامہ اس کو ملامت کرے گا۔ کائنات انسانی سے بڑھ کر خود کائناتِ ہستی بھی اس پر جو اس کے اندر کیا گیا اپنے خالق کے سامنے اپنی پشیمانی و ندامت کا اظہار کرے گی اسی عمومی اعتراف قصور اور کلی ندامت و پشیمانی کا نام قیامت ہے اور اسی مناسبت سے اس سورۂ بالا میں نفس لوّامہ اور قیامت کو باہم ایک قسم میں یعنی شہادت میں یکجا کیا گیا ہے اب اس تفصیل کی روشنی میں سورۂ مذکور کی آیتوں کو دوبارہ پڑھیے۔ [1]

② اس عالم کی ہر چیز پر اگر غور سے نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متضاد عناصر وقویٰ کا مجموعہ ہے اس میں سردی وگرمی، بیماری وتندرستی، بقا وفنا اور دیگر ہر قسم کی متضاد قوتیں ودیعت رکھی گئی ہیں، ان متضاد قوتوں میں جب تک اعتدال قائم رہتا ہے وہ زندہ رہتی ہے اور جس وقت یہ اعتدال جاتا رہتا ہے اسی لمحہ وہ فنا ہو جاتی ہے۔ ایک

[1] مستفاد از تفسیر سورۂ قیامہ، مولانا حمید الدین رحمہ اللہ ص:۱۳-۱۴۔

درخت میں ایک پھول کھلا، سردی و گرمی اور موسم کی تاثیر نے اس پر عمل کیا جب تک ان متضاد تاثیرات و استعدادات میں اعتدال کی کیفیت رہی وہ پھول شگفتہ رہا جس آن کسی ایک قوت نے شکست کھائی پھول کی ہستی معرض فنا میں آ گئی، یہی حال دنیا کی ہر چیز کا ہے اور اسی اصول پر افراد، خاندان، جماعتیں، قومیں بلکہ حیوانات، شجر، حجر غرض دنیا کی ہر چیز چل رہی ہے۔ پوری کائنات ہستی کو لیجئے اس کو خلاق عالم نے انہیں متضاد عناصر و اخلاط کے اصول پر قائم فرمایا ہے۔ دن رات، روشنی تاریکی، سردی اور گرمی، پانی اور آگ، بہار و خزاں، تندرستی اور بیماری، دولت اور افلاس، حیات اور موت، آسمان و زمین، نیکی و بدی، خیر و شر، غرض جدھر بھی دیکھو یہی معلوم ہوگا کہ یہ اربع عناصر کی چہار دیواری، انہیں متضاد قویٰ اور حالات کی بنیادوں پر قائم ہے۔ ان میں جب تک اعتدال قائم ہے یہ دنیا کی ہستی چل رہی ہے۔ جس دن ان کے اعتدال میں فرق آئے گا وہی دن اس کی فنا کا ہوگا۔ لیکن جس طرح افراد و اشخاص میں جہاں بیماری کے بعد تندرستی اور تندرستی کے بعد بیماری کی صلاحیت موجود ہے اسی طرح اس نظام کائنات میں بھی تندرستی کے بعد بیماری اور بیماری کے بعد تندرستی کی صلاحیتیں موجود ہیں، کتنی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ دنیا ظلم و جور سے لبریز ہوگئی اور کشت و خون کے سیلاب نے اس کے امن و امان کو غرق کر دیا کہ دفعتہً وہ پھر ابھری اور اس کا غرق شدہ امن و امان کشتی نوح بن کر کرۂ ارضی کو بچا لے گیا۔ بارہا اس باغ ہستی میں خزاں آئی اور پھر بہار کا موسم اس پر چھا گیا۔ اجرام سماوی کی باہمی مسابقت میں ہماری زمین کئی دفعہ ٹکرانے کے قریب پہنچی اور پھر بال بال بچ گئی۔ یہ کرّے اپنی رفتار میں بسا اوقات گرنے کے قریب پہنچے کہ پھر سنبھل گئے مگر فساد و صلاح کا یہ اصول اسی وقت تک چل رہا ہے جب تک ان متضاد قویٰ اور کائنات کے استعدادات میں یہ اعتدال قائم ہے، جس دن یہ اعتدال فنا ہوگا، نظام ارضی کا یہ پورا کارخانہ درہم برہم ہو جائے گا اور اس وقت زمین اپنی عمر کی پوری تاریخ اور کارناموں کے ساتھ اپنے خالق کے سامنے کھڑی ہوگی اور اپنے اوپر کی ہر کوتاہی و قصور کی شہادت اپنی زبان سے سنائے گی:

﴿ إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَأَخْرَجَتِ الْأَرْضُ أَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْإِنسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا ۝ بِأَنَّ رَبَّكَ أَوْحَىٰ لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ ﴾

(۹۹/ الزلزال:۱ تا ۸)

”جس وقت پوری زمین ہلائی جائے گی اور جب زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو اگل دے گی اور انسان کہے گا کہ اس کو کیا ہو گیا ہے اس دن وہ اپنی باتیں بیان کرے گی کہ اس کے پروردگار نے حکم دیا ہے، اس دن لوگ لوٹیں گے کہ اپنے عمل دیکھیں، تو جس کسی نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہے تو اس کو بھی دیکھ لے گا۔“

صورِ قیامت

قرآن میں قیامت کے ذکر میں صور پھونکنے کا بار بار ذکر آیا ہے ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ﴾ "پھر جب صور پھونکا جائے گا" صور کے لفظی معنی نرسنگھا کے ہیں اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال وجلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا، اس لیے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کے اظہار اور غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے، چنانچہ توراۃ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی کہ ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ "آج کس کی بادشاہی ہے" پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ "اس ایک سب پر غالب آنے والے کی۔" غرض وہ دن آسمان و زمین اور نظم کائنات کے شہنشاہِ مطلق کے اظہارِ جلال و شدید خطرۂ جنگ کے اعلان کا ہوگا اس لیے اس کے لیے نفخ، صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ استعمال کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ لفظی معنوں میں بھی اس دن اپنی شہنشاہی کے نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو، جیسا کہ صور کے لفظی معنی دلالت کرتے ہیں۔

عربوں کا انکار

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ قیامت اپنے اندر کتنی عظیم الشان حقیقت رکھتی ہے لیکن اہل عرب کو توحید کے بعد جس عقیدہ سے شدت کے ساتھ انکار تھا اور جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہیں سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے۔ جاہلی عرب حیات بعد الموت اور خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذہ اور پرستش اور جزا وسزا سے قطعاً لاعلم تھے اور اس لیے ان میں اعمال کے خیر وشر اور نیکی بدی کی وہ تمیز نہ تھی جن پر تمام اخلاق ومعاملات کا دارومدار ہے، عرب کا شاعر آپ کی اس تعلیم کو سن کر تعجب سے کہتا ہے:

امـوت ثـم بـعـث حشـر
حـديـث خـرافة يا ام عـمـر!

"کیا موت ہے پھر جی اٹھنا ہے پھر اکٹھا ہونا ہے اے ام عمر! (شاعر کی بیوی کا نام) یہ سب خرافات باتیں ہیں۔"

قریش کے ایک دوسرے شاعر نے کہا:

يـحـدثـنـا الـرسـول بان سنحيى
وكيف حياة اصـداء وهـام [1]

"رسول ہم سے کہتا ہے کہ ہم پھر زندہ کیے جائیں گے حالانکہ صدا اور ہام ہو کر پھر زندگی کیسی؟"

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی ﷺ واصحابه الى المدينة: ۳۹۲۱۔

(ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مر کر پرندہ ہو جاتا ہے اور آواز دیتا پھرتا ہے، اسی کا نام ان کے ہاں صدیٰ اور ہام تھا)

قرآن مجید میں بھی ان کے یہ اقوال بکثرت نقل کیے گئے ہیں، مثلاً:

﴿ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌ بَعِيْدٌ ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۳)

''کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے، یہ لوٹنا بہت دور ہے۔''

﴿ ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِي الْحَافِرَةِ ۝ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً ۝ ﴾

(۷۹/ النازعات:۱۰، ۱۱)

''کیا ہم دوبارہ الٹے پاؤں لوٹائے جائیں گے، کیا جب ہم سڑی ہوئی ہڈیاں ہو جائیں گے۔''

﴿ ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۴۹)

''کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو ہم نئے بنا کر پھر اٹھائے جانے والے ہیں۔''

﴿ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝ ﴾ (۳٦/ یٰسٓ:۷۸)

''ان سڑی گلی ہڈیوں کو کون جلائے گا۔''

ان میں بعضوں کا عقیدہ دہریوں کی طرح تھا کہ یہ دنیا اسی طرح قائم رہے گی، موت وحیات کا بھی سلسلہ اسی طرح برابر جاری رہے گا اور اس دنیاوی زندگی کے علاوہ کوئی دوسری زندگی نہیں:

﴿ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ ﴾

(٤٥/ الجاثية:٢٤)

''انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، دوسری نہیں، مرتے اور جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو مارتا ہے۔''

﴿ وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٢٩)

''اور انہوں نے کہا کہ یہی ہماری موجودہ زندگی ہے، ہم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے۔''

انہیں اپنے اعمال کے حساب ومواخذہ کا بھی یقین نہ تھا:

﴿ اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۲۷)

''وہ حساب کی امید نہیں رکھتے تھے۔''

خباب بن الارت، ابتدائی مسلمانوں میں ہیں، یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے، ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے، وہ جب جا کر تقاضا کرتے تو عاص کہتا جب تک تم محمد ﷺ کا انکار نہ کرو گے میں تم کو کچھ نہ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ ''یہ اس وقت نہیں ہو سکتا جب تک تم مر کر پھر جیو نہیں۔'' اس نے کہا، کیا مر کر مجھے پھر جینا ہے؟ انہوں نے کہا: ''بے شک۔'' اس نے مذاق سے کہا، اچھا تو پھر وہیں میرا

مال و دولت اور سرو سامان ہوگا وہیں تم دام بھی لے لینا۔ [1] اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارہ میں ان کا کفر کتنا شدید تھا۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کے سامنے توحید کے بعد جس عقیدہ کو سب سے زیادہ شدت کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا، قرآن مجید کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی مضمون کو مختلف تعبیروں اور مؤثر طریقوں سے روز مرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بتکرار بیان کیا گیا ہے۔ اس میں ہیبت الٰہی، ہنگامۂ قیامت اور حشر ونشر کے رستخیز کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ سننے والا سرتاپا اثر ہو جائے، انسان کے عجز، عقل کے قصور، خدا کی عظمت وقدرت اور کائنات کی حیرت انگیز خلقت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ سامع ہر قدم پر لرزہ براندام ہو جاتا ہے پھر ایک طرف حیاتِ ابدی، نعیم جنت اور بہشت کی مسرتوں کا اور دوسری طرف موت کی بے بسی، دنیا کی فنا، دوزخ کی دہشت اور عذاب الٰہی کی تہدید کا ایسا ہولناک نقشہ کھینچا ہے کہ نفس انسانی اپنے تاثر کو چھپانے پر قادر نہیں رہتا۔

وحی الٰہی نے قیامت اور بہشت ودوزخ کے حالات ومناظر کو سب سے پہلے جن اسباب سے پیش کیا ہے ان سے اہل نظر صحابہ رضی اللہ عنہم ناواقف نہ تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت ودوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوئے تب حلال وحرام کے احکام نازل ہوئے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے۔ یہ آیت کہ ﴿ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴾ (٥٤/ القمر:٤٦) ''بلکہ ان کے وعدہ کا وقت قیامت کی گھڑی ہے اور قیامت کی گھڑی نہایت مصیبت کی اور تلخ ہوگی۔'' مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کمسن بچی تھی کھیلتی تھی۔ بقرہ اور نساء کی سورتیں (جن میں احکام ہیں) اس وقت اتریں، جب میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ [2]

اس تشریح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول واساس میں کیوں داخل کیا ہے کہ اگر یہ تعلیم عقائد میں شامل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا وسزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل میں دلی رجحان اور میلان پیدا ہوتا اور یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیاوی ہی جزا وسزا کا ذکر باقی ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت اور تاثر سے خالی ہو جاتے، چنانچہ اس فلسفہ کو خود قرآن نے بیان کیا ہے:

﴿ فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ ﴾ (١٦/ النحل:٢٢)

''تو جو لوگ آخرت کا یقین نہیں کرتے، ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں مبتلا ہیں۔''

اس لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ تلاوت کریں، جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے: ﴿ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ ﴾ ''روز جزا کا مالک۔'' اسلام چاہتا ہے کہ یہ حقیقت اس کے پیروؤں کے دلوں میں

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر تفسیر سورۃ کھیعص: ٤٧٣٤۔

[2] صحیح بخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن: ٤٩٩٣۔

پوری طرح گھر کر لے۔

قیامت پر قرآنی دلائل

قرآن نے قیامت کی ضرورت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے۔ اول یہ کہ انسان بے کار اور بے مقصد پیدا نہیں کیا گیا اگر اس کے اعمال کا مؤاخذہ اور جزا و سزا نہ ہوتی تو خیر وشر اور نیکی و بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں:

﴿ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۱۵)

''(اے لوگو) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔''

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ ﴾ (۷۵/ القیامۃ:۳۶)

''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔''

دوسری بات جو اس روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن نے پیش کی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا عادل اور منصف ہونا ہے۔ اگر اچھے برے انسانوں کے اعمال کی جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے اور نیکی و بدی اور گناہ و ثواب کے کوئی معنی نہ رہیں، بلکہ نعوذ باللہ خدا ظالم اور غیر منصف قرار پائے۔ اس موجودہ مادی دنیا میں بھی انسانوں کو اپنے اعمال کی کچھ نہ کچھ جزا ملتی ہے، مگر تاہم یہ صاف نظر آتا ہے کہ بہت سے گناہگار، سیہ کار اور ظالم یہاں آرام اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور بہت سے نیکوکار، پرہیزگار اور اچھے لوگ مصیبتیں اور تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لیے یقیناً یہ موجودہ زندگی اعمال کی جزا و سزا کی اصلی جگہ نہیں ہو سکتی، اس بنا پر دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے جہاں ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا نتیجہ مل سکے، اس موجودہ دنیا میں دنیاوی حکام اپنے ناقص علم کے مطابق اچھوں اور بروں کو ان کے اعمال کی جزا و سزا دیتے رہتے ہیں پھر کتنا ضروری ہے کہ پوری دنیا کا عالم الغیب حاکم اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے۔ سورۂ والتین میں اسی استدلال کی طرف اشارہ ہے:

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ ۝ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِيْنَ ۝ ﴾ (۹۵/ التین:۶۔۸)

''لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے، ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے، پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی، کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں (تمام فیصلہ کرنے والوں میں سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا نہیں)۔''

اسی لیے قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ نیک و بد کا نتیجۂ عمل یکساں نہیں ہو سکتا، ایک جگہ خدا فرماتا ہے:

﴿ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ۝﴾ (۳۸/ ص: ۲۸)

''کیا ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کی طرح کر دیں، جو زمین میں فساد کرتے ہیں یا پرہیز گاروں کو بدکاروں کی طرح کر دیں۔''

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝﴾ (٤٥/ الجاثیة:۲۱)

''کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ خیال کیا کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہوگی؟ ان کا یہ خیال برا ہے۔''

لوگوں کو روزِ جزا اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیونکر جلائے جائیں گے، یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے یعنی چونکہ مر کر دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا، اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے، ورنہ اس کے انہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے، وحی محمدی ﷺ نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے اس استبعاد کے وہم کو حسب ذیل مختلف طریقوں سے دور کر دیا:

① مر کر جینے کی بعض تاریخی مثالیں پیش کیں، جیسا کہ حضرت ابراہیم، حضرت عزیر علیہم السلام اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ جب چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

② جس طرح زمین گرمیوں میں خشک اور بے حیات ہو جاتی ہے اور پھر دفعتہً بارش کے ایک چھینٹے سے اس میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے سبزے نکل آتے ہیں، کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں، اسی طرح قدرت الٰہی کی ایک بارش زمین سے انسانی دفینوں کو اگلوا دے گی ﴿ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴾ ''اور زمین اپنے اندر کے بوجھوں کو باہر نکال دے گی۔'' اور دوبارہ نئی زندگی پیدا کر دے گی۔

③ دوبارہ زندگی پر تعجب اور استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ جس نے آسمان بنائے، زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا، مردہ زمین سے زندہ کھیتیاں، سبزے اور درخت اگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا، کیا وہ ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں؟

④ حیات کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا خدا نے اس کو ہست و موجود کیا پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا، تو جس نے پہلے بغیر کسی مثال کے اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا جس نے نقش

اول بنایا، کیا نقشِ ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں؟

⑤ دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت، مالی وسعت، اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی، بڑی بڑی عمارتیں بنائیں، عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی، قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت و سلطنت قائم کی پھر جب انہوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور عظمت کی بقا کے لیے ضروری ہیں، مخالفت کی تو وہ فنا کر دی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ عربوں سے سوال کیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق و شام و مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے، کیا ہوئے؟ سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں؟ فرعون اور اس کی سلطنت کا کیا حال ہوا؟ قومِ لوط اور قومِ مدین کو زمین کیونکر نگل گئی؟ قرآن نے اہل عرب سے خطاب کر کے کہا:

﴿ اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٢١)

”کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں کہ دیکھتے کہ ان سے پہلوں کا کیسا انجام ہوا، جو ان سے قوت اور زمین میں یادگاروں کے لحاظ سے کہیں بڑھ کر تھے۔“

﴿ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ڔ وَالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ ڔ لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۭ ﴾ (١٤/ ابراهيم:٩)

”کیا تم کو نوح کی قوم اور عاد و ثمود کی اور جو ان کے بعد آئے، جن کو خدا ہی جانتا ہے، ان کی خبر تم کو معلوم نہ ہوئی۔“

یہ تو وہ قومیں ہیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کتنی قوموں کے عروج و فنا کی داستانیں محفوظ ہیں، بابلی، اسیری، اکادی اور مصری قومیں جو کبھی روئے زمین پر کوس لِمَنِ الْمُلْكُ بجاتی تھیں، ہزار ہا سال سے بے نشان ہیں۔ نارمن جیسے فاتح کیا ہوئے، یونانی اور رومی جو کبھی دنیا کے تنہا مالک بن گئے تھے اب ان کا کہیں وجود ہے؟ مجوس جو روم کے مقابل صدیوں تک برسرِ پیکار رہے ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں رہی، امریکہ کے قدیم باشندے جو کبھی اس براعظم کے واحد مالک تھے اب فنا کے قریب ہیں۔

الغرض جس طرح افراد جی کر مر جاتے ہیں۔ جماعتیں وجود میں آ کر مٹ جاتی ہیں، قومیں پیدا ہو کر فنا ہو جاتی ہیں، اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات بھی ایک دن آئے گا جب قانون الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔ جس طرح عوام جو قوموں کی تاریخ سے واقف نہیں، صرف افراد کو جیتے اور مرتے دیکھتے ہیں وہ گو افراد کی فنا کا یقین رکھتے ہیں لیکن قوموں کی فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھ سکتے اور اس میں شک کرتے ہیں اسی طرح جن کی نظر دنیائے خلق کی تاریخ پر نہیں وہ اس کے فنائے کامل پر اپنی جہالت اور نادانی سے اعتبار نہیں کرتے حالانکہ ایک

دن وہ آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو کر فنا ہو جائے گی اور کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اور اس میں موجودہ عالم کا قانونِ طبعی ایک دوسرے طبعی قانون سے منسوخ ہو جائے گا اور جیسا کہ سائنس کہتی ہے اور قرآن نے نقشہ کھینچا ہے، آفتاب و ماہتاب اور ستارے اور تمام اجرامِ فلکی ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پوری دنیا کی عدالت قائم ہو کر نئی زمین اور نیا آسمان بنے گا:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝ ﴾

(۱۴/ ابراهيم:۴۸)

''جس دن یہ زمین اور زمین سے بدل جائے گی اور آسمان بھی اور مخلوق اکیلے زبردست خدا کے سامنے نکل کھڑی ہوگی۔''

سورۂ ق میں قیامت پر استدلال انہیں دلیلوں سے کیا گیا ہے:

﴿ قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝ قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ۝ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ ۝ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ۝ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَاِخْوَانُ لُوْطٍ ۝ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ۝ اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ ﴾

(۵۰/ ق:۱۔۱۵)

''قسم ہے اس بڑی شان والے قرآن کی (جو مردہ دلوں کو زندہ کرتا ہے ان کافروں کو عقلی انکار نہیں ہے) بلکہ ان کو اس سے تعجب ہے کہ ان میں کا ایک آدمی آ کر ان کو (قیامت کا) ڈر سناتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ یہ تعجب کی بات ہے، کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو پھر زندہ ہوں گے) یہ دوبارہ لوٹنا تو دور از عقل ہے، (خدا کہتا ہے یہ تعجب کی کیا بات ہے) ہم کو معلوم ہے کہ زمین ان مردہ جسموں میں جو کمی کرتی ہے اور ہمارے پاس محفوظ ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان کافروں نے سچائی جھٹلا دی جب وہ ان کے پاس آئی انہوں نے جھٹلا دیا تو وہ الجھی باتوں میں پڑ گئے کیا انہوں نے اپنے اوپر کے آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا بنایا اور

کس طرح اس کو سجایا ہے کہ اس میں کہیں سوراخ نہیں اور زمین کو پھیلایا ہے اور اس میں پہاڑ کے لنگر ڈالے اور اس میں قسم قسم کی رونق کی چیزیں اُگائیں کہ ہر رجوع ہونے والے بندہ کو اس سے سوجھ ہو اور یاد آئے اور آسمان سے برکت کا پانی برسایا پھر اس سے باغ اور کٹنے کھیت کے اناج اُگائے اور کھجوروں کے لمبے درخت جن کے خوشے اوپر تلے ہیں، یہ بندوں کو روزی پہنچانے کے لیے ہے اور اس پانی سے مردہ آبادی کو ہم زندہ کرتے ہیں اسی طرح (قبروں سے) نکلنا ہوگا، ان کافروں سے پہلے نوح کی قوم، رس والے اور ثمود اور عاد اور فرعون اور لوط کے بھائیوں نے اور جنگل والوں نے اور تبع کی قوم نے اس کو جھٹلایا ان میں سے ہر ایک نے پیغمبروں کو جھٹلایا تو میری دھمکی پوری اتری، کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے، بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سرِ نو پیدائش میں شک ہے۔"

سورۂ قیامۃ میں بھی اس کا بیان ہے اس کی آخری آیتیں یہ ہیں:

﴿ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى ۝ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰى ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰى ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۝ ﴾

(٧٥/ القيامة:٣٦۔٤٠)

"کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یونہی بیکار چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا، پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا، پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا، پھر اس کو جوڑا، یعنی نر اور مادہ کیا یہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جلائے؟"

﴿ وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ﴾ (١٧/ بنی اسرآءیل:٩٨، ٩٩)

"اور وہ بولے کہ جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے، تو کیا پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے؟ کیا یہ نہیں دیکھتے کہ وہ اللہ جس نے آسمانوں کو اور زمین کو بنایا وہ ان لوگوں کے مثل کو دوبارہ بھی بنا سکتا ہے۔"

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿ وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ ﴾ (٣٠/ الروم:٢٧)

"اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے، پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا، یہ دوبارہ خلق کرنا اس کے لیے بہت آسان ہے۔"

﴿ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ﴾ (٢٢/ الحج:٥)

”(لوگو) اگر تم کو دوبارہ زندگی میں شک ہے تو (پہلے) تم کو اسی مردہ مٹی سے پیدا کر چکے ہیں، (پھر دوبارہ کیوں نہیں پیدا کر سکتے۔)“

قیامت کے متعلق تمام دور دراز اور طول طویل شکوک وشبہات کا کتنا مختصر جواب ہے:

﴿قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ۝ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾

(۳۶/ یٰسٓ: ۷۸، ۷۹)

”وہ بولا کہ کون ان سڑی کھوکھلی ہڈیوں کو جلائے گا، کہہ دے وہی جس نے پہلی دفعہ ان کو بنایا۔“

غرض وحی محمدی نے ہر پہلو سے کفار کے اس استعجاب اور استبعاد کو دور کیا اور ان کو دوبارہ زندگی کا یقین دلایا۔

حشر جسمانی

اس بحث پر لوگوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے کہ یہ دوبارہ زندگی آیا اسی گوشت پوست کے ساتھ ہوگی یا صرف روحانی ہوگی اور جہاں جسم وجسمانیت کا مطلق گزر نہ ہوگا۔ گو قرآن پاک کی مختلف آیتیں مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں جن میں اشارۃً ہر قسم کی باتیں آ جاتی ہیں، تاہم قیامت کے متعلق اوپر کی آیتوں میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو۔ کفار کو تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مر کر پھر جئے گا؟ کیا ہماری ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور ہم قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے؟ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا، مگر اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم تعجب نہ کرو اور انکار پر آمادہ نہ ہو کہ تمہارے یہ فنا شدہ جسم نہیں اٹھائے جائیں گے اور نہ تمہاری ان بوسیدہ ہڈیوں میں روح پھونکی جائے گی بلکہ وہ تو سراسر روحانی زندگی ہوگی کیونکہ جب دوبارہ جسمانی زندگی کا تخیل ان کے لیے ناقابل فہم تھا تو خالص روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی ان کے فہم سے دور تھا اور اب بھی ہے کہ ہم اس مادی زندگی کے جاننے والے سرتاپا روحانی زندگی کے تصور سے بالکل عاجز ہیں اس لیے مصلحت الٰہی اسی کی مقتضی تھی کہ وہ اصل واقعہ پر زد دے اور کیسے اور کیوں سے تعرض نہ کرے اور صاحب فہم کو اس کے فہم کے مطابق اس راز کو سمجھنے دے، چنانچہ قرآن پاک کے اس اسلوب بیان کو اگر سمجھنا ہے تو ان آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿وَقَالُوْٓا ءَاِذَا ضَلَلْنَا فِي الْاَرْضِ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۬ؕ بَلْ هُمْ بِلِقَآئِ رَبِّهِمْ كٰفِرُوْنَ۝﴾

(۳۲/ السجدۃ: ۱۰)

”اور انہوں نے کہا کہ کیا جب ہم زمین میں کھو جائیں گے کیا ہم نئی پیدائش میں پھر ہوں گے (خدا فرماتا ہے یہ کچھ نہیں) بلکہ یہ اپنے پروردگار کی ملاقات کے منکر ہیں۔“

غور کرو کہ ان مادی معدومیت کے بعد مادی پیدائش کے پُر تعجب انکار پر اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا کہ یہ شکوک وشبہات اس لیے ان کو پیش آتے ہیں کہ مرنے کے بعد خدا کی ملاقات اور اس کے سامنے ہونے سے

ان کو انکار ہے اور حواشی کو چھوڑ کر اصل مقصود یہی ہے کہ موت کے بعد اور آخرت میں خدا کے سامنے ہونے پر یقین رکھا جائے، اس سے ان کو کیا مطلب کہ وہ کس طرح ہوگا، چنانچہ اس کے بعد ہی فرمایا:

﴿ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ ﴾

(۳۲/ السجدۃ:۱۱)

''جواب میں کہہ دے کہ ملک الموت جو تم پر متعین ہے وہ تم کو موت دے گا، پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔''

یہی ملاقات اور رجوع الی اللہ اس عقیدۂ حشر کی اصلی روح ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم انہیں باتوں کو سمجھ بوجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے وہ بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے ان کے متعلق جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس ہی پر اس نادیدہ شہرستانِ بقا کا ہر نقشہ اور خاکہ بتایا اور سمجھایا جائے اور یہی محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے کیا ہے۔ جو لوگ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر قسم کی قدرت پر یقین رکھتے ہیں ان سے تو کچھ کہنا ہی نہیں، لیکن اگر کوئی شخص جسمانی حشر کا تصور اس لیے محال سمجھتا ہے کہ عام انسانوں نے کسی مردہ جسم کو زندہ ہوتے نہیں دیکھا اس کے نزدیک تنہا روحانی زندگی کا تخیل تو اور بھی زیادہ محال ہوتا ہے کیونکہ کسی انسان نے آج تک کسی انسان کو روحانی وجود میں نہیں دیکھا، بلکہ وہ اس کا تصور تک بھی نہیں کرسکا ہے وہ جب انسانی زندگی کا تصور کرے گا تو جسم وشکل واعضا کے ساتھ ہی کرے گا، ان سے مجرد ہو کر نہیں کرے گا۔

موت جسم سے روح کی مفارقت کا نام ہے اس لیے اگر یہ سچ ہے کہ قیامت میں نئی زندگی ملے گی، تو ظاہر ہے کہ موت آنے کے بعد کیفیت اور صورت سے کوئی الگ صورت وکیفیت ہوگی جس کا نام حیات ثانیہ رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ روح کا دوبارہ تعلق جسم سے تسلیم کیا جائے ورنہ غیر جسمانی زندگی تو قیامت کے پہلے بھی تھی اب نئی بات کیا بڑھ گئی، جس کا نام حیات ثانیہ رکھ دیا گیا۔

گو روح انسانی جسم کے اندر ہر فعل کی فاعل ہے مگر ہر فاعل کے فاعل بننے کے لیے آلات واوزار کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جن کے بغیر وہ اپنے فعل کے بجالانے سے مجبور رہتا ہے اسی طرح روح اپنے فعلِ لذت والم کے انجام دینے کے لیے جسمانی آلات اور اوزار کی محتاج ہے کہ لذت والم کا کوئی روحانی احساس جسمانیت کے شائبہ سے مبرا ہو کر ہو ہی نہیں سکتا، اس بنا پر روح کا محض جنت کی لذتوں سے متمتع یا دوزخ کی تکلیفوں سے متالم ہونا کسی جسمانی وساطت کے بغیر تصور میں نہیں آتا، خواب میں دیکھو کہ روح کو جو لذت یا تکلیف پہنچتی ہے اس میں بھی جسمانی پیکر وہیکل کی صورت نمودار ہوتی ہے۔

جسم وجسد

حشر جسمانی کے ماننے کے بعد یہ بحث بے سود ہے کہ آیا وہی جسم دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا جس کے قالب میں وہ روح پہلے دنیا میں رہی تھی یا کسی دوسرے نئے جسمانی پیکر میں وہ روح پھونکی جائے گی یا یہ کہ آیندہ جسم اپنی مادیت اور ترکیب میں اس دنیاوی جسم کے مماثل ہوگا، جب کہ یہ حقیقت ہے اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اعمال کی ذمہ داری روح پر ہے، جسم پر نہیں اور اسی طرح جزا وسزا کی راحت وتکلیف کا اصلی مورد روح ہے، جسم نہیں تو پھر اب وہ کسی قالب میں بھی ہو اور کسی رنگ میں بھی ہو روح پر مؤاخذہ اور ثواب وعذاب کی لذت والم کا احساس یکساں ہوگا البتہ یہ ضروری ہے کہ جو جسم ہم کو دوسری دنیا میں ملے گا، اس کی خصوصیات ولوازم اس خاکی جسم کے خصوصیات ولوازم سے بالکل الگ ہوں گے، چنانچہ خود ہمارے تخیل اور تصور اور نیز خواب ورؤیا میں جو جسم ہم کو نظر آتا ہے وہ جسم ہو کر نظر آنے کے باوجود مادی جسمانیت سے سراسر پاک ہوتا ہے اس لیے لفظ جسم کے بولنے سے انہیں خصوصیات کا جسم سمجھ لینا ضروری نہیں ہے اور نہ اس جسم پر قیاس کر کے اس جسم پر اشکالات پیش کیے جاسکتے ہیں۔

خلق جدید

چنانچہ جو جسم قیامت میں عنایت ہوگا وہ نئی خلقت اور نئی آفرینش کا ممنون ہوگا، اسی لیے قرآن نے منکروں کے جواب میں یہ کہا ہے:

﴿ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۱۵)

''بلکہ یہ لوگ نئی آفرینش سے شک میں ہیں۔''

منکرین کی زبان سے کہلوایا:

﴿ ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ۝ ﴾ (۱۷/ الاسرآء:۹۸)

''کیا ہم درحقیقت نئی آفرینش کر کے اٹھائے جائیں گے۔''

ایک دوسری سورۃ میں یہ تلقین ہے:

﴿ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝ ﴾ (۳۴/ سبا:۷)

''بے شک تم ایک نئی آفرینش میں ہونے والے ہو۔''

پھر تمثیل دے کر فرمایا:

﴿ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۱۰۴)

''جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح ہم اس کو دوبارہ بنائیں گے۔''

اسی لیے اس عالم کی اس نئی خلقت و پیدائش والے جسم کو بعینہٖ اسی جسم کے مطابق سمجھنا صحیح نہیں ہے اور

نہ اس خاکی جسم کی تمام خصوصیات کا بعینہٖ اس جسم میں ہونا ضروری ہے اس کو اگر اس عالم کے لفظ ''جسم'' سے تعبیر کیا جاتا ہے تو اس لیے کہ ہماری زبان میں روح کے غلاف وقالب کے لیے جسم سے بہتر، قریب تر اور مشابہ تر کوئی دوسرا لفظ نہیں۔

یہ بات کہ حشر میں بعینہٖ گزشتہ گوشت وپوست کا ہونا اس لیے ضروری سمجھا جائے کہ وہ بھی عذاب و ثواب میں شریک ہوں، تصریحِ قرآنی پر اضافہ ہے، قرآن میں تو یہ تصریح ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِیْزًا حَكِیْمًا۝ ﴾ (٤/ النسآء:٥٦)

''بے شبہ جو لوگ ہماری آیتوں کے منکر ہوئے، ہم ان کو آگ میں ڈالیں گے، جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ہم ان کو اور کھالیں دیں گے، جو پہلی کھالوں کی غیر ہوں گی، تاکہ وہ عذاب چکھیں، بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔''

جب کھالیں یکے بعد دیگرے بدلتی جائیں گی تو وہ پہلا اصلی حصہ جسم کا جو گناہ میں شریک تھا، کہاں باقی رہا؟ اسی طرح یہ تصریح ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھالیں اس کے اعمال کی شہادت دیں گی، اس سے معلوم ہوگا کہ وہ اصلی مجرم جو ان اعمال کا ذمہ دار اور اس مقدمہ کا مدعا علیہ ہے ان جسمانی اعضا کے علاوہ ہے اور وہ روح انسانی ہے۔

ذمہ داری روح پر ہے

یہی سبب ہے کہ موت وحیات، عذاب وثواب اور اعمال کے مؤاخذہ کا اسلام نے جس سے تعلق بتایا وہ نفس یعنی روح ہے:

﴿ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یّٰحَسْرَتٰی عَلٰی مَا فَرَّطْتُّ فِیْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ﴾ (٣٩/ الزمر:٥٦)

''تو (قیامت میں) کوئی نفس یہ کہنے لگے، کہ اے افسوس اس پر کہ میں نے اللہ کے پہلو میں کمی کی۔''

﴿ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ ﴾ (٥٩/ الحشر:١٨)

''اور چاہیے کہ ہر نفس دیکھے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا آگے بھیجا۔''

﴿ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّاۤ اَحْضَرَتْ ؕ۝ ﴾ (٨١/ التکویر:١٤)

''(اس دن) ہر نفس جان لے گا جو اس نے حاضر کیا۔''

﴿ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ؕ۝ ﴾ (٨٢/ الانفطار:٥)

''اس دن ہر نفس جان لے گا جو اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔''

﴿ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَیْـًٔا ؕ ﴾ (٢١/ الانبیآء:٤٧)

''تو اس دن کسی نفس پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔''

جنت کی نسبت ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۱۷)

''کوئی نفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے (جنت میں) کیا آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے؟''

ان آیتوں میں دیکھو کہ عمل کی ذمہ داری اور اس کے اچھے اور برے نتیجوں کا بار جسم پر نہیں، بلکہ روح اور نفس پر ڈالا گیا اور اسی کو تکلیف ولذت سے آشنا کیا گیا ہے، جنت میں داخلہ کی خوش خبری بھی اسی کو دی گئی ہے:

﴿ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ۝ وَادْخُلِي جَنَّتِي ۝ ﴾ (۸۹/ الفجر:۲۹، ۳۰)

''اے مطمئن روح! میرے بندوں میں شامل اور میری جنت میں داخل ہو جا۔''

دنیاوی جسم بدلتے رہنے پر بھی وہی جسم رہتا ہے

غرض اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی ذمہ دار اور جنت ودوزخ کی لذت والم کی اصل احساس کرنے والی ہستی صرف روح ہے اور جسم کی حیثیت صرف ایک لباس وآلہ احساس کی ہے اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ جسم لاکھ بار بدلے مگر روح اگر وہی ہے تو وہ انسان وہی ہے اور اسی کو اپنی ذمہ داری کی جزا وسزا مل رہی ہے۔ لوگ اپنی ظاہر بینی سے اصل زور جسم پر دیتے ہیں حالانکہ اس مٹی کے ڈھیر میں اگر روح کا خزانہ نہ چھپا ہو تو اس مشت خاک میں دھرا کیا ہے، دیکھو کہ انسان بچپن سے لے کر بڑھاپے تک وہی ایک شخص ہے جو پہلے تھا، حالانکہ اس کی جسمانی ہیئت اور اس کے جسم کا مادہ ہر آن اور ہر لمحہ فنا ہو کر بدلتا رہتا ہے اور بیماریوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا پھر تندرستی کے بعد نئے ذرات داخل ہو کر لہلہائے۔ تم غلطی سے یہ سمجھتے ہو کہ ہر حال میں وہی جسم یکساں طور پر قائم ہے حالانکہ حکیم سے پوچھو تو وہ بتائے گا کہ اس کے ذرے کیونکر ہر آن میں جھڑتے اور گھِستے رہے اور جو خوراک وہ کھاتا ہے وہ خون ہو کر کیونکر بدل ما یتحلل بن کر ان کی جگہ لیتی رہی پھر کیا ایسے ہر آن فنا ہوتے رہنے والے اور چند سال کے بعد بالکل بدل جانے والے کو دائم الوجود اعمال کا ذمہ دار اور ان کے نیک وبد کی اصلی جزا یا سزا پانے کا مستحق ٹھہرایا جا سکتا ہے، لیکن جس طرح دنیا میں اگر کوئی مجرم آج بھاگ گیا اور چند سال کے بعد پکڑ کر جب لایا گیا تو وہ یہ عذر نہیں کر سکتا کہ چونکہ وہ ہاتھ جس سے اس نے چوری کی تھی اور وہ پاؤں جن سے وہ مال لے کر بھاگا تھا اس عرصہ دراز میں بدل گئے ہیں اس لیے وہ لائق تعزیر نہیں، کیونکہ وہ روح جس نے اپنے ارادہ ونیت سے اس کام کو اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے ذریعہ کرایا تھا وہ جس طرح کل تھی بعینہٖ آج بھی ہے اور جو تکلیف اس کو اپنے پہلے جسم کے ذریعے کل پہنچ سکتی تھی آج بھی بعینہٖ وہی اس کو پہنچ سکتی ہے اور اس جسمانی تغیر سے اس کی روحانی شخصیت میں اصلاً کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا، اس لیے پہلے ہی جسم کے ضروری ہونے پر زور دینا بے سود ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جسم اگر بدل بھی جائے تو اعضا

کی شہادت کا مسئلہ اپنی جگہ پر صحیح ہوگا۔ جسم کے اجزا دنیا میں بدلتے جاتے ہیں، مگر جو بیماری اگلے اجزا میں پیدا ہوگئی تھی وہ ان کے فنا ہو جانے کے بعد بھی قائم رہتی ہے مٹ نہیں جاتی، بلکہ وہی ان کے بعد کے آنے والے اجزا میں برابر سرایت کرتی رہتی ہے۔

اخروی جسم کیسا ہوگا

روحوں کو آخرت میں جو جسم ملیں گے وہ حقیقت میں ان کے اعمال ہی کے ظل وعکس ہوں گے، یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا، مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گوراپن اعمال کی سیاسی وسپیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ خدا نے فرمایا:

﴿ وُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝ وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۝ ﴾ (۸۰/ عبس:۳۸۔۴۱)

”کتنے چہرے اس دن روشن ہنستے اور شاد ہوں گے اور کتنے چہروں پر اس دن کدورت ہوگی ان پر سیاہی چھائی ہوگی۔“

﴿ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ ۚ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ۝ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۰۶، ۱۰۷)

”جس دن کتنے چہرے سپید ہوں گے اور کتنے کالے، لیکن جن کے چہرے کالے ہوئے کیا تم وہ ہو جو ایمان کے بعد پھر کافر ہوگئے تھے، تو اپنے کفر کرنے کے بدلہ عذاب کا مزہ چکھو اور لیکن جن کے چہرے سپید ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے، اسی میں سدا رہیں گے۔“

صحیح حدیثوں میں ہے کہ ”جنت میں سب لوگ جوان بن کر داخل ہوں گے اور جسم پر کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا، ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کے اولین بہشتی قد کے مطابق ہوگا، [1] دوزخیوں میں سے کسی کا سر پہاڑ کے برابر ہوگا، کسی کا ایک پہلو مفلوج ہوگا، کسی کے ہونٹ لٹکے ہوں گے، دل کے اندھے آنکھوں کے اندھے بن کر اٹھیں گے، سزاؤں کے بعد جب ان کے جسم چور چور ہو جائیں گے، تو پھر ان کے جسم صحیح وسالم نمودار ہوں گے پھر ان کی وہی کیفیت ہوگی۔“ یہ بھی آیا ہے کہ ”جو اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں وہ چیونٹی بن کر قیامت میں اٹھیں گے۔“ ان تمام شواہد سے ہویدا ہے کہ اس دنیا کے جسمانی قالب ہمارے اس دنیاوی جسم کے مطابق نہیں بلکہ ہمارے دنیاوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

---

[1] جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی صفة ثیاب اهل الجنة:۲۵۳۹ و باب ماجاء فی سن اهل الجنة: ۲۵٤٥؛ دارمی، کتاب الرقاق، باب فی اهل الجنة و نعیمها: ۲۸۲۸؛ مسند أحمد، ج۲، ص: ۲۹۵، ۳٤۳۔

جزا اور سزا

''یومِ آخر'' یا ''یومِ دین'' پر ایمان لانے سے اسلام کا حقیقی منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے، کچھ اس دنیا میں اور پورا دوسری دنیا میں، اسی کا نام جزا و سزا ہے اور دنیا کے دوسرے مذاہب بھی اس مسئلہ میں اسلام کے ہم نوا ہیں۔

جزا و سزا دیگر مذاہب میں

درحقیقت مذاہب کا حقیقی تعلق اسی عقیدہ سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اچھا یا برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے، اس کے مطابق اس کا اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری دنیا میں ضرور ملے گا، اس عقیدہ کا نشان مصر و بابل جیسی دنیا کی قدیم قوموں میں بھی ملتا ہے، ہندوستان کے مذاہب میں اس دوسری دنیا کو دوسرے جنم سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ انسان جب مرتا ہے تو اس کے اچھے یا برے کاموں کے مطابق اس کی روح کسی جانور یا گھاس پھوس یا درخت کے قالب میں جا کر اپنے عمل کا نتیجہ بھگتتی ہے اور پھر انسانوں کے قالب میں لائی جاتی ہے اور کام کرتی ہے اس کے بعد جس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اس کو ''یم لوک'' میں جانا پڑتا ہے، جہاں نرک (دوزخ) ہیں وہاں وہ ہر قسم کی سزا بھگتتی ہے بعد ازیں اپنے بعض اچھے کاموں کی بدولت چندر لوک (چاند کی دنیا) میں جاتی ہے جس روح کے کچھ کام اب بھی باقی ہیں وہ اس دنیا میں ہوا، بادل اور بارش کے ذریعہ سے زمین میں دوبارہ آتی ہے اور اپنے کام کے مطابق حیوانات یا نباتات کے روپ میں سزا پاتی ہے اور پھر چھوٹ کر انسان بنتی ہے یہاں تک کہ اس کے کام اتنے اچھے ہو جائیں کہ وہ سزا کے قابل قرار نہ پائے اس وقت وہ مادی قالبوں کی قید سے نجات پا کر سورج لوک اور چندر لوک وغیرہ اجرام سماوی کی دنیاؤں میں جا کر آرام کرتی ہے اور پھر اپنے علم و عمل کی کسی کمی کے سبب سے بادل ہوا اناج یا کسی دوسری مخلوقات کے قالب میں ہو کر اس کو اس دنیا میں پھر آنا پڑتا ہے اور پھر وہی عمل شروع ہوتا ہے یعنی وہ نئے نئے جنموں میں پیدا ہو کر سزا بھگتتی ہے اور اس وقت تک اس آمد و رفت اور آواگون کے چکروں میں پھنسی رہتی ہے جب تک اس سے، اچھے یا برے کاموں کا صدور ہوتا رہتا ہے اس لیے کامل اور دائمی نجات کی صورت یہ ہے کہ انسان سے اچھا یا برا کوئی کام ہی صادر نہ ہو یہی ترک عمل روح کو مادہ کی قید سے آزاد کر کے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا (موکش) دلاتا ہے یہاں تک کہ یہ موجودہ مادی دنیا پرلے (قیامت) کے بعد جب پھر نئے سرے سے بنے گی تو پھر وہی عمل اور سزا اور جنم کے آواگون کا چکر شروع ہوگا اور پھر اسی طرح چھٹکارا پائے گی اور پھر دوسری پرلے کے بعد نیا دور اسی طرح شروع ہوگا، یہ چکر اسی طرح ہمیشہ جاری رہے گا۔

یہ وہ چکر ہے جس سے انسان کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا الا یہ کہ ہمالہ کی چوٹی یا غار میں بیٹھ کر ترک عمل کے ذریعہ خود اپنے وجود سے ہاتھ دھولیا جائے، لیکن اگر اس اصولِ نجات پر دنیا عمل کرے تو یہ بہارستان دم

کے دم میں خارستان بن جائے اور ہر قسم کا کاروبار بند ہو کر دنیا آپ سے آپ فنا کے قریب آ جائے اور بدی کے ساتھ نیکی کا وجود بھی دنیا سے مٹ جائے اور باایں ہمہ دائمی وابدی نجات میسر نہ ہو کیونکہ ہر پرلے کے بعد وہی جنم اور کرم اور آواگون پھر شروع ہوتا ہے۔ [1]

لیکن دنیا کے دوسرے مذاہب نے اس چکر اور بے عملی سے انسانوں کو نجات دلائی ہے، انہوں نے اس موجودہ دنیا کے بعد ایک ہی دنیا اور تسلیم کی ہے جس میں انسانوں کو اپنے اچھے اور برے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی مختلف زردشتی فرقوں نے آرین نسل ہونے کے باوجود ہندوؤں کے تناسخ کے بجائے مختلف سامی مذاہب کے خیالات کی نقالی کی ہے اور خصوصاً بعد والوں نے اسلام کے عقائد کو ''اروالے ویراف'' کے عجیب و غریب مشاہدات کا رنگ دے کر اور اس کی کتاب کو اسلام سے بھی پہلے قرار دے کر تمام تر قبول کر لیا ہے۔ [2]

صحیفۂ ابراہیم یعنی سفرِ تکوین میں دنیا کی محنت ومشقت اٹھانے کے بعد پھر جنت میں داخلہ کا اشارہ ہے (تکوین ۲۔۱۹) علی ھذا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں اخروی جزاوسزا کے اصول مذکور ہیں۔ نیکوکاروں کے لیے ایک ''ستھری آبادی'' کا ذکر ہے جس میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں مذکور ہے اور بدکاروں کے لیے ہلاکت اور بربادی اور دردناک عذابوں کی بھی خبر ہے مگر مترجموں نے ہر جگہ اس کو دنیاوی ثواب وعذاب بلکہ ارض موعودہ کی ظاہری سلطنت کے معنوں میں کر کے دکھایا ہے حالانکہ بعض مقامات میں یہ بے جوڑ سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی جنت عدن اور اس کے چار دریاؤں کا ذکر تکوین کے دوسرے باب میں ہے، علاوہ ازیں تورات میں موت کے بعد کی زندگی کی تصریح ملتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام (پیدائش ۲۵۔۱۸) اور یعقوب علیہ السلام (پیدائش ۴۹۔۳۳) کی موت کی تعبیر ان لفظوں میں کی گئی ہے کہ ''جان بحق ہوا اور وہ اپنے لوگوں میں جا ملا ساتھ ہی ہمیشہ کی بھلائی (استثناء ۶۔۲۴) کا بھی تذکرہ ہے اور جہنم کی آگ (استثنا ۳۲۔۲۲) کا بھی بیان ہے اور ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیے جانے کی بھی تصریح ہے (یرمیاہ ۱۷۔۱۱) روح کی بقا اور آسمان پر چڑھنے کی تعلیم بھی ان کے صحیفوں میں موجود ہے (واعظ ۳۔۲۱) مرنے کے بعد روح کے خدا کے پاس واپس پھر جانے کا بھی ذکر ہے (واعظ ۱۲۔۷) اور انسان کے اپنے ابدی مکان میں جانے کا بھی تذکرہ ہے آخر میں خدا سے ڈر اور اس کے حکموں کو مان کہ انسان کا فرض کلی یہی ہے کیونکہ خدا ہر ایک فعل کو ہر ایک پوشیدہ چیز کے ساتھ خواہ بھلی ہو خواہ بری عدالت میں لائے گا۔ (واعظ ۱۲۔۱۳۔۱۴) زبور میں خدا کی عدالت کے دن کی تصریحات بار بار ہیں اور امثالِ سلیمانی میں ہے کہ ''انسان کی راہیں خداوند کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور وہ اس کی ساری روشوں کو جانتا ہے شریر کی بدکاریاں اس کو پکڑ لیں گی اور وہ اپنے ہی گناہوں کی رسیوں سے جکڑا جائے گا، وہ بے تربیت پائے مر جائے گا اور اپنی جہالت کی شدت میں بھٹکتا

---

[1] تناسخ کے رد میں الندوہ مئی، جون ۱۹۰۶ء میں مولانا عبدالسلام ندوی کا ایک مضمون ہے۔ [2] دبستان المذاہب کا مصنف جو زردشتی مذاہب سے پوری واقفیت رکھتا تھا، اس نے اپنی کتاب میں اس کی پوری تفصیل درج کی ہے۔

پھرے گا (۵۔۲۱) دانیال میں ہے کہ اس وقت بہتیرے جو زمین میں خاک پر سورہے ہیں جاگ اٹھیں گے، بعضے حیاتِ ابدی کے لیے اور بعضے رسوائی اور ذلت کے لیے (۱۲۔۲) حزقیال (۲۸) جنت کی طلائی اور جواہرات کی بنی ہوئی عمارتوں کے اشارات ہیں۔

حضرت مسیح سے پہلے یہودیوں میں ''صدوقی'' نام ایک فرقہ پیدا ہوا، جس نے حکمران یونانیوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی بعض باتیں قبول کرکے یہودی تعلیم میں شامل کیں [1] منجملہ ان کے وہ قیامت اور حیاتِ اخروی کا بھی منکر ہوا، مگر اس کے مقابل کا دوسرا فرقہ جس نے اپنے کو فریسی (علیحدہ رہنے والا) کہا اپنے پرانے عقیدہ پر قائم رہا اور قیامت، حیاتِ اخروی اور جنت و دوزخ کے عقائد کو بدستور مانتا رہا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں فریسی یہی اعتقاد رکھتے تھے کہ جنت مادی ہوگی اور وہاں بہشتیوں کو ان کی بیویاں واپس ملیں گی۔ (مرقس ۱۲۔۲۴) یہودیوں کی پچھلی کتابوں میں جزا و سزا کی تفصیل موجود ہے، چنانچہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب کے یہودی اس پر ایمان رکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہود کیسے ہی گناہگار ہوں گے مگر چند روز سے زیادہ وہ دوزخ میں نہیں رہیں گے (۲/ بقرہ: ۸۰، ۳/عمران: ۲۴) یہ چند روز باختلاف روایت تین روز، چالیس روز [2] یا گیارہ مہینے ہیں۔ [3] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عہد میں یہودیوں کے ان دونوں فرقوں کے درمیان سخت اختلافات برپا تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تردید وابطال میں مصروف تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آکر صدوقیوں کے اس عقیدہ کی تردید کی اور قیامت اور جزا و سزا پر ایمان لانے کی تعلیم دی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک حواری یوحنا نے اپنے مکاشفہ میں جنت اور دوزخ کی پوری تصویر کھینچی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جواب سے جو انہوں نے ایک صدوقی کے سوال کا جواب دیا کہ اس دنیا میں لوگ شادی اور بیاہ نہیں کریں گے بلکہ فرشتوں کے مانند رہیں گے۔ ایسا سمجھا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جنت کو صرف روحانی وجود بخشا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں اپنے شاگردوں کے ساتھ بیٹھ کر جب انگور کا افشردہ پیتے ہیں تو کہتے ہیں: ''میں تم سے کہتا ہوں کہ انگور کے پھل کا رس پھر نہ پیوں گا، اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہت میں نیا نہ پیوں''۔ (متی ۲۶۔۲۹، ۲۹) [4]

حضرت عیسیٰ علیہ السلام یہودی علما کو خطاب کرکے فرماتے ہیں:

''اے سانپو اور اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیونکر بھاگو گے۔'' (متی ۲۳۔۳۳)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے ایک وعظ میں دوزخ کا ایک منظر دکھاتے ہیں اور فرماتے ہیں:

''اس نے دوزخ کے درمیان عذاب میں ہو کے اپنی آنکھیں اٹھائیں اور ابراہام (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کو دور سے دیکھا اور اس کی گود میں لعزر کو اور اس نے پکار کر کہا کہ اے باپ

---

[1] برٹش انسائیکلوپیڈیا مضمون صدوقین (صدوکیز)۔ [2] کتب تفسیر میں ان آیتوں کی تفسیر دیکھو۔

[3] سیل کا ترجمہ قرآن مجید حاشیہ زیر ترجمہ آیت بقرہ رکوع ۸۔

[4] اس کے اور آگے کے حوالوں کے لیے دیکھئے: الکتاب المقدس، کتاب العہد الجدید۔

ابراہام! مجھ پر رحم کر اور لعزر کو بھیج کہ اپنی انگلی کا سرا پانی سے بھگو کر میری زبان ٹھنڈی کرے، کیونکہ میں اس لو میں تڑپتا ہوں۔'' (لوقا ۱۶۔۲۳)

مکاشفاتِ یوحنا میں دوزخ کو ''آگ اور گندھک'' کہا گیا ہے۔ (۱۴۔۱۰) اور متی کی انجیل میں اس کے دروازے بھی بتائے گئے ہیں۔ (متی ۱۶۔۱۸) اسی طرح جنت اور اس کی طلائی و جواہراتی تعمیر اور نہر آب حیات کا ذکر مکاشفات کے اکیسویں باب میں ہے اور وہاں کے انگوری افشردہ کا بیان متی میں ہے۔ (متی ۲۶۔۱۹) وہاں کے آب سرد کا ذکر بھی انجیل میں آتا ہے۔ (لوقا۔۱۶۔۲۳)

اسی طرح ہر ایک کے عمل کا حساب لیے جانے اور عمل کے مطابق بدلہ ملنے کا ذکر بھی حواریوں کے خطوط میں موجود ہے۔

''مبارک وہ مرد ہے جس کے گناہوں کا حساب خداوند نہ لے گا۔'' (رومیون ۲۔۸۰)

''سو ہر ایک ہم میں سے خدا کو اپنا حساب آپ دے گا۔'' (رومیون ۱۴۔۱۱)

''لیکن وے اس کو جو زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پر تیار ہے حساب دیں گیا۔'' (اول پطرس ۴۔۵)

اس باب میں اسلام کا تکمیلی پہلو یہ ہے کہ اس نے اس عقیدہ کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان ہی کیا، بلکہ اس کے تمام ضروری اجزا فراہم کیے گزشتہ مذاہب کے تشنہ بیانات پر سیر حاصل بحثیں کیں اور ان کے نقائص کی تکمیل کی اور جزا و سزا کے اصول اس طرح بیان کیے کہ اس عقیدہ کا ہر پہلو شکوک و شبہات سے پاک ہو گیا۔

آیندہ مباحث کے سمجھنے کے لیے پہلے چند اصول ذہن نشین کر لینے چاہییں۔

عالم آخرت کا فہم و ادراک

اس عالم آخر میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ و زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہوگا تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے، جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہے، اس لیے ان الفاظ کے ساتھ جو مادی خصائص و لوازم مستلزم ہو گئے ہیں یا ہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سن کر ہم بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں اور اسی سبب سے بعض کم فہم وہاں کے وقائع و احوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض امور کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں اور بعضے ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنی میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا، یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں، اسی لیے وحی محمدی ﷺ نے ان نازک و دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے، اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر اس عالمِ آخرت کو بھی سرتاپا عالم آب و گل بنا دیا ہے اور نہ عقل و خرد کے بعض نادان

مدعیوں کی طرح ان کو مادہ سے اتنا بلند و برتر کیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہلِ نظر تماشائیوں اور دونوں کی تشفی اور تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

ان اخروی وقائع کے مختلف الخیال مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے وحی محمدی ﷺ نے ایسے بچے تلے الفاظ اختیار کیے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں اور ایک ایسے مذہب کے لیے جو سارے انسانی طبقوں کو اپنا مخاطب بنانے کا دعویٰ کرتا ہے ایسی ہی وسعت کی ضرورت تھی، تاکہ وہ سب کے لیے اپنی اپنی جگہ پر تشفی کا باعث ہو سکے ان تمام اخروی واقعات کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ ظاہر ہے کہ طبعاً وہی الفاظ ہو سکتے ہیں جن کے چاروں طرف اس دنیا میں تمام تر مادی ماحول، مادی مفہوم و مصداق اور جسمانی تخیلات ہر چار طرف سے لپٹے ہیں، ان لفظوں کے سننے کے ساتھ جو مفہوم ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ سرتا پا انہی مادی قیود و لوازم کے ساتھ آتا ہے، ہم جب ''آگ'' کا لفظ سنتے ہیں تو معاً اس دنیاوی آگ کا مفہوم ذہن میں آتا ہے، جس کو ہم یہاں دیکھتے ہیں جو انسانوں اور درختوں کو اور ہر چیز کو جو اس کے اندر ہوتی ہے بلا تمیز یکساں جلا دیتی ہے مگر اخروی آگ ایسی نہ ہوگی اس کے اندر بعض درخت ہوں گے جو نہیں جلیں گے وہ صرف گناہگار انسانوں کو جلائے گی، کسی کے پاؤں چھوئے گی، کسی کی کمر تک آئے گی، کسی کے گلے تک پہنچے گی، وہ ایسی تیز و گرم ہوگی کہ یہ دنیاوی آگ، اس کے مقابلہ میں ٹھنڈک ہے۔ ''وزن'' کا لفظ سننے کے ساتھ ہمارے سامنے اس عالم میں تولنے کی ساری خصوصیتیں آجاتی ہیں ترازو، پاسنگ، پلے ڈنڈی اور تولی جانے والی چیز میں جسمیت اور ثقل کا ہونا۔ اسی طرح نامۂ عمل کے لکھنے کا مفہوم جب ہم سمجھنا چاہیں گے تو کاتب کی انگلیاں، قلم، دوات، سیاہی، کاغذ اور حروف کی ساری قیدیں ہمارے ذہن میں آئیں گی اس بنا پر ان الفاظ کے سراسر لغوی معنوں اور اس کے قریب الفہم مجازی معنوں کے سمجھنے میں اختلاف آراء کی بڑی گنجائش ہے اس لیے حق تو یہ ہے کہ ان پر بلا مزید تشریح اس طرح ایمان لایا جائے، کہ ہماری تشریح سے ان کے الفاظ کے مفہوم کی وسعت تنگ نہ ہو جائے بایں ہمہ ان لوگوں کو بھی دائرہ سے خارج نہ کیا جائے جو ان الفاظ سے وہ مفہوم سمجھ کر تسلی پانا چاہتے ہیں، جن کے وہ الفاظ متحمل ہو سکتے ہیں اگر مرادِ الٰہی یہی تنگی ہوتی تو اللہ تعالیٰ انسانی عقلوں کے اس اختلاف مراتب کا لحاظ کیے بغیر اپنے مفہوم کو اس وسعت کے بجائے تنگ سے تنگ الفاظ میں ظاہر فرما سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا، تاکہ اسلام تمام مختلف العقول انسانوں کے لیے عالمگیر ثابت ہو سکے۔

ایک دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ عالمِ آخرت کے وقائع اور حالات کے سمجھنے میں اشکالات و اعتراضات اس لیے پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے موجودہ قوانین فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی شے کے وجود کا تذکرہ کیا جائے گا تو معاً اس کے وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے جن

کے دیکھنے کے ہم اس دنیا میں عادی ہیں حالانکہ اربابِ عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دنیا کے معلومات ومسببات اوران کے موجودہ علل واسباب میں جولزوم ہیں وہ محض عادی ہیں یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دنیا میں جو قوانینِ فطرت اور علل واسباب اوران کے نتائج کارفرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دنیا کے قوانین ہیں اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانین فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں، بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل رہے، نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں ہوں، نئی قسم کی آگ ہو، نئی قسم کے باغ اوران کے پھل ہوں، نئی قسم کے موجودات ومخلوقات ہوں، نئے علل واسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں وحی محمدی ﷺ نے اسی نئے عالم کے متعلق کہا ہے:

﴿ يَوْمَ تُبَدَّلُ الْأَرْضُ غَيْرَ الْأَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ ﴾ (۱۴/ ابراھیم:۴۸)

''جس دن یہ زمین نئی زمین سے بدل جائے گی اور آسمان (نئے آسمان سے)۔''

تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئی زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے، جو اس موجودہ زمین وآسمان میں جاری تھے اس بنا پر جسمانیت ومادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق اشکالات جو اس دنیا اوراس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔اس ضروری تمہید کے بعد جزا وسزا کی اسلامی تشریحات کی جانب قدم اٹھایا جاتا ہے،وھو الھادی الی الصواب.

اصولِ جزا

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے، جس کو اہلِ فلسفہ قانونِ قدرت اور اہل مذہب تقدیر اور اندازۂ الٰہی کہتے ہیں، اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے، جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے، انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصولِ فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں، حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا علمیات، ہر ایک میں یہ یکساں جاری وساری ہیں جس طرح یہ قانونِ فطرت ہے کہ زہر کھانے سے انسان کا جسم مرجاتا ہے اسی طرح یہ بھی اصول فطرت ہے کہ گناہ سے اس کی روح مرجاتی ہے اور جس طرح اصولِ حفظانِ صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح اصول تزکیہ نفس کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے پھر جس طرح دوا اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعہ بھی وہ شفایاب ہوتا ہے۔

اعمال کے لوازم ونتائج

غرض جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص وآثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات واعمال کے بھی کچھ آثار ولوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہوسکتے غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر، ہر ایک کا ایک اثر ونتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ولوازم ہیں، جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہوسکتے جس طرح سنکھیا سے سَمِّیَّتْ، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہوسکتی اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت ومعلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی اور طبیعاتی اشیاء میں ہے۔

اشخاص کی نیکوکاری وبدکاری اور افراد کی سعادت وشقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح وفساد اور سعادت وشقاوت پر بھی حاوی ہیں، جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی اس تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت (سائنس) ہے، اسی طرح ان روحانی اسباب وعلل اور آثار ونتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام ''شریعت'' ہے، انبیاء علیہم السلام کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار ونتائج کے متعلق وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کے متعلق ہوتا ہے، سائیکالوجی (علم النفس) اور سوشیالوجی (علم الاجتماع) کی وسعتِ تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کردی ہے۔

عقاب وثواب ردِ عمل ہے

الغرض یہ مادی وجسمانی دنیا علت ومعلول، عمل اور ردِ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرہ میں انسان کا ہر قول اور انسان کا ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام اسلام میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے انہیں دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے، عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے، جس کے معنی پیچھے کے ہیں، اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے لیا گیا ہے، جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنی میں بولا گیا ہے۔ اسی ایک مسئلہ کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو جزا اور سزا کے شرعی اصول کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ چنانچہ قرآن پاک میں یہ کئی دفعہ فرمایا گیا ہے:

﴿ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝﴾ (۴۵/ الجاثیہ:۲۸)

''جو تم کرتے تھے، آج وہی بدلہ پاؤ گے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ جزاوسزا ہمارے ہی اعمال کے ردِ عمل (ری ایکشن) کا نام ہے۔ایک اور جگہ ہے:

﴿ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۱۵)

''تا کہ ہر جان کو اس کا بدلہ دیا جائے، جو وہ کرتی تھی۔''

ان آیتوں میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزاوسزا تمام تر ہمارے دنیاوی اعمال کے آثار ولوازم ہیں:

﴿ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ ﴾

(۱٦/ النحل:۳٤)

''تو ان کے برے کام ان پر پڑے اور ان کا ٹھٹھا کرنا ان پر الٹ پڑا۔''

غرض جزاوسزا انہیں اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ اشارہ فرمایا کہ ''قیامت میں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر یہاں دے رہا ہوں، تو جو کوئی جزائے خیر پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔'' [1]

حصولِ راحت کا اصول

یہ فطری قانون ہے کہ ہم کسی بڑی تکلیف سے اسی وقت بچ سکتے ہیں جب اس کی خاطر ہم اس سے چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو برداشت کریں اور کسی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم اپنی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو قربان کرتے رہیں۔ عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آیندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دون ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ (عاجلہ) راحت کو پسند کر کے آیندہ راحت کی فکر نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی مگر نقد ہے اور آیندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آیند ہو مگر وہ نسیہ ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ ''نقد را بہ نسیہ مگزار'' لیکن بلند ہمت اور عالی حوصلہ طبائع کا طریق عمل اس کے بالکل برخلاف ہے۔ فاتح اور کشور کشا آج اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈالتے ہیں، تا کہ کل سلطنت ان کے ہاتھ آئے۔ تاجر اور سوداگر آج اپنے سرمایہ کو بازار کے سپرد کر دیتے ہیں، تا کہ دولت فردا سے وہ بہرہ مند ہوں ہر مہذب انسان اپنے بچہ کو بیس پچیس برس تک تعلیم وتربیت اور مشق وامتحان کی مصیبتوں کی آگ میں بے تامل جھونک دیتا ہے، تا کہ اس کی آیندہ کی زندگی راحت ومسرت میں بسر ہو۔ لوگ اپنے سرمایۂ عزیز کو تکلیفیں اٹھا اٹھا کر جمع کرتے جاتے ہیں، تا کہ کل اس سے زیادہ ضروری موقع پر اس کو کام میں لاسکیں اور تنگ دستی کی بڑی تکلیف سے بچ سکیں۔

غرض اگر انسانوں کی تمام کوششوں پر ایک غائر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کے حصول کا یہی اصول ان کے اندر جاری وساری ہے کہ تھوڑی سی تکلیف کو اس لیے برداشت کر لیا جائے کہ کسی بڑی تکلیف

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم: ٦٥٧٢ وادب المفرد وبخاری، باب الظلم ظلمات: ٤٩٥۔

سے رہائی ملے اور چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اس لیے برباد کر دیا جائے کہ کوئی بڑی خوشی حاصل ہو اور عارضی کامیابیوں کو اس غرض سے قربان کیا جائے کہ کوئی پائدار اور دائمی کامیابی نصیب ہو مگر یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ آیندہ کی خوشی و کامیابی کی فراوانی اور اس کے دوام و پائداری کا ہم کو یقین ہو کہ اگر ایسا یقین نہ ہو تو ہم کبھی اس ایثار و قربانی پر آمادہ نہ ہوں، اسی لیے ایمان کی ضرورت ہے، تاکہ ہمارے اندر یہ یقین پیدا ہو جائے اور ہم اس ایثار و قربانی کو خوشی خوشی گوارا کر لیں۔ جن لوگوں میں یہ یقین پیدا نہ ہوگا ان سے یہ عظیم الشان قربانی بھی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے گنا ہگار انسانوں کی یہ کیفیت قرآن نے بیان کی ہے:

﴿ كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ ۝ وَتَذَرُونَ الْآخِرَةَ ۝ ﴾ (۵۷/ القیامة: ۲۰، ۲۱)

''ہرگز نہیں بات یہ ہے کہ تم موجودہ زندگی سے محبت رکھتے ہو اور آیندہ زندگی کو چھوڑتے ہو۔''

حالانکہ انسان اسی اصولِ کار کو اگر دنیا کی طرح آخرت کے معاملات میں بھی برتے تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہ رہے، آیندہ کا خیال کر کے موجودہ سے دست بردار ہو جانا یہی کامیابی کی کنجی ہے اور اسی اصول کے تحت میں دین و دنیا کی تمام نیکیوں اور کامیابیوں کا راز پوشیدہ ہے، موجودہ عارضی لذت کو آیندہ کی دائمی لذت پر اور حال کی معمولی راحت کو مستقبل کی دیرپا راحت پر قربان کر دینا وہ سچائی ہے جس کے تسلیم کرنے سے کوئی انحراف نہیں کر سکتا۔ تم صبح خیزی کی معمولی تکلیف کو صحت کی دیرپا راحت کی خاطر قربان کرتے ہو۔ ورزش اور دوڑ دھوپ کی محنت کو اس لیے قبول کرتے ہو کہ کل کی پیری اور بیماری کی تکلیف سے تم کو وہ بچائے۔ غرض آج کی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو اٹھاؤ گے تو کل کی بڑی تکلیف سے تم کو نجات مل سکے گی اور آج کی عارضی خوشیوں کو قربان کرو گے تو کل کی دائمی خوشی نصیب ہوگی۔ یہی وہ فلسفہ ہے جس کو قرآن نے اس آیت میں ادا کیا ہے:

﴿ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر: ۱۲)

''اور خدا نے ان کے صبر کرنے پر ان کو باغ اور ریشم کے کپڑے اور مزدوری دی۔''

یہ صبر کیا تھا؟ دنیا کی عارضی خوشیوں کی قربانی، تاکہ آخرت کی بڑی تکلیف سے نجات ملے، یہی سبب ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ

((حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ)) [1]

''یعنی جنت دنیاوی تکلیفوں سے اور دوزخ دنیا کی معمولی خوشیوں سے گھری ہوئی ہے۔''

نادان تقویٰ اور نیکی کی ان معمولی قیدوں سے گھبراتے ہیں اور گناہ کی عارضی و فانی لذتوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ اس لیے آخرت کی بڑی تکلیف میں گرفتار ہوں گے اور وہاں کی ابدی لذت سے محروم رہیں گے اور جو دین و دیانت اور نیکی و تقویٰ کی ان معمولی تکلیفوں کو گوارا کریں گے اور گناہ کی عارضی لذتوں سے بچیں گے وہ آخرت کی لاانتہا لذتوں سے شادکام ہوں گے۔ یہی فلسفہ قرآنِ پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

[1] جامع ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ماجاء حفت الجنة بالمكاره: ۲۵۵۹۔

﴿ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ۙ ﴾

(۷۹/ النازعات: ۴۰، ۴۱)

''لیکن جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو ناجائز لذتوں اور خوشیوں سے باز رکھا، تو جنت اس کا ٹھکانا ہے۔''

نامۂ عمل

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہو جاتی ہے پھر وہ بلاحکم خدا فنا نہیں ہوتی۔ اسی طرح افعال و اعمال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس جس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہو کر فنا نہیں ہوتی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے، آج موجود ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں، وہ اعمال و افعال کے دوامِ وجود کے اسلامی عقیدہ کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کر سکتی، دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لیے گویا بھرا ہوا ہے۔ قرآن پاک نے اسی اصول کو اپنی ان آیتوں میں بیان کیا ہے:

﴿ هُنَالِكَ تَبْلُوْا كُلُّ نَفْسٍ مَّآ اَسْلَفَتْ ﴾ (۱۰/ یونس: ۳۰)

''اس وقت ہر جان جو اس نے پہلے کیا اس کو آزمالے گی۔''

﴿ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ ﴾ (۵۲/ الطور: ۲۱)

''ہر آدمی اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔''

﴿ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۙ ﴾ (۷۴/ المدثر: ۳۸)

''ہر جان اپنے عمل کے بدلہ گرو ہے۔''

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ ﴾

(۹۹/ الزلزال: ۷، ۸)

''تو جو کوئی ایک چیونٹی بھر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو چیونٹی برابر بدی کرے گا، وہ اس کو بھی دیکھے گا۔''

﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ ﴾

(۳/ آل عمران: ۳۰)

''جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے، ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کیے وہ بھی۔''

یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفۂ عالم پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتا ہے، اس کو قرآن نے کئی طریقوں سے ادا کیا ہے۔

ایک اس طرح کہ انسان کی زبان سے جب کبھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنا ہی تنہائی میں بولا جائے، خدائی شاہد اس کے سننے کو موجود رہتے ہیں اور وہ اس کو سن کر محفوظ کر لیتے ہیں:

﴿ اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ۝ مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ۝ ﴾ (۵۰/ ق:۱۷، ۱۸)

''جب دو لینے والے داہنے اور بائیں بیٹھے لیتے جاتے ہیں، کوئی بات وہ نہیں بولتا، مگر ایک نگران اس کے پاس حاضر رہتا ہے۔''

کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:

﴿ اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ ؕ بَلٰی وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ۝ ﴾

(۴۳/ الزخرف:۸۰)

''کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے، کیوں نہیں، بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس اعمال لکھتے ہیں۔''

﴿ اِنَّ رُسُلَنَا یَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۲۱)

''بے شک ہمارے فرستادہ تمہاری چالوں کو لکھتے رہتے ہیں۔''

کبھی اللہ تعالیٰ ہر عمل کے موقع پر خود اپنی حاضری اور دائمی علم و شہادت کو ظاہر کرتا ہے:

﴿ وَمَا تَكُوْنُ فِیْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَیْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ ؕ ﴾ (۱۰/ یونس:۶۱)

''اور تو کسی کام میں نہیں ہوتا اور نہ قرآن سے کچھ پڑھتا ہے اور نہ تم لوگ کوئی کام کرتے ہو، لیکن ہم موجود ہوتے ہیں، جب تم اس میں لگے ہوتے ہو۔''

کبھی یہ کہا کہ ہر انسان کا نامۂ عمل اس کی گردن میں لٹکا ہے، قیامت کے دن وہی فرد عمل کی صورت میں انسان کے سامنے پھیلا دیا جائے گا کہ اپنا اعمال نامہ تم خود پڑھ لو۔ فرمایا:

﴿ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰی بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل:۱۳، ۱۴)

''اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو دفتر کر کے نکالیں گے، جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا، اپنا دفتر پڑھ لے آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔''

اس آیت کا ایسا محمل ہے کہ نامۂ عمل کو اگر کوئی واقعی کاغذ کا دفتر یا حساب و کتاب کا رجسٹر نہ سمجھے تو سمجھ سکتا

ہے اور کہہ سکتا ہے کہ یہ تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ جس طرح کاغذ اور رجسٹر میں قلم بند حساب کوئی بھول نہیں سکتا اور ایک ایک چیز اس میں درج ہوتی ہے اسی طرح یہ اعمالِ انسانی فراموش نہ ہوں گے بلکہ لکھے ہوئے رجسٹر کی طرح محفوظ رہیں گے، فرمایا:

﴿ وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴾ (۱۸/ الکھف:۴۹)

''اور نامہ اعمال رکھا جائے گا تو، تو دیکھے گا گنہگاروں کو، اس میں جو لکھا ہے اس سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے کہ ہائے افسوس کہ اس کاغذ کو کیا ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی بات نہیں چھوڑتا، لیکن اس کو شمار کر لیا ہے اور جو کچھ انہوں نے زندگی میں کیا اس کو سامنے پائیں گے اور تیرا پروردگار کسی پر ظلم نہ کرے گا۔''

بایں ہمہ اگر کوئی ٹھیٹ لفظوں کا پابند ہو کر نامۂ اعمال کو واقعی کاغذوں کا دفتر سمجھتا ہے تو اس میں شک نہیں کہ الفاظ کے ظاہری معنی اس کی تائید کریں گے مگر کون سمجھا سکتا ہے کہ یہ کیونکر ہوگا اسی لیے اس پر بحث فضول ہے کہ یہ کیونکر ہوگا، چاہے یہ ہو یا وہ، بہر حال ہمارے اعمال کا ایک ایک نقطہ محفوظ رہے گا اور وہ خدا کے سامنے پیش ہوگا اور یہی اس عقیدہ کا اصل مقصد ہے۔

اعضا کی شہادت

انسان کا ہر عمل اپنے پیچھے اپنے کرنے والے کے اندر اپنا اچھا یا بُرا اثر چھوڑ جاتا ہے، اگر دل کا آئینہ صاف ہو تو اس کو اپنے عمل کا چہرہ اس میں صاف دکھائی دے، فرمایا:

﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۙ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۭ ﴾ (۷۵/ القیامہ:۱۴، ۱۵)

''بلکہ انسان کو اپنے نفس کا حال آپ دکھائی دیتا ہے، اگر چہ وہ اپنے عذر تراشتا ہے۔''

یہی وہ آئینہ ہے جو گناہ کے میل سے زنگ آلود ہو جاتا ہے:

﴿ كَلَّا بَلْ ۫ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ﴾ (۸۳/ المطففین:۱۴)

''نہیں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔''

اسی آیت کی تفسیر میں گویا آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ''جب انسان پہلے پہل گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اور اگر وہ توبہ وانابت کرتا ہے اور آئندہ اس سے باز رہتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اگر اسی طرح گناہ کیے جاتا ہے تو اس نقطہ کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک دن پورے دل پر چھا جاتا ہے۔'' [1]

[1] ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورۃ ویل للمطففین: ۳۳۳۴۔

اسی طرح سے وہ اپنے اعضا سے جو برا کام کرتا ہے اس کا اثر ان پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ چہروں پر اس اثر کے نقوش ابھر آتے ہیں، آنکھوں میں اس کی لکیریں پڑ جاتی ہیں اور ہاتھ پر اس کے نشان نمایاں ہو جاتے ہیں، عالم غیب کو چھوڑو، اسی عالمِ ظاہر میں تاڑنے والوں کی نگاہیں انسانوں کے چہروں آنکھوں اور ہاتھ پاؤں کے عنوان بیان سے انسان کے اندر کی تحریریں پڑھ لیتی ہیں، اسی طرح قیامت میں ان کے اعمال کے آثار ونتائج ان کے ایک ایک عضو سے نمایاں ہوں گے:

﴿ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ ﴾ (۵۵/ الرحمٰن:۴۱)

''گنہگار اپنی پیشانی سے پہچان لیے جائیں گے۔''

ایسی حالت میں اس وقت جب انسان کی زبان قال پر خداوند عدالت کے رعب وجلال سے مہرِ سکوت پڑ جائے گی اگر انسان کے ہاتھ پاؤں اور کھال تک نفسِ انسانی کے اعمالِ بد پر گواہی دے دیں تو تعجب کی کیا بات ہے، فرمایا:

﴿ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ۝ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ۝ۙ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ؕ اَفَلَمْ تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ۝ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۝ اِصْلَوْهَا الْيَوْمَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۝ اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝ ﴾ (۳۶/ یٰس:۵۹۔۶۵)

''اے گناہگارو! آج نیکو کاروں سے الگ ہو کر پہچان میں آ جاؤ.......... آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اوران کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اوران کے پاؤں ان کے کرتوتوں کی گواہی دیں گے۔''

﴿ وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۝ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَاَبْصَارُهُمْ وَجُلُوْدُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝ وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ ﴾ (۴۱/ حٰمٓ السجدۃ:۱۹۔۲۱)

''اور جس دن خدا کے دشمن دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے اور وہ درجہ بدرجہ بانٹے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچے تو ان کے کانوں، ان کی آنکھوں اور ان کی کھالوں نے ان پر ان کے کرتوتوں کی گواہی دی اور انہوں نے کہا تم نے ہم پر کیوں گواہی دی، کہا کہ جس خدا نے ہر چیز کو گویا کیا اسی نے ہم کو بھی گویا کیا۔''

اس لیے ان اعضا کی گویائی بھی اسی نوع کی ہوگی جس نوع کی گویائی دنیا کی ہر چیز کو حاصل ہے، لیکن

اس گویائی سے اگر کوئی حقیقی زبان کی گویائی مراد لے کر تشفی پاتا ہے تو اس کو اس کا حق حاصل ہے۔

میزان

اکثر انسانوں کے اچھے یا برے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں، ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر دو مادی چیزوں کے درمیان تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے، اس لیے وزن اور حساب سے عموماً عدل و انصاف، حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ اعمالِ انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا، فرمایا:

﴿ جَزَآءً وِّفَاقًا ﴾ (۷۸/ النبآء:۲٦) ''پورا پورا بدلہ۔''

اس برابری اور کمال عدل و انصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا، فرمایا:

﴿ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ﴾

(۷/ الاعراف:۷۔۹)

''پھر ہم احوال سنائیں گے اور ہم کہیں غائب نہ تھے اور وزن اس دن حق ہے، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں تو وہ ہیں جن کا بھلا ہوا اور جس کی تولیں ہلکی پڑیں سو وہی ہیں جو اپنی جانیں ہار بیٹھے۔''

﴿ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ ۝ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ ﴾

(۱۰۱/ القارعۃ:٦۔۹)

''تو جس کی تول بھاری ہوئی، تو وہ خوش خوش عیش میں ہوگا اور جس کی تول ہلکی ہوئی تو اس کی ماں دوزخ ہوگی۔''

ان دونوں آیتوں میں تول کے بھاری اور ہلکے ہونے سے مقصود اعمال خیر کی کمی و بیشی ہے۔ پہلی آیت میں اس کا اشارہ موجود ہے کہ وزن سے مراد حق و عدل ہے اور یہ کہ انسان کا ہر عمل علمِ الٰہی میں موجود ہوگا اور وہ کسی طرح کم و بیش نہ ہوگا۔

اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت مستعمل ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے:

﴿ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۱۷)

''وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان کو۔''

یعنی کتاب الٰہی حقانیت کے ساتھ اتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے،

(طبری تفسیر آیت مذکورہ) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا ہے اس کو بھی میزان ہی کے لفظ سے ادا فرمایا ہے:

﴿ وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ ﴾ (۵۵/ الرحمان:۷) ''اور خدا نے ترازو رکھی ہے۔''

حساب

کمی بیشی کے علم کا دوسرا طریقہ حساب کرنے کا ہے، دوسری آسمانی کتابوں کی طرح قرآن میں بھی یہ استعارہ استعمال ہوا ہے اور بار بار فرمایا ہے کہ ہم قیامت میں تمہارے عمل کا حساب لیں گے، مگر اس حساب سے بھی وہی مقصود ہے جو وزن سے ہے، چنانچہ سورۂ انبیاء میں یہ مفہوم مزید تصریح کے ساتھ مذکور ہے اور جس سے میزان کی حقیقت بھی پوری طرح سمجھ میں آتی ہے، فرمایا:

﴿ وَنَضَعُ الْمَوَازِينَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا ۖ وَإِن كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا ۗ وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِينَ ۝ ﴾ (۲۱/ الانبیآء:۴۷)

''اور ہم قیامت کے دن کے لیے ترازوئیں یعنی انصاف رکھیں گے، پھر کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا، اگر رائی کے دانہ کے برابر بھی کچھ ہوگا، تو ہم لے آئیں گے اور ہم کافی ہیں، حساب کرنے والے۔''

اس آیت سے دو باتیں سمجھی جاسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ وزن سے مقصود انصاف اور عدم ظلم ہے اور دوسری یہ کہ حساب سے مقصود یہ ہے کہ عمل انسانی کا کوئی ذرہ بھی معاوضہ میں چھوٹنے نہ پائے گا اور نہ وہ خدا کے علم سے غائب ہے، لیکن بہر حال وزن وحساب کے مادی ہی مفہوموں کو اگر صحیح باور کرتا ہے تو وہ بھی حق پر ہے۔

جنت ودوزخ

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان اعمال کی تکلیف اور ذمہ داری سے مقصود الٰہی کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ ارواح انسانی کو سعادت ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی عطا کی جائیں مگر اس سعادت وترقی کی بنیاد خدا نے اعمال نیک کے حصول اور اعمالِ بد سے پرہیز پر رکھی ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ خلقت انسانی کی غرض یہ ہے کہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرے، تاکہ وہ اپنی مقررہ سعادت اور موعودہ ترقی کو حاصل کرے اور اسی عالم کا نام جہاں یہ سعادت ابدی اور ترقیاتِ غیر متناہی ملتی ہیں بہشت ہے اور اس عالم کا نام جہاں جا کر دنیاوی کمیوں کی تلافی اور گزشتہ حیاتِ فانی کے اعمالِ بد کے نتائج سے پاکی حاصل ہوگی دوزخ ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ جنت ہی انسان کا اصلی گھر ہے۔ مزید تفصیل آگے آتی ہے۔

جنت انسان کی وراثت ہے

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ جو توراۃ اور قرآن پاک میں مذکور ہے، وہ آغاز خلقت کی محض تاریخ نہیں، بلکہ وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تفسیر ہے، عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو

اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے، مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی مقرر ہو چکا تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کی خلقت سے پہلے ہی فرشتوں پر یہ ظاہر کر چکا تھا کہ

﴿ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۰)

''میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

حضرت آدم علیہ السلام کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے، مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے، مگر اس سے دُوری اس کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت اور نیکوکاری کے ذریعہ ہوگا، چنانچہ ان کے زمین میں اترتے وقت اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرما دیا:

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۳۸، ۳۹)

''ہم نے کہا، تم سب اس جنت سے اترو، پھر کبھی تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے، تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی، تو اس کو نہ ڈر ہوگا نہ غم اور جنھوں نے نہ مانا اور ہمارے حکموں کو جھٹلایا تو وہی ہیں دوزخ والے اور وہ اس میں رہا کریں گے۔''

﴿ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِیْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۳، ۱۲۴)

''خدا نے کہا کہ اس جنت سے تم دونوں ایک ساتھ اتر جاؤ، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے، تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ بدبخت ہوگا اور جس نے میری یاد سے منہ پھیرا، تو اس کے لیے تنگ معاش ہوگی اور قیامت میں ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔''

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے، ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا زندگی جاوید کا، توراۃ کی رو سے آدم علیہ السلام کو اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا ہے لیکن آدم نے

اس کو کھالیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو اپنی برہنگی کا علم ہوا، آخر خدا نے ان کو جنت سے نکال دیا کہ وہ زندگی کے درخت کا پھل کھا کر خدائی کا دعویٰ نہ کر بیٹھیں، جب وہ جنت سے نکالے گئے، تو ان سے کہا گیا (سفر تکوین۔۲)

''اور اس درخت سے کھایا جس کی بابت میں نے تجھ سے حکم کیا کہ اس سے مت کھانا، زمین تیرے سبب سے لعنتی ہوئی اور تکلیف کے ساتھ تو اپنی عمر بھر اس سے کھائے گا اور وہ تیرے لیے کانٹے اور اونٹ کٹارے اگائے گی اور تو کھیت کی نبات کھائے گا اور تو اپنے منہ کے پسینہ کی روٹی کھائے گا، جب تک کہ زمین میں پھر نہ جائے۔''

قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کے پھل کھانے سے آدم کو روکا گیا تھا تصریحاً مذکور نہیں، لیکن ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا اور شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ ''یہ حیاتِ جاوید اور ملک جاوداں کا درخت ہے۔'' مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ''برہنگی کا علم'' ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔ فرمایا:

﴿ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۲۰، ۱۲۱)

''شیطان نے آدم کو وسوسہ دیا اور کہا اے آدم! کیا میں تجھے حیات جاودانی اور سلطنت غیر فانی کا درخت بتاؤں تو (آدم اور حوا) دونوں نے اس درخت کا پھل کھایا تو ان کی بری چیزیں ان پر کھل گئیں۔''

اب سوال یہ ہے کہ ''حیاتِ جاوداں'' اور ''غیر فانی بادشاہی'' سے مقصود کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ جنت ہے، شیطان کا مقصود یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں تم اب ہو، بے دردِسر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں؟ انسان نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا، یہ بھی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے۔ ہر وہ مخلوق بلکہ ہر وہ انسان جو اس ادراک سے خالی ہے وہ شرعی تکلیف اور مؤاخذہ سے بھی گرانبار نہیں ہے، غرض اس خیر و شر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی، چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور پھر نسل آدم میں یہ نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعہ عنایت ہوئی، فرمایا:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس: ۷، ۸)

''اور نفس اور اس کی بناوٹ کی قسم، پھر نفس میں اس کی بدی اور نیکی کو الہام کیا۔''

عجب نہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیتیں اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتی ہوں:

﴿ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا

وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ لِيُعَذِّبَ اللَّهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ ﴾

(۳۳/ الاحزاب:۷۲، ۷۳)

''ہم نے اپنی امانت (تکلیفِ شرعی) آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تا کہ اللہ نفاق والوں اور نفاق والیوں، شرک والوں اور شرک والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر رجوع ہو اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

انسان نے اپنی جہالت سے اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھا لیا جو نیک و بد کی معرفت کا لازمی نتیجہ تھا اور اس تکلیف شرعی کا لازمی نتیجہ جزا اور سزا تھی لیکن خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس کی رحمت و شفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنا ہگاروں کو معاف کرے اور نیکو کاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشت کار اپنے کھیتوں کو ابر رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا، اسی طرح جو بندہ شرک و نفاق میں مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحت الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی اس صورت سے پوری ہوئی اور وہ حیات جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جدو جہد اور سعی و عمل پر موقوف رکھا تھا اور جیسے شیطان نے آدم کو بلا سعی و محنت محض بخت و اتفاق سے دلوا دینا چاہا تھا بالآخر اس کا ملنا تقدیر الٰہی اور نظام ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی و جدو جہد اور اس کے مطابق سعی و عمل کے ذریعہ سے مقرر ہوا جیسا کہ پہلے سے طے شدہ تھا، فرمان آیا:

﴿ قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳۸)

''یہاں سے تم سب اترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی راہنمائی آئے تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو ان کو نہ ڈر ہوگا نہ غم۔''

﴿ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقَىٰ ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۳)

''تم دونوں یہاں سے نیچے اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے راہنمائی آئے، تو جس نے میری راہنمائی کی پیروی کی، تو وہ گمراہ نہ ہوگا اور نہ

بد بخت ۔‘‘

جب انسان کا اصل مقام، وہی حیات جاوید اور مملکت ابد ہے تو اسی کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے اور اس کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے ذریعہ اسی حیاتِ باقی اور لازوال بادشاہی کی دولت کو مزدومعاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے، تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے جس کی صفت یہ تھی:

﴿ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقَىٰ ۝ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ۝ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۱۷، ۱۱۹)

’’تو شیطان تم کو جنت سے باہر نہ کردے تو پھر تم مشقت میں پڑ جاؤ اور جنت میں تجھ کو یہ ملا ہے کہ اس میں تو نہ بھوکا ہوگا، نہ ننگا، نہ پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تپش اٹھائے گا۔‘‘

آدم علیہ السلام اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی اور ننگے بھی ہوئے پیاس بھی ان کو معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی اور زمین میں آکر ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے، کھانا، پینا، پہننا، رہنا۔ یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں اور انہیں کو اپنی ہوا وہوس سے پھیلا کر اس نے ضروریات کا ایک عالم پیدا کرلیا اور انہیں کے تیار کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کردیا اور اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی اور جائز اکل، جائز شرب، جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصولِ معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں اور پھر اس لیے، تاکہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو بھول نہ جائے، عرفانِ الٰہی (عقائدِ صحیحہ) اور عبادت واطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوئی، جو جنت کی اصلی غذا اور روزی ہے:

﴿ أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۰، ۱۱)

’’یہی وہ میراث لینے والے ہیں، جو سایہ دار باغ کے وارث ہوں گے اور وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔‘‘

لیکن یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعہ ملے گی۔ چنانچہ اہل جنت کو جنت کے داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی:

﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ۖ وَأَنتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۷۱، ۷۲)

''اور اس (جنت) میں وہ کچھ ہے، جس کو دل چاہے اور آنکھوں کو لطف ملے اور تم کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے اور یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے کاموں کے بدلہ میں جن کو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔''

اور ان ہی کو منادی غیب یہ ندا دے گا:

﴿ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۴۳)

''اور ان کو پکار کر کہے گا کہ یہی وہ جنت ہے، جس کے تم اپنے ان کاموں کے بدلہ میں جو تم کرتے تھے، وارث بنائے گئے۔''

ملت توحید کے مبلغ اعظم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاؤں کا ایک فقرہ یہ بھی تھا:

﴿ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۸۵)

''اور مجھے باغ نعمت کے وارثوں میں کر۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ اسلام نے انسان کا اصلی مقام وہی قرار دیا ہے، جہاں نہ بھوک ہے، نہ پیاس، نہ برہنگی ہے، نہ دھوپ کی تکلیف، جہاں کی بادشاہی لازوال اور جہاں کی زندگی غیر فانی ہے، لیکن اس کے حصول کا ذریعہ صرف انسان کا نیک عمل اور صحیح عرفان ہے، جن کے مجموعہ کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

﴿ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم:۶۳)

''یہ وہ بہشت ہے، جس کا وارث اپنے بندوں میں سے ہم اس کو بنائیں گے، جو تقویٰ والا ہوگا۔''

انسانی جزا و سزا کے تین گھر

انسان کے تین گھر ہیں، ایک موجودہ فانی عالم جس کو دنیا کہتے ہیں اور دوسرا درمیانی عالم موت یا عالم قبر جس کا نام برزخ ہے اور تیسرا اس غیر فانی زندگی کا گھر جس کو دار آخرت کہتے ہیں، یہودیوں کے یہاں اصلی زور اسی دنیا کی جزا و سزا پر ہے، ان کے ہاں تیسرے کا ذکر بہت کم، اور دوسرے کا مطلق نہیں اور عیسائیوں میں پورا زور تیسری منزل کی سزا و جزا پر ہے اور پہلی اور دوسری منزلوں کے ذکر سے خاموشی ہے لیکن وحی محمدی ﷺ کی تکمیل نے ان تینوں گھروں کو انسانی سزا و جزا کا مقام قرار دیا ہے، انسان کو اپنے اعمال کی پہلی جزا و سزا تو اسی دنیا میں کامیابی و ناکامی کی صورت میں ملتی ہے گو اس کامیابی و ناکامی کے سمجھنے کا معیار مختلف ہو، اس کے بعد جب انسانی روح دوسری منزل میں قدم رکھتی ہے تو یہاں بھی وہ اپنے اعمال کی تھوڑی بہت جزا و سزا کا منظر دیکھ لیتی ہے، اس کے بعد جب موجودہ دنیا کے پورے کاروبار کا خاتمہ ہو کر اس فانی کائنات کا ہر نقش و نگار مٹ جائے گا اور پھر نئی زمین اور نیا آسمان بنائے گا تو فانی انسانوں کو دائمی زندگی کے لیے پیدا کیا

جائے گا اور اس وقت وہ اپنے اعمال کی پوری جزاوسزا پائیں گے۔

انسان کا پہلا دارالجزاء

غرض انسان کا پہلا دارالجزاء یہی دنیا ہے انسان کے ہر نیک و بد فعل کا جو اثر دوسری دنیا کی زندگی پر پڑتا ہے اسی کے مشابہ خود اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی ملا کرتا ہے، انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہردلعزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت یہ تمام اس زندگی کے اعمالِ خیر کے نتائج ہیں، ان کے برخلاف، ذلت، رسوائی، بےعزتی، کسمپرسی، پریشان حالی، بےاطمینانی، غم، خوف، محکومیت ہمارے اعمال بد کے اثرات ہیں۔

یہودیوں کی تورات میں اعمال کے نتائج میں زیادہ اہمیت اسی دنیاوی دارالجزاء کو دی گئی ہے، بلکہ یہی خیال توراۃ میں سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ خدا کی فرمانبرداری اور نافرمانی کی جزا اسی دنیا کی رنج وراحت کی صورت میں اسی زندگی میں ملتی ہے، مثلاً: خدا کے حکموں پر عمل کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری کھیتیاں سرسبز ہوں گی، تمہاری اولادیں آبرومند ہوں گی، تمہارے جانور جنیں گے، تمہارے درخت پھل دیں گے اور تمہارے دشمن مغلوب ہوں گے اور اگر خدا کی نافرمانی کرو گے تو تم پر وبائیں آئیں گی، قحط پڑیں گے، تمہاری اولادیں جیتی نہ رہیں گی، تمہارے جانور مر جائیں گے، تمہارے شہر تباہ ہو جائیں گے، تمہارے باغ پھل نہ دیں گے اور تمہارے دشمن تم پر چھا جائیں گے۔ عیسائیت نے اس کے بالمقابل سارا زور زمین کی مملکت پر نہیں بلکہ آسمان کی بادشاہت پر دیا ہے اور اس ظاہری زندگی کے فوز وفلاح کو اپنے مقصد سے خارج قرار دیا ہے، آنحضرت ﷺ جس دعوت کو لے کر آئے وہ یہودیت وعیسائیت کی اس افراط وتفریط دونوں سے پاک ہے اس نے ایمان اور عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا کی بادشاہی بھی قرار دی اور اس دنیا کی بھی، زمین کی حکومت بھی اور آسمان کی جنت بھی، یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی اور وہاں کے باغ و بہار بھی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نیکوکار مسلمانوں کے ذکر میں فرمایا:

﴿ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴾

(۳/ آل عمران:۱٤۸)

”تو خدا نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کے ثواب کی خوبی بھی اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔“

ایمان اور عمل صالح والوں سے یہ وعدہ تھا کہ

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

(٤۸/ الفتح:۲۹)

''خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، گناہوں کی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا۔''

یہ بھی انہیں سے وعدہ ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ (۲۴/ النور: ۵۵)

''خدا نے ان سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کیے، وعدہ کیا ہے وہ ان کو ملک میں حاکم بنائے گا، جس طرح ان سے اگلوں کو حاکم بنایا تھا۔''

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے اس دنیا کی باقی زندگی زیادہ پائدار ہے، اسی طرح اس دنیا کے ثواب سے اس دنیا کے ثواب کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے اور اسی دنیا کے حسنِ عمل کی کوشش سے اس دنیا کی بہتری بھی ملتی ہے، فرمایا:

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۭ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ۭ وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ﴾

(۱۶/ النحل: ۳۰)

''جنہوں نے نیک کام کیے، اس دنیا میں ان کے لیے بھلائی ہے اور بے شبہ آخرت کا گھر بہتر ہے اور پرہیزگاروں کا گھر کیا اچھا ہے۔''

اسی طرح بدکاروں کی جزا جہاں اس دنیا کی دوزخ اور آگ کے عذاب کو فرمایا، اسی طرح اس دنیا کی ذلت و خواری اور رسوائی کو بھی، فرمایا:

﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ﴾ (۲۲/ الحج: ۱۱)

''اس نے دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا۔''

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (۲/ البقرة: ۱۱۴)

''ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑی مار ہے۔''

﴿حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (۲/ البقرة: ۲۱۷)

''ان کے کام دنیا اور آخرت میں برباد ہوئے۔''

اور ان کے متعلق یہ بھی فرمایا:

﴿فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ﴾ (۳/ آل عمران: ۵۶)

''تو میں ان کو دنیا اور آخرت میں سخت سزا دوں گا۔''

تنگی اور بدحالی کی سزا بھی یہیں ملتی ہے:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ ﴾

(۲۰/ طٰهٰ: ۱۲۴)

''اور جس نے میری نصیحت سے منہ پھیرا تو اس کے لیے تنگ گزران ہے اور قیامت میں اس کو اندھا اٹھاؤں گا کہ دنیا میں وہ دل کا اندھا بنا تھا۔''

انتہا یہ ہے خود صحابہ کو جنگِ احد میں جو فتح نہیں ملی، اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی ان کی بعض فروگزاشتوں کا ثمرہ بتایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۵۵)

''تم میں سے بعض لوگ اس دن جب دونوں فوجیں بھڑیں جو پیچھے ہٹے ان کے بعض کاموں کی وجہ سے شیطان نے ان کو پھسلا دیا۔''

ایک اور مقام پر عام طور سے فرمایا گیا:

﴿ وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝ ﴾

(۴۲/ الشورٰی: ۳۰)

''جو مصیبت تم کو پہنچی وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوتوں کے باعث اور وہ بہت سی باتوں سے درگزر کرتا ہے۔''

یہود کے ذکر میں قرآن نے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا ہے، عذاب کے موقع پر فرمایا:

﴿ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۱۲)

''ان پر ذلت ماری گئی، جہاں پائے گئے، لیکن (جہاں عزت حاصل ہے،) وہ خدا کے ذریعہ اور لوگوں کے سہارے اور اللہ کا غصہ کما لائے اور ان پر (قومی) محتاجی ماری گئی، یہ اس لیے کہ وہ خدا کے حکموں کا انکار کرتے تھے اور پیغمبروں کو مار ڈالتے تھے، یہ اس لیے کہ وہ نافرمان ہیں اور حدودِ الٰہی سے آگے بڑھتے ہیں۔''

اس کے بالمقابل عام اہل کتاب سے کہا گیا:

﴿ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۶۶)

''اور اگر یہ تورات اور انجیل کو اور جو ان کی طرف ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) اتارا گیا اس کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر (برکاتِ آسمانی) سے کھاتے اور اپنے پاؤں کے نیچے

(ارضی خیر و برکت) سے کھاتے۔"

ایک اور موقع پر ارشاد ہے:

﴿ وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰۤى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝ ﴾ (۷/ الاعراف:۹۶)

"اور ان آبادیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور پرہیز گاری کے کام کرتے تو ہم ان پر آسمان سے اور زمین سے برکتوں کو کھولتے لیکن انہوں نے خدا کے احکام کو جھٹلایا تو ہم نے ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔"

مگر یہ دار الجزاء فانی ہے

لیکن یہاں ایک لغزش گاہ بھی ہے، جس سے اہل ہوش کو باخبر رہنا چاہیے، اس دنیا میں گوانسان کو اعمال کی جزا و سزا کسی نہ کسی رنگ میں ضرور ملتی ہے، مگر اس نکتہ کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ کیا شخصی زندگی اور کیا جماعتی حیات کے لحاظ سے یہ دار الجزاء جس کا نام دنیا ہے عارضی اور فانی ہے، یہاں کا غم بھی فانی اور یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے اس لیے صرف اسی دنیا کی کامیابی کو اپنی زندگی کا اصل مطلوب ومقصود اور غایت ومنتہا نہیں بنانا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے بھی زیادہ ایک اور وسیع آسمانی مملکت اور لازوال ربانی سلطنت ہے جو فنا وزوال کے ہر عیب اور ہر نقص سے پاک ہے اور جہاں کی نعمتیں اس دنیا کی نعمتوں سے کہیں زیادہ بہتر اور غیر فانی ہیں، اس لیے اس فانی دنیا کی لذتوں میں پڑ کر اس کو نہ بھول جانا چاہیے، اس مسافر کی عقلِ سلیم کی داد کون دے گا جو راستہ کی عارضی خوش منظریوں اور سفر کی فانی دلچسپیوں میں پڑ کر اپنے خوش سواد اور سدابہار وطن کو فراموش کر بیٹھے:

﴿ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى۝ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱۶، ۱۷)

"بلکہ تم دنیاوی زندگی کو بڑھ کر چاہتے ہو حالانکہ آخرت کی زندگی اس سے بہتر اور اس سے زیادہ پائدار ہے۔"

﴿ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ﴾ (۱۲/ یوسف:۵۷)

"اور بے شک آخرت کی مزدوری (یہاں کی مزدوری سے) بہتر ہے۔"

اور اسی طرح گناہگاروں کے لیے یہاں کی ذلت ورسوائی سے بڑھ کر ایک اور ذلت ورسوائی کا مقام ہے:

﴿ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۝ ﴾

(۳۹/ الزمر:۲۶)

"تو خدا نے ان کو اس دنیاوی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھایا اور شبہ نہیں کہ آخرت کا عذاب

اس سے بھی بڑا ہے اگر وہ جانتے۔‘‘

اس دنیا کی ذلت ورسوائی تو شاید سہہ لی جائے مگر وہاں کے عذاب کی سختی کو کون سہہ سکتا ہے کہ

﴿ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۷)

’’آخرت کا عذاب البتہ زیادہ سخت اور زیادہ دیر رہنے والا ہے۔‘‘

اس لیے اس فانی دنیا میں انسان کو اپنے حسن عمل کی بدولت جو زور وقوت، جاہ وجلال، نعمت و مال اور حکومت وسروری ملے ان کو بھی آخرت کی لازوال نعمتوں اور وہاں کی غیر فانی بادشاہی کے حصول میں صرف کرنا چاہیے کہ اس سے خود ان دنیاوی نعمتوں کو بھی بقا اور پائداری حاصل ہوگی، اسی فلسفہ کو محمد رسول اللہ ﷺ کی وحی حقیقت طراز نے قارون کی نصیحت کے ضمن میں ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

﴿ وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ ۭ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۷)

’’اور خدا نے جو تجھ کو دیا ہے اس سے آخرت کا گھر تلاش کر اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھول اور جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی (خدا کے بندوں پر) احسان کر اور اس دولت سے زمین میں خرابی نہ چاہ۔‘‘

چنانچہ ناخلف یہود پر تباہی اسی لیے آئی کہ وہ دنیاوی زندگی کی دولت و جائداد کی محبت میں ایسے پھنسے کہ ان کو اپنے کاروبار میں آخرت کے سودا کا خیال بھول کر بھی نہ آیا:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۶۹)

’’تو ان کے بعد کچھ ناخلف کتاب کے وارث ہوئے، جو اس دنیا کے سامان واسباب کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہوگا اور اگر ویسا ہی سامان واسباب پھر آئے تو پھر لیں کیا ان سے کتاب کے حق میں یہ عہد نہیں لیا گیا، کہ وہ خدا پر حق کے سوا کچھ اور نہ بولیں، حالانکہ جو اس میں ہے وہ اس کو پڑھ چکے ہیں اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیے بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں۔‘‘

یہ دارالجزاء اور دارالاصلاح بھی ہے

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت وشفقت سے انسان کو پیدا کیا اور اسے ہمیشہ کی زندگی کا مقام بھی دکھایا اور بتایا کہ اس مقام کا دائمی وابدی استحقاق خود تمہارے عمل سے تم کو ہو سکتا ہے اور یہ دنیاوی زندگی اسی لیے اس کو دی

گئی کہ وہ اس زمانہ میں اس سدابہار سرزمین کی ملکیت کو اپنے عمل کی قیمت سے خرید سکے مگر چونکہ انسان دوسری مصلحتوں کے لحاظ سے طبعاً کمزور، زودفراموش اور بھولنے والا بھی پیدا ہوا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی اسی مستعار زندگی میں بار بار اپنے سنبھلنے، سدھرنے اور کامیاب بننے کے موقع عنایت کیے اور رسولوں کی بعثت، معلموں کی آمد، شریعت کی تعلیم، پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ اور گناہوں پر جسمانی سزا و تعزیر اور عمل خیر پر روحانی لذت اور عمل شر پر روحانی غبار و کدورت کے لوازم اسی لیے مقرر ہوئے کہ اس کو ہر قدم پر اپنے اعمال پر تنبیہ اور اپنی غلط روی کا احساس ہو اور ان سب کے علاوہ اس نے اپنی غایت رحمت سے انسانوں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے حسب ذیل مراتب مقرر کیے۔

① نیکی سے برائی کا کفارہ: چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے، اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا، اس لیے جس طرح اس دنیا میں اس نے انسانوں کے دلوں میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی ایک نیک کام امتیاز بردست ہو جاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد دھل جاتی ہے اسی کا نام کفارۂ عمل ہے، چنانچہ وحی محمدی ﷺ نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں تلقین کی کہ

﴿ إِنَّ الْحَسَنَٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ ﴾ (۱۱/ ھود:۱۱۴)

''بے شبہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔''

اس آیت کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوش خبری اس میں پوشیدہ ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی ان شاء اللہ مٹا دیں گی، اس معنی کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں:

﴿ إِن تَجْتَنِبُوا۟ كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا ۝ ﴾

(۴/ النسآء:۳۱)

''تم کو جن باتوں سے منع کیا گیا ہے، اگر ان میں کی بری باتوں سے تم بچتے رہو گے تو ہم تمہاری تقصیریں تم سے اتار دیں گے اور تم کو عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔''

﴿ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلَوٰةَ وَءَاتَيْتُمُ الزَّكَوٰةَ وَءَامَنتُم بِرُسُلِى وَعَزَّرْتُمُوهُمْ وَأَقْرَضْتُمُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّأُكَفِّرَنَّ عَنكُمْ سَيِّـَٔاتِكُمْ وَلَأُدْخِلَنَّكُمْ جَنَّٰتٍ تَجْرِى مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَٰرُ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۱۲)

''البتہ اگر تم نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ اور ان کی مدد کرو گے اور اللہ کو اچھی طرح قرض دو گے، تو میں تمہارے گناہوں کو اتار دوں گا اور تم کو ان جنتوں میں

داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔‘‘

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ﴾

(٤٦/ الاحقاف: ١٦)

’’یہ وہ ہیں جن کے اچھے عمل کو (اور) جنتیوں کے (شمول) میں ہم قبول اور ان کی برائیوں سے درگزر کریں گے اور یہی ہیں رہنے والے جنت کے۔‘‘

② توبہ کفارہ ہے: انسان کے تمام کاروبار میں اصل شے اس کا دل ہے، اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے، انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم وشرمسار ہوکر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہوکر آیندہ کے لیے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرلے تو اس کا نام توبہ ہے، یہ توبہ گناہگار سے گناہگار انسان کو بھی خدا کے آغوشِ محبت میں لاکر ڈال دیتی ہے، آدم علیہ السلام کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمت الٰہی کے رجوع کے واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوشِ رحمت کس طرح گناہگار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے، رحمت الٰہی کے اس پرجوش نظارہ کی جو کیفیت محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ وحی اور پیام نبوت میں نظر آتی ہے اس سے ہندوستان کا ہرمت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم اور انجیل کی خوش خبری مبہم ہے، لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے پیام ربانی میں اس کی کیفیات اور اصول وشرائط کو جس شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا ربُ العالمین کی طرف سے رحمۃ العالمین کا خاص حصہ تھا، فرمایا:

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْــــًٔا ﴾

(١٩/ مریم: ٦٠)

’’مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے، تو وہ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر کچھ ظلم نہ کیا جائے گا۔‘‘

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر دھوکر ان کی جگہ آپ لے لے گی:

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴾ (٢٥/ الفرقان: ٧٠)

’’مگر جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھے کام کیے تو یہ وہ ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔‘‘

اور یہی اس کی شانِ رحمت کا اقتضا ہے یہاں تک کہ چور اور ڈاکو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کریں تو ان

کو بھی بشارت ہے:

﴿ فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۹، ۴۰)

’’تو جس نے اپنے پر ظلم کرنے کے بعد توبہ کی اور اپنے کو سدھارا، تو بے شک اللہ اس پر رجوع ہوگا کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے، کیا تجھے نہیں معلوم کہ آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے جس کو چاہے سزا دے اور جس کو چاہے معاف کرے، اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ قطعی اصول ظاہر فرمادیا کہ

﴿ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۸۲)

’’اور بے شک میں اس کو بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے اور پھر راہ پر چلا۔‘‘

لیکن یہ توبہ کس لیے ہے اور کس شرط کے ساتھ ہے:

﴿ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّيْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ؕ ﴾

(۴/ النسآء:۱۷، ۱۸)

’’اللہ کو ان کی توبہ قبول ضرور کرنی ہے جو نادانی سے برا کام کرتے ہیں، پھر جلد توبہ کرتے ہیں، تو یہی وہ ہیں جن کو اللہ معاف کرتا ہے اور اللہ سب جانتا ہے اور حکمت والا ہے اور ان کی توبہ نہیں ہے جو برے کام کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کو موت آئی تو اس نے کہا کہ اب میں نے توبہ کی اور نہ ان کی توبہ ہے جو کافر ہو کر مریں۔‘‘

مقصود یہ ہے کہ توبہ کے بعد اس بندہ کے دل میں آیندہ تلافی اور تدارک کا احساس بھی موجود ہو اور ظاہر ہے کہ موت کے وقت یہ احساس ممکن ہی نہیں، ہاں اگر وہ توبہ اپنے احساس کے اثر سے کرے اور اس کے بعد اتفاقاً موت آجائے تو یقیناً رحمت الٰہی اس کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے گی:

﴿ وَالَّذِيْنَ عَمِلُوا السَّيِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِهَا وَاٰمَنُوْٓا اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۵۳)

’’اور جنہوں نے برے کام کیے، پھر اس کے بعد باز آئے (توبہ کی) اور یقین کیا، تو بے شک

تیرا پروردگار اس کے بعد اس کو بخشنے والا اور اس پر رحم کرنے والا ہے۔"

﴿ وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء: ١١٠)

"اور جو کوئی برا کام کرے یا اپنے آپ پر ظلم کرے پھر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی چاہے، تو وہ اللہ کو بخشش والا رحم کرنے والا پائے گا۔"

③ **مصائب کی تنبیہ اور کفارہ:** دنیا میں مصائب سے زیادہ بری اور تکلیف دہ چیز انسان کو کوئی دوسری نہیں معلوم ہوتی، لیکن یہ حقیقت بھلانے کے لائق نہیں کہ افراد بلکہ جماعتیں اور قومیں بھی مصائب ہی کی تنبیہ اور سرزنش سے متنبہ اور ہشیار ہو کر آمادۂ اصلاح ہوتی ہیں، چنانچہ اکثر اخلاقی محاسن کے جوہر کو مصیبتوں ہی کی آگ نکھار کر کندن بناتی ہے صبر، استقلال، تواضع، شکر، محبت اور رحم ان تمام اخلاقی فضائل کی تربیت انہیں مصائب کے زیر سایہ ہوتی ہے، مغرور سے مغرور انسان بھی جب کسی اتفاقی مصیبت کی ٹھوکر کھاتا ہے تو سنبھل جاتا ہے، اس لیے غافل انسانوں اور خود فراموش سرمستوں کو ہوش میں لانے کے لیے کبھی کبھی کی مصیبتوں سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں کہ ان کی بدولت ملحد سے ملحد انسان بھی ایک دفعہ بے قرار ہو کر خدا کا نام لے ہی لیتا ہے۔

دولت و نعمت کامیابی و مسرت وہ شراب ہے جس کے نشہ کا اتار اتفاقی مصائب ہی کی ترشی سے ہو سکتا ہے، انسان خدا کو کتنا ہی بھولا ہو اور اپنی دولت و ثروت پر کتنا ہی نازاں ہو لیکن جب وہ کسی افتاد سے دوچار ہوتا ہے تو دفعتہً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں، بیماری، تنگ دستی، عزیزوں کی موت، آرزوؤں کی ناکامی، ان میں سے ہر چیز وہ ٹھوکر ہے جس کو کھا کر سرمست سے سرمست راہ گیر بھی ایک دفعہ چونک کر ہشیار ہو جاتا ہے اور اس کو اپنے راستہ کی غلطی معلوم ہو جاتی ہے، اس لیے ان مصائب میں انسانوں کے اعمال بد اور گناہوں کا کفارہ بننے کی صلاحیت پوری طرح موجود ہے کہ اس تھوڑی سی تکلیف سے بندہ میں جو روحانی احساس پیدا ہوتا ہے وہ بڑی بیش قیمت چیز ہے۔

قرآن پاک نے اس نکتہ کو جابجا بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہگاروں کو، اس سے پہلے کہ ان کو ہلاک کرے، مصائب کی آزمائشوں میں ڈالتا ہے، تاکہ شاید وہ اپنے بھولے ہوئے مالک کو یاد کریں اور اپنی غلط روی پر متنبہ ہو کر اپنی ہدایت و صلاح کی فکر کریں، فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ۝ ﴾

(٧/ الاعراف: ١٣٠)

"اور بے شک ہم نے فرعون والوں کو قحطوں اور پھلوں کی کمی کی مصیبت میں گرفتار کیا، تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔"

بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

﴿ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۶۸)

''اور ہم نے ان کو نعمتوں اور مصیبتوں کے ساتھ آزمایا، تاکہ وہ شاید باز آئیں۔''

اسی سورۂ میں ایک اور جگہ اس اصول کو ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے:

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴾

(۷/ الاعراف:۹٤)

''اور ہم نے کسی آبادی میں کوئی نبی نہیں بھیجا، لیکن وہاں کے رہنے والوں کو سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار کیا، تاکہ شاید وہ گڑگڑائیں۔''

مسلمانوں سے فرمایا گیا:

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ؕ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۫ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۵۵۔۱۵۷)

''اور البتہ ہم تم کو تھوڑے خوف، بھوک اور دولت کی اور جانوں کی اور پھلوں کی کمی سے آزمائیں گے اور ان صابروں کو خوش خبری سنا کہ جن کو جب کوئی مصیبت ستاتی ہے تو کہتے ہیں ہم خدا کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، یہ وہ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی برکتیں اور رحمتیں ہوں گی اور یہی سیدھی راہ پائے ہوئے ہیں۔''

اسی اصول کے تحت میں احادیث صحیحہ میں آنحضرت ﷺ نے اس کے متعدد جزئیات بیان فرمائے ہیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب یہ آیت اتری ﴿ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ﴾ (٤/ النسآء:۱۲۳) ''جو کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ اس کو دیا جائے گا۔'' تو میں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا مطلب پوچھا فرمایا کہ ''یہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے عتاب ہے اس کا بدلہ دنیا میں بندہ کی ہر تکلیف سے پورا ہو جاتا ہے، جیسے اس کو بخار آجائے یا وہ کسی مصیبت سے دوچار ہو جائے یہاں تک کہ جیب میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائے اور اس سے جو تکلیف اس کو پہنچے وہ تکلیف بھی کفارہ بن جاتی ہے یہاں تک کہ بندہ گناہوں سے اس طرح صاف ستھرا ہو کر نکلتا ہے جیسے بھٹی سے سونا۔'' [1] دوسری حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''مسلمان کو کوئی مصیبت پیش نہیں آتی لیکن یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اگر اس کے

[1] یہ اور اس کی ہم معنی حدیثیں اکثر کتب حدیث میں ہیں مثلاً: ترمذی، ابواب التفسیر ومن سورۃ النساء:۳۰۳۸؛ سنن ابی داود، کتاب الجنائز، باب عیادۃ النساء:۳۰۹۳؛ ابن کثیر، ۲/ ۳۸۲۔

کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی کفارہ بن جاتا ہے۔'' ❶ تیسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسلمان کو کوئی تکلیف یا بیماری یا غم یا اذیت نہیں پہنچتی لیکن یہ کہ وہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ اگر اس کے کوئی کانٹا چبھ جائے تو وہ بھی۔'' ❷ چوتھی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کسی مسلمان کو کوئی تکلیف کانٹا چبھنے سے لے کر اوپر تک جتنی بھی پہنچے اللہ تعالیٰ اس سے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جیسے درخت کے پتے جھڑ جاتے ہیں۔'' ❸ پانچویں روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''دنیا میں جو مسلمان کسی جرم کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو یہیں مل گئی تو وہ اس کے لیے کفارہ اور اس کو اس گناہ سے پاک وصاف بنانے والی ہے۔'' ❹

سطور بالا سے ہویدا ہے کہ کوئی انسان جو اقرار توحید کے بعد گناہ سے ملوث ہو گیا ہو دنیا میں توبہ، اعمال نیک اور مصائب پر صبر وشکر کے ذریعہ سے نجات پا سکتا ہے اور اس دنیا سے اسی طرح پاک وصاف ہو کر نکل سکتا ہے کہ موت کے بعد اس کو کسی نئے کفارہ گناہ کی ضرورت پیش نہ آئے۔

اسی لیے قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۝ ﴾

(۳۲/ السجدة:۲۱)

''اور ہم البتہ ان کو بڑے عذاب کے پہلے ادنیٰ عذاب کا کچھ مزہ چکھاتے ہیں، تاکہ وہ اب بھی باز آئیں۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ عذاب الٰہی کا مقصد انتقام اور نفسِ سزا اور عقوبت نہیں بلکہ شریر نفس کو راہ راست پر لانا ہے، اسی لیے ایک اور آیت میں فرمایا:

﴿ مَّا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٤٧)

''اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ کہ خدا (نیکیوں) کا قبول کرنے والا اور (تمہارے ہر عمل کو) جاننے والا ہے۔''

الغرض یہ عذاب اس دنیا میں آئندہ گناہوں سے بچانے اور گزشتہ گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوتا ہے اور عالم برزخ اور عالم بعث میں چونکہ نئے عمل کے محل نہیں اس لیے ان دونوں مقاموں میں آئندہ کا کوئی سوال

❶ صحيح بخاري، كتاب المرضى، باب ماجاء في كفارة المرض: ٥٦٤٠۔

❷ صحيح بخاري، كتاب المرضى، باب ماجاء في كفارة المرض: ٥٦٤١، ٥٦٤٢۔

❸ صحيح بخاري، كتاب المرضى، باب شده المرض: ٥٦٤٧۔

❹ صحيح بخاري، كتاب التوحيد، باب في المشية والارادة: ٧٤٦٨۔

نہیں پیدا ہو سکتا صرف گزشتہ بداعمالیوں کی سزا بھگت کر ان کے نتائج سے نجات مل سکتی ہے اور یہی عالمِ برزخ اور عالمِ بعث کے عذابوں کا مقصد ہے الّا یہ کہ پروردگار عالم خود اپنی رحمت سے نوازے اور معاف فرمائے۔

عذابِ برزخ بھی کفارہ ہے

لیکن اگر کسی انسان کے اندر گناہوں کی ناپاکیاں اتنی زیادہ ہیں کہ اس کی دنیاوی زندگی کے تمام کفارے بھی اس کو دھو کر پاک وصاف نہ بنا سکے تو اس کو اپنے مرنے کے بعد بھی عالمِ برزخ میں اپنے اعمالِ بد کی مناسب سزاؤں کی صورتوں میں تکلیفیں اٹھا کر پاک وصاف بننا پڑے گا، یہی عالمِ برزخ کا عذاب ہے اس سے ظاہر ہوگا کہ عالم برزخ کی یہ سزائیں اس لیے ہیں کہ ہم نے دنیا میں اپنی ناپاک خواہشوں اور ناپاک کاموں سے احتراز کرنے کی جو زحمت نہیں اٹھائی اور اچھے کاموں کے کرنے میں جو تھوڑی تکلیف پیش آتی ہے اس کو برداشت کر کے اچھے کام جو نہیں کیے ان دونوں کے معاوضہ میں عالم برزخ میں آ کر عذاب کی تکلیفیں اٹھائیں، تاکہ حیاتِ ثانی کے دروازہ پر پہنچ کر بھی اگر ہم ان سزاؤں کے ذریعہ پاک وصاف ہو سکیں تو پاک وصاف ہو کر اپنی موروثی بہشت کے قابل بن سکیں جو صرف پاکوں اور بے گناہوں کی جگہ ہے، یعنی ان کی جگہ ہے جو سرے سے کسی گناہ کے مرتکب نہ ہوئے ہوں یا یہ کہ گناہ کے مرتکب ہوئے مگر اعمال نیک، توبہ اور مصائب میں صبر وشکر کر کے یا برزخ میں سزا پا کر وہ گناہوں کے داغ سے نجات پا سکے۔

یہ بات کہ عذابِ برزخ بھی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہے، قرآن پاک کی متعدد آیتوں سے نکلتی ہے اور یہ اسلام کے اس اصول سے مترشح ہے کہ ایک مسلمان کی ہر تکلیف اس کے کسی نہ کسی گناہ کا کفارہ ہے، اس بنا پر عذاب برزخ بھی اس کے گناہ کا کفارہ ہوگا، قرآن پاک کی اس آیت سے بھی یہ بات کنایۃً نکلتی ہے۔ گناہگار حشر کے دن کہیں گے:

﴿ وَبَلَغْنَآ اَجَلَنَا الَّذِيْٓ اَجَّلْتَ لَنَا ۭ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٩)

''اور ہم مقررہ وقت جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا پہنچ چکے۔''

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حشر سے پہلے عذاب کے ایک دورے کو ختم کر چکے۔

بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح ملتی ہے۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے:

عن ابن عمر ((ان طول مقام امتی فی قبورھم تمحیص لذنوبھم)) [1]

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرنا ہے۔''

ایک اور حدیث میں ہے:

((الضمة فی قبر کفارة لکل مومن لکل ذنب بقی علیه ولم یغفرله)) [2]

---

[1] کنز العمال، باب عذاب القبر، ج ٨، ص: ٩٦۔ [2] ایضًا۔

''یعنی قبر کی تنگی مومن کے گناہ کا کفارہ ہے۔''

اسی لیے ایک اور حدیث میں آیا ہے:

((اکثر عذاب امتی فی قبورھم)) [1]

''میری امت (کے لوگوں) کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہوگا۔''

اس حدیث کا (اگر وہ ثابت ہوتو) منشا یہ ہے کہ امت محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانہ عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو پیش نہ آئے گی، حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ایک موقع پر لکھتے ہیں:

فان وفت بالخلاص منها فی هذه الدار والا ففی البرزخ فان وفی بالخلاص والا ففی موقف القيامة واهوالها ما يخلصهم من تلك البقية. [2]

''اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لیے پورا ہو گیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے اس کا علاج کیا جائے گا تو اگر یہ نجات کے لیے کافی ہو گیا تو خیر ورنہ پھر قیامت کا مقام اور اس کی ہولناکیاں باقی بیماریوں سے نجات دلوائیں گی۔''

رؤیائے برزخ کی حدیث میں جو پہلے مفصل گزر چکی ہے، وہ منظر بھی دکھایا گیا ہے جس میں گناہگار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پا کر بہشت کے مستحق قرار پائے ہیں غالباً انہی نجات پانے والے مومنوں کو دیکھ کر مشرکین بھی قیامت میں یہ کہیں گے:

﴿ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَٰمَعْشَرَ ٱلْجِنِّ قَدِ ٱسْتَكْثَرْتُم مِّنَ ٱلْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَآؤُهُم مِّنَ ٱلْإِنسِ رَبَّنَا ٱسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَآ أَجَلَنَا ٱلَّذِىٓ أَجَّلْتَ لَنَا ۚ ﴾

(٦/ الانعام:١٢٩)

''اور جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا، اے گروہ جن، تم نے بہت سے انسانوں کو اپنا بنا لیا اور ان کے دوست انسان کہیں گے کہ ہمارے پروردگار ہم میں سے ایک نے دوسرے سے کام نکالا اور ہم مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے ٹھہرایا تھا پہنچ چکے۔''

یہ الفاظ کہ ''ہم اپنے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا پہنچ چکے'' یہ معنی رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے اور اب حشر ونشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا ملے۔ جواب ملے گا:

---

[1] اس حدیث کو شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ، باب الوقائع الحشریہ، ج ۱، ص: ۲۹ میں نقل کیا ہے، لیکن ہمیں اس کا اصل ماخذ معلوم نہ ہوسکا۔

[2] شفاء العليل لابن القيم مطبعه حسينيه مصر، ص: ٢٢٤۔

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(٦/ الانعام:١٢٩)

''فرمائے گا آتشِ دوزخ تمہارا ٹھکانا ہوا، اس میں سدا رہو گے، لیکن یہ کہ جو اللہ چاہے، بے شک تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے۔''

اس جواب کا مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہارا دورۂ عذاب ختم نہیں ہوا ہے اور تمہاری پاکیزگی ابھی تمام نہیں ہوئی اس لیے ابھی اس دوسرے عالم کا عذاب بھی تم کو سہنا ہے پھر جب خدا چاہے گا تم کو اس سے نجات دے گا اس کا ہر کام علم و حکمت پر مبنی ہے اس کے علم و حکمت اور مشیت کا جب تقاضا ہوگا تم کو نجات ملے گی۔ [1]

عذاب دوزخ کفارۂ گناہ ہے

ابھی یہ آیت اوپر گزر چکی ہے کہ

﴿ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۝ ﴾

(٤/ النسآء:١٤٧)

''خدا کو تمہارے عذاب سے کیا کام اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تمہاری شکر گزاری کو قبول کرنے والا (اور تمہارے دلوں کے حال کو) جاننے والا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ گناہگار کو جو عذاب ملے گا اس میں اللہ کو کوئی خوشی نہیں حاصل ہوتی نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے گناہگار بندے اس عذاب میں مبتلا ہوں، لیکن ازل سے اس نے اپنے جو قانون مقرر کر دیے ہیں وہ ان کو توڑتا بھی نہیں۔ جس وقت آدم علیہ السلام کو جنت کی سرزمین سے نکال کر اس دنیا میں اس لیے بھیجا گیا کہ وہ اپنے عمل کے استحقاق سے اس جنت کو دوبارہ ہمیشہ کے لیے حاصل کریں، اسی وقت یہ قانون بھی ان کو سنا دیا گیا تھا:

﴿ اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾

(٢/ البقرة:٣٨، ٣٩)

''یہاں سے تم سب اُترو، تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت اترے، تو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جنہوں نے ناشکری کی اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو وہی دوزخ والے ہوں گے۔''

اس آیت میں مستحق دوزخ ہونے کی دو وجہیں بیان کی گئی ہیں ایک کفران اور دوسری تکذیب۔ دیکھو کہ اوپر کی نساء والی آیت میں عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی دو شرطیں شکر اور ایمان ان کے بالمقابل ہیں

[1] حسب تفسیر ابن عباس؛ ابن جریر طبری، ج ۸، ص: ٢٤ مصر۔

اس سے ظاہر ہوا کہ شکر اور ایمان استحقاقِ جنت کی شرطیں اور کفران اور تکذیب استحقاقِ دوزخ کے اسباب ہیں، بقیہ تمام نیکیاں شکر اور ایمان کے فروغ اور تمام برائیاں کفران اور تکذیب کی شاخیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے نہیں بنایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے دوزخ کا ایندھن بنائے بلکہ اس نے تو ان کو اپنی رحمت کے ظہور کے لیے پیدا کیا غیظ وغضب کے اظہار کے لیے نہیں۔ فرمایا:

﴿ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ لِّيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنَافِقِينَ وَالْمُنَافِقَاتِ وَالْمُشْرِكِينَ وَالْمُشْرِكَاتِ وَيَتُوبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۷۲، ۷۳)

”ہم نے یہ امانت آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو ان سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا کہ وہ ظالم اور نادان تھا، تا کہ اللہ نفاق کرنے والوں اور نفاق کرنے والیوں اور شرک کرنے والوں اور شرک کرنے والیوں کو سزا دے اور ایمان والوں اور ایمان والیوں پر وہ اپنی رحمت کے ساتھ رجوع ہو اور اللہ تو بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔“

اس آیت پاک سے ہویدا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت یہی ہے کہ وہ غفور و رحیم ہے یعنی بخشش و رحمت اس کی صفتِ ذاتی ہے، اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لیے وہ اپنے کو رحمتِ الٰہی سے دور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے:

﴿ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۷۰)

”اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا، لیکن وہ اپنی جانوں پر آپ ظلم کرتے ہیں۔“

﴿ وَمَا اللّٰهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۳۱)

”اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنا نہیں چاہتا۔“

غرض جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے:

﴿ لِتُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعَىٰ ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۵)

”کہ ہر جان کو اپنے ہی کیے کا بدلہ دیا جائے گا۔“

اس لیے بہشت ہو یا دوزخ جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے، جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے، مثلاً: کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا نتیجہ سیرابی، بھوک کا نتیجہ تکلیف، بیماری کا نتیجہ بے آرامی، گرنے کا نتیجہ چوٹ، زہر کا نتیجہ موت، شہد کا نتیجہ مٹھاس، غرض ہر اچھے یا برے فعل کا ایک لازمی

جسمانی نتیجہ ہے، جو دنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے، اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک اور روحانی نتیجہ بھی لازمی ملنے والا ہے، جو ہم کو اس دوسرے عالم میں ملے گا، تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں یکساں ہمارے اعمال کے لازمی نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا تھا ہم کو اس نے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا، پھر نبی اور رسول بھیجے، شریعت دی، کتاب مرحمت فرمائی اس پر بھی اگر ہم باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کیا تو اب ہم کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے:

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ ﴾

(٤/ النسآء:١٦٥)

''یہ رسول بھیجے، نیکوں کو خوش خبری سنانے والے اور بدکاروں کو ہشیار کرنے والے، تاکہ خدا پر انسان کی حجت باقی نہ رہے۔''

پھر اپنی رحمت سے سب سے آخر میں اپنی رحمت کے کامل مظہر کو دنیا میں بھیجا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (٢١/ الانبیآء:١٠٧)

''ہم نے تجھ کو (اے پیغمبر) ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔''

لیکن ظالم و نادان انسانوں نے اس رحمت کے قبول کرنے سے انکار کیا اور طرح طرح کی بداعتقادیوں اور بداعمالیوں سے اپنے کو برباد کیا اور جس غرض سے خدا نے ان کو پیدا کیا تھا اس سے اعراض کیا اور اپنے کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے ہلاکت و بربادی میں مبتلا کیا:

﴿ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ۝ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ۭ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۭ ﴾

(١١/ هود:١١٧-١١٩)

''اور نہ تھا تیرا رب جو آبادیوں کو ظلم سے ہلاک و برباد کرتا اور درآنحالیکہ ان کے رہنے والے نیکوکار ہوتے اور اگر تیرا رب چاہتا تو سب لوگوں کو (زبردستی) ایک راہ پر کر دیتا (لیکن وہ ایسی زبردستی نہیں کرتا) اور وہ یوں ہی ہمیشہ اختلافات میں رہتے ہیں، مگر جن پر تیرے رب کا رحم ہو اور اسی واسطے ان کو پیدا کیا تھا۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رحمت کی خاطر بنایا ہے عذاب کے لیے نہیں، لیکن وہ

خود انسان ہے جو اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا اپنے کو سزاوار ٹھہرالیتا ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

لِلرَّحْمَةِ خَلَقَهُمْ وَلَمْ يَخْلُقْهُمْ لِلْعَذَابِ. 1

''خدا نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا، عذاب کے لیے نہیں۔''

لیکن اگر ظالم ونادان انسان نے خدا کی ان پے درپے رحمتوں کے باوجود اپنے کو اس کی رحمت کا مستحق نہ بنایا تو کیا وہ خدائے رحمٰن ورحیم جس کا یہ اعلان ہے:

﴿ كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٢)

''اس (خدا) نے (مخلوقات پر) رحمت کو اپنے اوپر واجب کرلیا۔''

﴿ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ ﴾ (٦/ الانعام:٥٤)

''تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے رحمت کو اپنے اوپر فرض ٹھہرالیا ہے۔''

﴿ وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۚ ﴾ (٧/ الاعراف:١٥٦)

''اور میری رحمت نے ہر چیز کو سمالیا ہے۔''

﴿ وَرَبُّكَ الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ ﴾ (١٨/ الکهف:٥٨)

''اور تیرا پروردگار بخشنے والا رحمت والا ہے۔''

((رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي)) 2

''اور میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی۔''

وہ اپنے گناہ گار وسیہ کار بندوں سے ہمیشہ کے لیے اپنا منہ موڑ لے گا، حالانکہ اس کی رحمت کسی غرض سے نہیں، بلکہ بے غرض ہے، فرمایا:

﴿ وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٣٤) ''اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔''

اور تسلی دی ہے:

﴿ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۚ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴾ (٣٩/ الزمر:٥٣)

''اے میرے وہ بندو! جنہوں نے اپنے اوپر آپ ظلم کیا ہے، خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو، خدا سب گناہوں کو معاف کرتا ہے، بے شک وہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔''

اس کی رحمت کا ظہور جس طرح اس دنیا میں ہوا ہے، اس دنیا میں بھی ہوگا اور وہاں اس کی رحمت کا سب

1 طبری، ج ١٢، ص: ٨١ مصر۔ 2 صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ: ولقد سبقت کلمتنا...: ٧٤٥٣۔

سے بڑا مظہر اس کے مقام لعنت (دوزخ) سے دوری اور اس کے مقام رحمت (بہشت) سے قرب ہے، فرمایا:

﴿ مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ وَذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِينُ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:١٦)

''جس سے خدا کا عذاب ہٹایا گیا تو وہ وہی ہے جس پر اس نے اپنی رحمت کی اور اس کی رحمت کا یہ حصول ہی کھلی کامیابی ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ان پے در پے رحمتوں کا تقاضا ہے کہ وہ گناہگاروں کو زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان کے نتائج عمل کے بھگت لینے کے بعد بالآخر اپنی رحمت کے سایہ میں لے اور ان کو اپنی بخششوں سے سرفراز فرمائے۔

دوزخ قید خانہ نہیں شفا خانہ ہے

انسان جب عدم حفظ صحت کی غلط کاریوں کے سبب سے بیمار ہو جاتا ہے تو اکثر یہی سمجھا جاتا ہے کہ فطرت نے اس کو ان کے معاوضہ میں بیماری کی تکالیف کی سزائیں دی ہیں، مگر واقعہ یہ نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان غلط کاریوں کے جو نتائج بد انسان کے جسم کے اندر پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرنے کے لیے جسم انسانی جدوجہد کرتا ہے اور اس کی اس لڑائی کا نام بیماری ہے اور اس لڑائی کی کشمکش کا نام بیماری کی تکالیف و آلام ہے، جن کو ہم دردسر، دردشکم، اعضا شکنی، بے خوابی وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہی روحانی بیماریوں کا حال ہے، جن کو ہم اصطلاح شرعی میں ''گناہ'' کہتے ہیں اور جن کے نتائج بد کو عذاب کہتے ہیں اور یہ نتائج جو آتش دوزخ اور اس کے شدائد و آلام کی صورت میں ظاہر ہوں گے اور جن کا منشا یہ ہوگا کہ روح انسانی اپنی غلط کاریوں کے نتائج بد کو دور کرنے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوگی اور جونہی وہ ان سے عہدہ برآ ہوگی خدا کی رحمت سے سرفرازی پا کر اس عذاب سے نکل کر اپنی موروثی بہشت میں داخل ہوگی۔

اس تمہید سے یہ ظاہر ہے کہ دوزخ کی مثال یہ نہیں کہ وہ مجرموں کے لیے قید خانہ ہے، بلکہ یہ ہے کہ وہ بیماروں کے لیے شفا خانہ ہے، بیمار کو شفا خانہ کے اندر بھی ہر قسم کی تکلیفیں محسوس ہوتی ہیں درد، اعضا شکنی، شدتِ تشنگی، سوزش جسم، ان کو وہاں کڑوی سے کڑوی دوا پلائی جاتی ہے، بدمزہ سے بدمزہ کھانا کھلایا جاتا ہے، ضرورت ہوتی ہے تو اس کو نشتر دیا جاتا ہے، اس کا کوئی عضو کاٹا جاتا ہے، کوئی داغا جاتا ہے اور ان سب کی تکلیفیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں مگر یہ ساری ایذا رسانی کسی انتقام اور تکلیف دہی کی غرض سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے عدم صحت کی غلط کاریوں کے نتائج بد سے اس کے جسم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی جاتی ہے اور جو تکلیفیں اس کو وہاں محسوس ہوتی ہیں وہ گو شفا خانہ کے اندر ہی محسوس ہوتی ہیں مگر ان کا سبب شفا خانہ نہیں، بلکہ خود اس بیمار کا اصول صحت سے دانستہ یا نادانستہ انحراف کرنا اور اس کی وجہ سے ان بیماریوں میں مبتلا ہونا ہے۔

یہ اصول ان آیات اور ان احادیث صحیحہ سے پوری طرح سمجھ میں آتا ہے جن میں بالآخر عذابِ دوزخ سے نجات پانے کی کیفیت بیان کی گئی ہے، دنیاوی آلام و تکالیف کی نسبت قرآن نے یہ اصول پیش کیا ہے:

﴿ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۴۱)

''اور تا کہ خدا ایمان والوں کو پاک وخالص کرے اور کافروں کو مٹائے۔''

یہی اصول عذابِ اخروی پر صادق آتا ہے کہ اس سے بھی مقصود گناہگار اہل ایمان کی پاکی وصفائی ہے، چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ حقوق عباد کے بعد: ((حَتّٰى إِذَا هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا أُذِنَ لَهُمْ فِيْ دُخُوْلِ الْجَنَّةِ)) [1] ''یہاں تک کہ جب گناہگار چھٹ جائیں گے اور پاک وصاف ہو جائیں گے تب ان کو جنت میں داخل ہونے کی اجازت ملے گی۔''

اس حدیث میں یہ دولفظ ((هُذِّبُوْا وَنُقُّوْا)) ذرا تشریح طلب ہے۔ ((هُذِّبُوْا)) کا مصدر تہذیب ہے، تہذیب کے لغوی معنی یہ ہیں کہ درختوں کی خراب شاخیں اس لیے چھانٹ دی جائیں، تا کہ درخت میں سرسبزی وشادابی پیدا ہو کر ترقی کی نئی زندگی اس کو مل جائے اور ((نُقُّوْا)) کا مصدر تنقیہ ہے، تنقیہ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ کسی چیز کے اندر سے خراب وفاسد مادہ کو الگ کر دیا جائے، تا کہ وہ پوری طرح نکھر جائے، اس تشریح سے صاف کھل گیا کہ گناہگاروں کو جنت کے داخلہ کے لیے کیا درکار ہے، اسی لیے قرآن پاک میں ہے کہ اہل جنت جب جنت کے قریب پہنچیں گے تو ندا آئے گی:

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۷۳)

''تم پاک وصاف ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے آ جاؤ۔''

الغرض جب اس طیب وپاکیزگی کا دور آئے گا تو گناہگاروں کو بھی نجات ملے گی، اسی لیے ہر گناہ گار کے لیے دوزخ سے نکلنے کی مدت خواہ کتنی ہی طویل ہو مگر بہرحال اس کی انتہا ہے، فرمایا:

﴿ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا۝ ﴾ (۷۸/ النبا: ۲۳)

''دوزخ میں وہ صدہا سال تک پڑے رہیں گے۔''

لیکن بالآخر ان صدہا سال کا بھی ایک دن خاتمہ ہوگا اور خدا نے چاہا تو ان کو نجات ملے گی۔

حدیث رؤیائے برزخ میں ہے کہ ''آپ ﷺ نے دوزخ میں کچھ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے کچھ اچھے اور کچھ برے کام کیے تھے، ان کا آدھا دھڑ تو نہایت خوبصورت اور آدھا سخت بدصورت تھا، جب ان کی سزا کی مدت ختم ہوئی تو فرشتوں نے ان سے کہا کہ جاؤ اور اس نہر میں جا کر پڑ جاؤ، سامنے وہ نہر تھی جس میں خالص سفید پانی بہہ رہا تھا وہ اس میں جا کر پڑ گئے، پھر نکل آئے تو ان کی بدصورتی جاتی رہی اور نہایت خوبصورت ہو گئے۔'' [2] اس سے ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت کیونکر گناہگاروں کو سرفراز فرمائے گی۔

---

[1] صحيح بخاري، كتاب الرقاق، باب القصاص يوم القيامة: ٦٥٣٥۔

[2] صحيح بخاري، كتاب التعبير، باب تعبير الرؤيا بعد الصبح: ٧٠٤٧۔

کیا دوزخ بھی ایک نعمت ہے

اس تفصیل کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ قیامت اور دوزخ کی ہولناکیاں اور سزائیں بھی گناہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ کی اسی طرح نعمت ہیں جس طرح اس دنیا میں شفاخانوں کا وجود بیماروں کے لیے نعمت ہے، اگر دوزخ نہ ہوتی تو گناہگاروں کی پاکیزگی اور پاکوں کی جنت میں ان کے داخل ہونے کی کوئی صورت نہ تھی اس رحمٰن ورحیم کی رحمت وکرم نے گوارا نہ کیا کہ ان بدبختوں کو ان کی نافرمانیوں کے باوجود ہمیشہ کے لیے محروم رکھا جائے اس لیے ان کی صفائی کے لیے پہلے برزخ کا حمام مقرر کیا اور جو اس سے بھی پاک نہ ہو سکیں ان کے لیے دوزخ کی آگ مقرر کی کہ وہ اپنی ہر قسم کی بداعمالیوں کے میل کچیل کو جلا کر نکھر کر پاک ہو جائیں اور کندن بن کر بالآخر اپنی آبائی اور فطری وراثت (جنت) پائیں اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن پاک کی ان آیتوں کو پڑھیے جن میں قیامت اور دوزخ کی ہولناکیوں اور مصیبتوں کو بھی نعمت سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَاۤءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَاۤنٌّ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ ﴾

(۵۵/ الرحمن: ۳۵۔۴۵)

”تم پر آگ کے صاف اور دھواں ملے شعلے چھوٹیں گے، پھر کوئی تمہاری مدد نہ کر سکے گا، تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، پھر جب آسمان پھٹ کر تلچھٹ کی طرح گلابی ہو جائے گا، تو اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، پھر اس دن کسی انس وجن سے اس کے گناہ کی نسبت نہ پوچھا جائے گا، تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے، گناہگار اپنی نشانیوں سے پہچان لیے جائیں گے، پھر وہ اپنی پیشانیوں کے بال اور پاؤں سے پکڑے جائیں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے یہ وہ دوزخ ہے جس کو گناہ گار جھٹلاتے ہیں وہ اس دوزخ اور گرم پانی کے بیچ میں گشت کریں گے تو تم اپنے پروردگار کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“

ان آیتوں کی تفسیر کسی بھی پہلو سے کیجئے یہ بات بہر حال ماننی پڑے گی کہ قیامت اور دوزخ کے ہولناک احوال مجرموں کے حق میں نعمت ہیں اس لیے بھی کہ دنیا میں وہ ان کے ڈر سے برائیوں کو چھوڑ کر راہ راست پر آتے ہیں اور اس لیے بھی کہ آخرت میں وہ انہیں کے ذریعہ سے اپنے گناہوں کے نتائج بد سے بری ہو کر بہشت ربانی کے لائق بن سکیں گے۔

دوزخ میں رحمتِ الٰہی کا ظہور اور نجات

انسان اور وہ بھی اللہ کی توحید کا اور رسول کی صداقت کا معترف خواہ کسی قدر گمراہ اور گناہگار ہو، تاہم اس کے نامۂ اعمال میں کچھ نہ کچھ نیکیاں ضرور ہوں گی، قیامت گو اللہ تعالیٰ کے عتاب وجلال کا روز ہوگا، جس میں ہر گناہگار کو اپنی گناہگاری کا ملزم ہونا پڑے گا مگر بالآخر اس رحمٰن ورحیم کی شان رحیمی کا ظہور ہوگا اور ((رحمتی سبقت غضبی)) [1] (اور میرے غصہ سے میری رحمت سبقت لے گئی ہے) کے اعلان کے مصداق شفاعت کی صورت میں جلوہ گر ہوگا اور گناہگاروں کو اس کی بدولت گناہوں کے داغ سے پاک و صاف کرکے پاکوں کو بہشت میں داخلہ کی اجازت ملے گی، فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ ﴾ (٦٤/ التغابن:٩)

''اور جو اللہ پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے اس سے اس کی برائیاں جھاڑ دے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا۔''

﴿ وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (٩/ التوبة:١٠٢)

''اور دوسرے لوگ جنہوں نے اپنے گناہوں کا اقرار کیا اور ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد، شاید اللہ ان کو معاف کرے، بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم والا ہے۔''

اس معافی کی دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ وہ بالکلیہ یعنی عذاب کے بغیر ہی معاف کردے، دوسری یہ کہ وہ دوزخ میں کچھ دن جاکر خدا کی معافی سے سرفراز ہوکر اس سے نکلیں، فرمایا:

﴿ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰي رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۚ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴾ (١٩/ مريم:٧١، ٧٢)

''اور تم میں کوئی نہیں جو جہنم میں وارد نہ ہو، تیرے رب کا یہ ضروری فیصلہ ہے، پھر ہم ان کو جو خدا سے ڈرے، نجات دیں گے اور مشرکوں اور کافروں کو ہم اس میں گھٹنے کے بل گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔''

احادیثِ صحیحہ میں اس کے متعلق آنحضرت ﷺ کی حسب ذیل تصریحات مذکور ہیں:

① حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''شفاعت کے ذریعہ لوگ دوزخ سے چھوٹی ککڑیوں کے مانند نکلیں گے۔'' [2]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید: ٧٤٥٣۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٥٨۔

② حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''دوزخ سے کچھ لوگ اس کی جھلس کھا کر نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے''۔ ❶

③ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو خدا فرمائے گا جس کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ کوئلے ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہر حیات میں ڈال دیے جائیں گے، تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔'' ❷

④ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے قیامت کے حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''پھر میں سجدہ میں گر پڑوں گا تو آواز آئے گی اے محمد (ﷺ)! سر اٹھا، مانگ، دیا جائے گا تو میں سر اٹھاؤں گا اور اس حمد سے جو خدا مجھے سکھائے گا، اس کی حمد کروں گا اور سفارش کروں گا، تو خدا ایک حد مقرر فرمائے گا تو میں ان کو دوزخ سے نکالوں گا اور جنت میں داخل کروں گا، پھر لوٹ کر آؤں گا اور سجدہ میں گر پڑوں گا پھر وہ کچھ لوگوں کو بخش دے گا اسی طرح تیسری پھر چوتھی بار کروں گا، یہاں تک کہ دوزخ میں پھر وہی رہ جائے گا، جس کو قرآن نے روک رکھا ہے۔'' ❸

⑤ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''محمد ﷺ کی شفاعت سے کچھ ایسے لوگ دوزخ سے نکلیں گے اور جنت میں داخل ہوں گے جن کا نام جہنم والوں میں ہوگا۔'' ❹

⑥ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے سوال پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''میری سفارش سے سرفراز ہونے کی خوش قسمتی اس کو حاصل ہوگی جس نے خلوص قلب سے اللہ کی توحید کا اقرار کیا ہو۔'' ❺

⑦ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فیصلہ سے فراغت پائے گا اور چاہے گا کہ ان کو جنہوں نے اس کی توحید کی گواہی دی تھی دوزخ سے نکالے تو فرشتوں کو ان کے نکالنے کا حکم دے گا، فرشتے ان توحید والوں کو اس علامت سے پہچانیں گے کہ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے نشان ہوں گے کہ خدا نے آدم کے بیٹے کی پیشانی کے نشان سجدہ کو دوزخ کی آگ پر حرام کر دیا ہے، تو وہ ان کو جلا نہ سکے گی، فرشتے جب ان کو نکالیں گے تو وہ جلے جھلسے ہوں گے پھر ان پر آب حیات چھڑکا جائے گا تو وہ اس طرح اگیں گے جس طرح سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانہ اگتا ہے۔'' ❻

⑧ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت والے جنت اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ دیکھو جس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر

---

❶ صحيح بخاري، كتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٥٩۔ ❷ ايضًا: ٦٥٦٠۔

❸ ايضًا: ٦٥٦٥۔ ❹ ايضًا: ٦٥٦٦۔ ❺ ايضًا: ٦٥٧٠۔ ❻ ايضًا: باب الصراط جسر جهنم: ٦٥٧٣۔

بھی ایمان ہو اس کو دوزخ سے نکالو تو وہ جل کر کوئلہ ہو کر نکلیں گے پھر وہ نہرِ حیات میں ڈال دیے جائیں گے تو اس طرح وہ اگیں گے جس طرح سیل آب کے کنارے جنگلی دانہ اُگتا ہے۔'' ❶

⑨ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اہل دوزخ جو دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے وہ اس میں نہ مریں گے اور نہ جئیں گے، لیکن وہ لوگ جن کو دوزخ کی آگ بعض گناہوں کی وجہ سے چھوئے گی، تو وہ اس میں کچھ دیر کے لیے مر جائیں گے، یہاں تک کہ وہ جل جائیں گے، پھر ان کے حق میں شفاعت کی اجازت ہوگی تو وہ تھوڑے تھوڑے کر کے آئیں گے اور جنت کی نہروں میں پھیل جائیں گے اور اہلِ جنت سے کہا جائے گا کہ ان پر پانی بہاؤ تو وہ اس طرح اگیں گے جیسے سیلاب کے بہاؤ میں جنگلی دانے۔'' ❷

⑩ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نجات پا کر نکلے گا وہ گھسٹتا ہوا نکلے گا اور اس کو جنت بھری معلوم ہوگی۔'' ❸

⑪ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں روایت ہے کہ ''خدا فرمائے گا کہ ملائکہ نے سفارش کی اور پیغمبروں نے سفارش کی اور اہل ایمان نے سفارش کی اور اب صرف وہ رہ گیا جو تمام رحم کرنے والوں میں سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے، یعنی خود وہ رحمٰن و رحیم دوزخ سے مٹھی بھر کر ان لوگوں کو نکالے گا جنہوں نے کبھی کوئی بھلائی نہیں کی۔'' ❹

⑫ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''حکم ہوگا کہ جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا ہو اور اس کے دل میں جَو برابر بھی نیکی رہی ہو اس کو دوزخ سے باہر کرو جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا ہو اور گیہوں کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو اور جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا ہو اور جوار کے دانہ کے برابر بھی اس کے دل میں نیکی ہو، اس کو دوزخ سے الگ کرو۔'' ❺

احادیث کی کتابوں میں ان معنوں کی اور بہت سی حدیثیں ہیں، جن کا استقصا یہاں مقصود نہیں، ان تمام حدیثوں میں قرآن پاک کی اس اہم آیت کا جلوہ موجود ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (٤/ النسآء:١١٦)

''بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے سوا جو گناہ ہے وہ اس کو جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا۔''

❶ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب تفاضل أهل الایمان فی الأعمال: ٢٢۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفه الجنة والنار: ٦٥٦٠۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٧١؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب اخر اهل النار...... : ٤٦١۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول الله: وجوه یومئذ ناضرة: ٧٤٣٩۔ ❺ ترمذی، ابواب صفة جهنم، باب ما جآء ان للنار نفسین: ٢٥٩٣، حدیث حسن صحیح، یہ روایت صحیح بخاری میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کے واسطہ سے ہے مگر کسی قدر فرق کے ساتھ اور اس میں صیغہ یُخْرَجُ مجہول آیا ہے۔ دیکھیے: کتاب الایمان، باب زیادة الایمان و نقصانه: ٤٤۔ ''ض''

اس آیت میں تصریح ہے کہ شرک کے علاوہ ہر گناہ کے نتیجہ سے براءت کی جاسکتی ہے مگر شرک وہ بیماری ہے، جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں اس لیے ان کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی خدا کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔

شرک وکفر کی بخشائش نہیں

احکامِ الٰہی اور شریعت ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق دل اور قلب سے ہے اور جو بمنزلہ اصل کے ہے اس کو مذہب کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدۂ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضا اور جوارح سے ہے اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات و معاملات اور اخلاق کہتے ہیں، شرک و کفر کے گناہ کا تعلق قسمِ اول سے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسم دوم سے ہے، دلوں میں ایمان وعمل وعرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ کی روشنی کی امید کسی طرح کی جاسکتی ہے، مگر جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے ناامیدی ہے، اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے، البتہ اعمال شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے، جن کی تلافی عذاب دوزخ کے بعد یا اللہ کی رحمت سے ہوسکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے، ایمان وعلم وعرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے، اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں، ہماری وسعت کا نتیجہ نہیں، بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا، اس بنا پر شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانونِ الٰہی میں ناممکن ہے، البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے، خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کھلی ہوئی مثال یہ ہے کہ دنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیا گیا ہے اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لیے اس کا نمبر صفر محض ہے تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے، لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحمدل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب بنا سکتا ہے۔

الغرض ایمان وعلم وعرفان کے مجرم جن کا نام مشرک و کافر ہے، اپنے ناقابل تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذابِ دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان کی دنیاوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنی طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا، مگر کیا شرک و کفر کے گناہگاروں کے لیے شرک و کفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جاسکتا ہے، اس کا جواب آئندہ سطروں میں ملے گا۔

کیا دوزخ کی انتہا ہے؟

دوزخ جو عتابِ الٰہی کا گھر ہے، کیا ہمیشہ آباد رہے گا؟ اللہ تعالیٰ کی رحمتِ عمومی کے قائلوں کے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے [1] ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدتِ دراز کے بعد ایک دن آئے گا جب جہنم کی آگ رحمت الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی، حدیث صحیح میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جنت میری رحمت اور دوزخ میرا عذاب ہے۔'' [2] اسی کے ساتھ یہ بھی حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ''جب اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کا فیصلہ کیا اسی وقت اس نے اپنے عرش کے اوپر یہ لکھ دیا کہ ((رَحْمَتِيْ سَبَقَتْ غَضَبِيْ)) [3] ''میری رحمت میرے غضب سے سبقت لے گئی ہے۔'' اب اگر دوزخ جو اس کے غضب کا مظہر ہے، اس کی جنت ہی کی طرح دائمی و ابدی ہو تو اس کا غضب اس کی رحمت پر سبقت لے جاتا ہے، یا برابر ہو جاتا ہے اور اس کا تخیل بھی اس رحمان و رحیم کی نسبت نہیں ہو سکتا، اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے سو حصوں میں سے

---

[1] ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت پر بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل و نحل کی کتابوں میں موجود ہے، ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بے شبہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی و ابدی ہے، لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے، عام اہل سنت کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا دائمی وجود ہے گناہگار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں جلیں گے۔ فقہا اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجیہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے کہ جو مومن ہوگا وہ گناہگار بھی ہوگا تو بھی دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ میں ہی رہے گا اور بھی اس بارہ میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل سنت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جن کے پرجوش حامی حافظ ابن قیم رحمہ اللہ ہیں نے بیچ کا مسلک اختیار کیا ہے چنانچہ علامہ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور ایک زیدی یمنی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے، العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الاباء والمشائخ (صفحہ ۱۲۲) نے یہ مسلک اختیار کیا ہے کہ جب گنہگار اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو جہنم فنا کر دی جائے گی اور جنت کو بقائے دوام بخشا جائے گا، حافظ ابن قیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح میں (دونوں مطبوعہ ہیں، حادی الارواح اعلام الموقعین کے ساتھ چھپی ہے، میں قرآن اور احادیث اور آثار اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے (دیکھو شفاء العلیل ص: ۲۵۲ تا ۲۶۴؛ حسینیہ مصر اور حادی الارواح از ص: ۱۶۷ تا ۲۲۵۱ مطبعہ جدیدہ مصر) علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا مسلک تسلیم کیا ہے، (حادی الارواح ابن قیم جلد دوم، صفحہ: ۱۶۷) صوفیہ میں شیخ محی الدین ابن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت اور لذت معلوم ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظتوں ہی کو پسند کرتے ہیں اور انہیں میں لطف اٹھاتے ہیں، میں نے اس باب کو بہت ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس میں اجمال الٰہی کی تصریح کا جرم عائد ہوتا ہے۔ اگر یہ اختیار کردہ پہلو حق نہ ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور توبہ کی توفیق بخشے اور اپنی مراد کا دروازہ مجھ پر کھول دے۔،،

[2] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ما جاء فی قول اللہ تعالیٰ ﴿إن رحمت اللہ قریب من المحسنین﴾: ۷٤٤۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها، باب النار یدخلها الجبارون ...... ۷۱۷۳۔

[3] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللہ ولقد سبقت کلمتنا ... : ۷٤٥۳؛ صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة اللہ: ٦۹۷۰۔

صرف ایک حصہ دنیا میں اتارا اور ننانوے حصے قیامت کے دن کے لیے رکھے ہیں۔'' [1] اس لیے ماننا پڑتا ہے کہ ایک دن آئے گا جب اس کے غضب پر اس کی رحمت غالب آ جائے گی اور اس کی رحمت کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا اور یہ وہ دن ہوگا جب گناہگار اپنے گناہوں کی ناپاکیوں اور نجاستوں سے اپنے اپنے مقررہ وقت پر پاک ہو کر اس کی رحمت کی سرفرازی کے قابل بن جائیں گے۔ اسلام کی رو سے سب سے بڑے مجرم مشرک و کافر ہیں اور جو اس وقت تک نجات نہ پا سکیں گے، جب تک دوزخ کے تنور میں ایک گرم کوئلہ بھی باقی ہے، تاہم ان کے عذاب کی مدت کی نسبت قرآن میں حسب ذیل تین تصریحات ہیں:

۱۔ ﴿ لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًاۚ﴾ (۷۸/ النبا:۲۳)

''وہ دوزخ میں صد ہزار سال ٹھہریں گے۔''

صد ہا ہزار ہا سال کی مدت کسی قدر بڑی ہو پھر بھی ایک دن ان کا خاتمہ ہوگا، دوسری آیت جو صریحاً کفار و مشرکین کے حق میں ہے، یہ ہے:

۲۔﴿ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ۝﴾

(۶/ الانعام:۱۲۹)

''دوزخ ہے تمہارا ٹھکانا، اس میں تم سدا رہنے والے ہو، لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے، بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔''

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دوزخ میں دائمی سزا دی جاتی رہے مگر اس کی رحمت کا اقتضا کچھ اور ہے، لیکن وہ حکیم و علیم ہے، اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت، مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے اور کب کرنا چاہیے۔

تیسری آیت میں ہے:

۳۔﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ۝﴾

(۱۱/ ھود:۱۰۷)

''وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، جب تک آسمان و زمین قائم ہیں، لیکن یہ کہ جو تیرا رب چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔''

دوسری اور تیسری دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں اپنی مشیت کو عذاب کی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو ''رب'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس سے اشارہ نکلتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہونا اس کی ربوبیت کا اقتضا ہے۔ قرآن پاک میں کوئی ایسی صاف و صریح آیت موجود نہیں ہے جس سے دوزخ کی بقائے دوام عدم انتہا اور تسلسلِ وجود پر بتصریح استدلال کیا جا سکے، حالانکہ اس کے برخلاف بہشت

[1] صحیح مسلم، کتاب التوبۃ، باب فی سعۃ رحمۃ اللہ: ۶۹۷۳ تا ۶۹۷۵۔

کی ہمیشگی و بقا اور عدمِ انقطاع وعدمِ فنا کی بیسیوں آیتیں قرآن پاک میں موجود ہیں۔ چنانچہ ان دونوں کے فرق کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس اوپر والی آیت کو ہم تمام وکمال یہاں نقل کرتے ہیں، فرمایا:

﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۭ عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۱۰۶۔۱۰۸)

''تو لیکن جو بد بخت ہوئے وہ دوزخ میں ہوں گے، اس میں ان کو گدھوں کی طرح چلانا اور رینگنا ہے جب تک آسمان اور زمین ہیں وہ اس دوزخ میں رہیں گے، مگر جو چاہے تیرا رب، بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے اور لیکن وہ جو خوش قسمت ہوئے، تو وہ جنت میں ہوں گے، ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم رہیں، مگر جو چاہے تیرا رب، یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔''

دیکھو کہ اہل جنت اور اہل دوزخ دونوں کے لیے خلود و دوام فرمایا، پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استثنا فرمایا، مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا کہ ''مگر جو چاہے تیرا رب بے شک تیرا رب جو چاہے کر ڈالتا ہے'' اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے اور چاہے تو قائم رکھے، لیکن اہلِ جنت کے دوام کے ذکر میں بتصریح فرمایا: ''مگر جو چاہے تیرا رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت یہی ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد ائمہ سلف مثلاً: ابن زید اور شعبی وغیرہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کے بارہ میں تو اپنی مشیت ظاہر فرمادی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے، لیکن اہل دوزخ کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے مخفی رکھا ہے۔ [1]

ایک اور مقام پر خاص طور پر کفار و مشرکین کا نام لے کر اس طرح فرمایا گیا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ۝ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ﴾ (۹۸/ البینۃ:۶۔۸)

''بے شک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنہوں نے کفر کیا، وہ جہنم کی آگ میں (خالد) پڑے رہیں، یہ بدترین لوگ ہیں، بے شک جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ بہترین لوگ ہیں، ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک بسنے کے باغ ہیں، جن میں نہریں بہتی ہوں گی

[1] تفسیر طبری، ج ۱۲، ص: ۶۶، ۶۷؛ درمنثور سیوطی تفسیر آیات ھود، ج ۳، ص: ۳۵۰۔

وہ اس میں ہمیشہ (خالد) رہیں گے۔"

غور سے دیکھو کہ اس میں اہل دوزخ کے مقابلہ میں اہل جنت کے دوام میں کتنی تاکید پر تاکید ہے، پہلے عدن فرمایا، جس کے معنی قیام اور بسنے کے ہیں، پھر خالدین کہا کہ وہ اس میں رہا کریں گے، بعدازیں اَبَدًا، فرمایا کہ وہ جنت میں ابدی طور سے قیام کریں گے۔

اسی طرح ایک اور سورۂ میں ہے:

﴿ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾

(٦٤/ التغابن:٩، ١٠)

"اور اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے اور وہی بڑی کامیابی ہے اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری باتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ والے ہیں وہ اس میں رہا کریں گے اور وہ بری جگہ ہے۔"

دیکھو کہ تقابلاً دونوں میں ﴿خالدین﴾ (رہا کریں گے) اور ﴿خالدین فیھا ابدا﴾ (ہمیشہ رہا کریں گے) کا فرق کتنا نمایاں ہے، کہیں یہ کہا گیا ہے کہ کفار کے عذاب میں مدت کے تعین سے سرے سے خاموشی برتی گئی ہے اور جنت میں خلود کی تصریح فرما دی گئی ہے، مثلاً:

﴿ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ (٣/ آل عمران:١٠٦، ١٠٧)

"جس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ سیاہ، تو جو سیاہ ہوئے، تو کیا ایمان کے بعد کافر ہو گئے تھے، تو اپنے کفر کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو اور جن کے منہ سفید ہوئے، تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اس رحمت میں سدا رہیں گے۔"

آیتِ بالا میں عذاب کے ذکر میں مدت کی تصریح سے سراسر خاموشی ہے اور رحمت کے ذکر میں خلود کی تصریح تمام ہے۔

انہیں آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایتیں ہیں کہ ایک دن آئے گا، جب دوزخ کے میدان میں ہُو کا عالم ہوگا اور کوئی ایک متنفس بھی وہاں نظر نہیں آئے گا، چنانچہ

① طبرانی میں حضرت ابوامامہ صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "جہنم پر ایک ایسا دن آئے گا جب وہ خزاں رسیدہ پتے کے مانند ہو جائے گی اور اس کے دروازے کھل جائیں گے۔"

② حضرت جابر رضی اللہ عنہ یا کسی اور صحابی سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جہنم پر ایک دن ایسا آئے گا جس میں اس کے دروازے کھل جائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا۔''

③ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''میں جو کہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک دن آئے گا جب اس میں کوئی نہ ہوگا۔''

④ تفسیر عبد بن حمید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''اہلِ دوزخ ریگستانِ عالج کے ذرات کے بقدر شمار بھی دوزخ میں رہیں پھر بھی ایک دن آئے گا جب وہ اس سے نکلیں گے۔''

⑤ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جہنم پر ایک دن آئے گا کہ جب اس کے خالی دروازے بھڑ بھڑائیں گے اور اس میں کوئی نہ ہوگا اور یہ اس وقت ہوگا جب لوگ اس میں صدہا ہزار سال (احقاب) کی مدت پوری کرلیں گے۔''

⑥ عبدالرزاق، ابن منذر، طبرانی اور بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی یا ابوسعید خدری صحابی یا کسی اور صحابی نے یہ فرمایا کہ ﴿اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ﴾ کا استثنا پورے قرآن پر حاوی ہے، یعنی جہاں جہاں قرآن میں ﴿خالدین فیها﴾ (سدا اس میں رہیں گے) وہاں یہ مشیت الٰہی کا استثنا قائم ہے۔

⑦ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دوزخ پر ایک زمانہ آئے گا، [1] جب اس کے خالی دروازے کھڑکھڑائیں گے۔

دفعِ شبہ

قرآن پاک میں ایسی بھی چند آیتیں ہیں جن سے لوگوں کو دوزخ کے دوام کا خیال ہوا ہے، مثلاً: وہ تین آیتیں جن میں کفار کو خلدین فیها ابدا ہمیشہ کے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے:

١۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۙ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ﴾

(٣٣/ الاحزاب: ٦٤، ٦٥)

''بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔''

٢۔ ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝﴾

[1] حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے شفاء العلیل، (ص: ٢٥٨) میں ان روایات کو غیر مطبوعہ کتب تفسیر وحدیث سے نقل کیا ہے، ان میں سے بعض ابن جریر طبری میں بھی آیات مذکور کی تفسیر میں خصوصاً تفسیر سورۂ ہود، جلد١٢، ص: ٦٦ میں مذکور ہیں اور حافظ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے بھی تفسیر درمنثور تفسیر سورۂ ہود، جلد٣، ص: ٣٥٠ میں زیر آیت مذکورہ ہود ذکر کیا ہے اور کتاب الاسماء والصفات بیہقی، ص: ١٢٣ مطبوعہ الہ آباد (حیدر آباد) میں چھٹی روایت ہے۔

(۷۲/ الجن:۲۳)

”اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی وہ آگ ہے، جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا۔“

۳۔ ﴿ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ۝ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ (٤/ النسآء: ١٦٨، ١٦٩)

”بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔“

ان تینوں آیتوں میں ﴿ خَلِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ﴾ (دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جن کے حق میں یہ آیتیں آئی ہیں وہ اس وقت دوزخ میں ہمیشہ قائم رہیں گے جب تک حسب مشیت الٰہی دوزخ کے خاتمہ کا دور نہیں آئے گا۔ باقی چند آیتوں میں ﴿ أَبَدًا ﴾ (ہمیشہ) کے بغیر صرف خالد ہے، جیسے ﴿ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴾ وہ اس میں ”خالد“ رہیں گے۔ یا ایک جگہ ہے:

﴿ وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝ ﴾ (٣٢/ السجدة:١٤)

”اور ”خلود“ کے عذاب کا مزہ چکھو۔“

تو یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ خلود کے دو معنی ہیں، ایک حقیقی دوام اور دوسرے قیام طویل، ان دو میں سے کسی ایک معنی کی تخصیص بقرائن ہوگی، اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے عربی اشعار میں پہاڑوں اور بدویانہ چولھوں کے پتھروں کے لیے خوالد اور خالدات کے لفظ صفت میں آتے ہیں، کیونکہ وہ تادیر اور زمانہ دراز تک باقی رہنے والے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا ﴿ خَالِدِينَ ﴾ کا لفظ ابدیت کے مفہوم میں صریح نہیں، جب تک اس کے ساتھ کوئی اور قرینہ قائم نہ ہو جو دوام کے معنی کی تخصیص کر دے، جیسا کہ یہ قرینہ ان آیتوں میں ہے جہاں اہل جنت کو ﴿ خَلِدِينَ ﴾ کہا گیا ہے کہ تقریباً بیس آیتوں میں اس خلود کے معنی دوام اور عدم انقطاع کے بتائے گئے ہیں، اس لیے جنت کے سلسلہ میں جہاں صرف ﴿ خَلِدِينَ ﴾ بھی ہے وہاں ہمیشگی اور دوام ہی کے معنی لیے جائیں گے برخلاف اس کے جہاں دوزخ کے ساتھ ﴿ خَلِدِينَ ﴾ کا لفظ ہے وہاں دوام کے مفہوم کے لیے کوئی قرینہ موجود نہیں اس لیے دوزخ والی آیتوں میں خلود سے مقصود یہ ہے کہ گناہگار زمانہ دراز تک دوزخ میں رہیں گے، غالباً یہی وجہ ہے کہ گناہگار اہل ایمان کی سزا میں کبھی خلدین کے ساتھ ﴿ أَبَدًا ﴾ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ گناہگار اہل ایمان میں سے سب سے بڑی دھمکی اس کو دی گئی ہے جس نے کسی مسلمان کا خون بے سبب بہایا ہو مگر اس کے سامنے بھی خلدین کے ساتھ اَبَدًا استعمال نہیں کیا گیا، فرمایا: ﴿ وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا ﴾ (٤/ النسآء:٩٣) ”اور جو کوئی کسی باایمان کو

قصداً قتل کردے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے، جس میں وہ ﴿خَالِدًا﴾ (یعنی مدت دراز تک) پڑا رہے گا۔"

یہی سبب ہے کہ معتزلہ اور خوارج کے سوا تمام اہل اسلام اس بے گناہ مسلمان مقتول کے قاتل کی بالآخر بخشائش کے قائل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان آیتوں میں "خلود" سے مراد ہمیشگی نہیں ہے بلکہ زمانہ دراز ہے کہ اہلِ توحید کی بالآخر نجات قرآن وحدیث کی متفقہ تعلیم ہے اور اس لیے مومن کے لیے اس کے کسی جرم کی سزا میں ہمیشگی کا مفہوم داخل ہی نہیں ہوسکتا، بنابریں ان آیتوں میں خلود کے معنی منطقی دوام نہیں بلکہ عرفی دوام یعنی مدت دراز کے ہیں ہم عام طور سے مجرم کے لیے حبسِ دوام کی قانونی اصطلاح بولتے ہیں جس سے مراد کبھی ابد تک کیا، قیامت تک کا زمانہ بھی نہیں ہوسکتا بلکہ عمر بھر بھی نہیں، بلکہ صرف اس سے قانونی قید کی دراز ترین مدت مراد ہے جس کا قانونی اندازہ بیس سال کیا گیا ہے۔ کتنے مجرم ہیں جو اس مدت کو کاٹ کر آزادی حاصل کرتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو کسی شاہی عفو عام کے سلسلہ میں قبل از مدت رہائی پا جاتے ہیں۔

دو چار آیتیں ایسی بھی ہیں جن میں مذکور ہے کہ یہ گناہگار دوزخ سے الگ نہ ہوں گے۔ چنانچہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں:

(۱) ﴿وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝﴾

(۸۲/ الانفطار:۱۴-۱۶)

"بے شک گناہگار دوزخ میں ہیں وہ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے اور وہ اس سے چھپے نہیں رہ سکتے۔"

(۲) ﴿وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۱۶۷)

"اور کہیں گے کہ کاش ہم کو دوبارہ دنیا کی زندگی ملتی تو ہم اپنے پیشواؤں سے ہی الگ ہو جاتے، جیسے وہ ہم سے یہاں الگ ہو گئے، اللہ ان کے کاموں کو ایسے ہی حسرتیں بنا کر ان کو دکھائے گا اور وہ دوزخ سے نکلنے والے نہیں۔"

(۳) ﴿إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُقِيمٌ ۝﴾ (۵/ المآئدۃ:۳۶، ۳۷)

"بے شک جنہوں نے کفر کیا اگر ان کی ملکیت میں کل روئے زمین ہو اور اتنا ہی اور ہو، تاکہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے عذاب سے رہائی پائیں، تو وہ ان کی طرف سے قبول نہ ہو اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں، لیکن وہ اس سے

نکلنے والے نہیں اور ان کے لیے قائم عذاب ہے۔"

(٤) ﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴾

(۲۲/ الحج:۲۲)

"وہ جب چاہیں کہ اس دوزخ سے غم کی وجہ سے نکل پڑیں وہ اس میں لوٹا دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ جلنے کی سزا چکھو۔"

(٥) ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴾ (۳۲/ السجدة:۲۰)

"اور لیکن جنہوں نے نافرمانی کی تو ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب وہ چاہیں گے کہ وہ اس سے نکل جائیں اس میں لوٹا دیے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ دوزخ کی اس مار کا مزہ چکھو، جس کو تم جھٹلاتے تھے۔"

یہ وہ پانچ آیتیں ہیں جن سے بعضوں کو عذابِ دوزخ کے دوام اور غیر منقطع بقا کا خیال پیدا ہوا ہے، مگر ان میں سے ایک ایک آیت پر غور کرو تو ان کے خیال کی غلطی فوراً معلوم ہو جائے گی، پہلی آیت کا منشا اسی قدر ہے کہ کوئی گناہگار اگر یہ سمجھے کہ وہ کسی جگہ چھپ کر دوزخ کے عذاب سے بچ جائے گا تو یہ محال ہے کہ خدا سے چھپ کر بچ جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوزخی کہیں گے کہ ہم کو دوزخ سے نکل کر دوبارہ دنیا میں جانے دیا جائے تو اب کی بار ہم نیکی کے کام کریں گے، اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ اب یہاں سے نکل کر دنیا میں دوبارہ جانا نہیں، تیسری آیت میں ہے کہ پورے روئے زمین کی دولت دے کر بھی آخرت میں نجات خریدی نہیں جا سکتی اور نہ وہاں سے کوئی نکل کر بھاگ سکتا ہے، چوتھی اور پانچویں آیت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی دوزخی دوزخ کے عذاب سے گھبرا کر اس سے نکل بھاگنا چاہے گا تو وہ پکڑ کر پھر اسی میں ڈال دیا جائے گا، ان آیتوں سے صرف اتنا معلوم ہوا کہ گناہگار از خود دوزخ سے نکل نہ سکیں گے اور نہ مدت عذاب کے اندر وہ خلاصی پا سکتے ہیں مگر اس سے خدا تعالیٰ کے حکم واجازت سے بالآخر اس سے نجات پانے کی نفی نہیں نکلتی اور نہ اس کی کہ بقدر گناہ عذاب کی مدت بسر کرنے کے بعد بھی نجات نہیں مل سکتی اور نہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ کو بھی غیر متناہی دوام بخشا گیا ہے۔

یہی وہ آیتیں ہیں جن سے گناہگاروں کے لیے دوام عذاب کا مفہوم نکالا جا سکتا ہے، مگر ایک ایک آیت کو غور سے پڑھو کہ ان میں سے کسی میں بھی دوزخ کے دوام، بقا اور عدم فنا یا اس کے عذاب کے عدم انتہا کی تصریح ہے؟ حالانکہ اس کے بالمقابل جنت کی بقائے دوام اور عدم انقطاع کی تصریح بار بار اور بتکرار ہے۔

ایک اور نکتہ لحاظ کے قابل ہے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خدا نے گناہگاروں کو عذاب دوزخ کی ابدیت اور

دوام کی دھمکی دی ہے، تاہم اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے کہ نیکی کا بدلہ نہ دینا، یقیناً برائی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی قدوسیت کا دامن تمام تر پاک ہے کہ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۹) ''تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔'' ﴿ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴾ (۱۹/ مریم: ۶۱) ''اس کا وعدہ جنت پورا ہی ہوگا۔'' لیکن اگر برائی کا بدلہ حسب تہدید، سابق برائی کے ساتھ نہ دیا جائے تو یہ حقیقت میں خلاف وعدگی نہیں جو قابل ملامت ہو بلکہ اس کا نام مغفرت، کرم، عطا اور عفو ہے جس کا اہل اس رحمٰن ورحیم اور عفو اور غفور سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں، اس لیے گناہگاروں کے ساتھ جیسا کہ اس نے فرمایا اپنی حکمت ومصلحت کی بنا پر وہ جو چاہے کرسکتا ہے، چنانچہ مسند ابویعلیٰ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''خدا نے کسی نیک کام پر جس ثواب کا وعدہ فرمایا ہے وہ اس کو ضرور ہی پورا کرے گا لیکن جس کسی کو اس نے کسی کام پر عذاب کی دھمکی دی ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔'' [1]

کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر بالآخر گناہوں کی مغفرت اور خدا کی رحمت میں یہ وسعت اور عموم ہے کہ بڑے سے بڑے گناہگار بھی دوزخ کی آگ میں جل کر بالآخر پاک وصاف اور جنت میں داخل ہونے کے قابل ہوجائیں گے تو اشارات وکنایات کے بجائے ان کی معافی کی صریح تصریح کیوں نہیں کردی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ ان مجرموں اور گناہگاروں کے حق میں اچھا نہ ہوتا کہ اس سے ان کے نادم و تائب ہونے کے بجائے ان میں اور خودسری، گستاخی اور شوخی پیدا ہوتی اور ان آیندہ کے نتائج بد سے نڈرپن اور بےخوفی آجاتی اور ایسا ہونا تنبیہ واصلاح وتدارک کی مصلحتوں کے سراسر منافی ہوتا، اس لیے ان کی قانونی سزا تو دائمی عقاب مقرر فرمائی اور بالآخران کی نجات کو اپنی مشیت اور علم ومصلحت کے سپرد فرما کر ان کو ایک گونہ اپنے سے ناامید بھی نہیں ہونے دیا اور امید وبیم کی حالت میں رکھ کر اپنے سامنے جھکنے اور محبت کرنے کا جذبہ بھی پیدا کردیا اور یہ اس باب میں وہ عظیم الشان اصلاح ہے، جس کو ایک طرف عیسائیوں نے کفارہ کی اور دوسری طرف ہندو مذاہب نے کرم کی تعلیم دے کر غارت کردیا تھا۔

عیسائیوں کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مصلوب ہوکر جی اٹھنے پر ایمان لانے سے تمام گناہ دفعتہً معاف ہوجاتے ہیں، اس تعلیم نے اعمال کو غیر ضروری چیز ٹھہرا دیا تھا اس کے برخلاف ہندو مذاہب نے تو خدا کو اتنا بے اختیار ٹھہرایا کہ اعمال بد کے نتائج جن کو کرم کہتے ہیں، خدا چاہے بھی تو وہ کبھی معاف نہیں ہوسکتے لیکن اسلام نے آکر ترازو کے ان دونوں پلوں کو برابر کردیا ایک طرف فرمایا: ﴿ كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴾ (۷۴/ المدثر: ۳۸) ''ہر نفس اپنے عمل کے ہاتھ میں گرو ہے۔'' اور دوسری طرف فرمایا: ﴿ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۴۰) ''خدا جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔''

---

[1] بحوالہ حادی الارواح ابن قیم رحمہ اللہ ص: ۲۲۲، مصر۔

یعنی قانوناً ہر انسان اپنے عمل کے نتائج کا یقیناً پابند ہے، مگر خدا تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اس قانون کے باوجود جو چاہے کرسکتی ہے۔ جس طرح اس دنیا کا حال ہے کہ گو خدا کے بنائے ہوئے قانون یہاں جاری ہیں، جن کو آپ قانونِ فطرت کہتے ہیں مگر باایں ہمہ اس حکم اور اس کی خواہش اور مصلحت ان پر بھی حاکم ہے اور وہ جو چاہے کرسکتا ہے، اس تعلیم نے ایک طرف اعمال کو غیر ضروری ہونے سے بچالیا اور دوسری طرف خدا کی قدرتِ تام اور رحمت کا دروازہ بھی کھلا رکھا۔

عذابِ طویل کا سبب

بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ جو ایک لحہ کا کام ہے اس کا عقاب اتنا طویل کیوں رکھا گیا ہے، اسی طرح سال دو سال یا عمر بھر کے گناہ کی سزا صدہا اور ہزار ہا سال کے عقاب سے دینا مناسب نہیں، حالانکہ یہ لوگ اگر دنیاوی ہی واقعات پر غور کرتے تو وہ ان کی تسکین کے لیے کافی ہوتے، دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لحہ میں انجام پاتا ہے، چوری، عمل خلاف قانون، یا کسی کو قتل کرتے کتنی دیر لگتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں سالہاسال کی قید ہم خود اپنی انسانی عدالت گاہوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کو خلافِ عقل نہیں کہتے۔

دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان کو دیکھو کہ ذراسی جسمانی بدپرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی سی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک مدتِ دراز میں جاکر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی تلافی کر پاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت یکساں نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلہ میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزار ہا گنا زیادہ ہوتی ہے کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑ جاتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت، طبیعت کی صلاحیت اور خلاقِ عالم کی مصلحت کی بنا پر کی جاسکتی ہے اسی لیے عقابِ طویل سے رہائی یا شفایابی کی مدت بھی ہر گناہگار کے لیے یکساں نہیں ہوتی۔ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِحَقِيْقَةِ الْحَالِ.

مشرک وکافر کا آخر انجام؟

اگر یہ صحیح ہے کہ بالآخر ایک دن جہنم کی آگ سرد ہوجائے گی، تو کیا اہل کفر وشرک بھی اپنے گناہوں سے پاک ہوکر رحم وکرم کے سزاوار ہوجائیں گے، جواب یہ ہے کہ

قرآن پاک میں اس کی تصریح موجود ہے کہ شرک وکفر کا گناہ معاف نہ ہوگا، یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش ضروری ہے اور یہ بھی معلوم ہوچکا ہے کہ شرک وکفر کی جزا دوامِ عذاب اور خلودِ نار ﴿ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ ہے، یعنی جب تک دوزخ قائم ہے اس سے ان کو نجات نہیں مل سکتی مگر جب حسبِ مشیتِ الٰہی وہ دن آئے کہ خود دوزخ کی مدتِ حیات ختم ہوجائے تو اس وقت عجب نہیں کہ ان کو بھی اس سے رہائی مل سکے۔

چنانچہ مشرکین وکافرین کے ذکر میں خدا فرماتا ہے:

﴿ قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(٦/ الانعام:١٢٨)

''فرمائے گا، دوزخ کی آگ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں ہمیشہ رہو گے، مگر یہ کہ جو چاہے اللہ، بے شک تیرا پروردگار حکمت اور علم والا ہے۔''

اس آیت کا آخری ٹکڑا خاص طور سے قابل ذکر ہے تیرا رب حکمت اور علم والا ہے۔ اس موقع پر خدا کے لیے خاص طور پر رب کا لفظ لانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس کی شانِ ربوبیت اگر چاہے گی تو اس کے غیر محدود علم و حکمت کا اقتضا ہوگا تو دوزخ کے خاتمہ پر ان کو رہائی مل سکے گی۔

لیکن اس میں شک ہے کہ آیا اس کے بعد بھی وہ جنت میں داخل ہوسکیں گے، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے قرآن میں یہ تصریح الٰہی ہے:

﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ ﴾ (٥/ المآئدۃ:٧٢)

''یہ کہ بے شبہ اللہ کا جو شریک بنائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کردی ہے اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔''

نیز ایک اور آیت میں ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ ﴾ (٧/ الاعراف:٤٠)

''بے شک جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے غرور کیا تو ان کے لیے آسمان کے دروازے نہیں کھولے جائیں گے اور وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہوجائے۔''

الغرض خدا کے اعلان کردہ قانون جزا کا اقتضا تو یہی ہے کہ گو ان کے لیے کبھی دوزخ کا خاتمہ بھی ہوجائے مگر پھر بھی جنت کے احاطہ میں ان کا گزر نہ ہو لیکن اس کی رحمت و مغفرت کا دائرہ اس سے بڑھ کر ہے جیسا کہ خود اس نے اہل دوزخ کی نسبت کہا ہے کہ

﴿ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝ ﴾ (١١/ هود:١٠٧)

''وہ سدا دوزخ میں رہیں گے، لیکن تیرا رب جو چاہے، بے شک تیرا رب جو چاہے کر گزرتا ہے۔''

س دائرہ کی وسعت کو کون کم کرسکتا ہے، پھر اس کا یہ بھی اعلان ہے کہ

﴿ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ ﴾ (٧/ الاعراف:١٥٦)

''اور میری رحمت ہر شے کو اپنی گنجائش میں لیے ہے۔''

اس رحمت عام کی وسعت سے آسمان وزمین کا کون سا گوشہ محروم ہے، اس سے بڑھ کر یہ کہ پیغمبر کے جھٹلانے والوں کو کہا جاتا ہے کہ

﴿ فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُو رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهُ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ ﴾

(٦/ الانعام:١٤٧)

''اے پیغمبر! اگر وہ تجھے جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارا پروردگار وسیع رحمت والا ہے اور اس کا عذاب گناہگاروں سے لوٹایا نہیں جاسکتا۔''

یعنی کسی دوسرے میں یہ طاقت نہیں کہ اس کے بھیجے ہوئے عذاب کو گناہگاروں کے سر سے ٹال دے لیکن خود اس کی رحمت بڑی وسیع ہے، وہ چاہے تو ان کو دنیا ہی میں ہدایت دے کر جنت نصیب کرے یا آخرت میں عذاب دینے کے بعد درگزر کردے اور اس کی اصلی رحمت کا محل وہی ہے، جہاں کسی دوسری رحمت کا وجود نہ ہوگا، فرمایا:

﴿ مَنْ يُصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهُ ۚ ﴾ (٦/ الانعام:١٦)

''جس سے اس دن عذاب ہٹایا گیا، تو خدا نے اس پر رحم کیا۔''

صحیح بخاری و مسلم، ترمذی میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اگر مومن کو معلوم ہو کہ خدا کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے گا اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہوگا۔'' [1] مصلح الدین سعدی شیرازی نے غالباً اسی حقیقت کو اپنے دو شعروں میں ادا کیا ہے:

بہ تهدید اگر بر کشد تیغ حکم	بـه مـا نـنـد کر وبیان صم وبکم
ودگـر درد هدیك صلائے کرم	عـزا زیـل گـو یـد نصیبے بر م [2]

خود اس رحمٰن ورحیم کا ارشاد ہے کہ جس کی بادشاہی آسمان وزمین کو محیط ہے وہ جو چاہے کرسکتا ہے:

﴿ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۡ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ (٥/ المآئدة:١٨)

''جس کو چاہتا ہے، بخش دیتا ہے اور جس کو چاہے عذاب دیتا ہے اور اسی اللہ کی آسمانوں کی اور زمین کی اور ان کے بیچ کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

لیکن یہ اس کی مشیت جیسا کہ اس نے (٦/ انعام:١٢٨) میں فرمایا ہے کہ اس کی وسیع حکمت ومصلحت

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب الرجاء مع الخوف: ٦٤٦٩؛ صحیح مسلم، کتاب التوبة، باب فی سعة رحمة الله: ٦٩٧٩؛ جامع ترمذی، ابواب الدعوات: ٣٥٤٢؛ مسند احمد، ج٢، ص:٣٣٤، ٤٨٤۔

[2] بوستان، ص:٥۔

پر مبنی ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو اس کی مصلحت وحکمت کا تقاضا ہے۔

اس سے زیادہ اس باب میں کچھ اور کہنا حد سے آگے بڑھنا ہے کہ جس کی تصریح خود خدائے تعالیٰ نے نہیں فرمائی اس کی تصریح کا حق کسی کو کیا ہے۔ اس لیے مشرک وکافر کے آخر انجام کے سوال کا جواب صرف مشیت الٰہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے:

﴿ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(٦/ الانعام:١٢٨)

''دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے، اس میں سدا رہو گے، لیکن جو چاہے اللہ بے شک تیرا پروردگار حکمت والا اور علم والا ہے۔''

جمہور کا مسلک خلود نار

جو کچھ کہا گیا وہ اس جماعت کا خیال ہے، جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معتقد ہے، جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے، اس کے نزدیک بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک اور کفر کے مرتکب ہوں گے، کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی۔ اس عقیدہ کے مطابق گناہگاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گناہگار تھے مگر ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے، دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک وکفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے، ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کر دیے جائیں گے، ان کی گناہگاری اس درجہ ہوگی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے، وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔ رحمتِ عمومی کے معتقدین گزشتہ آیتوں سے جو معنی نکالتے ہیں، وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں، وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے اور ان کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے اور قرآن مجید کی حسب ذیل آیتوں سے اپنے دعویٰ پر استدلال کرتے ہیں:

١۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَعَنَ الْكٰفِرِيْنَ وَاَعَدَّ لَهُمْ سَعِيْرًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۚ ﴾

(٣٣/ الاحزاب:٦٤، ٦٥)

''بے شک خدا نے کافروں پر لعنت کی اور ان کے لیے وہ آگ مہیا کی، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں۔''

٢۔ ﴿ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ ﴾

(٧٢/ الجن:٢٣)

''اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔''

۳۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ﴾ (٤/ النسآء:١٦٨، ١٦٩)

''بے شک جنہوں نے کفر کیا اور حد سے آگے بڑھے نہیں ہے کہ اللہ ان کو بخشے اور نہ یہ کہ ان کو راہ دکھائے، لیکن جہنم کی راہ، اس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ ان پر ہمیشہ عذاب ہوگا اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا، تو عذاب کی جگہ یعنی دوزخ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔

ان آیتوں کے علاوہ اور بھی دوسری آیتیں ہیں، جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کا عذاب کافر سے کبھی دور نہ ہوگا:

۱۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝ ﴾ (٥/ المآئدة:٣٦، ٣٧)

''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، اگر بالفرض ان کے پاس ساری زمین کا خزانہ ہو اور اتنا ہی اس کے ساتھ اور کہ وہ اس کو فدیہ دے کر قیامت کے دن اس عذاب سے چھوٹ جائیں تو ان سے یہ فدیہ قبول نہ کیا جائے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل جائیں اور وہ اس سے نہیں نکل سکیں گے اور ان کے لیے قائم رہنے والا عذاب ہے۔''

۲۔ ﴿ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝ ﴾ (٢/ البقرة:١٦٧)

''وہ دوزخ سے نکل نہیں سکیں گے۔''

قیامت کے منکروں کی نسبت فرمایا:

۳۔ ﴿ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝ ﴾ (٤٥/ الجاثية:٣٥)

''تو آج اس دوزخ سے وہ نہیں نکالے جائیں گے اور نہ ان کا عذر سنا جائے گا۔''

٤۔ ﴿ اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ۝ ﴾ (٤٢/ الشورىٰ:٤٥)

''ہاں کافر اور مشرک قائم رہنے والے عذاب میں ہوں گے۔''

ظلم کا اطلاق قرآن میں شرک پر کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ شرک کا عذاب قائم رہے گا:

۵۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ

أَجْمَعِينَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۶۱، ۱۶۲)

’’بے شک جنہوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے، ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور آدمیوں کی، سب کی لعنت ہے، اس میں وہ سدا رہیں گے، ان کے عذاب میں کمی نہیں کی جائے گی اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی۔‘‘

۶۔ ﴿ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَهُمْ نَارُ جَهَنَّمَ ۚ لَا يُقْضٰى عَلَيْهِمْ فَيَمُوْتُوْا وَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ مِّنْ عَذَابِهَا ۭ ﴾ (۳۵/ فاطر: ۳۶)

’’اور ان کے لیے جنہوں نے کفر کیا، جہنم کی آگ ہے، نہ تو ان کا فیصلہ کیا جائے گا کہ وہ مر جائیں اور نہ سزا میں کچھ کمی کی جائے گی۔‘‘

شرک وکفر والوں کی مغفرت کسی حال میں نہ ہوگی، فرمایا:

۷۔ ﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ﴾ (۴/ النسآء:۱۱۶)

’’بے شک اللہ اس کو معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔‘‘

۸۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝ ﴾

(۴۷/ محمد:۳۴)

’’بے شبہ جنہوں نے کفر کیا اور خدا کے راستے سے روکا اور اسی کفر کی حالت میں وہ مر گئے، تو ان کو ہرگز معاف نہ کیا جائے گا۔‘‘

ان کے لیے جنت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہے:

۹۔ ﴿ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۷۲)

’’یقیناً جو خدا کے ساتھ شرک کرے گا، تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔‘‘

۱۰۔ ﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَاۗءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ۭ ﴾ (۷/ الاعراف:۴۰)

’’بے شک جنہوں نے ہمارے حکموں کو جھٹلایا اور ان کے ماننے سے سرکشی کی، ان کے لیے آسمان کے دروازے کھولے نہ جائیں گے اور نہ جنت میں وہ داخل ہوں گے، تا آنکہ اونٹ سوئی کے ناکے میں گھس جائے۔‘‘

۱۱۔ ﴿ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۷۶)

''اور اے پیغمبر! تجھے وہ لوگ جو کفر میں جلدی کرتے ہیں غم میں نہ ڈالیں، وہ ہرگز خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، خدا چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ بنائے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔''

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک وکفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی ان کا گناہ بخشا نہ جائے گا اور وہ جنت میں کبھی داخل نہ ہو سکیں گے، بلکہ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں پڑے رہیں گے، جہاں نہ ان کے عذاب میں کبھی تخفیف ہوگی اور نہ ان کو موت آئے گی۔ تصویر کے دونوں رخ آپ کے سامنے آگئے۔

بیا کایں داور یہارابہ پیش داور اندازیم

بہشت ودوزخ کی جزا وسزا بھی تمثیلی ہے

اوپر عالم برزخ کے ذکر میں ہم بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ آخرت میں جزا وسزا تمام تر تمثیلی ہوگی۔ اس تمثیلی کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب ومشابہ اس کی جزا یا سزا ہوگی، مثلاً: قرآن میں ہے کہ جو زکوۃ یعنی اپنے مال کا میل کچیل [1] مستحقین کو کھانے کے لیے نہ دے گا تو اس کو دوزخ میں زخموں کا دھوون کھانے کو ملے گا۔ (۶۹/ الحاقۃ: ۳۴۔۳۶) یا یہ کہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان دے گا مرنے کے بعد اس کو جان تازہ اور حیات نو بخشی جائے گی۔ (۳/ آل عمران: ۱۶۹) وہ دولت مند جس کو دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے قصر ومحل اور پینے کے لیے ٹھنڈے سے ٹھنڈا پانی اور عزت کی جگہ عنایت کی گئی تھی اگر اس نے دنیا میں ان نعمتوں کے ملنے کا حق اس دنیا میں ادا نہ کیا تو دوسری دنیا میں اس کو یہ سامان ملے گا:

﴿ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۙ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ۝ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۚ ﴾ (۵۶/ الواقعۃ: ۴۲۔۴۵)

''وہ لو اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں، نہ ٹھنڈا، نہ باعزت، بے شک وہ پہلے ناز و نعمت میں تھے۔''

رؤیائے برزخ کی حدیث میں ہے کہ آپ نے کچھ ایسے لوگوں کو دیکھا جن کا آدھا دھڑ خوبصورت اور

[1] حدیث میں ہے کہ زکوۃ مسلمانوں کی دولت کا میل ہے۔ صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ترک استعمال آل النبی ﷺ علی الصدقۃ: ۲۴۸۲؛ ابوداود، کتاب الامارۃ، باب فی بیان مواضع قسم الخمس: ۲۹۸۵۔

آدھا بدصورت تھا، یہ وہ تھے جن کے کچھ کام اچھے اور کچھ برے تھے [1] اس لیے بداعمالی بدصورتی اور نیکی خوبصورتی کے رنگ میں نمایاں ہوئی، صریح طور سے یہ اصول ان حدیثوں میں مستنبط ہوتا ہے:

① حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ''جو مومن خود بھوکا رہ کر کسی دوسرے بھوکے مومن کو کھلائے گا، تو خدا اس کو جنت کے پھل کھلائے گا اور جو پیاسا ہو کر کسی دوسرے پیاسے کو پلائے گا تو خدا اس کو جنت میں شراب طہور پلائے گا اور جو کوئی کپڑوں کا حاجت مند ہو کر ننگے کو پہنائے گا، تو خدا اس کو جنت کے سبز جوڑے پہنائے گا۔'' [2]

② حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''جو کوئی کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی کوئی تکلیف دور فرمائے گا اور جو کوئی کسی نادار کو یہاں کسی مصیبت میں پھنسائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کو مصیبت میں مبتلا فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی ستر پوشی کرے گا تو خدا دنیا و آخرت میں اس کی ستر پوشی کرے گا اور جو کوئی اپنے بھائی کی مدد میں جب تک رہے گا خدا اس وقت تک اس کی مدد میں رہے گا۔'' [3]

③ ''جو انسانوں پر رحم کرے گا، خدا اس پر رحم فرمائے گا۔'' [4]

تمثیل کے دوسرے معنی یہ ہیں، کہ جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں وہ اپنی مثالی شکل وصورت میں ظاہر ہوں گے، مثلاً:

① قرآن میں ہے کہ جو اس دنیا میں حقیقت بینی سے اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا۔ (۱۷/ الاسراء ۷۲) دیکھو کہ دنیا کی معنوی و قلبی نابینائی دوسرے عالم میں ظاہری و جسمانی نابینائی کی شکل میں ظاہر ہوگی۔

② حدیث میں ہے کہ اہلِ تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے جن پر ہر طرف سے ذلت وخواری چھائی پھرے گی۔ [5] دیکھو کہ تکبر کی جزا ذلت وخواری سے ملے گی اور چونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں، اس لیے ان کی بڑائی اور تکبر کا معاوضہ یہ ہوگا کہ وہ چیونٹی بن کر اٹھیں۔

③ اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو بخل کرے گا، قیامت میں اس کا مال سانپ بن کر اس کو ڈسے

---

[1] صحيح بخاری، كتاب التعبير، باب تعبير الرؤيا بعد صلاة الصبح: ۷۰٤۷۔

[2] ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب فی ثواب الاطعام: ۲٤٤۹۔

[3] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی الستر علی المسلمين: ۱۹۳۰

[4] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی رحمة الناس: ۱۹۲٤۔

[5] ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب ماجاء فی شدة الوعيد للمتكبرين: ۲٤۹۲۔

گا۔'' [1] صفتِ بخل اس کے حق میں اسی سانپ کی صورت اختیار کر کے اس کی تکلیف کا باعث ہوگی، آنحضرت ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''جو شخص بلاوجہ بھیک مانگ کر اپنی آبروریزی کرتا ہے، قیامت میں وہ اٹھے گا تو اس کے منہ پر گوشت نہ ہوگا۔'' [2] دیکھو کہ دنیاوی بے شرمی و بے حیائی بے گوشت چہرہ کی صورت میں ظاہر ہوگی۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا کہ ''دو بیبیوں کا وہ شوہر جو ایک کا حق ادا کرتا اور دوسری سے غفلت برتتا تھا، قیامت میں اس طرح آئے گا کہ اس کا ایک پہلو (گویا مفلوج ہو کر) جھک گیا ہوگا۔'' [3] ایک پہلو کا عدم ادائی حق اپنی تمثیلی صورت ایک پہلو کی مفلوجی کیفیت میں نمودار ہوگا، یہ چند حوالے ذکر کیے گئے ہیں، انہیں پر جزا و سزا کے اور دوسرے جزئیات کو قیاس کرنا چاہیے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھنے سے حسب ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے:

﴿ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۲۴، ۱۲۶)

''جس نے میری یاد سے منہ پھیرا تو اس کو تنگ گزران ملتی ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے، وہ کہے گا کہ اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا، میں تو دیکھتا تھا، فرمائے گا اسی طرح میری آیتیں تیرے پاس آئیں تو، تو نے ان کو بھلا دیا ایسے ہی آج تو بھلایا جائے گا۔''

دیکھو کہ دل کی نابینائی قیامت میں ظاہری نابینائی اور یہاں خدا کو بھولنا اور اس کے احکام کو یاد نہ کرنا، وہاں رحمت الٰہی کی یاد سے بھول کی شکل میں نمودار ہوگا۔

دوزخ کی جسمانی سزائیں

دوزخ میں جسمانی اور روحانی دونوں سزائیں ملیں گی، قرآن پاک میں جن جسمانی سزاؤں کا ذکر ہے، وہ حسب ذیل ہیں:

① آتش دوزخ اور اس کی سوزش کا ذکر بار بار آیا ہے بلکہ اَلنَّارُ یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے، انہیں معنوں میں اَلسَّعِيْرُ یعنی جلتی آگ بھی بارہا مستعمل ہوا ہے اور عَذَابَ الْحَرِيْقِ جلن کا عذاب بھی دو چار جگہ کہا گیا ہے اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ

---

[1] صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں: ((مثل له ماله شجاعا اقرع)) کتاب الزکوٰۃ، باب اثم مانع الزکوٰۃ: ۱۴۰۳ وکتاب التفسیر: ۴۵۶۵۔ [2] ترمذی، ابواب الزکوٰۃ، باب ما جاء من نخل الزکوٰۃ: ۶۵۰؛ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من سال الناس تکثرا: ۱۴۷۴؛ بروایت سنن نسائی، کتاب الزکوٰۃ، باب المسالة: ۲۵۸۶ وباب حد الغنی: ۲۵۹۳؛ مسند احمد، ج ۲، ص: ۱۵ میں بھی ہے اور سب میں یہ الفاظ ملتے ہیں "لیس فی وجهه مزعة" لیکن ترمذی جس کا مصنف نے حوالہ دیا ہے اس میں "ومسئلته فی وجهه خموش اوخروش اوکدوح" وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں۔ "ض"

[3] ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی التسوية بین الضرائر: ۱۱۴۱۔

﴿ تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۰۴)

''ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی اور ان کی صورتیں بگڑ جائیں گی۔''

دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے، جس کے متعلق یہ ہے کہ

﴿ وَمَا أَدْرَاكَ مَا سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر:۲۷-۲۹)

''اور تمہیں کیا معلوم، سقر کیا ہے، نہ وہ رحم کھائے گی، نہ چھوڑے گی، چہروں کو جھلس دینے والی۔''

﴿ كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۱۵، ۱۶)

''ہرگز نہیں، وہ شعلہ والی آگ ہے، منہ کی کھال ادھیڑنے والی۔''

﴿ إِنَّهَا تَرْمِي بِشَرَرٍ كَالْقَصْرِ ۝ كَأَنَّهُ جِمَالَتٌ صُفْرٌ ۝ ﴾ (۷۷/ المرسلات:۳۲، ۳۳)

''دوزخ محل کے برابر اونچی چنگاریاں اتنی بڑی پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔''

② وہاں سایہ نہ ہوگا، بلکہ یہ حکم ہوگا:

﴿ انطَلِقُوا إِلَىٰ ظِلٍّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ ۝ لَّا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ ۝ ﴾

(۷۷/ المرسلات:۳۰، ۳۱)

''چلو ایک چھاؤں کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی، نہ گھنی کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام آسکے۔''

③ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی:

﴿ لَّا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَلَا شَرَابًا ۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۲۴)

''اس میں وہ نہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا۔''

④ دوزخ میں نہ موت آئے گی کہ چین آ جائے اور نہ ایسی زندگی ہی ہوگی جس میں کوئی مسرت ہو، دو جگہ فرمایا:

﴿ لَا يَمُوتُ فِيهَا وَلَا يَحْيَىٰ ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۷۴، ۸۷/ اعلی:۱۳)

''وہاں وہ نہ مرے گا نہ جیے گا۔''

⑤ پینے کو گرم پانی ملے گا، جس سے آنتیں نکل پڑیں گی:

﴿ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ ۝ ﴾ (۴۷/ محمد:۱۵)

''اور وہ گرم پانی پلائے جائیں گے تو وہ پانی ان کی آنتوں کو ٹکڑے کر دے گا۔''

⑥ اور پیپ پئیں گے:

﴿ إِلَّا حَمِيمًا وَغَسَّاقًا ۝ ﴾ (۷۸/ النبا:۲۵) ''لیکن کھولتا پانی اور پیپ۔''

⑦ ان کے اوپر سے گرم پانی چھوڑا جائے گا:

﴿ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوسِهِمُ الْحَمِيمُ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۹)

''ان کے سروں کے اوپر سے گرم پانی ڈالا جائے گا۔''

⑧ کھانے کو سینڈ ھے کا پھل ملے گا:

﴿ أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ ۝ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ۝ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ ۝ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ۝ فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيمٍ ۝ ﴾ (۳۷/ والصفت:۶۲۔۶۷)

''یا سینڈ ھے کا پھل .... وہ ایک درخت ہے دوزخ کی جڑ میں، اس کے شگوفے جیسے شیطانوں کے سر، تو وہ کھائیں گے اور اس سے پیٹ بھریں گے، پھر اس پر گرم پانی کی ملونی ہوگی۔''

﴿ إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ ۝ طَعَامُ الْأَثِيمِ ۝ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ۝ ﴾

(۴۴/ الدخان:۴۳۔۴۶)

''سینڈ ھے کا درخت گناہ گار کی غذا ہے، جیسے پگھلا ہوا تانبا، وہ پیٹیوں میں کھولتا ہے، جیسے کھولتا پانی۔''

⑨ خاردار جھاڑی کی خوراک ہوگی جس سے بدن کو کوئی فائدہ نہ ہوگا:

﴿ لَّيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ إِلَّا مِن ضَرِيعٍ ۝ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ ۝ ﴾

(۸۸/ الغاشیۃ:۶، ۷)

''اور ان کے لیے کوئی کھانا نہ ہوگا، لیکن خاردار جھاڑی، جو نہ موٹا کرے گی اور نہ بھوک سے بے پروا کرے گی۔''

⑩ زخموں کے دھوون کی خوراک ملے گی:

﴿ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ۝ ﴾ (۶۹/ الحآقۃ:۳۶)

''اور نہ کوئی کھانا، مگر زخموں کا دھوون۔''

⑪ کھانا نگلا نہ جائے گا:

﴿ وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ ﴾ (۷۳/ المزمل:۱۳) ''اور گلے میں اٹکنے والا کھانا۔''

⑫ آگ کے کپڑوں کا لباس ہوگا:

﴿ فَالَّذِينَ كَفَرُوا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّن نَّارٍ ﴾ (۲۲/ الحج:۱۹)

''کافروں کے لیے آگ کے کپڑے قطع ہوں گے۔''

⑬ لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے:

﴿ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۱)

''اوران کے لیے لوہے کے ہتھوڑے ہیں۔''

⑭ گلے میں طوق اورزنجیریں:

﴿ اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ۭ يُسْحَبُوْنَ ﴾ (۴۰/ المؤمن: ۷۱)

''جب انکی گردنوں میں طوق اورزنجیریں ہوں گی وہ کھینچے جائیں گے۔''

﴿ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَلٰسِلَا۟ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِيْرًا ﴾ (۷۶/ الدھر: ۴)

''ہم (خدا) نے کافروں کے لیے زنجیریں اورطوق اورآگ تیار کررکھی ہے۔''

﴿ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴾ (۱۴/ ابراھیم: ۴۹)

''وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔''

دوزخ میں روحانی سزائیں

ان جسمانی سزاؤں کے ساتھ روحانی سزائیں بھی ہوں گی، جو اہل نظر کی نگاہوں میں ان سے بڑھ کر ہوں گی، چنانچہ دوزخ کی وہ آگ جس کی گرمی اورسوزش کا حال اوپر گزرچکا ہے، وہ دل کو جاکر جھانکے گی، فرمایا:

﴿ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ ، الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَي الْاَفْـــِٕدَةِ ﴾ (۱۰۴/ الھمزۃ: ۶، ۷)

''سلگائی ہوئی اللہ کی آگ جو دلوں کو جھانکے گی۔''

﴿ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ ﴾ (۱۰/ یونس: ۵۴)

''اور جب عذاب کو دیکھیں گے، تو اپنی پشیمانی کو چھپائیں گے۔''

﴿ يٰحَسْرَتٰى عَلٰي مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۵۶)

''اے حسرت اس پر کہ میں نے خدا کے پہلو میں کمی کی۔''

﴿ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۲)

''وہ جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے۔''

ذلت کا عذاب

﴿ فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ ﴾ (۴۶/ الاحقاف: ۲۰)

''تو آج ذلت کے عذاب کا بدلہ دیے جاؤ گے۔''

اس افسوس وحسرت وندامت سے بڑھ کر یہ کہ ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی اجازت نہ ہوگی:

﴿ لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ﴾ (٦٦/ التحريم:٧) ''آج معذرت نہ پیش کرو۔''

اللہ عزوجل سے مکالمہ کا شرف ان کو نہ ملے گا، جب وہ بات کرنا چاہیں گے، تو وہ فرمائے گا:

﴿ اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:١٠٨)

''ذلیل ہو اس دوزخ میں اور مجھ سے بات نہ کرو۔''

سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلوہ سے محروم رہیں گے:

﴿ كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ﴾ (٨٣/ التطفيف:١٥)

''ہرگز نہیں، وہ اس دن اپنے رب سے پردہ میں ہوں گے۔''

اُن میں سے وہ جنھوں نے اس دنیا میں اپنے پروردگار کو بھلا دیا تھا، پروردگار بھی اس دن ان کو اپنی رحمت وشفقت کی یاد سے بھلا دے گا، فرمایا:

﴿ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا ۖ وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَىٰ ﴾ (٢٠/ طٰهٰ:١٢٦)

''اسی طرح ہماری آیتیں تیرے پاس آئیں تو، تو نے ان کو بھلا دیا، ایسے ہی آج تو بھی بھلایا جائے گا۔''

بلکہ وہ دوزخی بھی ہوں گے، جو اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم سے بھی محروم رہیں گے، وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے گا اور نہ اُن سے کچھ بات کرے گا اور نہ اُن کی اصلاح حال کی کوئی فکر کرے گا، یہ حقیقت میں شفیق ومہربان رب کی انتہائی ناراضی کی تصویر ہے، اس درد کے احساس کو وہی کچھ سمجھ سکتے ہیں جو عشق ومحبت کے زخم خوردہ ہیں، فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴾

(٣/ آل عمران:٧٧)

''جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی جھوٹی قسموں کے ذریعہ سے تھوڑی سی دولت خریدا کرتے ہیں، وہ یہ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور نہ قیامت میں خدا ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ ان کو سنوارے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

جنت

جنت کے نام

اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا، قرآن پاک میں عموماً ﴿اَلْجَنَّةُ﴾ (باغ) بتایا گیا ہے اور کبھی کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا، مثلاً: ﴿جَنّٰتُ النَّعِيْمِ﴾ (نعمت کا باغ) ﴿جَنَّةُ الْخُلْدِ﴾ (بقائے دوام کا باغ) ﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ﴾ (دائمی سکونت کے باغ) ﴿جَنَّةُ الْمَاْوٰى﴾ (پناہ کا باغ) ان کے علاوہ اور دوسرے لفظوں سے اس کی تعبیر کی گئی ہے مثلاً: فِرْدَوْسٌ (باغ) رَوْضَةٌ (چمن) ﴿دَارُ الْخُلْدِ﴾ (ہمیشگی کا گھر) ﴿دَارُ الْمُقَامَةِ﴾ (قیام کا گھر) ﴿دَارُ السَّلَامِ﴾ (امن وسلامتی کا گھر)

جنت کا دوام

اس موجودہ دنیا میں بھی گو لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت فانی ہے یہاں خوشی کا کوئی ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو، یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے، مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی بھی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے، غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے، جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں، جہاں حیات ہے مگر موت نہیں، راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں، وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں، شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے جس جنت کا نقشہ کھینچا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے کہا: اے آدم!

﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۰)

''کیا میں تجھے سدا جینے کا درخت اور وہ بادشاہی بتاؤں جس کو فنا نہیں۔''

مگر جنت کا یہ وصف سنا کر ان کو جدھر کا راستہ بتایا وہ موت کے درخت اور فنا کے ملک کی طرف کا تھا اور یہی وہ فریب تھا جس میں آدم گرفتار ہوئے، چنانچہ اسی جنتی زندگی کی تلاش میں وہ چیز کھالی جو ان کے حق میں زہر تھی یعنی گناہ کا پھل، نتیجہ یہ ہوا کہ جنۃ الخلد اور غیر فانی ملک سے نکل کر ان کو اس فنا کے ملک میں آنا پڑا اور پھر اس کا استحقاق ان کے اور ان کی نسل کے اعمال کا صلہ قرار پایا، چنانچہ فرمایا:

﴿اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ۭ كَانَتْ لَهُمْ جَزَاۗءً وَّمَصِيْرًا﴾

(۲۵/ الفرقان:۱۵)

''یا ہمیشگی کا باغ جس کا وعدہ پرہیز گاروں سے کیا گیا، جو ان کا صلہ ہوگا اور واپسی کی جگہ۔''

یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ہمیشہ، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ چنانچہ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے، فرمایا:

۱۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا﴾ (۴/ النسآء: ۱۲۲)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور ان میں وہ ہمیشہ کے لیے رہ پڑیں گے، اللہ کا وعدہ سچا ہے اور اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی۔''

اس تاکید پر تاکید اور پرزور طریقۂ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی اَبَدًا فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا، اس پر بھی بس نہ کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے اور اس پر بھی مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے:

۲۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ﴾ (۴/ النسآء: ۵۷)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، ہم ان کو ان باغوں میں داخل کریں گے، جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔''

۳۔ ﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ﴾

(۵/ المآئدۃ: ۱۱۹)

''ان کے لیے وہ باغ ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔''

۴۔ ﴿وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ﴾ (۹/ التوبۃ: ۲۱، ۲۲)

''اور (اللہ ان کو خوشخبری دیتا ہے) کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں، جن میں ہمیشہ کا آرام ہے اور جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔''

۵۔ ﴿اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ﴾

(۹/ التوبۃ: ۸۹)

''اور ان کے لیے وہ باغ مہیا کیے ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہا کریں گے۔''

٦۔ ﴿ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ﴾

(٦٤/ التغابن:٩)

”اس کو ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

٧۔ ﴿ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا ۝ ﴾ (٦٥/ الطلاق:١١)

”اور جو اللہ پر ایمان لائے اور نیک کام کرے اس کو وہ ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے، اللہ نے اس کو روزی خوب دی۔“

٨۔ ﴿ جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ﴾

(٩٨/ البینۃ:٨)

”ان کی مزدوری ان کے رب کے حضور میں بسنے کے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں وہ ہمیشہ رہا کریں گے۔“

یہ آیتیں وہ ہیں جن میں اہل جنت کو جنت میں خلود ابدی کی قطعی بشارت سنائی گئی ہے، ان کے علاوہ وہ آیتیں ہیں، جن میں جنت کی راحتوں اور لذتوں کی ابدیت اور دوام کی خبر دی گئی ہے، فرمایا:

٩۔ ﴿ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝ مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝ ﴾

(١٨/ الکہف:٢۔٣)

”اور ان مومنوں کو بشارت دُوں گا، جنہوں نے اچھے کام کیے کہ ان کے لیے اچھی مزدوری ہے، جس میں وہ ہمیشہ قیام پذیر رہیں گے۔“

سورۂ ص میں جنت کی اکثر نعمتوں کے بیان کے بعد ہے:

١٠۔ ﴿ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ۝ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ۝ ﴾

(٣٨/ صٓ:٥٣، ٥٤)

”یہ وہ ہے، جس کا حساب کے دن تم کو دینے کا وعدہ کیا جاتا ہے، بے شبہ یہ ہماری وہ روزی ہوگی، جس کو ختم ہونا نہیں ہے۔“

١١۔ ﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَاۗءَ رَبُّكَ ۭ عَطَاۗءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ۝ ﴾ (١١/ ہود:١٠٨)

”اور لیکن جو خوش قسمت ہوئے تو وہ جنت میں رہا کریں گے، جب تک آسمان اور زمین ہیں،

لیکن جو تیرا رب چاہے وہ بخشش ہوگی جو منقطع نہ ہوگی۔"

یعنی خدا کی مشیت کے سوا ان کو اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لیے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے، پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان، ہے وہ فنا کیونکر ہوگی:

۱۲۔ ﴿ وَجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴾ (۹/ التوبۃ:۲۱)

"اور وہ باغ، جن میں ان کے لیے قائم رہنے والی نعمت ہوگی۔"

۱۳۔ ﴿ اُكُلُهَا دَآئِمٌ وَّظِلُّهَا ﴾ (۱۳/ الرعد:۳۵)

"جنت کا میوہ اور اس کا سایہ دائمی ہے۔"

۱٤۔ ﴿ وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۝ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ۝ ﴾ (۵٦/ الواقعہ:۳۲، ۳۳)

"اور بہت سے میوے، جن کا نہ انقطاع ہوگا اور نہ جن کی روک ہوگی۔"

۱۵۔ ﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ﴾ (۹۵/ التین:٦)

"لیکن جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے وہ مزدوری ہے، جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔"

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے، پہلی صورت کی نفی تو گزشتہ آیتوں میں کر دی گئی ہے کہ راحت و مسرت کے اسباب کا وہاں خاتمہ نہ ہوگا، اب رہ گئی دوسری صورت تو گو ﴿ خالدین ابدا ﴾ کہہ کر اس کی نفی بار بار کی جا چکی ہے مگر ایک جگہ بتصریح یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اس احاطہ میں موت کا گزر نہ ہوگا، فرمایا:

۱٦۔ ﴿ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ﴾ (٤٤/ الدخان:۵٦)

"جنت میں جنت والے پہلی موت کے سوا پھر موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔"

لیکن ایک تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مسرت کے اسباب بھی قائم رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائم ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہلِ جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے باہر نکال سکے، فرمایا:

﴿ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:٤۸)

"وہاں ان کو کوئی غم نہ چھوئے گا اور نہ وہ اس میں سے نکالے جائیں گے۔"

یہ بھی ممکن ہے، کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں، تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی

کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الٰہی سے نکلنا پسند نہیں کریں گے، فرمایا:

﴿ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ ﴾ (۱۸/ الکہف:۱۰۸)

''سدا رہیں گے اس میں، اس سے منتقل ہونا نہ چاہیں گے۔''

دوام و بقا اور تسلسل وعدم انقطاع کی اس توبرتو تاکید اور اصرار سے اندازہ ہوگا کہ اسبابِ مسرت کی بقا راحت دوام اور زندگی کا تسلسل جنت کی اصلی خصوصیت ہوگی، یہی وہ حقیقت ہے جس کی لالچ شیطان نے

﴿ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۰) ''اور غیر فانی سلطنت۔''

کہہ کر آدم کو دلائی تھی اور اس بہانہ سے اس عالمِ بقا سے ان کو اس عالمِ فنا میں بھجوا دیا، آخر وہ زمانہ آئے گا جب آدم کی اولاد کو ان کے نیک اعمال کی بدولت اس غیر فانی بادشاہی کی وراثت ہمیشہ کے لیے حاصل ہوگی۔

غیر فانی بادشاہی

دنیا میں شخصی راحت و آرام کا بلند سے بلند تخیل، ایک لفظ ''بادشاہی'' کے اندر بخوبی ادا ہوسکتا ہے اگر انسان کو اس کی انتہائی آرزوؤں کے برآنے کی خوشخبری کے دینے کے لیے کوئی لفظ استعمال ہوسکتا ہے تو یہی ہے، گویا بادشاہی اس کیفیت کا نام ہے جس میں انسان کی کوئی آرزو کامیابی سے محروم نہ رہے، سامان راحت اور اسبابِ شادمانی کی فراوانی سے اس کی مسرت میں کسی غم کا شائبہ نہ ہو۔ اونچے اونچے محل، ہرے بھرے باغ، بہتی نہریں، سرسبز و شاداب تختے، سونے چاندی کے اسباب، زر و جواہر کے برتن، زرین کمر غلام وخدام، ریشمی لباس، طلائی تخت، موتیوں کے ہار، سونے کے کنگن، شراب کے زمردیں اور بلوریں پیالے، حسین و مہ جبیں بیگمات، غرض ایک لفظ بادشاہی کے یہ تمام ضروری لوازمے ہیں۔ جنت کی مختصر ترین لیکن سچی تعریف آدم کے دشمن نے، آدم کے سامنے کی تھی:

﴿ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ۝ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۲۰) ''اور غیر فانی بادشاہی۔''

آنے والی زندگی کے اس غیر فانی عیش و مسرت کے لیے، مختلف پیغمبروں نے مختلف الفاظ استعمال کیے ہیں، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے لیے آسمانی بادشاہی کی اصطلاح قائم فرمائی ہے اور اپنی گفتگو کے تمام استعاروں میں اس مفہوم کو اسی لفظ سے ادا کیا ہے، مگر جیسا کہ بار بار کہا گیا ہے کہ انسانی لغت کے الفاظ سے جو مادیت کی گودوں میں پلے اور مادیت کے ماحول میں پھلے پھولے ہیں، کسی خالص روحانی مفہوم کی تعبیر ناممکن ہے کہ اس کے ہر لفظ کے مفہوم کو انہیں لوازم اور خیالات کے ساتھ انسان سمجھنے پر مجبور ہے، جو ہمیشہ سے اس لفظ کے ساتھ وابستہ چلے آتے ہیں، آپ بادشاہی کو آسمانی کہہ کر کسی قدر مادہ سے بلند کریں، مگر بادشاہی کے مفہوم کے ساتھ جو موروثی خیالات و لوازم وابستہ ہیں وہ دور نہیں ہوسکتے، چنانچہ خود حضرت

عیسیٰ علیہ السلام اپنی زندگی کی آخری شب میں شاگردوں کو جب شراب کا پیالہ بھر کر دیتے ہیں تو آسمانی بادشاہی کے مادی لطف و مسرت کا ذکر ان لفظوں میں کرتے ہیں:

''میں پھر تمہیں کہتا ہوں کہ انگور کا شیرہ پھر نہ پیوں گا اس دن تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں اسے نیا نہ پیوں۔'' (متی ۲۶۔۲۹)

آپ نے دیکھا کہ ''باپ'' کی ''آسمانی بادشاہی'' میں بھی انگور ہی کا شیرہ پینے کو ملے گا، اور یوحنا حواری نے جب اس آسمانی بادشاہی کا خواب دیکھا، تو وہ اس کو اسی سونے چاندی کے محل، آب حیات کی نہر اور جواہرات کی دیواروں میں نظر آئی۔ (مکاشفات یوحنا باب (۲۱و۲۲) اور پھر

''وہاں رات نہ ہوگی اور وہ چراغ اور سورج کی روشنی کے محتاج نہیں، کیونکہ خداوند ان کو روشن کرتا ہے اور وہ ابدالآباد بادشاہی کریں گے۔'' (۲۲۔۵)

لیکن یہ ''بادشاہی'' عیسوی پیغام میں ہنوز تفسیر کی محتاج ہے، نبوت کے آخری پیغام نے اس اجمال کی تفصیل ان لفظوں میں کی ہے:

﴿ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآىِٕكِ ۚ لَا يَرَوْنَ فِيْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلٰلُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا تَذْلِيْلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ وَّاَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيْرَا۠ ۝ قَوَارِيْرَا۠ مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا ۝ عَيْنًا فِيْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۝ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۚ اِذَا رَاَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ۝ وَاِذَا رَاَيْتَ ثَمَّ رَاَيْتَ نَعِيْمًا وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ۝ عٰلِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَّاِسْتَبْرَقٌ ۖ وَّحُلُّوْٓا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاۗءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدهر: ۱۱۔۲۲)

''تو اللہ نے اہل جنت کو اس دن کی تکلیف سے بچا لیا اور ان کو تر و تازگی اور شادکامی سے ملایا اور ان کے صبر کے بدلہ میں ان کو رہنے کے لیے باغ اور پہننے کے لیے ریشمی کپڑے دیے، وہ ان باغوں میں تختوں پر تکیے لگائے ہوں گے، ان میں نہ دھوپ ہوگی نہ ٹھنڈ اور ان کے سایے ان پر جھکے ہوں گے، ان کے خوشے پست ہو کر لٹکے ہوں گے، چاندی کے برتن اور نقرائی شیشوں کے آبخورے جو ناپ کر بنائے گئے ہیں ان کو لوگ ان کے پاس لیے پھریں گے اور ان کو وہاں وہ پیالہ پلایا جائے گا جس میں سونٹھ ملی ہوگی اس میں ایک چشمہ کا نام، سلسبیل ہے اور سدا رہنے والے کمسن غلام ان کی خدمت میں گھوم رہے ہوں گے اور تو انہیں دیکھے تو سمجھے

کہ موتی بکھرے ہیں اور جب تو یہ سب دیکھے تو وہاں نعمت وعیش اور بڑی بادشاہی دیکھے، انکی پوشاک سبز نرم ریشم اور دبیز ریشم ہو اور ان کو نقرئی کنگن پہنائے جائیں گے اور ان کا پروردگار ان کو پاک شراب پلائے گا، یہ تمہاری مزدوری ہوگی اور تمہاری محنت کی قدر کی جائے گی۔"

یہ پورا نقشہ اس عیش ومسرت کا ہے جو اس دنیا کے شاہانہ محلوں کے متعلق تخیل میں آتا ہے۔ اس بیان کی تائید وتصدیق اس صحیح حدیث سے ہوگی جو جامع ترمذی میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ صحابی سے مروی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے پوچھا کہ اے پروردگار! جنت والوں میں سب سے کم رتبہ کون ہوگا، فرمایا کہ وہ شخص جو جنت والوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آخر میں آئے گا، تو اس سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ وہ کہے گا کہ اب میں کہاں جاؤں کہ لوگ اپنے اپنے مقام پر جا چکے ہیں اور ربانی نوازشوں پر قابض ہو چکے ہیں، اس سے کہا جائے گا کہ کیا تو اس پر راضی ہے کہ تجھے وہ ملے جو دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس نہ تھا، عرض کرے گا خداوندا! میں راضی ہوں، فرمائے گا: تیرے لیے اتنا اور اس سے دوگنا اور اس سے تین گنا اور چوگنا ہے، کہے گا: خداوندا! میں راضی ہوگیا۔ خدا فرمائے گا: تیرے لیے وہ اور اس کا دس گنا ہے۔ عرض کرے گا، میں راضی ہوگیا۔ فرمائے گا: اس کے ساتھ یہ بھی کہ جو تیرا دل آرزو کرے اور جو تیری آنکھ کو لذت بخشے۔" [1]

باغ کا استعارہ

آخرت کے خانۂ عیش وراحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت اور کہیں روضہ کے لفظ کا استعمال کیا ہے، نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز وشاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے، مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں، بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے، اس لیے عرب کی تخصیص بے معنی ہے، کیا دنیا کے سرسبز وشاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ وراغ اور رنگ وگل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان وگلستان کی تخصیص نہیں، یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے، انسان کسی خطہ ارضی میں آباد ہو، مگر وہ سرسبز وشاداب قطعات، باغ وبہار اور کنارِ آب ونہر کو عیش ومسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارہ کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے، انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن وغم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے، اہل وعیال اور دولت ومال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر وتفریح کے لیے باغ وچمن کا رخ کرتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے

[1] جامع ترمذی، ابواب تفسیر القرآن، ومن سورة السجدة: ۳۱۹۸ (حدیث حسن صحیح)

وہ ہر غم کو فراموش اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں، وحی محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے، تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھینچ جائے گی۔

سامانِ جنت کے دنیاوی نام

یہ حقیقت بار بار دہرائی گئی ہے کہ عالم آخرت کی اشیاء کو جن دنیاوی الفاظ سے ادا کیا گیا ہے ان سے مقصود بالکل وہی نہیں ہیں جو ان لفظوں سے سمجھنے کے ہم عادی ہیں، بلکہ ان اخروی اشیاء کو ان دنیاوی الفاظ سے اس لیے ادا کیا گیا ہے کہ وہ ان سے خاص مناسبت رکھتی ہیں، ورنہ از روئے حقیقت ان الفاظ کے لغوی مفہوم و معنی سے اُن کی اخروی حقیقتیں بدرجہا بلند واتم ہوں گی، چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں میں:

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڰ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۵، ۲۶)

''اور ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے یہ خوشخبری سنا کہ ان کے لیے وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ، جب ان باغوں سے کوئی پھل دیے جائیں گے، کہیں گے کہ یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہم کو دیا گیا تھا اور وہ ان کو ایک دوسرے کے مشابہ دیا جائے گا اور ان باغوں میں انکی صاف ستھری بیویاں ہوں گی اور وہ ان باغوں میں رہا کریں گے بے شبہ خدا اس سے شرمندہ نہیں کہ وہ ایک مچھر کی یا اس سے بھی کم رتبہ چیز کی مثال بیان کرے۔''

ان آیتوں کے سیاق و سباق اور نظم و ترتیب پر لحاظ کر کے میرے ذہن میں یہی معنی آتے ہیں کہ ان میں دنیاوی الفاظ اور ان کے اخروی مفہوم کے درمیان تشابہ کا بیان ہے ورنہ حقیقت کی رو سے ان الفاظ کے دنیاوی ولغوی معانی اور اخروی معنوں میں وہی نسبت ہے جو مچھر اور کسی عظیم الجثہ شے کے درمیان ہو سکتی ہے، یہی سبب ہے کہ جنت کی لذتوں اور نعمتوں کی نسبت قرآن نے یہ بھی کہا ہے:

﴿ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾

(۳۲/ السجدۃ:۱۷)

''تو کسی نفس کو معلوم نہیں کہ ان کے لیے ان کے (اچھے) اعمال کے بدلہ میں آنکھوں کی جو ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔''

اس آنکھوں کی ٹھنڈک ''یعنی لذت وراحت'' کی کیفیت دنیاوی تخیل سے چونکہ بہت بلند ہے اس

لیے یہ فرمایا گیا کہ جنت کی راحت ولذت کی حقیقت علم وفہم سے پوشیدہ اور مخفی ہے، آنحضرت ﷺ نے اسی مفہوم کو اپنے ان مبارک الفاظ سے واضح فرمادیا:

((قال اللّٰہ اعددت لعبادی الصلحین مالا عین رأت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر)) [1]

''خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ مہیا کیا ہے، جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔''

اگر جنت کے باغوں، نہروں، میووں، غلاموں، شرابوں، ریشمی کپڑوں اور طلائی زیوروں کی وہی اخروی حقیقت ہے جو ان لفظوں سے لغوی طور پر ہم اس دنیا میں سمجھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بہشت کی لذتوں اور مسرتوں کو ایک مخفی حقیقت نہ فرماتا اور نہ آنحضرت ﷺ اس کی توضیح میں اس درجہ بلندی کرتے کہ وہ ایسی چیزیں ہیں، جن کو آنکھوں نے دیکھا، نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی انسان کے خیال میں گزریں، مزید تاکید روایت کے دوسرے الفاظ میں ہے:

((بلہ ما أطلعتم علیہ)) [2] ''جو تم جانتے ہو اس کو چھوڑ دو۔''

صحیح مسلم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((بلہ ما اطلعکم اللّٰہ علیہ)) [3] اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ''بلکہ خدا نے تم کو اس پر مطلع بھی نہیں کیا ہے۔'' دوسرے یہ ''خدا نے اس کا جو حال بتایا ہے، اس سے بھی درگزر کرو۔''

غرض ان لفظوں سے جو بھی تم سمجھ سکتے ہو، اس کو چھوڑ کر آگے بڑھو، اصحابِ تفسیر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بسند نقل کیا ہے:

وقال السفیان الثوری عن الا عمش عن ابی ظبیان عن ابن عباس لا یشبہ شیء مما فی الجنۃ مافی الدنیا الا فی الاسماء.

''سفیان ثوری اعمش سے اور وہ ابوظبیان سے اور وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں جو کچھ ہے وہ دنیا کی چیزوں سے ناموں کے سوا اور کسی بات میں مشابہ نہیں۔''

دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں:

((لیس فی الدنیا مما فی الجنۃ الا الاسماء)) [4]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید: ۷۴۹۸ وکتاب التفسیر: ۴۷۷۹؛ صحیح مسلم، کتاب الجنۃ: ۷۱۳۴ وترمذی ابواب التفسیر: ۳۱۹۷۔ [2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ السجدۃ: ۴۷۸۰۔

[3] صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا: ۷۱۳۳۔ [4] تفسیر ابن جریر طبری، ج ۱، ص: ۱۳۳ وبیھقی فی البعث کما فی الدر المنثور للسیوطی تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱، ص: ۳۸۔

''جنت میں جو کچھ ہے وہ ناموں کے سوا دنیا میں نہیں۔''

غرض ان الفاظ سے انہی دنیاوی مشاہدات کی چیزوں کو سمجھنا ضروری نہیں بلکہ ان سے بدرجہا بلند لذائذ اور مسرتیں مراد ہیں، جن کی تعبیر کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ کسی وجہ مناسب کے سبب سے ان کو ان دنیاوی لفظوں سے ادا کیا جائے اور اس پر بھی مفہوم ادا نہ ہو سکے، اس میں اشکال نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی عدمِ قدرتِ کلام کے سبب سے نہیں ہے بلکہ عاجز انسانوں کی ذہنی درماندگی کے سبب سے ہے کہ نادیدہ و ناشنیدہ اور دردل ناخلیدہ مفاہیم کے لیے ان کی زبان ولغت میں کوئی لفظ ہی نہیں۔

جنت کی مسرتیں اعمال کی تمثیل ہیں

یہ اصول بار ہا بیان میں آ چکا ہے کہ دوزخ کی تکلیفیں ہوں یا جنت کی مسرتیں، دونوں اعمالِ انسانی کی تمثیلیں ہیں، اسی لیے قرآن پاک نے بتصریح تمام یہ کہا ہے:

﴿ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ ﴾ (۵۲/ الطور:۱۶)

''وہی بدلہ پاؤ گے، جو تم کرتے تھے۔''

حدیث میں آتا ہے کہ ''قیامت میں خدا فرمائے گا: اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی عمل ہیں، جو تم کو واپس مل رہے ہیں تو جو نیکی پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جو برائی پائے وہ اپنے آپ کو ملامت کرے۔'' [1]

مثلاً: وہ نیکوکار جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے خوف سے ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے تھے، ان کو جنت میں امن وامان اور سلامتی کے ساتھ وہاں کی تمام راحتیں ملیں گی تو:

﴿ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ۝ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ۝ ﴾

(۵۲/ الطور:۲۶، ۲۷)

''کہیں گے ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرتے تھے، تو خدا نے ہم پر مہربانی فرمائی اور ہم کو دوزخ کی لو کے عذاب سے بچا لیا۔''

اس آیت سے صاف نمایاں ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ڈرتے تھے وہ قیامت میں گرم لو کے عذاب سے بچائے جائیں گے قہر وغضب کی تمثیل شعلہ آتش، لو وغیرہ گرم چیزوں سے ہے، تو جو لوگ دنیا میں خدا کے قہر وغضب سے ترساں تھے دیکھو کہ قیامت میں ان کو بادِ سموم یا گرم ہوا کی لو سے بچائے جانے کی بشارت ملی۔

دولتمند وقوی دست منکرین، کمزور اور غریب مسلمانوں کو دیکھ کر دنیا میں ان پر تحقیرانہ ہنستے تھے۔ قیامت میں اس کا الٹا ہوگا یہ ان پر ہنسیں گے۔ فرمایا:

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحريم الظلم: ٦٥٧٢۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ ۝ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ ۝ وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ ۝ وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ ۝ فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ۝ ﴾

(۸۳/ التطفیف:۲۹۔۳٤)

''بے شک گناہگار، ایمان والوں پر ہنستے تھے.........تو آج ایمان والے کافروں پر ہنسیں گے۔''

نیکو کاروں کے دنیا کے آنسو یہاں تبسم اور خندہ مسرت میں بدل گئے اور گناہگاروں کی وہاں کی ہنسی یہاں آنسوؤں کا تار بن کر ظاہر ہوئی۔

گناہگار جو دنیا میں اپنی دولت وقوت کے نشہ میں چور اور اپنے اہل وعیال کے ساتھ خوش اور مسرور رہتے تھے، وہ یہاں غمگین ہوں گے اور جو وہاں غمگین تھے وہ یہاں خوش اور مسرور ہوں گے:

﴿ فَسَوْفَ يَدْعُوْا ثُبُوْرًا ۝ وَّيَصْلٰى سَعِيْرًا ۝ اِنَّهٗ كَانَ فِيْٓ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ ﴾

(۸٤/ الانشقاق:۱۱۔۱۳)

''تو وہ موت کو پکارے گا اور دوزخ میں داخل ہوگا کیونکہ وہ اپنے اہل وعیال میں (مغرورانہ) خوش تھا۔''

اور غریب ومسکین جو وہاں اہل وعیال میں بیٹھ کر بھی مسرت سے ناآشنا تھے، ان کا یہ حال ہوگا کہ

﴿ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا ۝ وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ ﴾

(۸٤/ الانشقاق:۸، ۹)

''تو اس سے آسان حساب لیا جائے گا اور وہ خوش خوش اپنے لوگوں کے پاس لوٹے گا۔''

قرآن پاک میں بارہا یہ آیتیں یا بعینہٖ ان ہی معنوں کی آیتیں آئی ہیں:

﴿ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۵)

''اور ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کو باغ کی خوش خبری سنا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

ان آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل باغ اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی کے ساتھ آتا ہے، اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی خاص تمثیلی تعلق ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ درخت اصلی چیزیں ہیں جن کی ترقی اور نشو ونما پانی سے ہوتی ہے بعینہٖ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال کی آبیاری سے ہوتی ہے اگر ایمان ہو اور اعمال صالح نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشو ونما کی امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہے اور ایمان نہیں، تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود وعدم یکساں ہے، اس تمثیل کے ذہن میں آنے کے ساتھ قرآن پاک کی یہ آیت سامنے آتی ہے:

﴿ وَأُدْخِلَ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا بِإِذْنِ رَبِّهِمْ ۖ تَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلَامٌ ۝ أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۝ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا ۗ وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝ ﴾ (۱۴/ ابراهیم:۲۳۔۲۵)

''اور جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ ان باغوں میں داخل کیے گئے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ان میں سدا رہیں گے، وہاں سلامتی کی مبارکباد ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ خدا نے کیسی ایک مثال بیان کی، نیک بات ایک ستھرے درخت کی طرح ہے، جس کی جڑ مضبوط ہو اور ٹہنی آسمان میں ہو، اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ہمہ وقت پھل لایا کرتا ہے اور خدا مثالیں بیان کرتا ہے کہ لوگ شاید سوچیں۔''

اس آیت میں جنت اور کلمہ طیبہ کے درخت کی پوری تمثیل ہے، یہاں تک تقابل ہے کہ پہلے میں جب یہ کہا گیا کہ ''اپنے پروردگار کے حکم سے وہ ان باغوں میں سدا رہیں گے۔'' تو دوسرے میں ہے کہ ''وہ درخت اپنے پروردگار کے حکم سے سدا پھل دیتا رہے گا۔'' کلمہ طیبہ سے یہاں مراد ایمان ہے، جس [1] کی جڑ مضبوط و مستحکم اور اس کی شاخیں آسمان میں اور اس کے پھل سدا پھلنے والے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ صحابی کی وفات کے بعد ان کی ایک ہمسایہ صحابیہ رضی اللہ عنہا نے خواب میں دیکھا کہ ایک نہر بہہ رہی ہے اور جب یہ معلوم ہوا کہ یہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی ہے، انھوں نے آ کر یہ خواب آنحضرت ﷺ سے بیان کیا، آپ نے اسکی تعبیر میں فرمایا: ((ذلك عمله يجرى له)) ''یعنی یہ نہر ان کا عمل ہے جو ان کے لیے بہہ رہی ہے۔'' [2]

ان دونوں سابقہ حوالوں سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ ایمان کی تمثیل سدا بہار درخت سے اور عمل کی تمثیل نہر رواں سے ہے، اس بنا پر اہلِ جنت کے لیے بار بار جس باغ اور نہر جاری کی بشارت دی گئی ہے، وہ حقیقت میں ان کے ایمان اور عمل صالح کی تمثیلی شکلیں ہوں گی، ان کا ایمان خوشنما اور سدا بہار باغ اور ان کے اعمالِ صالحہ صاف و شفاف نہر کی صورت میں نمایاں ہوں گے اور وہ ان سے لطف و لذت اٹھائیں گے۔

اسی قیاس پر جنت کی دوسری لذتوں اور مسرتوں کی حقیقت کی تشریح کی جا سکتی ہے، علومِ نبوی کے ایک بڑے واقف کار اور اسرار شریعت کے ایک بڑے دانائے راز شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

واكثر الوقائع الحشرية من هذا القبيل .... وبالجملة فتشبحات

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱۳، ص: ۱۲۰۔

[2] صحیح بخاری، کتاب التعبیر، باب العین الجاریة فی المنام: ۷۰۱۸۔

وتمثلات لما عندها .... وتتشبع النعمة بمطعم هنئي ومشرب مريئي ومنكح شهي وملبس رضي ومسكن بهي۔ [1]

''حشر کے واقعات از قبیل تمثیل ہیں .... حاصل یہ کہ یہ تمام امور معانی کا جسمانی قالبوں میں اور مثالی صورتوں میں ظاہر ہونا ہے .... اللہ تعالیٰ کی عنایت و مہربانی خوش مزہ کھانے، خوش گوار پینے کی چیزوں، رغبت انگیز لذتِ نکاح، دل پسند لباس اور عمدہ مسکن کی صورتوں میں نمایاں ہوگی۔''

ہم نے آیات و احادیث کے حوالوں سے پہلے کئی دفعہ یہ دکھایا ہے کہ اس تمثیل و تشبیہ کے کیا معنی ہیں اور کیونکر غیر مجسم معانی اپنے مناسب قالبوں میں مجسم ہو کر وجود پذیر ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام اعمال صالحہ کی اگر تحلیل کی جائے تو ان کی اولاً دو قسمیں نکلیں گی، خدا پر ایمان اور خلوصِ دل سے اس کی اطاعت، جس کو حقوق اللہ کہتے ہیں اور دوسری بندگانِ الٰہی کے ساتھ حسنِ سلوک، بندگانِ الٰہی کے ساتھ جو نیک سلوک کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ ان کی عزت و آبرو کا پاس کیا جائے، جس کو عفت و عصمت کہتے ہیں اور ان کی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں امداد کی جائے اور ضروریات زندگی یہی کھانا، پینا، پہننا اور رہنا ہیں انہیں کی نسبت ہم ان کے ساتھ حسنِ سلوک کر سکتے ہیں، اب یہ پانچ قسمیں ہوئیں، جنت کی نعمتیں انہیں پانچ قسموں میں منحصر ہیں۔ ایمان و اخلاص و اطاعت کی جزا وہ خود تبارک و تعالیٰ ہے، وہ اپنے دیدار سے نوازے گا، عفت و عصمت کی جزا حسین و مہ جبیں بیویوں کی صورت میں نمایاں ہوگی، دوسروں کے کھلانے کی جزا جنت کے باغ اور پھل اور قسم قسم کے الوانِ طعام ہیں، دوسروں کو پلانے کی جزا خوش مزہ و خوشگوار پینے کی مختلف چیزوں کی فراوانی ہے، پہنانے کی جزا ریشم و حریر و دیبا و اطلس اور بہتر سے بہتر خوشنما لباس ہے اور رہنے اور رکھنے میں حسنِ سلوک کی جزا، خوش منظر مکان و قیام گاہ ہے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی بہشت کی صفت یہ بیان فرمائی ہے:

﴿ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۱۸، ۱۱۹)

''بے شک تیرے لیے اس بہشت میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ ننگا اور پیاسا ہونا، نہ دھوپ میں رہنا۔''

یہی چار مختصر انسانی ضرورتیں ہیں جو پھیل کر ایک دنیا ہوگئی ہیں، جب آدم کی اولاد کو اپنے اعمال صالحہ کی بدولت نجات ملے گی تو پھر ان کے لیے وہی بہشت ہے، جس میں نہ بھوکا ہونا ہے، نہ پیاسا ہونا ہے، نہ ننگا ہونا، نہ گرمی اور نہ دھوپ کی تکلیف میں گرفتار ہونا، اس حقیقت کی تعبیر دو طرح سے کی جا سکتی ہے، یا تو یہ کہ بہشت

---

[1] حجة الله البالغة، ص:٣٦۔

میں اہل بہشت کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ وہ ان تمام انسانی ضرورتوں سے یکسر پاک و بے نیاز ہو جاتے ہیں، اس لیے وہاں نہ کوئی بھوکا ہوگا نہ پیاسا ہوگا اور نہ ننگا ہوگا اور نہ دھوپ اور لو کی محنت میں گرفتار، دوسرے یہ کہ بہشت میں اہل بہشت کو کھانے کے لیے ایسے الوان نعمت ملیں گے جن کو کھا کر انسان پھر بھوکا نہ ہوگا اور پینے کے لیے شراب وشربت کی وہ نہریں بہیں گی جن کو پی کر پیاسا نہ ہوگا اور پہننے کو وہ کپڑے ملیں گے جو پھر نہ میلے ہوں گے اور نہ بوسیدہ ہو کر پھٹیں گے اور رہنے کے لیے ایسے گھنے باغ اور بلند مکانات ملیں گے جہاں دھوپ کا گزر نہ ہوگا۔ یہ اصول پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ دنیا میں انسان کے لیے جو لطف ولذت ہے، وہ تھوڑی سی تکلیف کا نتیجہ ہے۔ انسانی اصول یہ ہے کہ بڑی لذت کے حصول کے لیے تھوڑی تکلیف گوارہ کرتا ہے اور بڑی مسرت پر چھوٹی مسرت کو قربان کرتا ہے، اسی اصول پر اس کے تمام اعمال کی کامیابی و ناکامیابی کی بنا ہے، اعمال صالحہ کے بجالانے میں انسان کو اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی تکلیفیں برداشت کرنی پڑتی ہیں اور اپنی عارضی خوشیوں اور لذتوں کو ان پر قربان کرنا ہوتا ہے۔ صبح کے نمازی کو خواب سحر کی لذت کو خیر باد کہنا اور دوپہر کی جلتی دھوپ میں ظہر کے لیے مسجد میں جانا پڑتا ہے، خود بھوکا رہ کر دوسروں کو کھلانا پڑتا ہے اور اپنی بہت سی ناجائز مگر بظاہر دلچسپ خوشیوں کا ایثار کرنا پڑتا ہے، اسی طرح پاکیزہ زندگی گزارنے پر اس کو آخرت کی غیر فانی دولت اور ابدی سعادت میسر آتی ہے۔

انسان کو دنیا میں ان اعمال صالحہ کی خاطر جن چیزوں کو قربان کرنا پڑتا ہے ان میں پہلی چیز تو خود اس کی زندگی ہے، پھر انسانی زندگی کی وہ چار قسمیں ہیں، جن کا نام، کھانا، پینا، پہننا، رہنا ہے اس لیے آخرت میں ان قربانیوں کی جزا میں انہیں کی مناسب و مماثل چیزیں جو ملیں گی وہ غیر فانی زندگی، الوانِ طعام، اقسام شراب و شربت، انواع لباس اور بہترین مسکن ہیں، قرآن پاک میں ہے:

﴿ فَأَمَّا مَنْ طَغَىٰ ۝ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ۝ فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝ ﴾ (۷۹/ النازعات: ۳۷۔۴۱)

''پس جس نے خدا سے سرکشی کی اور دنیاوی زندگی کے ناجائز لطف وآرام کو ترجیح دی، تو دوزخ اس کا ٹھکانا ہے، لیکن جو خدا کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشوں سے روکا تو اس کا ٹھکانہ بہشت ہے۔''

گو اس کی جزئی نیکیوں کی جزا تو وقتاً فوقتاً اس دنیا میں تھوڑی تھوڑی کر کے شہرت، تعریف، ہر دلعزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے، مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا دوسری زندگی ہی میں اس کو ملے گی۔

﴿ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۸۵)

''اور تمہاری مزدوری قیامت کے دن پوری ادا کی جائے گی۔''

لطف و مسرت کا تصور

مسرت ایک نفسی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو اپنی کسی خواہش کے پورے ہوتے وقت حاصل ہوتی ہے، اس بنا پر مسرت کے وجود کے لیے کسی خواہش کی تکمیل ضروری ہے، اب انسانی خواہشوں کی تحلیل کرو، تو بالآخران کی انتہا انہیں باتوں پر ہوگی جن کی طلب اس کی فطرت کے اندر ودیعت کردی گئی ہے، اب غور کرو کہ وہ کیا چیزیں ہیں یا کیا چیزیں اس کے فہم میں آسکتی ہیں، وہ یہی ہیں باغ و بہار، لباس و طعام، حور و قصور، خدم و حشم، سامان و اسباب اور زر و جواہر، مسرت اور راحت کا جب کبھی تخیل آئے گا اور جب کبھی ہم ان کو سمجھنا چاہیں گے اور کہنا چاہیں گے تو ہم کو انہیں چیزوں کا نقشہ کھینچنا پڑے گا اور ہماری انسانی فطرت انہیں مسرتوں اور خوشیوں کو ڈھونڈنے کی عادی ہے اور انہیں کے حصول کی خاطر دنیا میں ہر طرح کی سیہ کاری اور گنہگاری کی مرتکب ہوتی ہے اس لیے ان سے احتراز کرنے پر جو چیزیں ہم کو وہاں ملیں گی، وہ ہمارے انہیں عادی و مانوس اسبابِ مسرت کی صورتوں میں ہمارے سامنے پیش ہوں گی اور ہم ان سے لطف اندوز ہوں گے۔

لطف و مسرت کا اعلیٰ ترین تخیل

اس دنیائے کون و فساد میں ہم ایک عجیب قسم کی مصیبت میں مبتلا ہیں ہم کو تخیل کے لحاظ سے اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کی وسیع اور غیر محدود دنیا بخشی گئی ہے لیکن عملاً اپنی اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے مطابق اپنی دنیا بنا لینے پر قدرت نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگر ہم نے صبر و شکر کا دامن نہیں پکڑا تو ہم سے زیادہ اس دنیا میں تصور و تخیل کی تکلیف میں کوئی اور گرفتار نہیں، جنت آخرت کی اس دنیا کا نام ہے، جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی:

﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۭ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (١٦/ النحل:٣١)

''رہنے کے باغ، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں ان کے لیے ان باغوں میں وہ ہے، جو وہ چاہیں، اللہ اسی طرح پرہیزگاروں کو بدلہ دے گا۔''

﴿ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴾ (٤١/ حٰمٓ السجدة:٣١)

''اور تمہارے لیے جنت میں وہی ہے، جو تمہارے دل چاہیں اور تمہارے لیے اس میں وہ ہے، جو تم مانگو۔''

﴿ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ﴾ (٥٠/ ق:٣٥)

''ان کے لیے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہیں اور ہمارے پاس اس سے بھی بڑھ کر ہے۔''

﴿ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ ﴾ (٤٣/ الزخرف:٧١)

''اور جنت میں وہ ہے، جس کی دل خواہش کریں اور جو آنکھوں کو لذت دے۔''

﴿ لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُولًا ﴾ (٢٥/ الفرقان:١٦)

''ان کے لیے جنت میں وہ ہے، جو وہ چاہا کریں گے ہمیشہ، یہ وعدہ ہے تیرے رب کے ذمہ۔''

﴿ لَهُم مَّا يَشَاءُونَ عِندَ رَبِّهِمْ ﴾ (٣٩/ الزمر:٣٤)

''ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں گے۔''

الغرض جنت وہ مقام ہے جہاں ہم کو وہ کچھ ملے گا جہاں تک ہمارا مرغ خیال اڑ کر پہنچ سکتا ہے، لطف و مسرت کا وہ بلند سے بلند تخیل جو تصور میں آ سکتا ہے وہاں ہمارے لیے مہیا ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ہر قسم کے لوگ تھے جنت کے سامان مسرت کے متعلق وہ اپنی اپنی پسند اور آرزو کے مطابق آپ سے پوچھتے رہتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''جنت میں جو سب سے کم رتبہ ہوگا اس کی کیفیت بھی یہ ہوگی کہ خدا تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ تو اپنی انتہائی آرزو دل میں خیال کر وہ کرے گا تو اللہ فرمائے گا کہ تجھ کو وہ سب دیا گیا جس کی تو نے آرزو کی تھی اور اس کے برابر [1] یہاں تک کہ بازار کا شوق ہوگا تو بازار بھی لگے گا، لیکن وہ حقیقی خرید و فروخت نہ ہوگی کہ ہاں کسی چیز کی کمی ہوگی بلکہ وہ مثالی صورتوں میں ہوگی۔ (الا الصور من الرجال) [2]

کسی کو جنت میں کھیتی کا شوق ہوگا تو دانہ، سبزہ، غلہ اور پھر تیاری یہ سب کام منٹوں میں انجام پا جائے گا، [3] ایک بدوی نے پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! وہاں گھوڑے بھی ہوں گے؟ فرمایا کہ ''اگر تم کو جنت ملی تو اگر تم یہ بھی چاہو گے کہ سرخ یاقوت کا گھوڑا ہو جو تم کو جہاں چاہو بہشت میں لیے پھرے تو وہ بھی ہوگا۔'' دوسرے نے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اونٹ بھی ہوگا؟ فرمایا: ''اگر تم جنت میں گئے تو تمہارے لیے وہ سب کچھ ہوگا جو تمہارا دل چاہے گا اور جو تمہاری آنکھیں پسند کریں گی۔'' [4]

جنت میں اہل جنت کے مختلف رتبے ہوں گے۔ اس لیے اعلیٰ کے لباس و سامان کو دیکھ کر ادنیٰ کو اپنی کمی کا خیال ہوگا تو اس کے تصور میں یہ پیدا کر دے گا (حتى يتخيل اليه) [5] کہ خود اس کا لباس و سامان اس سے بہتر ہے اور یہ اس لیے ہوگا کہ جنت میں کسی کو غم ہونا ممکن نہیں۔ [6]

جنت جہاں کوئی جسمانی و روحانی آزار نہیں

کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے کہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب آخر اهل النار...... ٤٦٢۔ [2] ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی سوق الجنة: ٢٥٥٠۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الحرث والمزارعة: ٢٣٤٨۔

[4] ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی صفة خیل الجنة: ٢٥٤٣۔ [5] ترمذی میں "الیه" کے بجائے "علیه" کے الفاظ ہیں۔ [6] ترمذی، ابواب صفة الجنة، باب ما جاء فی سوق الجنة: ٢٥٤٩۔

ع بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو یا تو موجودہ مسرت کے آیندہ ختم ہونے کا خوف ہے اور یا گزشتہ ناکامی کا افسوس ہے، اس بنا پر یہاں کوئی خوشی بھی کامل نہیں، مگر جنت وہ مقام ہوگا، جہاں نہ ماضی وحال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا، چنانچہ اہل جنت کے متعلق بار بار ارشاد ہوا:

﴿ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ (۱۰/ یونس:۶۲)

''نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی اس میں جسمانی وروحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دنیا میں کوئی انسان اس وقت تک کوئی لقمہ گلے سے نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک اس کے سر کا پسینہ اس کے پاؤں تک نہ آئے، دنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوشش کا فانی نتیجہ ہیں، مگر جنت کی خوشیاں بے غم وتکلیف ہماری گزشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ تعالیٰ کا رحم و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت ومشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا جس کے بغیر دنیا میں کوئی انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے، چنانچہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو کر اور شاہانہ تزک واحتشام اور لباس وزیور سے آراستہ ہو کر خدا کی حمد وتعریف کا ترانہ ان لفظوں میں گائیں گے:

﴿ جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۚ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ۭ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۝ الَّذِيْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ۝ ﴾

(۳۵/ فاطر:۳۳۔۳۵)

''رہنے کے باغ جن میں وہ داخل ہوں گے اور ان میں وہ سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک ان میں ریشم ہوگی اور وہ کہیں گے کہ پاک ہے وہ جس نے ہم سے غم دور کر دیا بے شک ہمارا پروردگار گناہوں کا معاف کرنے والا اور نیکیوں کی قدر کرنے والا ہے، وہ جس نے ہم کو اپنی مہربانی سے رہنے کے گھر میں اتارا اور ہم کو وہاں نہ مشقت پہنچی اور نہ اس میں ہم کو تھکنا ہے۔''

﴿ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۴۸)

''اس میں ان کو کوئی آزار نہ ہوگا اور نہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔''

جنت جہاں رشک وحسد نہیں

موجودہ دنیا خیر وشر کے متضاد عناصر سے بنی ہے، یہاں ثواب کے ساتھ گناہ، رحم دلی کے ساتھ سنگدلی، محبت کے ساتھ کینہ ہے، یہ گناہ وکینہ اور بغض وحسد، وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن وامان کے خرمن میں آگ لگا رکھی ہے، ہر شخص یہاں دوسروں کو اچھی حالت میں دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے ابلتا ہے، جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا ہر قسم کے گناہ، سنگدلی، عداوت اور بغض وحسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبت والفت کے دریا موجزن ہوں گے۔ فرمایا:

﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ﴾ (۱۹/ مریم:۶۲)

''اس میں امن وسلامتی کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے۔''

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ﴾ (۷/ الاعراف:۴۳)

''اور ہم نے ان کے سینوں سے کینہ کھینچ لیا، ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔''

﴿ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ ﴾ (۱۵/ الحجر:۴۷)

''اور ہم نے ان کے سینے سے کینہ کھینچ لیا، بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔''

اس کی تفسیر میں حدیث صحیح میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا نہ باہم بغض وکینہ سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے۔'' [1]

وہاں کی جسمانی زندگی کیسی ہوگی؟

بہشت میں زندگی کی جو لذتیں ہوں گی ان کی تعبیر الوان نعمت اور انواع شربت وشراب اور دوسرے مادی لذائذ سے ہو سکتی ہے مگر وہ حظ ومسرت اور اطمینان وسکون وسکینت کے علاوہ کسی معنی میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوگی یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول وبراز، پسینہ اور سوئے ہضم کی علت لگی ہوئی ہے اور بغیر اس کے انسان یہاں زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول وبراز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی، نہ بلغم اور کھکھار جیسی گھناؤنی چیزیں ہوں گی، کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی، جو بہشت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی، نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی۔ وہاں منادی غیب یہ پکار کر کہہ دے گا یہاں وہ تندرستی ہے کہ بیمار نہ پڑو گے، وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی، وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہو گے اور وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے، کوئی ستارہ کی طرح، کوئی

[1] صحیح مسلم، کتاب صفة الجنة، باب فی صفات الجنة واهلها: ۷۱۵۱۔

چودھویں کے چاند کی طرح۔'' [1]

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی، ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی، اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کی سانس اور دوسرے لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات وقوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے۔ اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کے حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادہ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگی، ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالم آب وگل کے باشندے اس دوسری زندگی کے اصول حیات، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہوں تو ان کا بھی یہ فعل دانش مندی کے خلاف ہوگا۔

جنت ارتقائے روحانی ہے

مادی وجسمانی خلقت وفطرت کی لاکھوں برس کی تاریخ کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچی ہے کہ مادہ نے لاکھوں برس کے تغیرات کے بعد اس انسانی جسمانیت تک ترقی کی ہے، وہ پہلے جماد بنا، پھر نبات کی شکل میں آیا، پھر حیوان کا قالب اختیار کیا، پھر جسم انسانی کی صورت میں نمودار ہوا اور یہ مادیت کی معراج ترقی ہے، جمادیت مٹ کر نباتیت پیدا ہوئی اور نباتیت فنا ہو کر حیوانیت نمودار ہوئی، پھر حیوانیت معدوم ہو کر انسانیت ظہور پذیر ہوئی اور ارتقائے انسانی کا جسمانی پہلو تکمیل کو پہنچ گیا، لیکن انسانیت کا دوسرا رخ جو روحانیت سے عبارت ہے، ہنوز اپنے آغاز طفولیت میں ہے، کیا اس پر بھی اسی ارتقائی دور کے مدارج نہیں آئیں گے، ایک مادہ پرست صرف بام ارتقا تک زینہ بزینہ چڑھ کر ٹھہر جاتا ہے، لیکن مذہب اس سے بھی آگے لے چلتا ہے اور یہاں سے وہ اڑ کر سقف آسمان تک پہنچتا ہے اور ملکوتیت کی سرحد کی ترقی شروع کرتا ہے، قرآن پاک کی ان آیتوں پر غور کرنے سے اس نظریہ کے اشارات نکلتے ہیں:

﴿ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۱-۱۴)

''جو فردوس کی وراثت پائیں گے اور وہ اس میں صدا رہیں گے اور ہم (خدا) نے انسان کو مٹی کی کشید سے بنایا، پھر اس کو (رحم نسوانی کے) ایک ٹھہراؤ کی جگہ میں ایک بوند بنایا پھر اس بوند کو بندھا ہوا خون بنایا، پھر اس خون کو لوتھڑا بنایا، پھر ہڈیوں کو گوشت پہنایا، پھر اس کو ایک نئی صورت میں اٹھا کر کھڑا کیا، تو برکت والا سب سے بہتر بنانے والا (خدا)۔''

---

[1] یہ احادیث صحیح مسلم، كتاب صفة الجنة، باب فى صفات الجنة وأهلها: ۷۱۵۲ تا ۷۱۵٦ میں ہیں۔

لیکن یہ ترقی یہیں تک پہنچ کر رک نہیں جائے گی بلکہ آگے بھی ہوگی اس لیے جس طرح ماں کے پیٹ کی تنگ وتاریک دنیا میں زیست وحیات کے کچھ قواعد تھے پھر عالم کی اس سے بھی وسیع تر دنیا میں اس نے قدم رکھا جہاں ترقی وحیات کے دوسرے ہی اصول ہیں اس طرح اس مادی دنیا سے نکل کر اس وسیع تر دنیا میں قدم رکھے گا جہاں ترقی اور سعادت کے اور دوسرے اصول ہوں گے، چنانچہ اس کے بعد، فرمایا:

﴿ ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ۝ ﴾

(۲۳/ المؤمنون:۱۵، ۱٦)

''پھر بے شک تم اس کے بعد مرنے والے ہو اور پھر قیامت کے دن اٹھائے جاؤ گے۔''

جس طرح انسانیت سے پہلے لاکھوں برس میں ایک نوع کی کیفیت مٹ کر دوسری نوع کی کیفیتیں پیدا ہوتے ہوتے انسانیت تک نوبت پہنچی، موت کے معنی یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تمام کیفیتیں مٹ کر ایک بلند تر نوع کی کیفیتوں کی تیاری شروع ہوئی، صدہا ہزارہا سال کے بعد قیامت سے دوسری نوع ملکوتی کا ظہور ہوگا۔ یہاں مسئلہ ارتقا کا دوسرا اصول سامنے آتا ہے، جس کو بقائے اصلح کہتے ہیں، ان مدارج ترقی کے اثنا میں ہزاروں وہ نوعیں فنا ہوتی رہتی ہیں جن میں آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور وہی باقی رہ جاتی ہیں جن میں آئندہ بقا کی پوری استعداد ہوتی ہے، جس طرح پچھلی استعداد سے آئندہ کی استعداد پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اس دوسری ملکوتی نوع کی استعداد انہی کو ملتی ہے، جن کے اندر اپنی پچھلی مادی وجسمانی زندگی میں اس کی استعداد پیدا ہو چکی تھی دوزخ کے درجے ان لوگوں کے مقامات ہیں جو گویا ہنوز جمادی ونباتی وحیوانی منزلوں میں ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس دارالامتحان میں اپنی کی استعداد کے بقدر رہ کر آگے کی استعداد پیدا کرلیں اور ملکوتیت کی ترقی حاصل کرسکیں۔ بہشت کے مختلف مدارج ان کی استعدادوں کے مقامات ہیں جو اپنی پہلی زندگی میں اس ترقی کی استعداد پیدا کر چکے تھے، لیکن یہاں پہنچ کر بھی ان کی روحانی ترقی کا دروازہ بند نہ ہوگا، بلکہ وہ بقدر استعداد وتکمیل کے مدارج طے کرتے چلے جائیں گے، شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ۝ ﴾ (۹۵/ التین:٦)

''ان بہشتیوں کے لیے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔''

ایک دوسری آیت میں ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں اہل ایمان کے آگے پیچھے، داہنے بائیں نور ہوگا پھر بھی دعا کریں گے:

﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۚ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ﴾ (٦٦/ التحریم:۸)

''ان کا نور ان کے سامنے اور داہنے دوڑے گا اور وہ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے

نور کو کامل کر اور ہم کو معاف کر، تو ہر بات کر سکتا ہے۔''

مومنوں کے لبوں پر اللہ کے بخشے ہوئے نور کی مزید تکمیل اور اتمام کی دعا ادھر اشارہ کر رہی ہے کہ ان کے مدارج میں ترقی ہوتی رہے جس کا اقتضا خدا کی ربوبیت کا منشا ہے۔

امن وسلامتی کا گھر

انسان امن وسلامتی کا بھوکا ہے، لیکن وہ اس امن وسلامتی کو اسبابِ راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا، وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور وہ اس کو نہیں ملتا لیکن یہاں آ کر اس کو نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن وسلامتی کی ایک دنیا ملے گی وہ پرندہ جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا، یہاں وہ سدرۃ المنتہٰی کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا، جنت کے جہاں وحی محمدی ﷺ نے اور بہت سے نام بتائے ہیں وہاں اس کا ایک نام دار السلام بھی بتایا، جس کے معنی امن وسلامتی کے گھر ہیں۔

اہل جنت کی نسبت ارشاد فرمایا:

﴿ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ (٦/ الانعام:١٢٧)

''ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے جس شریعت کو دے کر اپنے پیغمبر علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، وہ حقیقت میں اسی امن وسلامتی کی نویدِ بشارت ہے، اسی لیے فرمایا:

﴿ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ﴾ (١٠/ یونس:٢٥)

''اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔''

آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے امن وسلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی، عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جو ایک یہودی عالم تھے، آنحضرت ﷺ کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی ''لوگو! سلامتی پھیلاؤ، بھوکوں کو کھلاؤ، جب دنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو، امن وسلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا۔'' [1] جنت کے ذکر میں امن وسلامتی کا تذکرہ قرآن پاک میں بار بار آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن وسلامتی کے ترانے سنائی دیں گے:

﴿ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ ﴾

(١٣/ الرعد:٢٣، ٢٤)

''اور فرشتے ہر دروازہ سے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ تم پر سلامتی ہو کہ تم نے

---

[1] مسند احمد، ج ٢، ص:٣٢٣، ٤٩٣۔

صبر کیا تھا تو کیسا اچھا پچھلا گھر ہے۔"

وہاں امن وسلامتی کے سوا کچھ اور سنائی نہ دے گا:

﴿ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴾ (٥٦/ الواقعة:٢٦) "لیکن سلامتی سلامتی کی پکار۔"

فرشتے اہل جنت کو یوں کہیں گے:

﴿ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ﴾ (٥٠/ ق:٣٤)

"اس جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو، یہ زندگی جاوید کا دن ہے۔"

﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ﴾ (١٩/ مريم:٦٢)

"اس میں سلامتی کے سوا اور کوئی بے ہودہ بات نہ سنیں گے۔"

جنت کا ایک اور نام قرآن میں مقام امین (امن والا مقام) بتایا گیا ہے، فرمایا:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴾ (٤٤/ الدخان:٥١)

"بے شک پرہیزگار لوگ امن والے مقام میں ہوں گے۔"

مقام رحمت

خدا کی رحمت کب نہیں؟ اور کہاں نہیں؟ مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حادثے بھی پیش آ جاتے ہیں، جن کو ہم رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں، پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت خداوند تعالیٰ کے قہر وغضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر وغضب کا نام ونشان نہ ہوگا، اس کی رحمت اور فیض وکرم کی وہاں بارش ہوگی اور اس کی رحمت کے سوا کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا:

﴿ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴾

(٩/ التوبة:٢١)

"ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت، خوشنودی اور ان باغوں کی خوشخبری دیتا ہے، جن میں ان کے لیے ہمیشہ کا آرام ہے۔"

اہل جنت کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے، یہ آواز سنائی دے گی:

﴿ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴾

(٣/ آل عمران:١٠٧)

"لیکن جن کے چہرے روشن ہوئے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اس میں وہ سدا رہیں گے۔"

مقام نور

جنت کا نور وہ مقام ہے، جہاں ظلمت وتاریکی کا نام ونشان نہ ہوگا، جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے،

کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا اور کوئی چاند کی طرح، ہر طرف ان کے انوار کی بارش ہوگی، آگے پیچھے، داہنے بائیں ہر سمت سے نور درخشاں ہوگا، فرمایا:

﴿ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ ﴾ (٦٦/ التحریم:٨)

''ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑے گا۔''

اس دن اہل ایمان کے نور ایمان کی بجلیاں ہر طرف کوندیں گی:

﴿ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴾

(٥٧/ الحدید:١٢)

''جس دن تو مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھے گا کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے چمکے گا، آج تم کو خوشخبری ہو، وہ باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں ہمیشہ رہا کرو گے، یہی بڑی کامیابی ہے۔''

اس دن اہل نفاق اہل ایمان سے آرزو کریں گے کہ ذرا ٹھہر جائیے کہ ہمارے ظلمت کدہ میں بھی ایک دم کے لیے روشنی ہو جائے:

﴿ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ﴾

(٥٧/ الحدید:١٣)

''جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں اہل ایمان سے کہیں گی کہ ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی کر لیں۔''

مقامِ رضوان

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقامِ رضوان ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندہ سے راضی اور خوش ہونا اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندہ پر عتاب فرمائے گا اور نہ اس سے ناراض ہوگا، بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا، متقیوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں رکھی ہیں ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد روح کی مسرت رکھی ہے، لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے، چنانچہ سورۂ توبہ میں رحمت اور رضوان کے بعد جنت کے ذکر کو جگہ دی گئی ہے:

﴿ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ﴾

(٩/ التوبۃ:٢١)

”انکا پروردگار ان کو اپنی رحمت اور خوشنودی (رضوان) کی خوشخبری دیتا ہے اور ان باغوں کو جن میں نعمت الٰہی قائم رہے گی۔“

سورۂ حدید میں بھی اسی طرح مغفرت اور رضائے الٰہی کے بعد بطور تکملہ کے جنت کا ذکر آتا ہے، فرمایا:

﴿ وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ ۙ وَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ ۚ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۞ سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ ۙ أُعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۞ ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۰، ۲۱)

”اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی بخشش اور رضامندی بھی ہے اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے، اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو، جس کا پھیلاؤ آسمان اور زمین کے پھیلاؤ کے برابر ہے، یہ ان کے لیے بنائی گئی ہے، جو اللہ اور اس کے رسولوں پر یقین رکھتے ہیں، یہ اللہ کی مہربانی ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑا مہربانی والا ہے۔“

سورۂ آل عمران میں جنت کی تمام نعمتوں کو گنا کر ان کا خاتمہ رضوان کی عظیم الشان بشارت پر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ ۗ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵)

”جنہوں نے پرہیزگاری کی، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ سدا رہیں گے اور پاک بیویاں اور اللہ کی خوشنودی۔“

سورۂ توبہ میں جنت کی تمام نعمتوں سے بڑھ کر نعمت رضوانِ الٰہی کو قرار دیا ہے:

﴿ وَعَدَ اللَّهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللَّهِ أَكْبَرُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۞ ﴾

(۹/ التوبۃ:۷۲)

”اللہ نے باایمان مردوں اور عورتوں سے ان باغوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں سدا رہیں گے اور رہنے کے ستھرے گھر اور اللہ کی رضامندی، سب سے بڑی ہے وہی بڑی کامیابی ہے۔“

بہشت کی مطمئن روحوں کو اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی یہ نوید مسرت سنائی جاتی ہے:

﴿ يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۞ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۞ ﴾

(۸۹/ الفجر:۲۷۔۲۸)

"اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کے پاس اس طرح واپس جا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی ہو۔"

اہل جنت کی یہ صفت آئی ہے:

﴿ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۱۹)

"خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش۔"

انہیں آیتوں کی تفسیر میں آنحضرت ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے کہ "خداوند تعالیٰ اہل جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے اے خداوند! ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں فرمائے گا (جنت کی نعمتیں پا کر) اب تم خوش ہوئے۔ عرض کریں گے، پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تم نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائے گا کہ میں ان تمام گزشتہ نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں؟ کہیں گے، اے پروردگار! ان سے بہتر کیا ہے؟ فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی و خوشی تم پر اتاروں، پھر اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔" [1]

مقامِ طیب وطاہر

موجودہ دنیا کی ہر چیز آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے، لیکن بہشت وہ مقام ہے جو پاکی، ستھرائی، لطافت اور طہارت کا مظہر ہے، اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہو چکے ہوں، فرمایا:

﴿ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر:۷۳)

"تم پاک ہو چکے تو جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔"

جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف ستھری اور ہر جسمانی وروحانی آلائش سے بری ہوگی، فرمایا:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (۱٦/ النحل:۹۷)

"مرد ہو یا عورت جس نے مومن بن کر اچھے کام کیے ہم اس کو ایک پاک زندگی دے کر جلائیں گے اور ان کو ہم ان کے سب سے بہتر عمل کے مطابق بدلہ دیں گے۔"

جو گھر وہاں ملیں گے، وہ بھی پاک وصاف اور ستھرے ہوں گے:

﴿ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً ﴾ (٦۱/ الصف:۱۲) "اور پاک گھر"

جو بیویاں ملیں گی، وہ بھی پاک ہوں گی:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب صفة الجنة والنار: ٦٥٤٩؛ صحیح مسلم، کتاب الجنة وصفة نعیمها واهلها، باب احلال الرضوان......: ٧١٤٠۔

﴿ وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۵) ''اور پاک بیویاں۔''

وہاں کی جو باتیں ہوں گی وہ بھی پاک ہوں گی۔

﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲٤)

''اور اہل جنت کو پاکیزہ گفتگو کی طرف راہنمائی کی جائے گی۔''

ان کو پینے کی جو چیز ملے گی وہ بھی پاک ہوگی:

﴿ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ ﴾ (۷٦/ الدھر: ۲۱) ''پینے کی پاک چیز۔''

غرض کہ ہر چیز وہاں پاک وصاف، طیب وطاہر اور تمام روحانی وجسمانی آلودگیوں سے مبرا ہوگی۔

مقامِ تسبیح وتہلیل

اس آرام ولطف کے بعد اہل جنت کی روحانی لذت اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل ہوگی، یہ ان کی روحانی غذا ہوگی، وہ عالم جہاں ہر طرف انوار الٰہی برستے ہیں، جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی اور منظر نہیں، جہاں قدس ونزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی وہاں حمد وثنا کے روح افزا ترانے بھی ہر طرف سے بلند ہوں گے:

﴿ دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس: ۱۰)

''جنت میں ان کی ندا یہ ہوگی کہ اے میرے اللہ! تیری پاکی اور ان کی آپس کی دعا، سلامتی ہوگی اور ان کی آخری پکار یہ ہوگی کہ دنیا کے پروردگار اللہ (تعالیٰ) کی حمد ہو۔''

جنت کی تمام شاہانہ نعمتوں کے بعد بڑی نعمت یہ ہوگی کہ خدا کی تسبیح وتہلیل کی نئی نئی پرلطف راہیں وہاں ان پر کھلیں گی، فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ۭ وَلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ ۝ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۳، ۲٤)

''بے شک اللہ ان کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے، ان باغوں میں داخل کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور ان کی پوشاک اُن میں ریشم کی ہوگی اور وہ راہ دکھائے جائیں اچھی بات کی اور وہ دکھائے جائیں گے اس سراپا حمد (ذات) کی راہ۔''

وہ اپنے ہر سرور اور نعمت کے شکریہ میں فرشتوں کے ساتھ مل کر حمدِ الٰہی کا سرودِ سرمدی گائیں گے اور یہ

وہ وقت ہوگا، جب عالم وجود کے ہر گوشہ سے اس کی حمد کا ترانہ بلند ہوگا، فرمایا:

﴿ وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۝ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۷۳-۷۵)

''جنت کے نگہبان ان سے کہیں گے، تم پر سلامتی ہو تم پاک ہو چکے، تو جنت میں چلے جاؤ، اہل جنت کہیں گے اس اللہ کی حمد ہو جس نے اپنا وعدہ سچا کیا اور ہم کو اس سرزمین کا مالک کیا کہ جنت میں جہاں چاہیں رہیں تو کام کرنے والوں کی کیسی اچھی مزدوری ہے اور یہ دیکھے گا کہ فرشتے عرش الٰہی کو گھیرے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر رہے ہوں گے اور سب لوگوں کے درمیان فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ حمد ہو سارے عالم کے پروردگار کی۔''

اہل جنت کے متعلق قرآن پاک میں ایک جگہ ہے:

﴿ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ۝ ﴾ (۱۹/ مریم: ۶۲)

''وہ نہ سنیں گے وہاں بیکار بات، مگر سلام اور ان کی روزی اس میں صبح اور شام ہوگی۔''

اس صبح وشام کی روزی سے مقصود کیا جنت کے کھانے کے الوانِ نعمت ہیں، اگر ایسا ہوتا تو صبح وشام کی تخصیص کیا تھی وہ تو ہر وقت سامنے ہوں گے، میرا گمان یہ ہے کہ اس روزی سے خدا کی تسبیح وتہلیل کی روحانی روزی اور ربانی غذا مراد ہے اور حدیث کے ان لفظوں کو اسی کی تفسیر سے جانتا ہوں، صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے جنت کی نعمتوں کے سلسلہ میں فرمایا:

((يُسَبِّحُوْنَ اللّٰهَ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا)) [1]

''وہ صبح اور شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتقدیس کریں گے۔''

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اہل جنت کو خدا کی تسبیح وتقدیس کا الہام ہوا کرے گا۔'' [2] اور شاید قرآن پاک کی اس آیت کے یہی معنی ہوں:

﴿ وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۴)

''اور اچھی بات کی طرف ان کی راہنمائی کی جائے گی اور اس سراپا حمد کا راستہ ان کو بتایا جائے گا۔''

مقامِ قرب

اہلِ جنت کو جو کچھ نصیب ہوگا، ان سب کے سوا سب سے اعلیٰ مرتبہ قرب خاص کا مقام ہوگا، بندے

[1] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی صفات الجنة: ۷۱۵۱۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الجنة، باب فی صفات الجنة: ۷۱۵۵؛ سنن دارمی، کتاب الرقاق، باب فی اهل الجنة ونعیمها: ۲۸۲۸۔

اپنے پروردگار کی حضوری کا شرف پائیں گے، قرآن پاک میں جا بجا ان کے لیے یہ آتا ہے کہ ﴿ جَزَآءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾ ''ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس ہے۔'' یہ قرب خاص کے اشارے ہیں اور ایک جگہ یہ اشارہ اس تصریح سے بدل جاتا ہے:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝ ﴾

(٥٤/ القمر:٥٤، ٥٥)

''بے شک پرہیزگار، باغوں میں اور نہروں میں، سچائی کی نشست گاہ میں، اس بادشاہ کے حضور جس کا سب پر قبضہ ہے۔''

دیدار

جنت کی سب سے آخری لیکن بڑی نعمت اللہ تعالیٰ کی تجلی کا نظارہ ہے، کون ہے جو اس مطلعِ انوار کے دیدار کی تاب لا سکے، تاہم یا تو یہ آنکھیں اور ہوں گی یا وہ نورِ مطلق کسی خاص شان میں نمایاں ہوگا، اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا اور اہل جنت کی مشتاق آنکھیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی:

﴿ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۝ ﴾ (٧٥/ القيامة:٢٢، ٢٣)

''کتنے چہرے اس دن تر و تازہ اور اپنے پروردگار کی سمت دیکھ رہے ہوں گے۔''

اسی آیت کی تفسیر میں حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''تم اپنے پروردگار کو بالمشاہدہ دیکھو گے۔'' دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جیسے چاند کو تم دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے اس دیدار و رویت میں کوئی ایک دوسرے کا مزاحم نہ ہوگا۔'' [1] اس تمثیل سے رسول اللہ ﷺ کے دو مقصود ہیں ایک تو شدتِ یقین کا اظہار کہ جس طرح تم اس روشن چاند کو بے شک وشبہ دیکھ رہے ہو اسی طرح بے شک وشبہ اپنے پروردگار کو دیکھو گے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ جس طرح لاکھوں کا مجمع بھی ہو تو سب لوگ ایک چاند کو یکساں حیثیت سے باطمینان اس طرح دیکھ سکتے ہیں کہ ایک کا دیکھنا دوسرے کے دیکھنے میں عائق نہیں ہوتا، اسی طرح دیدار الٰہی میں کروڑوں کا ہجوم مانع نہ ہوگا، اتنا ہی نہیں بلکہ جس دن جنتی اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے ان کی زبان پر سلامتی کی دعا ہوگی:

﴿ تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٤٤)

''ان کی دعا جب وہ اپنے پروردگار سے ملیں گے، سلامتی ہوگی۔''

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ سراپا رحمت پروردگار خود اپنے بندہ کو اپنی زبان سے سلامتی کا پیام دے گا:

﴿ سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ ۝ ﴾ (٣٦/ يٰسٓ:٥٨)

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب قول اللّٰہ: وجوہ یومئذ ناضرۃ:٧٤٣٦۔

”رحمت والے پروردگار کی طرف سے پیام سلامتی ہوگا۔“

بخاری میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”خداوند تعالیٰ اپنے بندوں سے ترجمان کے بغیر خود کلام فرمائے گا۔“ ❶

یہ روایت کیونکر ہوگی؟ اہل روایت لفظ کے قائل ہیں، اہلِ عقل زیادتِ ایمان کی تاویل کرتے ہیں، اہلِ حقیقت اس کو اسماء وصفات کی ناقابل بیان جلوہ انگیزی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے کہ

ع بیا کیں د اور یہاں رابہ پیش د اور اندازیم

ان تعلیمات کا عملی اثر

اوپر کے صفحوں میں قیامت، حشر ونشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر گزر چکے ہیں، یہ ایمان بالغیب مذہب کی حقیقت کا اصلی جوہر ہے اور اسی کے یقین میں مذہب کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے، معلوم ہو چکا ہے کہ اہل عرب کو ان حقائق کی تسلیم سے کس قدر انکار تھا، بلکہ مرکر جی اٹھنا اور اس موت کے بعد دوبارہ زندگی ان کے نزدیک کس قدر مستبعد تھی، قرآن پاک کا بڑا حصہ شرک کے ابطال اور توحید کے اثبات کے بعد اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے، آنحضرت ﷺ اپنے اکثر خطبوں میں اس کا حال بیان کیا کرتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ قٓ کی تلاوت فرماتے تھے، جس میں قیامت کے حالات ہیں، مگر دیکھو کہ ۲۳ برس کی مسلسل تعلیمِ قرآن پاک کی تاثیر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیضِ ہدایت سے نہ صرف انکا انکار اقرار سے بدل گیا بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر ان کے دل ودماغ کی لوح میں منقوش ہو گئے تھے۔ یاد ہوگا کہ اسلام کے آغاز میں ایک عرب شاعر نے طنزاً کہا تھا:

امـوت ثم بعث ثم حشر — حديث خرافة يا ام عمرو

”کیا مرنا ہے پھر جینا اور پھر اکٹھا ہونا — اے عمرو کی ماں یہ خرافات باتیں ہیں۔“

لیکن چند ہی سال کے بعد یہ طنز وانکار، رمز یقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا:

”ہم آسمان تک پہنچ گئے اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے ہو جائیں گے۔“ ❷

وانا لنرجوا فوق ذَالِكَ مَظْهَرًا

”اور ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بلند مقام میں ظہور کریں۔“

آنحضرت ﷺ استفسار فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند مقام اور کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ ”جنت یا رسول اللہ؟“ آپ ﷺ فرماتے ہیں: ”ان شاء اللہ دیکھو کہ جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جا پاتی تھیں

---

❶ صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب کلام الرب یوم القیامة مع الانبیاء وغیرهم:۷۵۱۲۔

❷ اصابه، ج۶، ص:۲۱۹؛ استیعاب ذکر نابغة جعدی، ج۱، ص:۳۲۱۔

ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا'' جن کو مر کر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا، جن کو آخرت کے مؤاخذہ کا کوئی ڈر نہ تھا جن کو اپنے اعمال کی جواب دہی کی پروانہ تھی، جو سزا و جزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے، جو جنت اور دوزخ کے تخیل سے نا آشنا تھے، وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے، دوسری زندگی پر ان کو اسی طرح یقین آ گیا جس طرح آج کی زندگی پر تھا، آخرت کے مؤاخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے، اعمال کی جواب دہی سے ترساں و لرزاں رہنے لگے، سزا و جزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے، جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا، دوزخ کا ڈر ان کے دل کے اندر کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا، ان کی آنکھوں کو اشک بار رکھتا تھا، فرائض اور ذمہ داری کی دیانت داری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا رہتا تھا، راحت کا خواب اور آرام کے بستر سے ان کو چونکا کر عمل کے میدان میں تنہا لے آتا تھا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروف جدوجہد بنا دیتا تھا، تنہائی اور تاریکی میں بھی ان کے دل اور بدن کو برائیوں اور بداعمالیوں سے باز رکھتا تھا، ان کے ضمیر اور دل کے ہر غنچوں کو ہر وقت خدا کی آنکھوں کے سامنے کھلا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ دو صحابیوں میں کسی حقیقت کے متعلق جھگڑا تھا آنحضرت ﷺ نے فریقین کی باتیں سن کر ایک کے حق میں اس کا فیصلہ دے دیا پھر فرمایا: ''میں بھی ایک آدمی ہوں، مدعی اور مدعا علیہ میں سے ممکن ہے کہ کوئی زیادہ اچھا بولنے والا ہو جو اپنے دعویٰ کو خوبی کے ساتھ بیان کرے اور میں اس کے موافق اس کا فیصلہ دوں لیکن درحقیقت وہ چیز اس کی نہ ہو تو گویا میں اس کے گلے میں آگ کا ایک طوق پہنا رہا ہوں۔'' یہ سن کر فریقین پر یہ اثر ہوا کہ دونوں رونے لگے اور ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کو دینے لگا۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ خدا کے مطیع و فرمانبردار تھے، رسول کے عاشق و شیدا تھے، نیکیوں سے مالا مال جنت کی بشارت سے سرفراز تھے، تاہم آخرت کے مؤاخذہ اور جواب دہی سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ ایک دفعہ انہوں نے کہا کہ ''اگر وصال نبوی کے بعد میرے اچھے اور برے اعمال برابر برابر ہیں تو میں بھی خوش ہوں [2] اگر جنت نہ ملے تو پروا نہیں مگر الٰہی دوزخ نہ ملے۔'' وہ نزع کے حال میں بہت بے چین تھے، بعض صحابہ ان کے اچھے اعمال گنا کر ان کو تسلی دینے لگے تو جواب میں کہا: ''خدا کی قسم! اگر کل زمین میرے لیے سونا ہو جاتی تو اس کو دے کر عذاب الٰہی سے بچ سکتا تو میں دے دیتا۔'' [3] ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی تھیں: ''اے کاش میں جنگل کی گھاس ہوتی [4] اے کاش میں کچھ نہ ہوتی'' [5]

---

[1] سنن ابی داود، کتاب القضاء، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ: ۳۵۸٤۔

[2] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار: ۳۹۱۵۔ [3] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب مناقب عمر: ۳٦۹۲۔ [4] ابن سعد جزء النساء، ج۸، ص: ۵۱۔

[5] مستدرك حاکم، ج٤، ص: ۹؛ مسند احمد، ج۱، ص: ۲۷٦۔

قیامت کے متعلق قرآن پاک کی یہ عجیب مؤثر آیت:

﴿ يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ ۝ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۱، ۲)

''لوگو! اپنے رب سے ڈرو، قیامت کا بھونچال ایک بڑی چیز ہے، جس دن اس کو دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی عورت اپنے دودھ پیتے بچہ کو بھول جائے گی اور پیٹ والی اپنا پیٹ ڈال دے گی اور لوگوں کو نشہ میں دیکھو گے، لیکن وہ نشہ میں نہ ہوں گے، بلکہ خدا کا سخت عذاب ہوگا۔''

جب اتری اور آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو سنایا اور اس کی تفسیر کی تو ان کے چہروں کا رنگ بدل گیا [1] اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، [2] ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے قبر کا ذکر کیا اور موت کے بعد عذاب کا حال بیان کیا تو صحابہ چیخیں مار مار کر رونے لگے، [3] حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کو ایک بار قیامت کے ایک منظر کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اثنائے روایت میں وہ تین دفعہ بے ہوش ہو کر گرے اور جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ روایت دہرائی گئی تو ان پر بھی گریہ طاری ہو گیا۔ [4]

اس یقین وایمان کا دوسرا سماں یہ ہے کہ بدر کا میدان جنگ ہے، مشرکین کی ایک ہزار لوہے میں ڈوبی ہوئی فوج کا سیلاب امنڈا آ رہا ہے، ادھر تین سو نہتے مسلمان صف باندھے کھڑے ہیں کہ آپ ﷺ صحابہ کی طرف خطاب کر کے فرماتے ہیں: ''لو اس جنت کا موقع سامنے ہے جس کی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے۔'' ایک انصاری حیرت سے پوچھتے ہیں کہ کیا آسمان و زمین کے برابر؟ آپ فرماتے ہیں ''ہاں۔'' وہ خوشی سے واہ واہ کہہ اٹھتے ہیں آپ دریافت فرماتے ہیں کہ ''تم نے واہ واہ کیوں کہا؟'' عرض کی، اس امید سے کہ شاید میں بھی اس میں ہوں۔ فرمایا: ''تم اس میں ہو۔'' یہ سن کر وہ کھجور نکال نکال کر جلدی جلدی کھانے لگے بالآخر جنت کے جانے میں اتنا توقف بھی شاق گزرا بولے، اتنی دیر بھی کیوں کی جائے، یہ کہہ کر کھجوریں پھینک دیں اور تلوار کھینچ کر آگے بڑھے اور شہید ہوئے۔ [5]

غزوۂ احد میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا احد کے میدان میں دار و گیر کا شور برپا تھا، لاشوں پر لاشیں گر رہی تھیں کہ ایک صحابی نے آگے بڑھ کر پوچھا، یا رسول اللہ ﷺ! اگر میں خدا کی راہ میں مارا گیا تو کہاں ہوں گا؟ فرمایا: ''جنت میں۔'' وہ کھجور کھا رہے تھے ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر جان دے دی، [6] قیس ایک

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الحج: ٤٧٤١۔ [2] جامع ترمذی، ابواب التفسیر: ٣١٦٨۔

[3] سنن نسائی، کتاب الجنائز، باب التعوذ من القبر: ٢٠٦٤۔

[4] جامع ترمذی، ابواب الزھد، باب ماجاء فی الریاء والسمعۃ: ٢٣٨٢۔

[5] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب ثبوت الجنۃ للشھید: ٤٩١٥۔ [6] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب ثبوت الجنۃ للشھید: ٤٩١٣؛ سنن نسائی، کتاب الجھاد، باب ثواب من قتل فی سبیل اللہ: ٣١٥٦۔

صحابی تھے وہ ایک جہاد میں شریک تھے انہوں نے اسلامی فوج کے سپاہیوں کے سامنے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ "جنت کے دروازے تلواروں کے سایہ کے نیچے ہیں۔" ایک معمولی سا مسلمان پاس کھڑا تھا اس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا ہے؟ انہوں نے کہا "ہاں" یہ سن کر وہ اپنے دوستوں کے پاس آیا اور سلام کر کے رخصت ہوا، میان توڑ کر پھینک دی اور تلوار لے کر دشمن کی صف پر جا پڑا اور شہادت حاصل کی۔ [1]

ان حیرت انگیز واقعات میں سے ہر ایک واقعہ پر غور کرو کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے منکر و کافر عرب کے دل و دماغ اور ذہن و اعتقاد کو کس طرح آن کی آن میں بدل دیا اور دم کے دم میں عربوں کے عقائد اخلاق اور کارناموں کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشهيد:٤٩١٦۔

قضا وقدر

﴿ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴾ (۵۴/ القمر:۴۹)

اگر چہ قرآن پاک میں ایمان کے سلسلہ میں اس کا ذکر نہیں آیا مگر اس کا اعادہ بار بار قرآن پاک میں اتنی دفعہ ہوا ہے کہ اس کی اہمیت اس کی مقتضی ہے کہ اس کو بھی ایمانیات کے پہلو میں جگہ دی جائے، چنانچہ بعض صحیح حدیثوں [1] میں یہ ایمانیات کی آخری کڑی قرار بھی دی گئی ہے اور سلسلۂ توحید میں اسلام نے اللہ تعالیٰ کی وسعت قدرت اور مشیت مطلقہ کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کا لازمی نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیے۔

اس عقیدہ کا ماحصل یہ ہے کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ہوا ہے جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے علم سابق اور فیصلہ ازلی کے مطابق ہوا ہے، ہوتا ہے اور ہوگا جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کی تمام جزئیات پر غور کر کے پہلے ہی سے نقشہ تیار کر لیتے ہیں اور اسی مجوزہ نقشہ کے مطابق معمار اور مزدور اس کی تعمیر کو مکمل کرتے ہیں، اسی طرح اس مہندس ازل، خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول وقواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں، موت وحیات، فقر وغنا، کامیابی وناکامی، تکلیف وراحت ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق وہ ظہور پذیر ہوتی ہے۔ نفس یہ عقیدہ بھی اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، جو کچھ مخصوص ہے، وہ اس کی تکمیلی تعلیم ہے۔

توراۃ میں حضرت آدم علیہ السلام وشیطان اور ہابیل وقابیل کے قصوں میں اس عقیدہ کے اشارات پائے جاتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اسی حقیقت کی تعبیر ہے، مگر ان اشارات سے گزر کر زبور میں اس کی کھلی کھلی تعلیم بھی ملتی ہے، زبور ۱۳۸۔۱۴ تا ۱۶ (کتاب مقدس عہد نامہ قدیم ص:۹۹) میں ہے:

> ''تیرے کام حیرت افزا ہیں، اس کا میرے جی کو بڑا یقین ہے، جب کہ میں پردے میں بنایا جاتا تھا اور زمین کے اسفل میں منقوش ہوتا تھا، تو میرے جسم کی صورت تجھ سے چھپی نہ تھی، تیری آنکھوں نے میرے بے ترتیب مادہ کو دیکھا اور تیرے دفتر میں یہ سب چیزیں تحریر کی گئیں اور ان کے دلوں کا حال بھی کہ کب بنیں گی، جب ہنوز ان میں سے کوئی بھی نہ تھی۔''

اس کے بعد زبور ۱۴۸:۱ تا ۶، (کتاب مقدس عہد نامہ قدیم ص:۱۰۴) کا ترانہ حمد اسی لئے میں شروع ہوتا ہے:

> ....''خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (مخلوقات) موجود ہوگئے، اس نے ان کو ابدی پائیداری بخشی اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔''

انجیل میں اس کی تعلیم ''خدا کی مرضی'' کے عنوان سے ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندگی کی آخری شب کی

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان: ۹۳۔

دعا میں فرماتے ہیں: ''میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہو۔'' (متی ۲۶-۳۹) اور اسی ''مرضی'' کا ذکر یوحنا (۵-۳۰ و ۶-۳۸) اور خطوط (فلپون ۲-۱۳) میں ہے اور رومیوں کے نویں باب میں اس کی پوری تفصیل ہے، مگر خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم نے اول یہ کیا کہ اس مسئلہ کی مجمل حقیقت کی توضیح کی اور اسکی حکمت ومصلحت کی تشریح کی اور دوسری بات یہ کی کہ گزشتہ مذاہب کی طرح اپنے دفتر کے کسی ایک گوشہ میں بطور ایک حقیقت ثانیہ کے اس کو کہہ کر خاموشی اختیار نہیں کر لی بلکہ بار بار اتنی دفعہ دہرایا کہ سننے والوں کے دلوں میں اس کی عقیدت نے گھر پیدا کر لیا اور یہ تلقین کی صورت میں ان کی رگ وریشہ میں پیوست ہوگئی اور ایسا اس نے اس لیے کیا، تا کہ صبر وشکر کی اخلاقی تعلیم صرف نظریہ کی صورت میں نہ رہ جائے، بلکہ عملی حیثیت میں اس کے پیروؤں کے اندر استقلال وثبات کی روح اور دنیا کے مصائب وحوادث میں تسلی وتشفی کی قوت پیدا کرے اور اس طرح یہ عقیدہ پہلے کی طرح صرف ایک مذہبی تلقین یا فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت میں نہ رہے بلکہ ایک مفید عملی تعلیم کی شکل اختیار کر لے۔

وحی محمدی ﷺ نے اس اصطلاح کے لیے دو لفظ اختیار کیے ہیں ایک ''قدر'' ہے جس کے معنی اندازہ کرنے کے ہیں اور دوسرا ''قضا'' جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں:

﴿ اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝ ﴾ (٥٤/ القمر:٤٩)

''ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا۔''

﴿ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ ﴾ (٦/ الانعام:٢)

''وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔''

یہ دونوں لفظ بجائے خود اس عقیدہ کی اسلامی حقیقت کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ کائنات کی پیدائش سے پہلے کائنات کی ہر چیز کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے اندازہ اور تقدیر سے ہر ایک کا فیصلہ فرما دیا ہے اور متعین کر دیا ہے، اسی کے مطابق یہ کائنات چل رہی ہے اس میں خدا کے حکم کے بغیر ایک ذرہ کا بھی تغیر نہیں ہوسکتا، آسمان کو جس طرح بنایا، آفتاب کو جس طرح روشن کیا، چاند کے متعلق جو اصول مقرر فرمایا، ستاروں کے نکلنے اور ڈوبنے کے جو احکام دے دیے، موت وحیات، فنا وبقا اور عروج وزوال، غرض کائنات کی ہر شق اور پہلو کے متعلق جو اصول متعین فرما دیے انہیں پر وہ چل رہی ہے۔ قرآن پاک میں کائنات کے بہت سے حالات کے بیان کرنے کے بعد ہے:

﴿ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝ ﴾ (٣٦/ یٰسٓ:٣٨-٤٠)

''اور سورج اپنے ٹھہراؤ پر چل رہا ہے، یہ ہے غالب اور علم والے کی تقدیر (اندازہ) اور چاند کو ہم نے تقدیر (اندازہ) کر دی ہیں منزلیں، یہاں تک کہ وہ پرانی ٹہنی کی طرح (خمیدہ ہوکر) لوٹتا ہے، نہ تو سورج کی قدرت میں ہے کہ چاند کو پالے اور نہ رات دن سے آگے بڑھے، ہر ایک اپنے مدار میں تیر رہا ہے۔''

یہ تو آسمان کی بات تھی، زمین کے متعلق ارشاد ہوا:

﴿ وَقَدَّرَ فِيهَآ أَقْوَٰتَهَا ﴾ (۴۱/ حٰمٓ سجدة:۱۰)

''اور زمین میں اس کی روزیاں اندازہ کر دیں۔''

اس سے آگے بڑھ کر یہ کہ دنیا کی ہر چیز میں اس نے ایک اندازہ مقرر کر دیا:

﴿ قَدْ جَعَلَ ٱللَّهُ لِكُلِّ شَىْءٍ قَدْرًا ۝ ﴾ (۶۵/ الطلاق:۳)

''اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ بنایا ہے۔''

موت و حیات بھی اسی اندازہ کے مطابق ہے، فرمایا:

﴿ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ ٱلْمَوْتَ ﴾ (۵۶/ الواقعة:۶۰)

''ہم نے تمہارے درمیان موت کا اندازہ کر دیا۔''

ہر شے میں اللہ نے جو اندازہ لگایا ہے وہ وہی چیز ہے جس کو لوگ قانونِ فطرت کہتے ہیں اور جس پر دنیا چل رہی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام متعین فرما دیے ہیں، جن کی اطاعت اس پر واجب ہے، علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی و زوال، موت و حیات، بیماری و صحت، دولت و افلاس، آرام و تکلیف، سعادت و شقاوت، ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرما دیے ہیں، غرض ان کو آرام و تکلیف جو کچھ بھی پیش آتی ہے، خدا کے علم اور اجازت سے پیش آتی ہے:

﴿ مَآ أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ ٱللَّهِ ۗ ﴾ (۶۴/ التغابن:۱۱)

''نہیں پہنچی تم کو کوئی مصیبت، لیکن اللہ کے حکم سے۔''

اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لیے مقدرات کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹتی اور بھولتی نہیں، ایسے ہی یہ باتیں بھی مٹتیں اور بھولتیں نہیں:

﴿ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَىٰ وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِۦ ۚ وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِۦٓ إِلَّا فِى كِتَٰبٍ ۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرٌ ۝ ﴾ (۳۵/ فاطر:۱۱)

''اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جنتی ہے، لیکن خدا کے علم سے اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے، یا اس کی عمر کم ہو جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔''

اس آیت پاک میں دو ٹکڑے ہیں، ایک یہ کہ جو عورت بھی اپنے پیٹ میں بچہ رکھتی ہے یا جو بچہ جنتی ہے، وہ خدائے پاک کے علم سے ہے، دوسرا ٹکڑا یہ ہے کہ جس کو چھوٹی بڑی عمر بھی ملتی ہے وہ کتاب الٰہی میں پہلے سے لکھی ہوتی ہے، ان دونوں ٹکڑوں کے ملانے سے معلوم ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ہونا اور علم الٰہی میں ہونا دونوں ہم معنی ہیں۔

قرآن پاک نے اس کو بھی ظاہر کیا ہے کہ قضا وقدر کے عقیدہ کی فلسفیانہ حقیقت سے زیادہ اس کی نظر اس عقیدہ کی اخلاقی اہمیت پر ہے، انسان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ناچیز کوشش کی ذرا سی کامیابی پر فخر وغرور کے نشہ میں چور ہو جاتا ہے اور ذرا سی ناکامی پر وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے، یہ دونوں مختلف اخلاقی بیماریاں اس لیے اس کو لاحق ہوتی ہیں کہ وہ اپنے کام کے اچھے یا برے نتیجے کو خود اپنے کام کا لازمی نتیجہ جانتا ہے، اس لیے وہ کبھی اپنے کیے پر مغرور اور کبھی ملول ہوتا ہے اور یہ دونوں کیفیتیں افراد اور اقوام کی متانت، استقلال اور صبر وثبات کے جوہر کو برباد کرتی ہیں، اس لیے ایک ایسے عقیدہ کی ضرورت تھی جو کامیابی کے فخر ومسرت اور ناکامی کے افسوس وحسرت دونوں موقعوں پر عاجز انسانوں کی دست گیری کرے اور وہ یہی عقیدہ قضا وقدر ہے۔ اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہِ راست نتیجہ نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا نتیجہ ہے، اس لیے اس پر ہمارا فخر وغرور کرنا بے جا ہے، اسی طرح ہم کو جو ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی کسی حکمت ومصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہی ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے تھے، اس لیے ہم کو دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش وخروش اور سرگرمی سے پھر از سرِ نو جد وجہد میں مصروف ہو جانا چاہیے۔

اس مسئلہ کی یہ پوری توضیح سورۂ حدید میں ان لفظوں میں مذکور ہے:

﴿مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝﴾ (۵۷/ الحدید: ۲۲، ۲۳)

''کوئی مصیبت نہیں آتی ملک میں اور نہ خود تم (اس ملک کے بسنے والوں) میں لیکن یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے، ایسا اس لیے کیا گیا، تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے، غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا۔''

اس آیت کریمہ نے مسئلہ قضا وقدر کے فلسفہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت باقی نہیں رہتی، یہ اسی عقیدہ کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی گردنیں عین کامیابی و

فتوحات کی حالت میں خداوند قادر مطلق کے آگے جھک جاتی تھیں اور ناکامی کی حالت میں ان کے دل یاس و ناامیدی سے دوچار نہیں ہوتے تھے اور ان کی عملی زندگی کا جو نتیجہ بھی پیش آتا تھا وہ اس کو اپنی طرف سے نہیں بلکہ خداوند عالم کی طرف سے سمجھ کر خاموش رہتے تھے، مالی بے چارگی، سیاسی مصیبت، عزیزوں کی مفارقت، لڑائیوں کی ناکامی کسی موقع پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس ہونا نہیں جانتے تھے اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اٹھا بیٹھتے تھے کہ ان کا یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، اسی لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے، نہ سمندر بہا لے جا سکتے تھے، نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے:

﴿ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۵، ۱۴۶)

’’کسی کے اختیار میں نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر سکے، یہ لکھا ہوا مقرر ہے (انسان کے ہاتھ میں صرف اچھا یا برا ارادہ و نیت ہے، اس نیت کے مطابق کام کا نتیجہ ظاہر ہونا اس کے اختیار میں نہیں) جو کوئی دنیا کا معاوضہ چاہے گا تو ہم اس کو اس میں سے کچھ دیں گے اور جو آخرت کا معاوضہ چاہے گا اس میں سے کچھ (یہاں) دیں گے اور پورا معاوضہ شکر کرنے والوں کو آئندہ (وہاں) دیں گے، کتنے پیغمبر تھے جو لڑے ہیں، ان کے ساتھ بہت سے خدا کے طالب تھے، تو خدا کی راہ میں ان کو جو مصیبت پیش آئی اس کی وجہ سے نہ دل ہارے، نہ سست ہوئے اور نہ دب گئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔‘‘

ان آیتوں نے یہ واضح کر دیا کہ قضا و قدر کے عقیدہ کا نتیجہ پستی، سستی اور دوں ہمتی نہیں، بلکہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے، ان کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں سے کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں کیوں کہ

﴿ لَّنْ يُّصِيْبَنَاۤ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ ﴾

(۹/ التوبۃ:۵۱)

’’ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی، لیکن جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔‘‘

خطرات اور مشکلات کی ان کو پروا نہیں کہ جن کے لیے موت لکھی ہے وہ میدان جنگ میں بھی مریں

گے اور بستر راحت پر بھی اور جن کی موت کا مقررہ وقت نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں سے بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے:

﴿ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۴)

''منافق کہتے ہیں کہ اگر ہماری بات مان لی جاتی تو ہم یہاں مارے نہ جاتے، کہہ دے کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن پر یہاں مرنا لکھا جا چکا تھا وہ از خود اپنے مقتل میں نکل کر چلے جاتے۔''

﴿ أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ ﴾ (٤/ النسآء:۷۸)

''تم جہاں بھی رہو تم کو موت آ کر پالے گی اگر چہ تم مضبوط و مستحکم قلعوں میں ہو۔''

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمان کی ناقابل ہزیمت، جرأت اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے، کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ تقدیر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی تقدیر پر صابر و شاکر ہو کر سست و غافل بن کر بیٹھ رہے، حالانکہ اگر یہ صحیح ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی، نہ ربانی کتابوں کے اترنے کی حاجت ہوتی، نہ تبلیغ وارشاد کی تاکید ہوتی اور نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی مگر ایسا نہیں کیا گیا، لاکھوں پیغمبر بھیجے گئے، کتنی کتابیں اتریں، کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر پھیلائے گئے، ہدایت وارشاد کی تاکید پر تاکید آئی، لوگوں کی دعوت واصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا، کوشش و محنت سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ ٹھہرائی گئی اور خلفائے راشدین اور عام صحابہ نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی کامیابی کی تصدیق کی۔ اب کیا محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین اور آپ کا عمل دو متضاد چیزیں تھیں؟ نہیں، یہ دونوں ایک دوسرے کی مؤید تھیں اور اس طرح ایک دوسرے کی تصدیق تھیں کہ ((اعملوا فكل ميسر لما خلق)) [1] ''لوگو! اپنے اپنے کام کیے جاؤ کہ تم میں سے ہر شخص سے وہی کام صادر ہوں گے جن کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔'' کام کرنا انسان کا فرض ہے اور اس کے نتیجہ کے مطابق جزا دینا خدا کا کام ہے اور یہ تقدیر ہے، فرمایا:

﴿ إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّىٰ ۝ فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَىٰ ۝ وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ ۝ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ ۝ فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَىٰ ۝ وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ ۝ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ ۝ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ ۝ ﴾ (۹۲/ الیل:٤-۱۳)

---

[1] صحيح بخاري، كتاب التفسير، تفسير والليل اذا يغشى:٤٩٤٩۔

’’بے شبہ تمہاری کوششیں مختلف رُخ کی ہیں تو جس نے دیا اور پرہیز گاری کی اور نیکی کو سچ کر دکھایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ آسانی کی طرف لے چلیں گے اور جس نے نہ دیا اور بے پروائی برتی اور نیکی کو جھٹلایا تو ہم اس کو آہستہ آہستہ سختی کی طرف لے چلیں گے اور اسکی دولت مندی اس کو گڑھے میں گرنے سے نہیں بچاسکتی ہے، بیشک راہ سوجھانا ہمارا فرض ہے اور آخر اور اول ہمارے لیے ہے۔‘‘

یہ ہے قضاوقدر اور سعی وعمل کی باہمی تطبیق جس کی ژولیدگی نے اسلام سے پہلے ایک عالم کو گمراہ کر رکھا تھا۔ کام کرنا اور عمل کر دکھانا انسان کا فرض ہے اور اس کے مطابق اس کی جزا کا ملنا جو اس کام کے لیے پہلے سے مقدر ہو چکی ہے خدا کا کام ہے۔ نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستہ کے دکھانے کا نام توفیق وہدایت ہے اور بروں کو خدا کی طرف سے اس توفیق وہدایت کے نہ ملنے کا نام عدمِ توفیق وضلالت ہے اور ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش ہے، خدا فرماتا ہے:

﴿ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۶۹)

’’اور جو ہماری بات میں کوشش کرتے ہیں البتہ ہم ان کو اپنا راستہ سوجھاتے ہیں۔‘‘

خدا کی طرف سے توفیق وضلالت کا ملنا خود انسان کے اچھے یا برے عمل کا لازمی نتیجہ ہے:

﴿ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۙ﴾ (۲/ البقرہ:۲۶)

’’اور ہم اس سے گمراہ نہیں بناتے ،لیکن انہیں کو جو ہمارا حکم نہیں مانتے۔‘‘

غرض پہلے فسق، عدم اطاعت اور نافرمانی ہوتی ہے، تب اس کے نتیجہ کے طور پر خدا کی طرف سے ضلالت کا ظہور ہوتا ہے:

﴿ وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰى ۪ ﴾

(۵۳/ النجم:۳۹، ۴۰)

’’اور انسان کے لیے نہیں، لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔‘‘

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے، بچہ چلنا یا بولنا کیونکر سیکھتا ہے، وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کچھ کوشش کرتا ہے، تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے، وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو بامعنی الفاظ کی تلقین کرتے ہیں اور اس طرح دونوں کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں، اسی طرح تقدیر الٰہی اور عمل انسان باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔

جبر وقدر

عموماً لوگ اسی موقع پر جبر وقدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل میں مجبور ہے یا مختار؟ حالانکہ یہ رشتۂ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف یہ کہ مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہوسکتا جس طرح اہل مذہب ارادہ الٰہی اور ارادہ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں اسی طرح فلسفۂ الٰہیات کے معلم علم الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفہ اخلاق والے انسان کی آزادی عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے، اس کو بمشکل بچا سکتے ہیں۔ دنیا کے عام مذاہب کا بھی یہی حال تھا ہر دھاگے میں یہ گرہ اسی طرح پڑی ہوئی تھی اور اس کے حل کی صورتیں دو ہی انہوں نے نکالی تھیں یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اس راستہ سے گزر جایا جائے یا بحث چھڑی تو جبر ہی کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا چنانچہ یہی جبر ہندو مذاہب میں تناسخ آواگون اور کرم کی صورت میں ہے۔ عیسائیوں میں حضرت آدم علیہ السلام کے گناہ اور خدا کی [1] مرضی کے پیرایہ میں ہے اور یہودیوں کے مجموعۂ تورات میں حضرت ایوب کا صحیفہ ادھر ہی رہبری کرتا ہے۔ دوسری طرف مجوسی تھے، جنہوں نے انسانی اختیار و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ [2] غرض آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مذاہب کی یہی دو نوعیتیں تھیں یعنی یا تو ان کو اس مشکل کی خبر ہی نہیں تھی یا تھی تو خدا کی قدرت مطلقہ اور مشیت عامہ کی اس طرح تعبیر کرتے تھے کہ انسان بالکل بے بس اور مجبور نظر آتا تھا یا یہ کہ تناسخ کے چکر میں اس کو پھنسا کر اس کی زندگی کو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کے ہاتھوں گرو کردیتے تھے یا پھر اس سے بچے تو انسان کو کامل خود مختار بنا کر خود خدا کو مجبور بنا دیا۔

تمام انبیا میں آنحضرت ﷺ ہی کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دیرینہ راز کے چہرہ سے پردہ ہٹایا، حقیقت یہ ہے کہ یہ دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرہ ذرہ پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے اور آسمان و زمین، بر و بحر اور انسان و حیوان کوئی چیز نہیں، جو اس کے ارادہ اور مشیت کے بغیر حرکت بھی کر سکے، اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اس کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں، یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے، اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آجائے جس کے

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرفتاری کی رات کو دعا میں فرمایا: ''اے خدا! اگر تو اس پیالہ کو ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے، لیکن میری نہیں بلکہ تیری مرضی پوری ہو۔'' (کتاب مقدس عہد جدید، متی، ۲۶: ۳۹، ص: ۵۰) عیسائیوں کے جبری و قدری فرقوں کی معرکہ آرائی کا حال فرنچ فاضل موسیو دی کانت کی کتاب الاسلام (ترجمۂ عربی) صفحہ ۷ سے کسی قدر معلوم ہوسکتا ہے۔

[2] شفاء العليل في القضاء والقدر والتعليل مقدمة الكتاب، ص: ٣ حافظ ابن قيم رحمه الله۔

اختیارات محدود، جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شہنشاہی ناتمام ہو۔

۲۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح کوئی اختیار ضرور بخشا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار نہ تسلیم کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہیں تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیا کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنی ہو جائے، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام دینا اور بلاسبب بُرے کام پر اس کو عذاب دینا سراسر ظلم بن جائے بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ پر درست ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو و کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے، نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر وہ ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی کی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا، اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مؤاخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے خدا کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول اور نبی آتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کا صحیفۂ ربانی پہلی اور آخری آسمانی کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ''خدا کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا۔'' (۶/ الانعام:۵۹) اور دوسری طرف وہ کہتا ہے: ''ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے۔'' (۷۴/ المدثر:۳۸) یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت، وسیع اختیار اور ناقابلِ رد مشیئت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی، یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری، تکلیف، باز پرس اور مؤاخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے، اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادہ اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار رہا ہو ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ)) [1] اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی: ۱۔

وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے، مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا۔ فرمایا:

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (۱۸/ الکھف:۲۹)

''تو جو چاہے مومن بن جائے اور جو چاہے کافر ہو جائے۔''

اس لیے ہر انسان اپنی جنت آپ بناتا ہے اور اپنی دوزخ آپ مہیا کرتا ہے:

﴿ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۗ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ ﴾

(۴۱/ فصلت:۴۶)

''جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور برا کام کیا تو اپنے لیے کیا، تیرا پروردگار بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔''

کہ اگر ایسا نہ ہو تو وہ ظلم ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی جناب پاک و برتر ہے، چنانچہ آنحضرت ﷺ سے ارشاد ہے:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۴۲۔۴۴)

''اے پیغمبر! ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف کان لگاتے ہیں، تو کیا تم بہروں کو سناؤ گے، اگرچہ وہ سمجھتے نہ ہوں اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں، تو کیا تم اندھوں کو سوجھاؤ گے اور اگرچہ وہ نہ دیکھیں، بے شک اللہ لوگوں پر ظلم نہیں کرتا، بلکہ لوگ ہیں جو اپنے اوپر آپ ظلم کرتے ہیں۔''

وہ انسان جو اندھا اور بہرہ بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے، خدا اس کو اندھا اور بہرا بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا کہ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے۔ لوگوں کو قرآن کی ہدایت وضلالت کے الفاظ سے بھی دھوکہ ہوا ہے حالانکہ ہدایت اور ضلالت خدا کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے، ضلالت کی نسبت فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰي سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓي اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ﴾ (۲/ البقرۃ:۶، ۷)

''بے شک جنھوں نے (اسلام کی تعلیمات کے قبول) سے انکار کیا ان کو تمہارا تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں برابر ہیں، وہ ایمان نہ لائیں گے خدا نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔''

دیکھو جب انسان سے کفر کا صدور پہلے ہو چکا تب خدا کی طرف سے ضلالت کا فیضان ہوا اور اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر پڑ گئی کہ سمجھتے نہیں، کانوں پر مہر پڑ گئی کہ سنتے نہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہے کہ دیکھتے نہیں، دوسری جگہ فرمایا:

﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾ (٤/ النسآء:١٥٥)

''بلکہ خدا نے ان کے کفر کے سبب سے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔''

یہاں بھی ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے، مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مہر ہے۔ [1]

برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغامِ حق کے سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق وہدایت سے سرفراز فرمائے۔ ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِيْمَانِهِمْ ۚ ﴾ (١٠/ یونس:٩)

''بے شک جو ایمان لائے اور نیک کام کیے، ان کو ان کا پروردگار ان کے ایمان کے سبب ہدایت دے گا۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى ﴾ (٤٧/ محمد:١٧)

''اور جنھوں نے ہدایت قبول کی، ان کو ہدایت میں اور بڑھایا۔''

ایرانی فلسفۂ خیر وشر کی آمیزش نے اس مسئلہ کو اور زیادہ اُلجھا دیا، حالانکہ عربی الفاظ خیر وشر کو اعمال خیر و شر سے بحث نہیں، عربی میں مطلق خیر کے معنی دولت ونعمت وآرام کے اور شر کے معنی غربت وتکلیف ومصیبت کے ہیں، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ انہی معنوں میں آئے ہیں، البتہ جب ان کے ساتھ لفظ عمل شریک ہوگا، تو عملِ خیر اور عملِ شر کے معنوں میں یہ استعمال ہوگا، جیسے:

﴿ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ ﴾

(٩٩/ الزلزال:٧، ٨)

''تو جو کوئی چیونٹی برابر نیکی کرے گا، اس کو دیکھے گا اور جو برائی کرے گا وہ بھی دیکھے گا۔''

اس لیے حدیثوں کے ان الفاظ میں:

[1] قرآن پاک میں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے، وہاں اس کے کفر وفسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے، اس لیے ان آیتوں سے جبر پر استدلال صحیح نہیں۔

((وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى)) [1]

''اور اس پر ایمان کہ خیر اور شر کی تقدیر خدا کی طرف سے ہے۔''

کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کے اچھے اور برے کام سب خدا کی طرف سے ہیں بلکہ یہ معنی ہیں کہ انسانوں کو راحت ورنج، مسرت وتکلیف، دولت وافلاس اور صحت ومرض وغیرہ اچھائی اور برائی سب خدا کی طرف سے پہنچتی ہے اور اس کے تسلیم کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟

بعض لوگوں کو صحیح مفہوم کے سمجھنے میں ان آیتوں سے بھی شبہ ہوتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ ''اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دے دیتا'' اس سے وہ غلطی سے یہ سمجھے ہیں کہ وہ خود خداوند تعالیٰ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوئے ہے حالانکہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے الا یہ کہ خود خدا زبردستی ان کو مسلمان بنا دینا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر اور نیک یا بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے، چنانچہ ان آیتوں کا یہی مطلب ہے:

﴿ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ﴾ (۷٦/ الدھر:۳۰)

''تم نہیں چاہو گے الا یہ کہ خود خدا چاہے اور (تم کو زبردستی مسلمان بنا دے)۔''

﴿ مَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ ﴾ (٦/ الانعام:١١١)

''وہ نہیں ہیں کہ ایمان لے آئیں الا یہ کہ خدا چاہے۔''

﴿ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى ﴾ (٦/ الانعام:٣٥)

''اور اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت پر متفق کر دیتا۔''

﴿ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (٦/ الانعام:١٤٩)

''تو اگر وہ (خدا) چاہتا تو البتہ ان سب کو وہ (خود) ہدایت دے دیتا۔''

﴿ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴾ (١٦/ النحل:٩)

''اور اگر وہ (خدا) چاہتا البتہ ان سب کو ہدایت دے دیتا۔''

مگر اس کی عادت نہیں کہ وہ بندے کے ارادہ اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے دے، اس لیے اس مشیتِ الٰہی کے ساتھ قرآن پاک کی وہ آیتیں مطابق ہوں گی، جن میں بندوں کی مشیت کا بھی اعتبار کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ﴾ (١٨/ الكهف:٢٩)

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان:۹۳؛ ابوداود، کتاب السنة، باب فی القدر:٤٦٩٥؛ ترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی وصف جبریل للنبی ﷺ الایمان والاسلام:٢٦١٠۔

"تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔"

﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ﴾ (۷۳/ المزمل:۱۹ و ۷۶/ الدھر:۲۹)

"تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ قبول کرے۔"

﴿ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰی رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴾ (۷۸/ النبا:۳۹)

"سو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف بازگشت پکڑے۔"

﴿ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ یَّتَّخِذَ اِلٰی رَبِّهٖ سَبِیْلًا ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۷)

"لیکن جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے۔"

اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی بھی اترتی ہے، مگر کن کے لیے، بتصریح فرمایا:

۱۔ ﴿ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۶)

"اور اللہ اس سے گمراہ نہیں کرتا، مگر نافرمانوں کو۔"

۲۔ ﴿ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ﴾

(۶۱/ الصف:۵)

"جب وہ کج ہوئے تو اللہ نے انکے دلوں کو کج کر دیا اور اللہ بے حکم لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔"

۳۔ ﴿ بَلْ ٚ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴾ (۸۳/ التطفیف:۱۴)

"بلکہ ان کے کام ان کے دلوں پر زنگ بن گئے۔"

۴۔ ﴿ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ ﴾ (۴/ النسآء:۱۵۶)

"بلکہ ان کے کفر کے سبب سے اللہ نے ان پر مہر کر دی۔"

۵۔ ﴿ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۲۷)

"وہ پھر گئے اللہ نے ان کے دلوں کو اس لیے پھیر دیا کہ وہ لوگ سمجھتے نہ تھے۔"

۶۔ ﴿ كَذٰلِكَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِ الْكٰفِرِیْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۰۱)

"اسی طرح اللہ کافروں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔"

۷۔ ﴿ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۰)

"ان کے دلوں میں (پہلے سے) (نفاق کی) بیماری تھی تو خدا نے بیماری بڑھا دی۔"

ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو ہر ایک سے یہ صاف وصریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا مؤخر ہے اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اترنا علت اور انسانوں کا کفر وگناہ و

نفاق معلول نہیں بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کا فسق، کجی، زنگ، کفر، انصراف، (پھر جانا) نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت وگمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے، انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔

بہر حال اس مسئلہ میں مہبطِ وحی و رسالت محمد رسول اللہ ﷺ کی عجیب مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا [1] اور درحقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے، یہ کلی جہاں چٹکی کہ خوشبو اڑ گئی۔ اس عقیدہ کے تمام وسیع اطراف اور گوشوں کو چھوڑ کر جن کو متکلمین کی مجادلانہ کاوشوں نے پیدا کیا ہے، قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے:

﴿ وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۲)

''اور خدا کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، پھر اس کا ایک اندازہ (تقدیر) لگا دیا۔''

[1] ترمذی، ابواب القدر، باب ماجاء من التشدید فی الخوض فی القدر:۲۱۳۳۔

ایمان کے نتائج

گزشتہ صفحوں میں ایمان کی حقیقت اوراس کی چھ شاخوں خدا، فرشتے، رسول، کتاب، یوم آخراور قدر کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں اور دکھایا گیا ہے کہ ان میں سے ہر عقیدہ کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی صداقت کی دلیلیں کیا ہیں؟ اوراس کی تعلیم میں شارع علیہ السلام نے کیا مصلحتیں رکھیں ہیں اور شروع میں یہ بحث بھی کی جاچکی ہے کہ ہر مذہب میں اور خصوصاً مذہب اسلام میں ایمان کو اولین اہمیت کیوں دی گئی ہے، وہ بحثیں اصول کی تھیں یہاں خاتمہ میں نتائج کی حیثیت سے پھر اسی دعویٰ کی تکرار کی جاتی ہے یعنی یہ کہ درحقیقت ایمانیات اسی لائق ہیں کہ ان کو مذہب میں یہی اولین درجہ دیا جائے کیونکہ مذہب جن نتائج تک پہنچنا چاہتا ہے وہاں ایمان کی روشنی کے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم کسی دستور پر عمل کریں یہ ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں کہ اگر ایسا نہ ہوتو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس وضمیر پر اس کا اثر ہوسکتا ہے یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال، ہمارے دل کے تابع ہیں، اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہوسکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد اسی دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ درست ہوگیا تو سب کچھ درست ہوگیا۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھنا چاہیے، یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم ورواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات وفلاح کا دارومدار رکھا، چنانچہ حواریوں کے خطوط وملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عملیات نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے، اسلام کی پہلی تکمیلی شان اس بارہ میں یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان پر اور نہ عمل پر، بلکہ ایمانِ صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''جو ایمان لائے اورانہوں نے نیک کام کیے۔'' دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عملِ صالح کی علت وسبب ہے، یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہوسکتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص تم کو نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ وبار پیدا نہیں کیا، یہی سبب ہے کہ قرآنِ پاک ہر نیکی اور ہر خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے، ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اے وہ

لوگو! جو ایمان لائے۔'' کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، بہت سے موقعوں پر ہے ﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ﴾ ''اگر تم ایمان والے ہو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے اہل و سزاوار ہیں، فرمایا:

﴿وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۶۵)

''ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ محبت الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے، ایک اور سورہ میں ہے:

﴿اِنَّمَا كَانَ قَوۡلَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذَا دُعُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ لِيَحۡكُمَ بَيۡنَهُمۡ اَنۡ يَّقُوۡلُوۡا سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ۝﴾ (۲٤/ النور:٥١)

''ایمان والوں کی بات یہ ہے کہ جب ان کو فیصلہ کرنے کے لیے اللہ اور رسول کی طرف بلایا جائے، تو کہیں کہ ہم نے سنا اور ہم نے مانا اور انہیں لوگوں کا بھلا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ ایمان کا ایک نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے، دوسری آیت میں فرمایا:

﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ﴾ (٤٩/ الحجرات:١٠)

''ایمان والے تو آپس میں بھائی ہیں۔''

اس سے نتیجہ نکلا کہ مسلمانوں میں باہمی محبت اور شفقت کا ہونا بھی ایمان کی نشانی ہے، ایک اور آیت میں ہے:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ۝﴾ (۳/ آل عمران:١٦٠)

''اور خدا ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ کریں۔''

معلوم ہوا کہ خدا پر بھروسہ اور توکل اہلِ ایمان کی شان ہے اور سورۂ مومنون میں اہل ایمان کے اوصاف یہ بتائے گئے ہیں:

﴿قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ۝ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِيۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۙ۝ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۙ۝ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوۡنَ ۙ۝ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ۝ ...... وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ۙ۝ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَوٰتِهِمۡ يُحَافِظُوۡنَ ۘ۝﴾

(۲۳/ المؤمنون:١۔٥، ٨، ٩)

''بے شبہ اہل ایمان نے بھلائی پائی جو اپنی نماز میں ادب سے جھکے رہتے ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں دیتے اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں......

اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کی نگرانی رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پابندی کرتے ہیں۔"

ان آیتوں سے اہل ایمان کے ضروری اوصاف یہ معلوم ہوئے ،نماز میں خضوع وخشوع ، بے کار باتوں سے احتراز، زکوۃ وخیرات دینا، عفت و پاک دامنی، امانت، ایفائے عہد، نمازوں کی پابندی، ان آیتوں میں ایک عجیب رمز ہے دیکھو کہ اہل ایمان کے اوصاف کا آغاز بھی نماز سے کیا گیا اور انجام بھی نماز پر رکھا گیا، اس سے اشارہ نکلا کہ نماز ایمان کی اولین وآخرین نشانی ہے اور اسی لیے ایمان کے بعد سب سے زیادہ اس پر زور دیا گیا ہے۔ ہم نے یہ چند آیتیں یہاں مثالاً نقل کی ہیں ورنہ اگر کوئی استقصا کرے تو قرآن میں ایمان کے اثرات و نتائج اور بہت سے ملیں گے، احادیث میں بھی اس مضمون کی کمی نہیں، صحیح حدیث ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "ایمان کی کچھ اوپر ستر شاخیں ہیں۔" ❶ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب شعب الایمان میں مختلف حدیثوں سے ایمان کی ان ستر شاخوں کو ایک ایک کر کے گنایا ہے، اس کتاب کا خلاصہ مختصر شعب الایمان کے نام سے چھپ بھی گیا ہے۔

ایک اور حدیث میں ایمان کی شناخت، اخلاق کی پاکیزگی کو بتایا گیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا)) ❷

"مومنوں میں اس کا ایمان سب سے زیادہ کامل ہے، جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔"

حسن اخلاق کا اساسی مرکز محبت ہے، یہ محبت سب سے پہلے تو اس ہستی سے ہونی چاہیے جو تمام محبتوں کا مرجع ومرکز ہے یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد اسی محبت الٰہی کے ضمن اور تبعیت میں اس ہستی سے بھی محبت کرنا ضروری ہے، جس کی ہدایت اور تعلیم کے وسیلہ سے یہ جوہر ایمانی ہم کو ہاتھ آیا، اس محبت کے سامنے دوسری تمام دنیاوی محبتیں اور قرابت اور رشتہ داری کے علائق ہیچ ہیں، فرمایا:

((لا يؤمن احدكم حتى اكون احب اليه من ولده ووالده والناس اجمعين)) ❸

"تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان میں کامل نہیں، جب تک کہ اس کے دل میں میری محبت، اس کی اولاد اور والدین اور تمام لوگوں سے زیادہ نہ ہو۔"

ایمان کا تیسرا تاثر یہ ہے کہ اس کو اپنی ہم جنس برادری اور پڑوسی سے بھی اسی طرح محبت، پیار اور اخلاص ہو جس طرح خود اپنے آپ سے، فرمایا:

((والذي نفسي بيده لا يؤمن احدكم حتى يحب لاخيه اولجاره مايحب

❶ صحيح بخاري، كتاب الايمان، باب امور الايمان، :٩؛ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان عدد شعب الايمان:١٥٢۔ ❷ سنن ابوداود، كتاب السنة، باب الدليل على زيادة الايمان و نقصانه: ٤٦٨٢۔

❸ بخاري، كتاب الايمان، باب حب الرسول: ١٤، ١٥؛ مسلم، كتاب الايمان، باب وجوب محبة رسول الله ﷺ : ١٦٩۔

لنفسه)) [1]

’’قسم ہے اس ذات کی، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں، جب تک کہ وہ اپنے بھائی یا پڑوسی (راوی کو شک ہے) کے لیے وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے۔‘‘

آپ نے ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا: ’’جب تک تم مومن نہ بنو گے جنت میں داخل نہ ہو سکو گے اور مومن نہ بنو گے، جب تک تم آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو گے تمہیں بتاؤں کہ تم میں آپس میں محبت کیونکر ہو سکتی ہے آپس میں سلام پھیلاؤ۔‘‘ [2]

یہ محبت کسی نمائش، ریا، یا ذاتی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو، بلکہ خدا اور صرف خدا کے لیے ہو فرمایا: ’’تین باتیں جس میں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پالیا، اول یہ کہ اس کے دل میں خدا اور رسول سے بڑھ کر کسی اور کی محبت نہ ہو، دوسری یہ کہ بندگانِ خدا سے صرف خدا کے لیے محبت کرتا ہو، تیسری یہ کہ کفر سے نجات پانے کے بعد پھر اس میں آلودہ ہونا اس کے لیے اتنا ہی تکلیف دہ ہو جتنا آگ میں ڈالا جانا۔‘‘ [3] ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کامل اسلام کس مسلمان میں ہے؟ فرمایا: ’’اس مسلمان میں جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ رہے۔‘‘ [4] فرمایا: ’’ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک شرم و حیا ہے۔‘‘ [5] یہ بھی تعلیم دی کہ ’’جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ زبان سے بات نکالے تو اچھی، ورنہ چپ رہے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کو دکھ نہ پہنچائے جس کو خدا اور آخرت پر ایمان ہو اس کو چاہیے کہ مہمان کی عزت کرے۔‘‘ [6] ایک صحابی آپ کے اس ارشاد کو نقل کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں سے اگر کوئی برائی دیکھے تو اس کو ہاتھ سے مٹا دے یہ نہ ہو سکے تو زبان سے ٹوک دے یہ بھی نہ ہو سکے تو اپنے دل میں اس کو بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا آخری درجہ ہے۔‘‘ [7]

اس کے بالمقابل آپ ﷺ نے متنبہ فرمایا: ’’نفاق کی چار (۴) نشانیاں ہیں جس میں ان میں سے ایک بھی پائی جائے اس میں اتنا نفاق کا عنصر موجود ہے اگرچہ وہ نماز گزار اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو وہ مسلمان ہی کیوں نہ سمجھتا ہو، ایک یہ کہ گفتگو کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو توڑ دے، امانت سپرد کی

---

[1] مسلم، كتاب الايمان، باب الدليل على ان من خصال الايمان: ۱۷۰، ۱۷۱۔ [2] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان انه لا يدخل الجنة......: ۱۹۴۔ [3] صحيح بخارى، كتاب الايمان، باب من كره ان يعود......: ۲۱؛ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان خصال من......: ۱۶۶۔ [4] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان تفاضل الاسلام: ۱۶۱ تا ۱۶۳۔ [5] صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب بيان عدد شعب الايمان: ۱۵۲۔
[6] یہ تمام روایتیں صحيحين، كتاب الايمان میں ہیں، صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الحث على اكرام الجار: ۱۷۳۔ [7] صحيح بخارى، كتاب الايمان، پیش نظر مسلم ہے۔ باب بيان كون النهى عن المنكر: ۱۷۷۔

جائے تو خیانت کرے، غصہ آئے تو گالی بکے۔'' [1]

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اور اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو انسانی نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے لیکن اس سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ایمان کے بعد عمل کی ضرورت نہیں کہ اسلام نے اسی نکتہ کو بار بار ادا کیا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عملِ صالح دونوں پر ہے، اسی لیے ﴿اٰمَنُوْا﴾ کے ساتھ ساتھ ﴿وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ پر بھی اس نے ہمیشہ زور دیا ہے بلکہ اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے، ایمان ملزوم اور اعمال حسنہ اس کے خصوصیات اور لوازم ہیں، یعنی ان دونوں میں اصل وفرع اور لازم وملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے، اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ وبار درخت ہے، جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم ووجود برابر ہے، اس بنا پر جہاں ایمان ہے، اس کے عملی نتائج وآثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

کاغذ کے پانچ سو چوراسی (584) [2] صفحے سیاہ ہو چکے ہیں، ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گراں باری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی، اس لیے بہتر ہے کہ رہروِ قلم کے ساتھ قافلہ نظر کے دوسرے رفقا بھی کچھ دیر آرام کریں ہر چند کہ

رہ روانِ راخستگی راہ نیست — عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

سید سلیمان ندوی
دار المصنفین
رمضان ۱۳۵۰ھ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب خصال المنافق: ۲۱۰؛ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب علامات المنافق: ۳۴۔ [2] موجودہ ایڈیشن کے لحاظ سے۔





سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم